درجہ ثالثہ کی معرکۃ الآراء کتاب کافیہ کی افہام و تفہیم کے اسلوب پر مبنی شرح !

نافعہ

شرح اردو

کافیہ

ترتیب وتالیف

مفتی ابوصہیب نثار عفی عنہ

امام وخطیب؛ جامع مسجد بیت المکرم (لانڈھی)

استاذ؛ جامعہ؛ تدریس القرآن بنوریہ (لانڈھی)

فہرست

مقدمہ شرح کافیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدُ للهِ الذی علّمَ بالقلم، علّمَ الإنسانَ مالم یَعلم، وأفضلُ الصلواتِ وأزکی التسلیماتِ علی سیّدِ العربِ والعجمِ، سیّدنا محمدٍ النبیّ الأکرم، وعلی آلہ وصحبِہ أجمعین، ومن تبعھم بإحسانٍ إلی یوم الدین۔

علمِ نحو کی ابتدا اور ارتقاء

قرآن و حدیث کو درست طور پر سمجھنے کے لیے زبانِ عربی کا صحیح اور مستحکم ادراک نہایت ضروری ہے۔ جب اسلام مختلف خطوں تک پھیلا اور عجمی اقوام عربوں سے اختلاط میں آئیں تو زبان میں لحن و فساد پیدا ہونے لگا۔ حتیٰ کہ قرآنِ کریم کی تلاوت میں بھی اغلاط ظاہر ہوئیں۔ اس موقع پر حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے صحابیٔ رسول اور فصیح العرب ابوالاسود دؤلیؒ کو حکم دیا کہ عربی زبان کے قواعد مدون کریں تاکہ قرآن و سنت کے فہم میں خلل نہ آئے۔ یہی علم بعد میں "نحو" کے نام سے مشہور ہوا۔ ابتدائی دور میں یہ قواعد نہایت مختصر اور محدود تھے، لیکن پھر بصری اور کوفی مکتبہ فکر نے اسے وسعت دی۔ بصرہ میں خلیل بن احمد فَراہیدیؒ اور ان کے شاگرد سیبویہؒ نے نمایاں خدمات انجام دیں، حتیٰ کہ سیبویہ کی کتاب "الکتاب" آج بھی نحو کی بنیادی ماخذ شمار ہوتی ہے۔ کوفہ میں کسائیؒ اور فراءؒ جیسے جلیل القدر ائمہ نے اس علم کو مزید وسعت بخشی۔ یوں رفتہ رفتہ نحو ایک مکمل اور منظم فن کی صورت اختیار کر گیا۔

ائمہ نحو اور مشہور کتب

صدیوں کے سفر میں بے شمار ائمہ نے اس فن کی آبیاری کی۔ ان میں سیبویہؒ (م 180ھ)، زمخشریؒ (م 538ھ)، ابن مالکؒ (م 672ھ) اور ابن ہشامؒ (م 761ھ) خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان حضرات کی تصنیفات نے نحو کے اصول و مباحث کو مرتب کیا اور مدارس کے نصاب میں مستقل جگہ پائی۔ ان مشہور کتب میں **"الکتاب"** (سیبویہ)، **"المفصل"** (زمخشری)، **"ألفیة ابن مالك"**، **"قطر الندی"**، **"أوضح المسالك"** اور **"کافیہ ابن الحاجب"** شامل ہیں۔

صاحبِ کافیہ کا تعارف:

امام جمال الدین ابن الحاجبؒ (570ـ646ھ) کا شمار اپنے زمانے کے جلیل القدر علماء اور محققین میں ہوتا ہے۔
آپ کا اصل نام عثمان بن عمر ہے۔ آپ نے نحو اور اصولِ فقہ میں ایسی گراں قدر خدمات انجام دیں کہ آپ کی تصانیف آج بھی دینی مدارس و جامعات میں پڑھائی جاتی ہیں۔ آپ کی اہم کتب میں **"الشافیة فی التصریف"**، **"الکافیة فی النحو"**، اور اصولِ فقہ میں **"المختصر"** نمایاں ہیں۔
آپ نہ صرف بصیرت افروز عالم تھے بلکہ بہترین معلم اور مصنف بھی تھے۔ آپ کی تصانیف میں جامعیت، اختصار اور فنی باریکی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

کافیہ کی خصوصیات

"کافیہ" علم نحو کی ایک ایسی کتاب ہے جو نہایت مختصر لیکن جامع ہے۔ اس کی عبارت گہری، دقیق اور علمی نکات سے بھرپور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں اعلیٰ درجے پر شامل کی گئی ہے۔ اس پر بے شمار شروح لکھی گئیں جن میں "شرح رضی"، "شرح جامی"، اور دیگر قابل ذکر ہیں۔ "شرح جامی" کو مدارس میں مرکزی نصاب کی حیثیت حاصل ہے۔

اردو شروح اور ہماری شرح کا تعارف؛

یہ حقیقت ہے کہ "کافیہ" پر اردو میں بھی متعدد شروح لکھی جا چکی ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ مفید ہے۔ تاہم ہماری اس شرح کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری قیل و قال سے مکمل اجتناب کیا گیا ہے۔ صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے جو طلبہ کے فہم کے لیے ناگزیر تھا۔ اس شرح میں علمی پہلو بھی باقی رکھا گیا ہے لیکن اس کا انداز زیادہ تر افہام و تفہیم پر مبنی ہے تاکہ مبتدی طلبہ بھی بآسانی عبارت کو سمجھ سکیں۔

اس شرح کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

1 عبارت کو آسان اور سہل انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

2 مشکل الفاظ و اصطلاحات کی تشریح دی گئی ہے۔

3 غیر ضروری بحث و تمحیص سے اجتناب کیا گیا ہے۔

4 مثالوں اور شواہد کے ذریعے طالب علم کی سمجھ کو پختہ کیا گیا ہے۔

5 مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ کافیہ کی عبارت طلبہ پر بوجھ بننے کے بجائے آسانی سے ذہن نشین ہو جائے۔

دعا ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اس کام کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اسے علم کے فروغ کا ذریعہ بنائے اور ہم سب کو زبانِ قرآن و حدیث کے صحیح فہم کی توفیق عطا فرمائے۔

اللّٰهم اجعل هذا العمل خالصاً لوجهك الكريم، وعلِّمنا ما ينفعنا وانفعنا بما علَّمتنا وزِدنا علماً» وصلى الله على سيدنا محمدٍ وعلى آله وصحبه أجمعين

ابو صہیب نثار عفی عنہ

1445_ 2023

ضروری باتیں

اصل کتاب کے مباحث سے پہلے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے۔
(۱) نحو کی تعریف (۲) موضوع (۳) غرض وغایت۔ (۴) مقام نحو۔

فائدہ:... تعریف کا جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ طلب مجہول مطلق لازم نہ آئے۔ غرض وغایت کا جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ ایک فن دوسرے فن سے ممتاز ہوسکے۔ تدوین کی معرفت اس لئے ضروری ہے تاکہ فن کی تاریخ ذہن نشین ہو جائے۔ مقام جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ مقام کے علم سے حصول فن کا شوق پیدا ہو جائے۔ مصنف کا جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ مصنف کے مرتبہ سے اس کی تصنیف کا اندازہ لگایا جاسکے۔ کیونکہ جس درجے کا متکلم ہوتا ہے اسی درجے کا اس کا کلام ہوتا ہے۔

فن نحو کی تعریف:

نحو کا لغوی معنی: لغت میں نحو مختلف معانی کے لئے آتا ہے یہاں مراد نحو سے القصد یعنی ارادہ کرنا کلام عرب کا تاکہ اس کو حاصل کرے وہ شخص جو اہل عرب میں سے نہیں ہے۔

نحو کا اصطلاحی معنی:

النحو علم باصول یعرف بها احوال اواخر الکلم الثلاث من حیث الاعراب والبناء و کیفیه الترکیب بعضها مع بعض۔

یعنی نحو ان اصول اور قوانین کو جاننے کا نام ہے جس کے ذریعے تین کلموں کے آخر کے احوال معلوم کئے جائیں معرب اور مبنی ہونے کے اعتبار سے اور بعض کی بعض کے ساتھ ترکیبی کیفیت کے اعتبار سے۔

فن نحو کا موضوع:

کسی بھی فن کا موضوع وہ کہلاتا ہے جس سے اس کے عوارض ذاتیہ میں بحث کی جائے جیسے بدن انسان طب کا موضوع ہے غور وفکر منطق کا موضوع ہے۔ اصول اربعہ شرعیہ اصول فقہ کا موضوع ہے مکلّف کا فعل فقہ کا موضوع ہے وغیرہ ذلک، اسی طرح نحو کا موضوع الکلمۃ والکلام۔

نحو کا موضوع کلمہ اور کلام ہے۔

غرض وغایت:

جس وجہ سے اس فن کی ابتدا کی گئی ہو اس کو غرض غایت کہا جاتا ہے لہٰذا نحو کی غرض وغایت یہ ہے:

صیانۃ الذهن عن الخطاء اللفظی فی الکلام العرب

ذہن کو کلا عرب میں لفظی غلطی سے بچانا

(۴) مقام نحو:

علوم عقلیہ میں نحو کا بہت بلند مقام ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: تعلموا النحو کما تعلموا السنن والفرائض۔ (علم نحو کو اس طرح سیکھو جیسے سنن و فرائض کو سیکھتے ہو)۔

بعض حکماء کا قول ہے۔ النحو فی العلوم کالضوء فی النجوم۔ (علم نحو علوم میں ایسے ہے جیسے ستاروں میں روشنی) یعنی نحو تمام علوم کا نور ہے۔

بعض حضرات کا قول ہے۔ النحو فی الکلام کالملح فی الطعام (کلام میں نحو کا مقام ایسے ہے جیسے کھانے میں نمک)۔

نحو کی فضیلت اور مقام کے لئے یہ بات کافی ہے کہ نحو قرآن وحدیث کے علوم کے پڑھنے کے لئے واسطہ اور ذریعہ ہے اسی وجہ سے صاحب مفتاح السعادۃ کے نزدیک نحو کا علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے کیونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے استدلال کرنے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور نحو میں مہارت کے بغیر قرآن وحدیث کا صحیح طریقے سے پڑھنا اور سمجھنا ناممکن ہے اور ضیاع عمر ہے۔

انتساب

اس عظیم ہستی کے نام جس کے متعلق فرمایا گیا ہے!

الجنۃ تحت اقدام الامھات

[الكلمة والكلام]

الكلمة :لفظ وضع لمعنى مفرد.

ترجمہ:...دوسری فصل۔ کلمہ وہ لفظ ہے جس کو وضع کیا گیا ہے معنی مفرد کے لئے۔

تشریح:

اس عبارت میں چند مباحث ہیں:

پہلی بحث الکلمۃ کے الف لام سے متعلق:

الف لام کی دو قسمیں ہیں۔

اول:...الف لام اسمی۔ دوم:... الف لام حرفی۔

الف لام اسمی :الف لام اسمی وہ ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول کے شروع میں آتی ہے اور الذی کے معنی میں ہوتی ہے۔ جیسے الضارب، المضروب۔ الضارب بمعنی الذی ضَرَبَ۔ المضروب بمعنی الذی ضُرِبَ۔

الف لام حرفی کی دو قسمیں ہیں:

اول:...الف لام حرفی زائدہ۔ دوم:...الف لام حرفی غیر زائدہ۔

الف لام حرفی زائدہ سے مراد وہ الف لام ہے جس کو اگر لفظوں سے گرادیا جائے تو معنی پر کوئی اثر نہ پڑے جیسے والیوم الاٰخر، اس صورت میں جب اس کی ترکیب اضافی ہو، کیونکہ مضاف پر الف لام اور تنوین داخل نہیں ہو سکتی۔

دوم:...الف لام حرفی غیر زائدہ، وہ جس کو لفظوں سے گرادیا جائے تو معنی میں اثر پڑے۔ جیسے الکلمۃ معرفہ ہے کلمہ نکرہ ہے۔

الف لام حرفی غیر زائدہ کی پھر چار قسمیں ہیں:

اول:... جنسی۔ دوم:... استغراقی، سوئم:...عہد خارجی۔ چہارم:... عہد ذہنی۔

الف لام جنسی۔ وہ ہے جو جنس پر دلالت کرے افراد پر نہ کرے۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ ۔ الْمَلٰٓئِكَةُ کا الف لام جنسی ہے ۔الرجل خیر من المرءۃ۔ الرجل اور المرءۃ کا الف لام جنسی ہے۔

الف لام استغراقی :وہ ہے جو تمام افراد پر دلالت کرے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ :الْاِنْسَانَ کا الف لام استغراقی ہے۔

الف لام عہد خارجی :وہ ہے جو بعض معین افراد پر دلالت کرے :فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ :الرَّسُوْلَ کا الف لام عہد خارجی ہے کیونکہ اس سے مراد موسیٰ ہے۔

الف لام عہد ذہنی :وہ ہے جو بعض غیر معین افراد پر دلالت کرے :فَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ ۔ الذئب کا الف لام عہد ذہنی ہے، کیونکہ اس سے غیر معین بھیڑیا مراد ہے۔

الکلمۃ کا الف لام یا تو جنسی ہے اور یا تو عہد خارجی ہے، یعنی یا تو جنس کلمہ مراد ہے یا وہ کلمہ مراد ہے جو نحویین کے ہاں کلمہ ہے۔

دوسری بحث کلمہ سے متعلق ہے:

کلمہ نکلا ہے کلمٌ سے اور کلمٌ کہتے ہیں زخم کو تاثیر زخم کی وجہ سے الفاظ کو بھی کلمہ کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے عرب کے شاعر کا شعر ہے۔

جراحات السنان لها التیام ولا یلتام ما جرح اللسان

ترجمہ۔ تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے لگے ہوئے زخم نہیں بھرتے۔

تیسری بحث الکلمۃ کے ۃ سے متعلق ہے:

الکلمۃ کی تاوحدت کے لئے ہے پھر اس پر اشکال ہوتا ہے کلمہ جنس ہے اور تاوحدت کی ہے تو پھر یہ دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟
جواب یہ ہے کہ یہاں وحدت سے مراد وحدت نوعی یا وحدت جنسی ہے وحدت فرو مراد نہیں ہے۔

چوتھی بحث لفظٌ سے متعلق ہے:

لفظٌ کا لغوی معنی ہے الرمی پھینکنا، جیسے اہل عرب کا قول ہے :اکلت التمرۃ ولفظت النواۃ۔ میں نے کھجور کھائی اور گٹھلی پھینک دی۔
لفظ کی اصطلاحی تعریف :مایتلفظ بہ الانسان من حرف فصاعدًا۔ جس کا انسان تلفظ کرسکے خواہ ایک لفظ ہو یا زیادہ ہو۔

پانچویں بحث وضع سے متعلق ہے:

وضع:

وضع لغت میں رکھنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں وضع سے مراد وہ چیز ہے جس کے سمجھنے سے دوسری چیز خود بخود سمجھ میں آجائے جیسے چاقو وضع کیا گیا ہے دستہ اور پَل کے لئے، جب چاقو کہا جائے گا تو دستہ اور پَل پر خود دلالت ہو جائے گی۔

چھٹی بحث مفرد سے متعلق ہے:

مفردٌ ٍ ً :اعراب کے اعتبار سے مفرد کی تین حالتیں ہیں:

پہلی حالت:

مفردٌ، مرفوع ہو۔ **مُفْرَدٌ** اس صورت میں یہ لفظٌ کی صفت ثانیہ ہوگی پھر معنی یہ ہوگا۔
الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفردٌ۔ کلمہ وہ لفظ مفرد ہے جس کو معنی کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

دوسری حالت:

مفردًا، منصوب ہو۔ **مفردًا** اس صورت میں مفردًا یا تو وُضِعَ کی ضمیر سے حال واقع ہوگا یعنی کلمہ وہ لفظ ہے جس کو معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اس حال میں کہ وہ لفظ مفرد ہے اور یا معنیً سے حال واقع ہوگا، پھر ترجمہ یہ ہوگا، کلمہ وہ لفظ ہے جس کو معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اس حال میں کہ وہ معنی مفرد ہے۔

تیسری حالت:

مفردٍ، مجرور ہے۔ مفردٍ اس صورت میں مفردٍ صفت ہوگی معنیً کی، ترجمہ یہ ہوگا، کلمہ وہ لفظ ہے جس کو ایسے معنی کے لئے

وضع کیا گیا ہے جو مفرد ہے

وَهِيَ :اِسْمٌ وَفِعْلٌ وَحَرْفٌ. لِأَنَّهَا إِمَّا أَنْ تَدُلَّ عَلَى مَعْنًى فِي نَفْسِهَا أَوْلَا. الثَّانِي الْحَرْفُ. وَالْأَوَّلُ إِمَّا أَنْ يَقْتَرِنَ بِأَحَدِ الْأَزْمِنَةِ الثَّلَاثَةِ أَوْلَا. الثَّانِي الِاسْمُ، وَالْأَوَّلُ الْفِعْلُ، وَقَدْ عُلِمَ بِذٰلِكَ حَدُّ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهَا.

ترجمہ :اور وہ (کلام) اسم، فعل اور حرف ہیں۔ اس لیے کہ کلام یا تو خود اپنے طور پر کسی معنی پر دلالت کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ دوسری قسم حرف ہے۔ اور پہلی قسم یا تو تین زمانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے یا نہیں۔ دوسری قسم اسم ہے اور پہلی قسم فعل ہے۔ اور اس (تقسیم) سے ہر ایک کی تعریف معلوم ہو گئی۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے کلمہ کی بنیادی اقسام بیان فرماتے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ کلمہ، اپنی ساخت اور معنی کے اعتبار سے تین بنیادی اقسام پر مشتمل ہے :اسم، فعل اور حرف۔

اس دعوے کی دلیل مصنفؒ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہم غور کرتے ہیں کہ کوئی بھی لفظ جو بامعنی کلام کا حصہ بنتا ہے، وہ یا تو ایسا ہوگا کہ اپنے معنی کو سمجھنے کے لیے کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہیں ہوگا، یعنی وہ بذاتِ خود ایک مکمل یا کسی حد تک مستقل معنی رکھتا ہوگا۔ یا پھر وہ ایسا ہوگا کہ اپنے معنی کو واضح کرنے کے لیے کسی دوسرے لفظ کا محتاج ہوگا۔

پہلی صورت :

اگر کوئی لفظ اپنے معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے لفظ کا محتاج نہ ہو، تو پھر اس کی دو صورتیں ہوں گی: یا تو وہ کسی زمانے کے ساتھ جڑا ہوا ہوگا، یعنی اس کے معنی میں ماضی، حال یا مستقبل میں سے کوئی زمانہ پایا جائے گا۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ایسا لفظ فعل کہلاتا ہے۔

مثال کے طور پر لفظ "ذَهَبَ" (وہ گیا) ماضی کے زمانے پر دلالت کرتا ہے۔ "يَذْهَبُ" (وہ جاتا ہے یا جائے گا) حال اور مستقبل دونوں زمانوں میں دلالت کرتا ہے۔ یا وہ کسی زمانے کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہوگا، یعنی اس کے معنی میں کوئی خاص زمانہ نہیں پایا جائے گا۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ایسا لفظ اسم کہلاتا ہے۔ اسم کسی شخص، جگہ، چیز یا کیفیت کا نام ہوتا ہے اور یہ زمانے سے آزاد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "رَجُلٌ" (ایک آدمی)، "بَيْتٌ" (ایک گھر)، "عِلْمٌ" (علم) وغیرہ۔

دوسری صورت :

اگر کوئی لفظ اپنے معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے لفظ کا محتاج ہو، یعنی وہ اکیلا کوئی مکمل یا واضح معنی نہ دے سکے، تو مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ایسا لفظ حرف کہلاتا ہے۔ حرف دو اسموں یا ایک اسم اور ایک فعل کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتا ہے اور ان کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے۔ حروفِ جارّہ، حروفِ عطف اور حروفِ ناصبہ و جازبہ وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

مثال کے طور پر حرف "مِنْ" (سے) اکیلا کوئی مکمل معنی نہیں دیتا جب تک اسے کسی اسم یا فعل کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے۔

جیسے "ذَهَبْتُ مِنَ الْبَيْتِ" (میں گھر سے گیا۔) یہاں "مِنْ" نے جانے کے عمل کو گھر سے منسلک کیا ہے۔
مصنفؒ آخر میں فرماتے ہیں کہ اس تقسیم اور وضاحت سے اسم، فعل اور حرف میں سے ہر ایک کی تعریف واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی اسم وہ کلمہ ہے جو کسی معنی پر بذاتِ خود دلالت کرے اور کسی زمانے کے ساتھ خاص نہ ہو۔ فعل وہ کلمہ ہے جو کسی معنی پر بذاتِ خود دلالت کرے اور کسی ایک زمانے کے ساتھ خاص ہو۔ اور حرف وہ کلمہ ہے جو کسی معنی پر بذاتِ خود دلالت نہ کرے بلکہ دوسرے کلمات کے ساتھ مل کر معنی دے۔

اَلْكَلَامُ :

مَا تَضَمَّنَ كَلِمَتَيْنِ بِالْإِسْنَادِ، وَلَا يَتَأَتَّى ذَلِكَ إِلَّا فِي اسْمَيْنِ، أَوْ فِعْلٍ وَاسْمٍ. اَلْإِسْمُ :مَا دَلَّ عَلَى مَعْنًى فِي نَفْسِهِ غَيْرَ مُقْتَرِنٍ بِأَحَدِ الْأَزْمِنَةِ الثَّلَاثَةِ.

ترجمہ :کلام :وہ (مرکب) ہے جو دو کلموں پر اسناد کے ساتھ مشتمل ہو، اور یہ اسناد صرف دو اسموں یا ایک فعل اور ایک اسم میں ہی متحقق ہو سکتی ہے۔ اسم :وہ (کلمہ) ہے جو بذاتِ خود کسی معنی پر دلالت کرے اور تین زمانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملا ہوا نہ ہو۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے کلام کی تعریف بیان فرماتے ہیں۔
الکلام لفظ...الخ اس عبارت میں صاحب کتاب نے نحو کے دوسرے موضوع کلام کو بیان فرمایا ہے۔

کلام کا لغوی معنی :

لغت میں کلام اس کو کہتے ہیں جس کا انسان تکلم کرے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ ہو۔

کلام کی اصطلاحی تعریف :

نحو کی اصطلاح میں کلام کی تعریف یہ ہے کہ :

اَلْكَلَامُ :مَا تَضَمَّنَ كَلِمَتَيْنِ بِالْإِسْنَادِ،

کلام وہ لفظ ہے جو شامل ہو دو ۲ کلموں کو اسناد کے ساتھ۔

والاسناد: اسناد کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

نمبر ۱:...مسند۔ نمبر ۲:...مسند الیہ۔
مسند :اس کو کہتے ہیں جس کی نسبت کسی چیز کی طرف کی جائے۔
مسند الیہ :اُس کو کہتے ہیں جس کی طرف نسبت کی جائے، جیسے :زَيْدٌ قَائِمٌ۔
اس مثال میں قائم مسند ہے کیونکہ اس کی نسبت کی گئی ہے زَيْدٌ مسند الیہ ہے کیونکہ اس کی طرف قیام کی نسبت کی گئی ہے۔

اسناد کا فائدہ

اسناد کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مخاطب کو فائدہ تامہ حاصل ہو جائے یعنی ایسا مکمل فائدہ کہ جس پر متکلم کا خاموش ہونا صحیح ہو اور مخاطب کو بات سمجھ آجائے مزید وضاحت کی ضرورت نہ ہو۔

مثالیں:

نمبر ۱: جملہ اسمیہ: جیسے زیدٌ قائمٌ اس میں زید مسند الیہ ہے قائم مسند ہے۔

نمبر ۲: جملہ فعلیہ: جیسے قامَ زیدٌ اس میں قام مسند ہے اور زید مسند الیہ ہے۔

کلام کی ممکنہ چھ صورتیں

وَلَا يَتَأَتّٰى ذٰلِكَ إِلَّا فِي اسْمَيْنِ، أَوْ فِعْلٍ وَاسْمٍ.

اس عبارت میں صاحب کتاب نے ترکیب کلام کی ممکنہ چھ صورتیں بیان فرمائی ہیں اور وہ چھ صورتیں یہ ہیں:

(۱) کلام مرکب ہو دو اسموں سے۔ (۲) کلام مرکب ہو دو فعلوں سے۔ (۳) کلام مرکبّ ہو دو حرفوں سے۔ (۴) کلام مرکب ہو ایک اسم اور ایک فعل سے۔ (۵) کلام مرکب ہو ایک فعل اور ایک حرف سے۔ (۶) کلام مرکب ہو ایک اسم اور ایک حرف سے۔

ان چھ صورتوں کا حکم

ان چھ صورتوں میں پہلی صورت یعنی کلام مرکب ہو دو اسموں سے جیسے زَيْدٌ قَائِمٌ اور چوتھی صورت یعنی کلام مرکب ہو ایک فعل اور ایک اسم سے جیسے قَامَ زَيْدٌ یہ دونوں صورتیں درست ہیں ان دونوں کے علاوہ باقی چار صورتیں صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ کلام مرکب ہوتا ہے مسند اور مسند الیہ سے اور یہ دونوں اس صورت میں موجود ہیں جب کلام مرکب ہو دو اسموں سے یا مرکب ہو ایک اسم اور ایک فعل سے اس کے علاوہ جتنی بھی صورتین ہیں ان میں یا تو صرف مسند پایا جارہا ہے یا صرف مسند الیہ اور یا دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ للذا اس سے کلام نہیں بنے گا۔

اس کے بعد مصنفؒ اسم کی تعریف بیان فرماتے ہیں۔

آپؒ فرماتے ہیں کہ اسم وہ کلمہ ہے جو اپنے معنی پر دلالت کرنے میں کسی دوسرے کلمے کا محتاج نہ ہو، یعنی وہ بذاتِ خود ایک معنی رکھتا ہو، اور اس کے معنی میں تین زمانوں (ماضی، حال، مستقبل) میں سے کوئی خاص زمانہ پایا نہ جائے۔

یہاں مصنفؒ نے اسم کی دو اہم خصوصیات بیان فرمائیں:

دلالت بر معنی فی نفسہٖ (اپنے طور پر معنی پر دلالت کرنا):

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم کو سمجھنے کے لیے کسی دوسرے لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر لفظ "كِتَابٌ" (کتاب) کا معنی سمجھنے کے لیے کسی اور کلمے کی حاجت نہیں ہے۔

غیر مقترن باحد الازمنۃ الثلاثۃ (تین زمانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملا ہوا نہ ہونا)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم کے معنی میں کوئی خاص زمانہ نہیں پایا جاتا۔ "کتاب" ماضی میں بھی کتاب ہی تھی، حال میں بھی کتاب ہے اور مستقبل میں بھی کتاب ہی رہے گی۔ اس کے برعکس فعل کسی خاص زمانے کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس

تعریف سے فعل اور حرف سے اسم کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ فعل بھی بذاتِ خود معنی پر دلالت کرتا ہے لیکن وہ کسی زمانے کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ جبکہ حرف بذاتِ خود معنی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ دوسرے کلمات کے ساتھ مل کر معنی دیتا ہے۔

وَمِنْ خَوَاصِّهِ :

دُخُولُ اللَّامِ، وَالْجَرُّ، وَالتَّنْوِينُ، وَالْإِسْنَادُ إِلَيْهِ، وَالْإِضَافَةُ.

ترجمہ :اور اسم کی خاصیتوں میں سے یہ ہیں :لام کا داخل ہونا، جرّ (زیر)، تنوین، اس کی طرف اسناد کیا جانا اور اضافت۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، اس عبارت میں اسم کی چند نمایاں خصوصیات بیان فرمارہے ہیں جن سے اسم کو فعل اور حرف سے ممتاز کیا جاسکتا ہے۔آپؒ فرماتے ہیں کہ اسم کی پہچان کے لیے چند علامات ہیں، جن میں سے اہم یہ ہیں:

دخولُ اللّامِ (لام کا داخل ہونا) :

اسم کی خاصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس پر حرف تعریف "اَلْ" (لام) داخل ہو سکتا ہے۔ یہ لام کسی اسم کو خاص (معرفہ) بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فعل اور حرف پر عموماً یہ لام داخل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لفظ "رَجُلٌ" (ایک آدمی) نکرہ (عام) ہے، لیکن جب اس پر "اَلْ" داخل کر دیا جائے تو "اَلرَّجُلُ" (وہ خاص آدمی) بن جاتا ہے اور معرفہ ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "رَجُلٌ" اسم ہے۔ افعال جیسے "ذَہَبَ" یا حروف جیسے "فِي" پر "اَلْ" داخل نہیں ہو سکتا، جیسے "اَلْذَهَبَ" یا "اَلْفِي" کہنا درست نہیں ہے۔

اَلْجَرُّ (جرّ) :

اسم کی دوسری خاصیت جرّ ہے، جس کا مطلب ہے زیر کی حرکت کا آنا۔ اسم پر حروفِ جارّہ (جیسے مِنْ، إِلَى، عَنْ، عَلَى، فِي، بِ، لِ، كَ) داخل ہونے کی وجہ سے یا اضافت کی وجہ سے آخر میں زیر آتا ہے۔ فعل پر کبھی بھی جرّ نہیں آتا اور حروفِ جارّہ کے علاوہ دوسرے حروف بھی مجرور نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر "ذَهَبْتُ إِلَى الْمَسْجِدِ" (میں مسجد کی طرف گیا۔) یہاں "الْمَسْجِدِ" اسم ہے اور حرفِ جارّ "إِلَى" کی وجہ سے اس کے آخر میں زیر آیا ہے۔ فعل "ذَهَبْتُ" یا حرف "إِلَى" پر جرّ کی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔

اَلتَّنْوِينُ (تنوین) :

اسم کی تیسری خاصیت تنوین کا قبول کرنا ہے۔ تنوین سے مراد کسی اسم کے آخر میں دو زبر، دو زیر یا دو پیش کا آنا ہے۔ یہ علامت بھی عام طور پر اسم کے ساتھ خاص ہے اور فعل یا حرف پر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر "رَأَيْتُ وَلَدًا" (میں نے ایک لڑکا دیکھا)۔ یہاں "وَلَدًا" اسم ہے اور اس کے آخر میں دو زبر کی تنوین آئی ہے۔ فعل "رَأَيْتُ" یا حرف جیسے "فِي" پر تنوین نہیں آتی۔

اَلْإِسْنَادُ إِلَيْهِ (اس کی طرف اسناد کیا جانا) :

اسم کی چوتھی خاصیت یہ ہے کہ اس کی طرف اسناد کیا جا سکتا ہے۔ اسناد سے مراد کسی اسم کو مبتدا یا فاعل وغیرہ بنانا ہے جس کے ذریعے کوئی خبر دی جائے یا کوئی فعل سرزد ہو۔ فعل اپنی ذات میں کسی فاعل کا محتاج ہوتا ہے جبکہ اسم ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ

فعل اس کی طرف منسوب کیا جاسکے۔ مثال کے طور پر جملہ "زَيْدٌ قَائِمٌ" (زید کھڑا ہے) میں "قیام" کی اسناد "زید" کی طرف کی گئی ہے اور "زید" اسم ہے۔ اسی طرح "قَامَ زَيْدٌ" (زید کھڑا ہوا) میں فعل "قام" کی اسناد اسم "زید" کی طرف کی گئی ہے۔ حروف میں یہ خاصیت نہیں ہوتی کہ ان کی طرف کسی فعل یا خبر کی اسناد کی جاسکے۔

اَلْإِضَافَةُ (اضافت) :

اسم کی پانچویں خاصیت اضافت قبول کرنا ہے۔ اضافت سے مراد ایک اسم کا دوسرے اسم کے ساتھ اس طرح ملنا ہے کہ پہلے اسم کی نسبت دوسرے اسم کی طرف کی جائے۔ پہلا اسم مُضَاف کہلاتا ہے اور دوسرا اسم مُضَافٌ إِلَيْهِ کہلاتا ہے۔ فعل میں اضافت نہیں ہوتی اور حروف بھی مضاف واقع نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر "كِتَابُ زَيْدٍ" (زید کی کتاب)۔ یہاں "كِتَابُ" مضاف ہے اور "زَيْدٍ" مضافٌ إِلَيْهِ ہے۔ دونوں اسم ہیں۔

وَهُوَ مُعْرَبٌ وَمَبْنِيٌّ،

فَالْمُعْرَبُ :اَلْمُرَكَّبُ الَّذِي لَمْ يُشْبِهْ مَبْنِيَّ الْأَصْلِ. وَحُكْمُهُ أَنْ يَخْتَلِفَ آخِرُهُ بِاخْتِلَافِ الْعَوَامِلِ لَفْظًا أَوْ تَقْدِيرًا.

ترجمہ :اور اسم مُعرَب اور مَبْنِیّ ہوتا ہے۔ پس مُعرَب وہ مرکب ہے جو اصل کے مبنی کے مشابہ نہ ہو۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا آخری حرف عوامل کے اختلاف سے لفظاً یا تقدیراً بدلتا رہے۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے اسم کی ایک اور اہم تقسیم بیان فرما رہے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسم کی دو بنیادی حالتیں ہوتی ہیں :مُعرَب اور مَبْنِیّ۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ اسم یا تو مُعرَب ہوتا ہے یا مَبْنِیّ۔ اب ان دونوں کی تعریف اور وضاحت ملاحظہ ہو:

مُعرَب :

مصنفؒ کے مطابق مُعرَب وہ مرکب اسم ہے جو "مَبْنِيِّ الْأَصْلِ" کے مشابہ نہ ہو۔ یہاں "مَبْنِيِّ الأَصْلِ" سے مراد وہ کلمات ہیں جو اپنی اصل ساخت میں مبنی ہوتے ہیں، جیسے حروف اور فعل ماضی وامر حاضر۔ اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ مُعرَب اسم وہ ہے جو کسی مبنی کلمے کی طرح اپنی اصلی حالت پر جما ہوا نہ رہے بلکہ اس میں تبدیلی واقع ہو۔

غور کیا جائے تو مصنفؒ نے معرب کی دو شرائط ذکر کی ہیں

معرب کی پہلی شرط:

معرب کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ دوسرے کلمے کے ساتھ مرکّب ہو جیسے قام زیدٌ میں زید جب تک ترکیب میں ہے یہ معرب ہے کیونکہ معرب کی شرط پائی جارہی ہے اگر ترکیب ختم کر دی جائے تو اکیلا زید مبنی ہے کیونکہ جب شرط ختم ہو جاتی ہے تو مشروط بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اور قاعدہ مشہور ہے :اِذا فات الشرط فات المشروط۔

معرب کی دوسری شرط:

معرب کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مبنی الاصل کے مشابہ نہ ہو للذا جو بھی چیز ترکیب میں واقع ہو اور مبنی الاصل کے مشابہ ہو تو وہ بھی مبنی ہو گی معرب نہیں ہو گی جیسے هٰؤلاءِ قامَ هٰؤلاءِ میں یہاں اگرچہ هٰؤلاء ترکیب واقع ہے لیکن پھر بھی مبنی ہے کیونکہ دوسری شرط نہیں پائی جارہی ہے اور وہ مشروط ہے۔ مبنی الاصل کے مشابہ نہ ہونا اور ھٰؤلاء مبنی الاصل کے مشابہ ہے اس لیے ھٰؤلاء حرف کی طرح ہے اور جس طرح حرف دوسرے کلمہ کے ملائے بغیر اپنا معنی نہیں بتا سکتا اسی طرح اسم اشارہ بھی اپنا معنی مشار الیہ کے بغیر نہیں بتا سکتا تو جس طرح حرف ترکیب میں واقع ہونے کے باوجود مبنی ہوتا ہے اسی طرح ھٰؤلاء بھی ترکیب میں واقع ہونے کے باوجود مبنی ہی رہے گا۔ مبنی الاصل کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے۔

فائدہ؛

معرب کا دوسرا نام متمکن ہے تمکن کا معنی ہوتا ہے جگہ دینا چونکہ اسم معرب رفع، نصب، جر اور تنوین کو جگہ دیتا ہے اس وجہ سے اس کو اسم متمکن بھی کہتے ہیں۔

معرب کا حکم؛

مصنفؒ مُعرَب اسم کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے آخری حرف میں عوامل کے اختلاف کی وجہ سے تبدیلی آتی ہے۔ یہ تبدیلی یا تو لفظاً ظاہری طور پر نظر آتی ہے، یا تقدیراً پوشیدہ ہوتی ہے اور صرف معنی کے اعتبار سے سمجھی جاتی ہے۔

لفظاً تبدیلی :

اس کا مطلب ہے کہ جب مُعرَب اسم پر مختلف عوامل (جیسے حروفِ جارّہ، حروفِ ناصبہ، حروفِ جازمہ، یا کسی جملے میں اس کی مختلف نحوی حیثیتیں جیسے فاعل، مفعول وغیرہ) داخل ہوتے ہیں تو اس کے آخری حرف کی حرکت (زبر، زیر، پیش) بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "زیدٌ" ایک مُعرَب اسم ہے۔ اگر اس سے پہلے حرفِ جارّ "بِ" آئے تو یہ "بِزیدٍ" (زید کے ساتھ) ہو جاتا ہے، جہاں آخر میں زیر کی حرکت ظاہر ہوئی۔ اسی طرح اگر یہ جملے میں مفعول بنے تو "رَأَيْتُ زَيْدًا" (میں نے زید کو دیکھا) ہو جائے گا، جہاں آخر میں زبر کی حرکت آئی۔ اور اگر فاعل بنے تو "جَاءَ زَيْدٌ" (زید آیا) ہوگا، جہاں آخر میں پیش کی حرکت ہے۔

تقدیراً تبدیلی :

اس کا مطلب ہے کہ بعض مُعرَب اسماء ایسے ہوتے ہیں جن کے آخر میں عوامل کے اختلاف کے باوجود ظاہری طور پر کوئی تبدیلی نہیں آتی، لیکن ان کی اعرابی حالت معنی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی پوشیدہ یا مقدر مانی جاتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، مثلاً اسم کے آخر میں الفِ مقصورہ یا یائے منقوطہ کا ہونا۔ مثال کے طور پر لفظ "فَتًى" (ایک نوجوان لڑکا)۔ اگرچہ اس پر کوئی بھی عامل آئے اس کی ظاہری شکل "فَتًى" ہی رہتی ہے، لیکن اس کی اعرابی حالت بدلی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔ جیسے "جَاءَ الْفَتَى" (نوجوان لڑکا آیا) میں یہ فاعل ہے اور مرفوع تقدیری ہے، "رَأَيْتُ الْفَتَى" (میں نے نوجوان لڑکے کو دیکھا) میں یہ

مفعول ہے اور منصوب تقدیری ہے، اور "مَرَرْتُ بِالْفَتٰی" (میں نوجوان لڑکے کے پاس سے گزرا) میں یہ مجرور تقدیری ہے۔

[الإعراب]

الْإِعْرَابُ :مَا اخْتَلَفَ آخِرُهُ بِهِ لِيَدُلَّ عَلَى الْمَعَانِي الْمُعْتَوِرَةِ عَلَيْهِ. وَأَنْوَاعُهُ :رَفْعٌ، وَنَصْبٌ، وَجَرٌّ. فَالرَّفْعُ :عَلَمُ الْفَاعِلِيَّةِ، وَالنَّصْبُ :عَلَمُ الْمَفْعُولِيَّةِ، وَالْجَرُّ :عَلَمُ الْإِضَافَةِ. وَالْعَامِلُ :مَا بِهِ يَتَقَوَّمُ الْمَعْنَى الْمُقْتَضِي لِلْإِعْرَابِ.

ترجمہ :اعراب :وہ (تبدیلی) ہے جس کی وجہ سے کسی کلمے کا آخری حرف بدلتا ہے تاکہ ان معانی پر دلالت کرے جو اس اسم پر اس (تبدیلی) کی وجہ سے پے در پے آتی ہیں۔ اور اس کی اقسام ہیں :رفع، نصب اور جرّ۔ پس رفع فاعلیت کی علامت ہے، اور نصب مفعولیت کی علامت ہے، اور جرّ اضافت کی علامت ہے۔ اور عامل وہ (چیز) ہے جس کے ذریعے اس معنی کی بنیاد رکھی جاتی ہے جو اعراب کا تقاضا کرتا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے علم نحو کے ایک انتہائی اہم مبحث، یعنی اعراب کی تعریف اور اس کی اقسام بیان فرما رہے ہیں۔

اعراب کی تعریف:

آپؒ فرماتے ہیں کہ اعراب سے مراد وہ تبدیلی ہے جو کسی مُعرَب کلمے کے آخری حرف میں رونما ہوتی ہے، اور اس تبدیلی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اس کلمے کے مختلف معانی اور نحوی وظائف کو واضح کیا جاسکے۔ یعنی اس آخری حرف کی حرکت یا تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کلمہ فاعل ہے، مفعول ہے، مضاف الیہ ہے، یا کسی اور اعرابی حالت میں ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس تبدیلی کے ذریعے ان معانی پر دلالت کی جاتی ہے جن پر اس تبدیلی کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ گویا اعراب ایک نشانی ہے جو کلمے کے معنی اور اس کے مقام کو جملے میں متعین کرتی ہے۔

اعراب کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اعراب بالحرکت جیسے ضمّہ، فتحہ، کسرہ :زبر، زیر، پیش جس کو کہتے ہیں۔

(۲) اعراب بالحرف جیسے واوٗ، الف، یاؔ۔

پہلی قسم کی مثال یعنی اعراب بالحرکت کی مثال:

جَاءَ زَيْدٌ، رَأَيْتُ زَيْدًا، مَرَرْتُ بِزَيْدٍ۔ پہلی صورت میں رفع ہے۔ دوسری صورت میں نصب ہے۔ تیسری صورت میں جر ہے۔

دوسری قسم کی مثال یعنی اعراب بالحرف کی مثال:

جاء ابوك، رأيت اباك، مررتُ بابيك اعراب واوٗ، الفؔ اور یؔ کے ساتھ ہے۔

اسم کے اعراب کی اقسام؛

پھر مصنفؒ اسم کے اعراب کی بنیادی اقسام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اعراب کی تین اہم قسمیں ہیں :رفع، نصب اور جر۔

رفع :

مصنفؒ کے مطابق رفع فاعلیت کی علامت ہے۔ جب کوئی اسم جملے میں فاعل (کام کرنے والا) یا اس کے قائم مقام (جیسے نائب فاعل) کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کی اعرابی حالت رفع ہوتی ہے، جس کی ظاہری علامت عام طور پر پیش (ضمہ) ہوتی ہے۔ جیسے "جَاءَ زَيْدٌ" (زید آیا)، یہاں "زید" فاعل ہے اور مرفوع ہے۔

نصب :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ نصب مفعولیت کی علامت ہے۔ جب کوئی اسم جملے میں مفعول بہ (جس پر کام کا اثر واقع ہو) یا اس کی طرح کوئی اور منصوب چیز ہو تو اس کی اعرابی حالت نصب ہوتی ہے، جس کی ظاہری علامت عام طور پر زبر (فتحہ) ہوتی ہے۔ جیسے "رَأَيْتُ زَيْدًا" (میں نے زید کو دیکھا)، یہاں "زیدًا" مفعول بہ ہے اور منصوب ہے۔

جرّ :

مصنفؒ کے نزدیک جرّ اضافت کی علامت ہے۔ یہاں "اضافت" سے مراد صرف مضاف الیہ نہیں بلکہ وہ تمام صورتیں مراد ہیں جن میں اسم مجرور ہوتا ہے، جیسے حروفِ جارّہ کے بعد آنے والا اسم۔ تو جب کوئی اسم کسی حرفِ جارّہ کے بعد آئے یا کسی اسم کی طرف مضاف ہو تو اس کی اعرابی حالت جرّ ہوتی ہے، جس کی ظاہری علامت عام طور پر زیر (کسرہ) ہوتی ہے۔ جیسے "مَرَرْتُ بِزَيْدٍ" (میں زید کے پاس سے گزرا)، یہاں "زیدٍ" حرفِ جارّ "بِ" کی وجہ سے مجرور ہے۔ اور "كِتَابُ زَيْدٍ" (زید کی کتاب) میں "زیدٍ" مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

عامل کی تعریف؛

آخر میں مصنفؒ عامل کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عامل وہ قوت یا اثر ہے جس کی وجہ سے کسی کلمے میں اعراب کی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یعنی یہ وہ نحوی سبب ہے جو کسی اسم کو رفع، نصب یا جرّ کی حالت میں لے کر آتا ہے۔ مثال کے طور پر جملہ "جَاءَ زَيْدٌ" میں فعل "جاءَ" اسم "زید" کے لیے رفع کا عامل ہے کیونکہ اسی فعل کی وجہ سے "زید" فاعل بن کر مرفوع ہوا ہے۔ اسی طرح "رَأَيْتُ زَيْدًا" میں فعل "رأیت" اسم "زیدًا" کے لیے نصب کا عامل ہے کیونکہ اسی فعل کی وجہ سے "زیدًا" مفعول بن کر منصوب ہوا۔ اور "مَرَرْتُ بِزَيْدٍ" میں حرفِ جارّ "بِ" اسم "زیدٍ" کے لیے جرّ کا عامل ہے کیونکہ اسی حرف کی وجہ سے "زیدٍ" مجرور ہوا۔

فائدہ؛

کلام عرب میں معرب کی صرف دو قسمیں آتی ہیں: (۱) اسم متمکن جس کی تفصیل گزر گئی۔ (۲) فعل مضارع یہ بھی معرب ہوتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے جب یہ خالی ہو نون جمع مؤنث اور نون تاکید سے، جب یہ ان دونوں نونوں سے خالی ہو تو یہ معرب ہوتی ہے اور جب یہ دونوں نون ہوں تو پھر یہ مبنی ہوتی ہے۔ فعل مضارع کی تفصیل ان شاء اللہ آگے فعل کی بحث میں

آجائے گی۔

مفرد منصرف وجمع مکسر کااعراب

فَالْمُفْرَدُ الْمُنْصَرِفُ وَالْجَمْعُ الْمُكَسَّرُ الْمُنْصَرِفُ بِالضَّمَّةِ رَفْعًا، وَالْفَتْحَةِ نَصْبًا، وَالْكَسْرَةِ جَرًّا ۔

ترجمہ :پس مفرد مُنْصَرِف اور جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف، حالتِ رفعی میں ضمہ کے ساتھ، حالتِ نصبی میں فتحہ کے ساتھ، اور حالتِ جری میں کسرہ کے ساتھ (معرب ہوتے ہیں)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے مُعرب اسماء کی اعرابی علامات بیان فرمارہے ہیں۔

کتاب کی باتین سمجھنے سے پہلے دو باتیں سمجھ لیں :

پہلی بات : کیفیت کے اعتبار سے اعراب کی چار قسمیں ہیں :

نمبر(۱) اعراب لفظی۔ نمبر(۲) اعراب تقدیری۔ نمبر(۳) اعراب محلّی۔ نمبر(۴) اعراب حکائی۔

اعراب لفظی کی تعریف:

اعراب لفظی وہ ہے جو اعراب لفظًا موجود ہو جیسے جاءَ زیدٌ، رَأَیْتُ زیدًا، مَرَرْتُ بزیدٍ۔ زید پر تینوں اعراب لفظًا موجود ہیں۔

اعراب تقدیری کی تعریف :

اعراب تقدیری وہ ہے جو لفظًا موجود نہ ہو تقدیرًا موجود ہو۔ جیسے جاءَ موسٰی، رَأَیْتُ موسٰی، مَرَرْتُ بموسٰی، موسیٰ پر تینوں اعراب تقدیری ہیں۔

اعراب محلّی کی تعریف:

اعراب محلّی وہ ہے جو مبنی پر آتا ہے اس حیثیت سے کہ اگر وہاں لفظ معرب ہوتا تو اعراب لفظی ہوتا۔ جیسے :جاءَ هٰؤُلَاءِ، رأیت هٰؤُلَاءِ، مررت هٰؤُلَاءِ۔ هٰؤُلَاءِ پر تینوں حالتوں میں اعراب محلّی ہے اگر هٰؤلاءِ کی جگہ معرب ہوتا تو اعراب لفظی ہوتا۔

اعراب حکائی کی تعریف :

اعراب حکائی وہ ہے جو ایسے کلمے پر آتا ہے جس کو کلام سے اُٹھا کر دوسرے کلام میں اسی حالت کے ساتھ ذکر کیا جائے جس حالت میں وہ پہلے تھا۔ جیسے نحو زید فی قام زیدٌ۔

دوسری بات :...اعراب کے اعتبار سے اسم کی تین حالتیں ہیں :

پہلی حالت :

...حالت رفعی، جب اسم مرفوعات میں ہو یا مرفوع کا تابع ہو۔

دوسری حالت :

...حالتِ نصبی، جب اسم منصوبات میں سے ہو یا منصوب کا تابع ہو۔

تیسری حالت:

...حالتِ جری، جب اسم مجرورات میں سے ہو یا مجرور کا تابع ہو۔

فَالْمُفْرَدُ الْمُنْصَرِفُ وَالْجَمْعُ الْمُكَسَّرُ الْمُنْصَرِفُ الخ

آپؒ فرماتے ہیں کہ مفرد مُنْصَرِف اور جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف تین اعرابی حالتوں میں کس طرح ظاہر ہوتے ہیں:

مفرد مُنْصَرِف :

اس سے مراد وہ واحد اسم ہے جو غیر منصرف (یعنی غیر متمکن) نہ ہو۔

"مُنْصَرِف" کا مطلب ہے جو تنوین کو قبول کرے اور جس پر اعرابی حرکات (ضمہ، فتحہ، کسرہ) بآسانی ظاہر ہو سکیں۔

جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف :

اس سے مراد وہ اسم ہے جو جمع ہو اور اس کی واحد کی صورت ٹوٹ چکی ہو جیسے رجل سے رجال اور وہ منصرف بھی ہو۔ مصنفؒ ان دونوں اقسام کے اسماء کی اعرابی علامات اس طرح بیان فرماتے ہیں:

بِالضَّمَّةِ رَفْعًا (حالتِ رفعی میں ضمہ کے ساتھ): جب کوئی مفرد مُنْصَرِف یا جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف حالتِ رفعی میں ہو، جیسے فاعل یا مبتدا وغیرہ، تو اس کے آخر میں ضمہ (پیش) کی حرکت آتی ہے۔ مثال کے طور پر "جَاءَ رَجُلٌ" (ایک آدمی آیا) میں "رَجُلٌ" مفرد مُنْصَرِف ہے اور فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اس لیے اس کے آخر میں ضمہ ہے۔ اسی طرح "جَاءَ رِجَالٌ" (کچھ آدمی آئے) میں "رِجَالٌ" جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف ہے اور فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اس لیے اس کے آخر میں ضمہ ہے۔

وَالْفَتْحَةِ نَصْبًا (حالتِ نصبی میں فتحہ کے ساتھ): جب یہی اسماء حالتِ نصبی میں ہوں، جیسے مفعول بہ وغیرہ، تو ان کے آخر میں فتحہ (زبر) کی حرکت آتی ہے۔ مثال کے طور پر "رَأَيْتُ رَجُلًا" (میں نے ایک آدمی دیکھا) میں "رَجُلًا" مفرد مُنْصَرِف ہے اور مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس لیے اس کے آخر میں فتحہ ہے۔ اسی طرح "رَأَيْتُ رِجَالًا" (میں نے کچھ آدمی دیکھے) میں "رِجَالًا" جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف ہے اور مفعول بہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اس لیے اس کے آخر میں فتحہ ہے۔

وَالْكَسْرَةِ جَرًّا (حالتِ جری میں کسرہ کے ساتھ): جب یہ اسماء حالتِ جری میں ہوں، جیسے کسی حرفِ جارہ کے بعد یا مضاف الیہ بن کر، تو ان کے آخر میں کسرہ (زیر) کی حرکت آتی ہے۔ مثال کے طور پر "مَرَرْتُ بِرَجُلٍ" (میں ایک آدمی کے پاس سے گزرا) میں "رَجُلٍ" مفرد مُنْصَرِف ہے اور حرفِ جارّ "بِ" کی وجہ سے مجرور ہے، اس لیے اس کے آخر میں کسرہ ہے۔ اسی طرح "نَظَرْتُ إِلَى رِجَالٍ" (میں نے کچھ آدمیوں کی طرف دیکھا) میں "رِجَالٍ" جمعِ مُکَسَّر مُنْصَرِف ہے اور حرفِ جارّ "إِلَى" کی وجہ سے مجرور ہے، اس لیے اس کے آخر میں کسرہ ہے۔

جمع مؤنث سالم کا اعراب

جَمْعُ الْمُؤَنَّثِ السَّالِمِ بِالضَّمَّةِ وَالْكَسْرَةِ.

ترجمہ : جمع مؤنث سالم ضمہ کے ساتھ (حالتِ رفعی میں) اور کسرہ کے ساتھ (حالتِ نصبی اور جری میں معرب ہوتا ہے)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے جمع مؤنث سالم کے اعرابی علامات بیان فرما رہے ہیں۔

جمع مؤنث سالم کی تعریف:

جمع مؤنث سالم سے مراد وہ جمع ہے جو مؤنث اسماء کی باقاعدہ قاعدے کے مطابق آخر میں "ات" (تاء مفتوحہ کے ساتھ الف) کا اضافہ کرکے بنائی جاتی ہے اور اس میں واحد کا صیغہ سلامت رہتا ہے (یعنی اس کی بنیادی ساخت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آتی)۔ جیسے "مُسْلِمَةٌ" (ایک مسلمان عورت) سے "مُسْلِمَاتٌ" (کئی مسلمان عورتیں)۔

مصنفؒ جمع مؤنث سالم کی اعرابی حالتیں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

بِالضَّمَّةِ (ضمہ کے ساتھ) :

جمع مؤنث سالم حالتِ رفعی میں ضمہ (پیش) کے ساتھ معرب ہوتا ہے۔ جب یہ کسی جملے میں فاعل، مبتدا یا خبر وغیرہ کے طور پر آئے تو اس کے آخر میں ضمہ کی حرکت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "جاءتنی مسلماتٌ،" (مسلمان عورتیں آئیں)۔ یہاں "مسلماتٌ" فاعل ہے اور مرفوع ہے، اس لیے اس کے آخر میں ضمہ ہے۔

بِالْكَسْرَةِ (کسرہ کے ساتھ) :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جمع مؤنث سالم حالتِ نصبی اور حالتِ جری دونوں میں کسرہ (زیر) کے ساتھ معرب ہوتا ہے۔ یہ اس کی ایک خاص علامت ہے کیونکہ عام طور پر حالتِ نصبی میں فتحہ (زبر) آتا ہے۔ حالتِ نصبی میں : جب جمع مؤنث سالم کسی جملے میں مفعول بہ کے طور پر آئے تو اس کے آخر میں کسرہ آتا ہے۔ مثال کے طور پر "رَأَيْتُ مسلماتٍ" (میں نے مسلمان عورتوں کو دیکھا)۔ یہاں "مسلماتٍ" مفعول بہ ہے اور منصوب ہے، لیکن اس کی علامت کسرہ ہے۔

حالتِ جری میں :

جب جمع مؤنث سالم کسی حرفِ جارّہ کے بعد آئے یا مضاف الیہ بنے تو اس کے آخر میں بھی کسرہ ہی آتا ہے۔ مثال کے طور پر "مررت بمسلماتٍ" (میں مسلمان عورتوں پر گزرا)۔ یہاں "بمسلماتٍ" حرفِ جارّ "ب" کی وجہ سے مجرور ہے اور اس کی علامت کسرہ ہے۔

فائدہ :

عبارت کے اندر جمع مؤنث کے بعد سالم کی قید ہے تو یاد رکھیں یہ جمع کی صفت ہے مؤنث کی صفت نہیں۔ یعنی ایسی جمع جس میں جمع بناتے وقت واحد کا وزن سلامت رہے۔

غیر منصرف کا اعراب

غَيْرُ الْمُنْصَرِفِ بِالضَّمَّةِ وَالْفَتْحَةِ.

ترجمہ :غیر منصرف ضمہ کے ساتھ (حالتِ رفعی میں) اور فتحہ کے ساتھ (حالتِ نصبی اور جری میں معرب ہوتا ہے)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف اسماء کے اعرابی علامات بیان فرمارہے ہیں۔

غیر منصرف کی تعریف

غیر منصرف وہ اسم ہے کہ اسباب منع صرف میں سے کوئی دو ۲

سبب ہوں یا ایک ایسا سبب اس میں پایا جائے جو دو کے قائم مقام ہو۔ جیسے :عُمَرُ جَاءَنِيْ عُمَرُ وَرَأَيْتُ عمرَ وَمَرَرْتُ بِعُمَرَ۔
غیر منصرف سے مراد وہ اسم ہے جو تنوین کو قبول نہ کرے اور نہ ہی اس پر حالتِ جری میں کسرہ آئے، بلکہ فتحہ کے ساتھ مجرور ہو۔ غیر منصرف ہونے کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں جن کا ذکر نحو کی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہے۔ عام طور پر یہ اسماء کسی وصف یا کسی خاص نام کی وجہ سے غیر منصرف ہوتے ہیں۔ جیسے انبیاء کے اکثر نام، غیر عربی نام، بعض خاص اوزان پر بنے ہوئے اسماء وغیرہ (تفصیل آگے آرہی ہے)۔

مصنفؒ غیر منصرف اسم کی اعرابی حالتیں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

بِالضَّمَّةِ (ضمہ کے ساتھ) :غیر منصرف اسم حالتِ رفعی میں ضمہ (پیش) کے ساتھ معرب ہوتا ہے۔ جب یہ کسی جملے میں فاعل، مبتدا یا خبر وغیرہ کے طور پر آئے تو اس کے آخر میں ضمہ کی حرکت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "جَاءَ إِبْرَاهِيمُ" (ابراہیم آئے)۔ یہاں "إِبْرَاهِيمُ" غیر منصرف اسم ہے اور فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، اس لیے اس کے آخر میں ضمہ ہے۔

بِالْفَتْحَةِ (فتحہ کے ساتھ) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ غیر منصرف اسم حالتِ نصبی اور حالتِ جری دونوں میں فتحہ (زبر) کے ساتھ معرب ہوتا ہے۔ یہ اس کی ایک خاص علامت ہے جو اسے منصرف اسماء سے ممتاز کرتی ہے۔ حالتِ نصبی میں :جب غیر منصرف اسم کسی جملے میں مفعول بہ کے طور پر آئے تو اس کے آخر میں فتحہ آتا ہے۔ مثال کے طور پر "رَأَيْتُ إِبْرَاهِيمَ" (میں نے ابراہیم کو دیکھا)۔ یہاں "إِبْرَاهِيمَ" مفعول بہ ہے اور منصوب ہے، اور اس کی علامت فتحہ ہے۔

حالتِ جری میں :

جب غیر منصرف اسم کسی حرفِ جارّہ کے بعد آئے یا مضاف الیہ بنے تو اس کے آخر میں کسرہ کی بجائے فتحہ آتا ہے۔ مثال کے طور پر "مَرَرْتُ بِإِبْرَاهِيمَ" (میں ابراہیم کے پاس سے گزرا)۔ یہاں "إِبْرَاهِيمَ" حرفِ جارّ "بِ" کی وجہ سے مجرور ہے، لیکن اس کی علامت فتحہ ہے۔

اس اعراب کو غیر منصرف کے ساتھ خاصکرنے کی وجہ :

غیر منصرف اکثر مفرد ہوتا ہے اور مفرد کا اعراب بالحرکت ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غیر منصرف فعل کے مشابہ ہوتا ہے اور فعل میں دو ۲

چیزیں ہوتی ہیں :(۱) یہ کہ فعل کا مصدر سے مشتق ہونا۔(۲) فعل کا فاعل کا محتاج ہونا۔ تو جس طرح فعل پر کسرہ اور تنوین نہیں آسکتے اسی طرح غیر منصرف پر بھی کسرہ اور تنوین نہیں آسکتے۔

اسمائے ستہ کا اعراب

(أَخُوكَ)،وَ(أَبُوكَ)،وَ(حَمُوكَ)،وَ(هَنُوكَ)،وَ(فُوكَ)،وَ(ذُومَالٍ)،مُضَافَةً إِلَى غَيْرِ يَاءِ الْمُتَكَلِّمِ،بِالْوَاوِ،وَالْأَلِفِ،وَالْيَاءِ .

ترجمہ :(جیسے) آپ کا بھائی، اور آپ کا باپ، اور آپ کا سُسر، اور آپ کا فلاں، اور آپ کا منہ، اور مال والا، جب کہ وہ یائے متکلم کے علاوہ کسی اور کی طرف مضاف ہوں، تو یہ واو، الف اور یاء کے ساتھ (معرب ہوتے ہیں)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے ان خاص اسماء کا ذکر فرمارہے ہیں جنہیں علم نحو میں "الأسماء الخمسة" (پانچ اسماء) یا "الأسماء الستة" (چھ اسماء) کہا جاتا ہے۔ آپؒ یہاں پانچ اسماء کا ذکر فرمارہے ہیں اور "ذُومالٍ" کو بھی ان کے حکم میں بیان کررہے ہیں۔

ان کا اعراب بالحرف ہوتا ہے یعنی حالت رفعی واؤ کے ساتھ حالت نصبی الف کے ساتھ حالت جری یاء کے ساتھ جیسے

جَاءَنِي أَخُوكَ رَأَيْتُ أَخَاكَ مَرَرْتُ بِأَخِيكَ .

اور یہ اعراب بالحرف لفظی خاص ہے اسمائے ستہ کے ساتھ جب اس میں چار شرائط پائی جائیں

پہلی شرط:

مکبّرہ ہوں کیونکہ اگر مکبّرہ نہ ہوں بلکہ مصغرہ ہوں تو اس کا اعراب مفرد منصرف صحیح والا ہوگا جیسے:

جَاءَنِي أُخَيُّكَ رَأَيْتُ أُخَيَّكَ مَرَرْتُ بِأُخَيِّكَ .

دوسری شرط:

موحدہ ہوں کیونکہ اگر واحد نہ ہو بلکہ تثنیہ اور جمع ہوں تو اس کا اعراب تثنیہ اور جمع والا ہوگا جیسے :

تثنیہ کی مثال:

جَاءَنِي أَبَوَانِ رَأَيْتُ أَبَوَيْنِ مَرَرْتُ بِأَبَوَيْنِ.

جمع کی مثال:

جَاءَنِي آبَاءٌ رَأَيْتُ آبَاءً مَرَرْتُ بِآبَاءٍ.

تیسری شرط:

مضاف ہوں کیونکہ اگر یہ اسمائے ستہ مضاف نہ ہو تو ان کا اعراب اسم مفرد منصرف صحیح والا ہوگا۔ جیسے:

جَاءَنِي أَبٌ رَأَيْتُ أَبًا مَرَرْتُ بِأَبٍ.

چوتھی شرط:

یائے متکلم کے علاوہ کی طرف مضاف ہوں۔

کیونکہ اگر یہ اسماء یائے متکلم کی طرف مضاف ہوں گے تو تینوں حالتوں میں ان کا اعراب تقدیری ہو جیسے:

جَاءَنِیْ اَبِیْ رَأَیْتُ اَبِیْ مَرَرْتُ بِاَبِیْ۔

جب یہ اُوپر کی مذکورہ چاروں شرائط موجود ہوں تو اعراب اس طرح آئے گا حالتِ رفعی واو کے ساتھ حالتِ نصبی الف کے ساتھ حالت جری یاء کے ساتھ۔

سب کی مثالیں یہ ہیں:

(۱)...اَبٌ جَاءَنِیْ اَبُوْكَ رَأَیْتُ أَبَاكَ مَرَرْتُ بِأَبِیْكَ۔

(۲)...اَخٌ جَاءَنِیْ اَخُوْكَ رَأَیْتُ أَخَاكَ مَرَرْتُ بِأَخِیْكَ۔

(۳)...حَمٌ جَاءَنِیْ حَمُوْكَ رَأَیْتُ حَمَاكِ مَرَرْتُ بِحَمِیْكِ۔

(۴)...اَهَنٌ جَاءَنِیْ هَنُوْكَ رَأَیْتُ هَنَاكَ مَرَرْتُ بِهَنِیْكَ۔

(۵)...فَمٌ جَاءَنِیْ فُوْكَ رَأَیْتُ فَاكَ مَرَرْتُ بِفِیْكَ۔

(۶)...ذُوْمَالٍ: جَاءَنِیْ ذُوْمَالٍ، رَأَیْتُ ذَامَالٍ مَرَرْتُ بِذِیْ مَالٍ۔

تثنیہ وملحق بالتثنیہ کا اعراب

اَلْمُثَنّٰی، وَ(كِلَا) مُضَافًا إِلٰی مُضْمَرٍ، وَ(اثْنَانِ)، بِالْأَلِفِ وَالْیَاءِ۔

ترجمہ: تثنیہ، اور (کِلَا) جب ضمیر کی طرف مضاف ہو، اور (اثْنَانِ) (یہ سب) الف اور یاء کے ساتھ (معرب ہوتے ہیں)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے اسم کے اعراب کی پانچویں قسم کو بیان کیا ہے کہ حالت رفعی الف کے ساتھ اور حالت نصبی وجری یاء ما قبل مفتوح کے ساتھ اور نون مفتوح آئے کے ساتھ اور یہ اعراب خاص ہیں تثنیہ اور ملحق بتثنیہ کے ساتھ۔

تثنیہ کی تعریف:

تثنیہ اس اسم کو کہتے ہیں جو دو پر دلالت کرے اور جس کے واحد کے صیغے میں الف اور نون مکسور یا یاء ساکن ما قبل مفتوح اور نون مکسور کا اضافہ کیا گیا ہو جیسے رَجُلٌ سے رَجُلَانِ اور رَجُلَیْنِ۔

ملحق بتثنیہ کی تعریف:

ملحق بتثنیہ اس اس کو کہتے ہیں جو دو پر دلالت کرے یعنی معنی تثنیہ والا ہو مگر اس کا واحد نہ ہو یا اگر ہو تو اس لفظ سے نہ ہو۔ جیسے

کِلَا اور اثنان، اثنتانِ۔

اس عبارت میں صاحب کتاب نے تثنیہ کی تین قسمیں ذکر کی ہیں۔

(ا)۔مثنی۔ (۲)۔کلا۔ (۳)اثنان اثنتان۔

کہ تثنیہ کی تین صورتیں ہیں: (ا) حقیقی۔ (۲) معنوی۔ (۳) صوری۔

پہلی قسم تثنیہ حقیقی:

یہ ہے کہ لفظ اور معنی دونوں تثنیہ کا ہو یعنی اس لفظ سے اس کا مفرد موجود ہو جیسے رَجُلٌ سے رَجُلَانِ اور رَجُلَیْنِ۔

دوسری قسم تثنیہ معنوی:

یہ ملحق بتثنیہ ہے یعنی معنی تو تثنیہ والا ہو لیکن صورت تثنیہ والی نہ ہو جیسے کِلَا کہ اس کی نہ ہی صورت تثنیہ والی ہے اور نہ ہی اس کا مفرد موجود ہے۔

تیسری قسم تثنیہ صوری:

یہ ہے کہ لفظ اور معنی دونوں تثنیہ کے ہوں لیکن اس کا مفرد مِنْ غَیْرِ لَفْظِهٖ ہو اس لفظ سے نہ ہو بلکہ دوسرے الفاظ میں ہو جیسے اِثْنَانِ اِثْنَتَانِ کہ اس کا مفرد اِثْنٌ اور اِثْنَةٌ نہیں آتا بلکہ وَاحِدٌ اور وَاحِدَةٌ آتا ہے۔

(کِلَا) مُضَافًا اِلٰی مُضْمَرٍ،

فائدہ:

صاحبِ کتاب نے کِلَا مُضَافًا اِلٰی مُضْمَرٍ فرمایا کہ کِلَا اور کِلْتَا مضاف ہوں ضمیر کی طرف کیونکہ اگر یہ ضمیر کی طرف مضاف نہ ہوں گے تو ان کا اعراب تینوں میں تقدیری ہو گا جیسے:

جَآءَنِیْ کِلَا الرَّجُلَانِ رَأَیْتُ کِلَا الرَّجُلَیْنِ مَرَرْتُ بِکِلَا الرَّجُلَیْنِ۔

اعراب ہے لیکن تینوں حالتوں میں تقدیری ہے۔

تثنیہ حقیقی معنوی اور صوری کی امثلہ

حالتِ رفعی:

...جَآءَنِی الرَّجُلَانِ وَکِلَاهُمَا وَاِثْنَانِ وَاِثْنَتَانِ۔

حالتِ نصبی:

...رَأَیْتُ الرَّجُلَیْنِ کِلَیْهِمَا وَاِثْنَیْنِ وَاِثْنَتَیْنِ۔

حالتِ جری:

...مَرَرْتُ بِالرَّجُلَیْنِ کِلَیْهِمَا اِثْنَیْنِ وَاِثْنَتَیْنِ۔

جمع مذکر سالم وملحق باجمع کا اعراب

جَمْعُ الْمُذَكَّرِ السَّالِمُ، وَ (أُولُو)، وَ (عِشْرُونَ) وَأَخَوَاتُهَا، بِالْوَاوِ وَالْيَاءِ.

ترجمہ :جمع مذکر سالم، اور (اُولُو)، اور (عِشْرُونَ) اور اس کے مانند (الفاظ)، واو اور یاء کے ساتھ (معرب ہوتے ہیں)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سے اسم کے اعراب کی چھٹی قسم کو بیان فرمایا۔ جمع مذکر سالم اور ملحق بجمع مذکر سالم کا اعراب یہ ہے کہ رفع واو ما قبل مضموم کے ساتھ اور نصب وجر یاء ما قبل مکسور کے ساتھ۔

جمع مذکر سالم کی تعریف:

جمع اس اسم کو کہا جاتا ہے جو دو ۲ سے زیادہ پر دلالت کرے اور جمع بنتی ہے واحد کے صیغے میں تبدیلی کرکے یعنی واحد کے صیغے کے آخر میں واو ساکن ما قبل مضموم یا یاء ساکن ما قبل مکسور اور نون مفتوح کا اضافہ کرنے سے بنتی ہے۔ لیکن واحد کا صیغہ بھی سلامت رہے جمع بناتے وقت جیسے مُسْلِمٌ سے مُسْلِمُوْنَ اور مُسْلِمِیْنَ.

ملحق بجمع مذکر سالم کی تعریف:

ملحق بجمع مذکر سالم وہ اسم ہے کہ لفظ جمع کا نہ ہو لیکن معنی جمع کا ہو۔ اور اس کا مفرد یا تو موجود ہی نہ ہو یا اگر ہو تو اس لفظ سے نہ ہو بلکہ مِنْ غَیْرِ لَفْظِہٖ ہو۔ جیسے اُولُوْا اور عِشْرُوْنَ سے تِسْعُوْنَ تک۔

جَمْعُ الْمُذَكَّرِ السَّالِمُ، وَ (أُولُو)، وَ (عِشْرُونَ) وَأَخَوَاتُهَا

اس عبارت میں صاحب کتاب نے جمع کی تین قسموں کی طرف اشارہ فرمایا: (۱) جمع حقیقی۔ (۲) جمع صوری۔ (۳) جمع معنوی۔

جمع حقیقی کی تعریف:

جمع حقیقی وہ اسم ہے جس کا لفظ اور معنی دونوں جمع کے ہوں اور مفرد کا صیغہ اسی مادہ سے موجود ہو جیسے مُسْلِمٌ سے مُسْلِمُوْنَ ۔

جمع صوری کی تعریف:

جمع صوری وہ اسم ہے کہ اس کی صورت جمع والی ہو معنی جمع والا نہ ہو اور نہ اس مادہ سے اس کا مفرد موجود ہو جیسے عِشْرُوْنَ کہ اس کا مفرد ہے ہی نہیں۔

جمع معنوی کی تعریف:

جمع معنوی وہ اسم ہے کہ لفظ تو جمع کا نہ ہو لیکن معنی جمع کے ہوں اور اس کا مفرد مِنْ غَیْرِ لَفْظِہٖ ہو جیسے اُولُوْ کہ اس کا مفرد ذُوْ ہے۔

مثالیں

حالتِ رفعی :

...جَآءَنِیْ مُسْلِمُوْنَ وَعِشْرُوْنَ وَاُولُوْ مَالٍ۔

حالتِ نصبی:

...وَرَأَیْتُ مُسْلِمِیْنَ وَعِشْرِیْنَ وَاُولِیْ مَالٍ۔

حالت جری:

...وَمَرَرْتُ بِمُسْلِمِیْنَ وَعِشْرِیْنَ وَأُولِیْ مَالٍ۔

اعراب تقدیری ولفظی

اَلتَّقْدِیْرُ فِیْمَا تَعَذَّرَ کَـ(عَصَا)، وَ(غُلَامِیْ) مُطْلَقًا، أَوِ اسْتُثْقِلَ کَـ(قَاضٍ) رَفْعًا وَجَرًّا، وَنَحْوُ (مُسْلِمِیْ) رَفْعًا، وَاللَّفْظِیُّ فِیْمَا عَدَاهُ.

ترجمہ: تقدیری (اعراب) ان (اسماء) میں ہوتا ہے جن میں (اعراب کا ظاہر ہونا) متعذر ہو، جیسے (عَصَا) (لاٹھی)، اور (غُلَامِیْ) (میرا غلام) مطلقًا (یعنی تمام حالتوں میں)، یا (جن میں اعراب کا ظاہر ہونا) مستثقل ہو، جیسے (قَاضٍ) (قاضی) حالتِ رفعی اور جری میں، اور جیسے (مُسْلِمِیْ) (میرے مسلمان) حالتِ رفعی میں، اور لفظی (اعراب) اس کے علاوہ (دیگر تمام صورتوں میں ہوتا ہے)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے اعراب کی ایک اور اہم قسم بیان فرمارہے ہیں، اور وہ ہے اعرابِ تقدیری اور اس کے مقابلے میں اعرابِ لفظی۔آپؒ فرماتے ہیں کہ اعراب کی تبدیلی کبھی تو لفظوں میں ظاہر ہوتی ہے جسے اعرابِ لفظی کہتے ہیں، اور کبھی کسی وجہ سے ظاہری طور پر ظاہر نہیں ہوتی بلکہ مقدر مانی جاتی ہے جسے اعرابِ تقدیری کہتے ہیں۔

اعرابِ تقدیری :

مصنفؒ اعرابِ تقدیری کی دو بنیادی وجوہات بیان فرماتے ہیں:

تَعَذُّرْ (متعذر ہونا) :

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی حرف کا ایسا ہونا کہ اس پر حرکت کا ظاہر ہونا ممکن ہی نہ ہو۔ جیسے اسم کے آخر میں الف ماقبل مفتوح یا 'یا' ماقبل مکسور ہو۔

تینوں حالتوں میں اعراب بالحرکت تقدیری ہوگا یعنی ضمہ رفع تقدیری کے ساتھ فتحہ نصب تقدیری کے ساتھ اور کسرہ جر تقدیری کے ساتھ۔اور یہ اعراب اسم متمکن کی دو ۲ قسموں کو دیئے گئے ہیں:

(۱)...پہلی قسم اسم مقصور جیسے عصا۔

(۲)...دوسری قسم وہ اسم جو مضاف ہو یائے متکلم کی طرف اور جمع مذکر سالم کے علاوہ ہو جیسے غُلَامِیْ۔

اسم مقصورہ کی تعریف:

اسم مقصورہ وہ اسم ہے کہ اس کے آخر میں الف مقصورہ ہو چاہے لفظوں میں موجود ہو جیسے العصا معرف باللام یا لفظوں میں موجود نہ بلکہ تنوین کی صورت میں موجود ہو جیسے عَصًا۔

ان دونوں قسموں کا اعراب تینوں حالتوں میں تقدیری ہوگا

مثالیں یہ ہیں:

حالتِ رفعی:

...جَآءَنِیْ عَصَا وَغُلَامِیْ۔

حالتِ نصبی:

...وَرَأَیْتُ عَصَا وَغُلَامِیْ۔

حالتِ جری:

...وَمَرَرْتُ بِعَصًا وَغُلَامِیْ۔

اِسْتُثْقِلَ (ثقیل ہونا) :

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی حرف پر حرکت کا ظاہر ہونا قواعداً تو ممکن ہو لیکن زبان پر ثقیل اور دشوار محسوس ہو۔ اس کی مصنفؒ دو مثالیں دیتے ہیں:

(قَاضٍ) رَفْعًا وَجَرًّا، وَنَحْوُ (مُسْلِمِیْ)

کَ (قَاضٍ) رَفْعًا وَجَرًّا (جیسے (قَاضٍ) حالتِ رفعی اور جری میں) :لفظ (قَاضٍ) (قاضی) کے آخر میں یاء ہے جس سے پہلے زیر ہے۔ حالتِ رفعی میں اس پر پیش اور حالتِ جری میں اس پر زیر کا پڑھنا ثقیل محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے ان دو حالتوں میں اعراب تقدیری مانا جاتا ہے۔ البتہ حالتِ نصبی میں اس پر فتحہ پڑھنا آسان ہے، تو یہاں اعراب لفظی ہے۔

مثالیں

حالتِ رفعی:

...جَآءَنِیْ الْقَاضِیْ۔

حالتِ نصبی:

...رَأَیْتُ الْقَاضِیَ۔

حالتِ جری:

...مَرَرْتُ بِالْقَاضِیْ۔

وَنَحْوُ (مُسْلِمِیْ) رَفْعًا (اور جیسے (مُسْلِمِیْ) حالتِ رفعی میں) :

یہاں مصنفؒ یائے متکلم کی طرف مضاف ہونے والے جمع مذکر سالم کی مثال دے رہے ہیں۔

حالت رفعی واؤ تقدیری کے ساتھ ہو اور حالت نصبی و جری یاء لفظی کے ساتھ ہو اور یہ اعراب خاص ہیں جمع مذکر سالم کے ساتھ جب وہ مضاف ہو یائے متکلم کی طرف جیسے:

جَآءَنِیْ مُسْلِمِیَّ ،رَأَیْتُ مُسْلِمِیَّ ،مَرَرْتُ بِمُسْلِمِیَّ۔

حالتِ رفعی میں واو کی حرکت (پیش) کا یاء پر پڑھنا ثقیل محسوس ہوتا ہے، اس لیے یہاں رفع تقدیری مانا جاتا ہے۔ جیسے "جَاءَ مُسْلِمِی" میں "مُسْلِمِی" فاعل اور مرفوع تقدیری ہے۔ البتہ حالتِ نصبی اور جری میں اس کی صورت "مُسْلِمِیَّ" ہو جاتی ہے جہاں یاء پر فتحہ ظاہر ہوتا ہے، تو وہاں اعراب لفظی ہے۔

حالتِ رفعی جاء مسلمی کی تعلیل:

مُسْلِمِیَّ اصل میں مُسْلِمُوْنَ یَ تھا۔اضافت کی وجہ سے "ن" کو گرا دیا۔ مُسْلِمُوْیَ رہ گیا۔ واؤاور یاء جمع ہوئی پہلی ساکن دوسری متحرک۔ واؤ کو یاء سے بدلا۔ یاء کو یاء میں ادغام کیا۔مُسْلِمُیَّ ہو گیا۔ میم کے ضمہ کو کسرہ سے بدلا یاء کی مناسبت کی وجہ سے مُسْلِمِیَّ ہو گیا۔

حالتِ رفعی :جَآءَنِیْ مُسْلِمِیَّ۔ حالتِ نصبی :رَأَیْتُ مُسْلِمِیَّ۔ حالتِ جری :مَرَرْتُ بِمُسْلِمِیَّ۔

وَ(غُلَامِیْ) مُطْلَقًا

مصنفؒ نے (غُلَامِیْ) مُطْلَقًا جب کوئی اسم یائے متکلم کی طرف مضاف ہو تو اس کی تمام حرکات (رفع، نصب، جر) یاء کی مناسبت سے تقدیری مانی جاتی ہیں کیونکہ یاء ماقبل کسرہ کو لازم کرتی ہے۔ جیسے "جَاءَ غُلَامِیْ" میں "غُلَامِیْ" فاعل اور مرفوع تقدیری ہے۔ "رَأَیْتُ غُلَامِیْ" میں "غُلَامِیْ" مفعول بہ اور منصوب تقدیری ہے۔ اور "مَرَرْتُ بِغُلَامِیْ" میں "غُلَامِیْ" مجرور تقدیری ہے۔

اعرابِ لفظی :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اعرابِ لفظی ان تمام صورتوں میں ہوتا ہے جن کا ذکر اعرابِ تقدیری کی وجوہات میں نہیں کیا گیا۔ یعنی وہ تمام مُعرَب اسماء جن کے آخر میں حرکت کا ظاہر ہونا ممکن ہو اور وہ ثقیل بھی نہ ہو، ان کا اعراب لفظی ہوتا ہے۔ جیسے

"جَاءَ زَیْدٌ"، "رَأَیْتُ زَیْدًا"، "مَرَرْتُ بِزَیْدٍ"

وغیرہ میں "زَیْدٌ"، "زَیْدًا" اور "زَیْدٍ" کا اعراب لفظی ہے کیونکہ ان کے آخر میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ بآسانی ظاہر ہو رہے ہیں۔

منصرف وغیر منصرف

غَیْرُ الْمُنْصَرِفِ :مَا فِیْهِ عِلَّتَانِ مِنْ تِسْعٍ، أَوْ وَاحِدَةٌ مِنْهَا تَقُوْمُ مَقَامَهُمَا، وَهِیَ:

عَدْلٌ وَوَصْفٌ وَتَأْنِیْثٌ وَمَعْرِفَةٌ ... وَعُجْمَةٌ ثُمَّ جَمْعٌ ثُمَّ تَرْکِیْبُ

وَالنُّوْنُ زَائِدَةٌ مِنْ قَبْلِهَا أَلِفٌ ... وَوَزْنُ فِعْلٍ وَهٰذَا الْقَوْلُ تَقْرِیْبُ

مِثْلُ :عُمَرَ، وَأَحْمَرَ، وَطَلْحَةَ، وَزَیْنَبَ، وَإِبْرَاهِیْمَ، وَمَسَاجِدَ، وَمَعْدِیْکَرِبَ، وَعُمْرَانَ، وَأَحْمَدَ، وَحُکْمُهُ أَنْ لَا کَسْرَ وَلَا تَنْوِیْنَ، وَیَجُوْزُ صَرْفُهُ لِلضَّرُوْرَةِ، أَوْ لِلتَّنَاسُبِ مِثْلُ :{سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا} ،وَمَا یَقُوْمُ مَقَامَهُمَا :اَلْجَمْعُ وَأَلِفَا التَّأْنِیْثِ۔

ترجمہ :غیر منصرف :وہ (اسم) ہے جس میں نو علتوں میں سے دو علتیں پائی جائیں، یا ان میں سے ایک علت دو علتوں کے قائم

مقام ہو، اور وہ یہ ہیں :عدل، وصف، تانیث، معرفہ، ... عجمہ، پھر جمع، پھر ترکیب۔ اور وہ نون جو زائد ہو اور اس سے پہلے الف ہو، ... اور فعل کا وزن، اور یہ قول تقریبی ہے۔ جیسے :عمر، اور احمر، اور طلحہ، اور زینب، اور ابراہیم، اور مساجد، اور معدیکرب، اور عمران، اور احمد۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ وہ نہ کسرہ قبول کرتا ہے اور نہ تنوین، اور ضرورت کی بنا پر یا تناسب کی خاطر اسے منصرف پڑھنا جائز ہے، جیسے :{سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا}۔ اور جو چیز دو علتوں کے قائم مقام ہوتی ہے :وہ جمع اور الف ہائے تانیث ہیں۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف اسم کی تعریف اور اس کے اسباب بیان فرما رہے ہیں۔

غیر منصرف کی تعریف؛

آپؒ فرماتے ہیں کہ غیر منصرف وہ اسم ہے جس میں نو علتوں میں سے کوئی دو علتیں جمع ہو جائیں، یا ان نو علتوں میں سے کوئی ایک علت ایسی ہو جو اکیلے ہی دو علتوں کے قائم مقام ہو جائے۔ اب مصنفؒ ان نو علتوں کو ایک شعری انداز میں جمع فرما رہے ہیں تاکہ انہیں یاد رکھنا آسان ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ علتیں یہ ہیں:

"عَدْلٌ وَوَصْفٌ وَتَأْنِيثٌ وَمَعْرِفَةٌ ... وَعُجْمَةٌ ثُمَّ جَمْعٌ ثُمَّ تَرْكِيبُ

وَالنُّونُ زَائِدَةٌ مِنْ قَبْلِهَا أَلِفٌ ... وَوَزْنُ فِعْلٍ وَهَذَا الْقَوْلُ تَقْرِيبُ"

یعنی نو علتیں یہ ہیں:

عَدْلٌ (عدل) :عدل کا معنی ہے اصلی وزن سے پھر جانا، جیسے "عُمَر" اصل میں "عامِر" تھا لیکن اسے "عُمَر" کے وزن پر کر دیا گیا۔

وَصْفٌ (وصف) :وصف کا معنی ہے کسی چیز کی صفت بیان کرنا، جیسے "أَحْمَر" (لال) ایک صفت ہے۔

تَأْنِيثٌ (تانیث) :تانیث کا معنی ہے مؤنث ہونا، جیسے "طَلْحَة" اور "زَيْنَب" مؤنث نام ہیں۔

مَعْرِفَةٌ (معرفہ) :معرفہ کا معنی ہے خاص ہونا، جیسے علم ہونا، مثال کے طور پر "زَيْنَب" اور "إِبْرَاهِيم" خاص نام ہیں۔

عُجْمَةٌ (عجمہ) :عجمہ کا معنی ہے غیر عربی ہونا اور تین حروف سے زیادہ ہونا، جیسے "إِبْرَاهِيم" ایک عجمی نام ہے۔

جَمْعٌ (جمع) :جمع کا معنی ہے ایک سے زیادہ ہونا وہ بھی خاص اوزان پر جیسے "مَسَاجِد" جمع ہے اور ایک خاص وزن پر ہے۔

تَرْكِيبُ (ترکیب) :ترکیب کا معنی ہے دو اسماء کا مل کر ایک اسم بن جانا، جیسے "مَعْدِيكَرِب" دو ناموں سے مل کر بنا ہے۔

وَالنُّونُ زَائِدَةٌ مِنْ قَبْلِهَا أَلِفٌ (وہ نون جو زائد ہو اور اس سے پہلے الف ہو) :اس سے مراد وہ اسماء ہیں جن کے آخر میں الف نون زائدہ ہو، جیسے "عُمْرَان"۔

وَوَزْنُ فِعْلٍ (فعل کا وزن) :اس سے مراد وہ اسماء ہیں جو فعل کے وزن پر ہوں، جیسے "أَحْمَد" جو "أَفْعَل" کے وزن پر ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ نو علتیں ہیں جن میں سے دو کا کسی اسم میں پایا جانا یا ایک کا ایسی صورت میں پایا جانا جو دو کے قائم مقام ہو، اس اسم کو غیر منصرف بنا دیتا ہے۔

مثالیں:

مصنفؒ ان علتوں کی مثالیں بھی دیتے ہیں:

عُمَرَ :اس میں عدل اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے۔

أَحْمَرَ :اس میں وصف اور فعل کے وزن کی علت پائی جاتی ہے۔

طَلْحَةَ :اس میں تانیث اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے۔

زَيْنَبَ :اس میں تانیث اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے (بعض کے نزدیک عجمہ کی علت بھی ہے)۔

إِبْرَاهِيمَ :اس میں عجمہ اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے۔

مَسَاجِدَ :اس میں جمع (صیغہ منتہی الجموع) کی علت ہے جو خود دو علتوں کے قائم مقام ہے۔

مَعْدِيكَرِبَ :اس میں ترکیب (مزجی) اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے۔

عِمْرَانَ :اس میں نون زائدہ ما قبل الف اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے۔

أَحْمَدَ :اس میں فعل کا وزن اور معرفہ کی علت پائی جاتی ہے۔

وَحُكْمُهُ أَنْ لَا كَسْرَ وَلَا تَنْوِينَ، وَيَجُوزُ صَرْفُهُ لِلضَّرُورَةِ أَوْ لِلتَّنَاسُبِ مِثْلُ :{سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا}.

غیر منصرف کا حکم:

مصنفؒ غیر منصرف اسم کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس پر نہ کسرہ آتا ہے اور نہ تنوین۔ یعنی حالتِ جری میں یہ زیر کی بجائے زبر قبول کرتا ہے اور یہ تنوین کو بالکل قبول نہیں کرتا۔

غیر منصرف پر کسرہ اور تنوین نہ آنے کی وجہ:

کیونکہ غیر منصرف فعل کے مشابہ ہے تو جس طرح فعل پر کسرہ اور تنوین نہیں آتے اسی طرح غیر منصرف پر بھی نہیں آسکتے۔ غیر منصرف جر کے مقام بھی ہمیشہ مفتوح ہوتا ہے جیسے:

حالتِ رفعی :جَاءَنِي أَحْمَدُ۔ حالتِ نصبی :وَرَأَيْتُ أَحْمَدَ۔ حالتِ جری :وَمَرَرْتُ بِأَحْمَدَ۔

فائدہ:

صاحب کتاب نے فرمایا کہ تنوین نہیں آسکتی غیر منصرف پر۔ تو یہ بات آپ بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ تنوین کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱) تنوین تمکن (۲) تنوین تنکیر (۳) تنوین عوض (۴) تنوین مقابلہ (۵) تنوین ترنم۔

تنوین تنکیر اور تنوین ترنم کے علاوہ باقی تینوں اقسام غیر منصرف پر داخل ہو سکتی ہیں۔

استثناء:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح ضرورت شعری کی وجہ سے بھی غیر منصرف پر تنوین آسکتی ہے جیسے شاعر کا قول:

ثُمَّ فَتْوٰی زُفَرٍ بَعْدَہٗ   وَمَا هُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وَحْدَہٗ

کہ یہاں زُفَرٌ غیر منصرف ہے لیکن اس پر ضرورت شعری کی وجہ سے تنوین داخل ہے۔اور یہ جائز ہے۔
یا کسی تناسب کی خاطر، جیسے قرآنی آیت "{سَلاَسِلَ وَأَغْلاَلاً}" میں "سَلاسِلَ" کے ساتھ قافیے کی رعایت کی وجہ سے "أَغْلاَلاً" کی وجہ سے سلاسلا پر تنوین لائی گئی ہے، ان مندرجہ بالا اعذار کی بناء پر غیر منصرف اسم کو منصرف پڑھنا جائز ہے۔

وَمَا يَقُومُ مَقَامَهُمَا :الْجَمْعُ وَأَلِفَا التَّأْنِيثِ.

دو علتوں کے قائم مقام:

مصنفؒ آخر میں فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک ہی علت دو علتوں کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہیں

:اَلْجَمْعُ (جمع) :وہ جمع جو صیغہ منتہی الجموع پر ہو، یعنی وہ جمع جس کے بعد کوئی اور جمع نہ بن سکتی ہو، جیسے "مَسَاجِد" (مفاعِلُ) اور "مَصَابِيحُ" (مفاعِيلُ) وغیرہ۔ یہ اکیلی علت غیر منصرف ہونے کے لیے کافی ہے۔

أَلِفَا التَّأْنِيثِ (الف ہائے تانیث) :اسم کے آخر میں آنے والی الفِ تانیث، خواہ وہ ممدودہ ہو (جیسے حَمْرَاءُ) یا مقصورہ ہو (جیسے سَلْمٰی)، یہ بھی اکیلی علت غیر منصرف ہونے کے لیے کافی ہے۔

پہلا سبب عدل

فَالْعَدْلُ :خُرُوجُهُ عَنْ صِيغَتِهِ الْأَصْلِيَّةِ، تَحْقِيقًا كَ(ثُلَاثَ) وَ(مَثْلَثَ) وَ(أُخَرَ) وَ(جُمَعَ)، أَوْ تَقْدِيرًا كَ(عُمَرَ) وَبَابُ (قَطَامِ) فِي بَنِي تَمِيمٍ.

ترجمہ :پس عدل :اس کا اپنی اصلی صورت سے نکل جانا ہے، حقیقتاً جیسے (ثُلَاثَ) اور (مَثْلَثَ) اور (أُخَرَ) اور (جُمَعَ)، یا تقدیراً جیسے (عُمَرَ)۔اور بنو تمیم میں (قَطَامِ) کا باب۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی پہلی علت یعنی "عَدْلٌ" کی تفصیل بیان فرما رہے ہیں۔

عدل کے لغوی معنی:

لغت میں عدل کہتے ہیں لوٹنا۔ پھرنا۔ تجاوز کرنا۔

عدل کی اصطلاحی تعریف:

نحویین کی اصطلاح میں عدل کہتے ہیں کسی لفظ کا اپنے اصلی صیغے سے نکل کر دوسرے صیغے میں تبدیل ہو جانا۔ جس لفظ سے نکلے اس کو معدول عنہ کہتے ہیں اور جو صیغہ نکلے اس کو معدول کہتے ہیں۔

تَحْقِيقًا أَوْ تَقْدِيرًا:

اس عبارت سے صاحب کتاب نے عدل کی اقسام کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عدل کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عدل تحقیقی۔ (۲) عدل تقدیری۔

عدل تحقیقی:

وہ یہ ہے کہ اس میں میں غیر منصرف ہونے پر کلام عرب میں کوئی دلیل مستقل موجود ہو جیسے ثُلَاثُ اور مَثْلَثُ کہ اس کا معنی ہے تین تین۔ اور قاعدہ مشہور ہے کہ معنی کا تکرار دلالت کرتا ہے لفظ کے تکرار پر۔ معلوم ہوا کہ اس کی اصل ثَلٰثَۃٌ ثَلٰثَۃٌ ہے۔ پس ثَلٰثَۃٌ ثَلٰثَۃٌ معدول عنہ ہے اور ثُلَاثُ اور مَثْلَثُ معدول ثُلَاثُ اور مَثْلَثُ کے اندر غیر منصرف کے دو ۲ سبب ہیں: (۱) عدل تحقیقی۔ (۲) وصف۔

عدل تقدیری:

عدل کی دوسری قسم عدل تقدیری ہے۔ عدل تقدیری کی تعریف یہ ہے کہ کلام عرب میں اس کے غیر منصرف ہونے پر کوئی دلیل عدل موجود نہ ہو پس ہم نے اہل عرب سے جس طرح سنا اسی طرح پڑھا۔ جیسے عُمَرُ اور زُفَرُ کہ ان دونوں اسموں میں غیر منصرف ہونے کا صرف ایک ہی سبب پایا جا رہا ہے وہ ہے علمیت۔

لیکن اہل عرب سے غیر منصرف سننے کی وجہ سے ہم نے ان کی اصل فرض کرلی کہ عُمَرُ اصل میں عَامِرٌ تھا اور زُفَرُ اصل میں زَافِرٌ تھا۔ پس دوسرا سبب عدل تقدیری ہے۔

وَاُخَرَ وَجُمَعَ:

صاحب کتاب نے تیسری مثال اُخَرَ اور چوتھی مثال جُمَعَ ذکر کی ہے۔

اُخَرُ جمع ہے اسم تفضیل آخَر کی مؤنث اُخْرٰی کی۔ اصل میں اَشَدُّ تَاَخُّرًا ہے۔ قاعدہ مشہور ہے کہ اسم تفضیل کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے۔ (۱) اضافت کے ساتھ۔ (۲) مِنْ کے ساتھ۔ (۳) الف لام کے ساتھ۔

اُخَر کا استعمال ان تین میں کسی بھی طریقے سے نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اُخَر ان میں سے کسی ایک سے معدول ہے۔ پس اُخَرُ کے اندر دو سبب ہیں: (۱) عدل تقدیری۔ (۲) وصف۔

صاحبِ کتاب نے چوتھی مثال جُمَعُ کی دی ہے۔ جُمَعُ جمع ہے جَمْعَاءُ کی جو کہ مؤنث ہے اَجْمَعُ اسم تفضیل بروزن اَفْعَلُ کی۔ اور قاعدہ مشہور ہے کہ فَعْلَاءُ، اَفْعَلُ صفتی کا مؤنث ہو تو اس کی جمع فُعُلٌ کے وزن پر آتی ہے۔ اور اگر فَعْلَاءُ اسم ذات ہو تو اس کی جمع فَعَالِیْ یا فَعْلَاوَات کے وزن پر آتی ہے جیسے صَحْرَاء کی جمع صَحَارِیْ یا صَحْرَاوات آتی ہے۔ حالانکہ جُمَعُ ان میں سے کسی وزن پر نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جُمَعُ اگر اسم صفت ہے تو یہ معدول ہے اَجْمَعُ معدول عنہ کا۔

اور اگر جُمَعُ اسم ذات ہے تو یہ معدول ہے جَمَاعِیْ یا جَمْعَاوَات معدول عنہ کا۔

پس جُمَعُ کے غیر منصرف پڑھے جانے پر دلیل عدل موجود ہے پس دو سبب ہوئے۔ (۱) عدل تحقیقی۔ (۲) وصف۔

وَبَابُ (قَطَامِ) فِیْ بَنِیْ تَمِیْم (اور بنو تمیم میں (قطام) کا باب):

مصنفؒ یہاں "قَطَامِ" کے باب کا ذکر کر رہے ہیں جو قبیلہ بنو تمیم کے ہاں غیر منصرف ہے اور قاطمۃ سے معدول ہے تو عدل

وعلم کی بناء پر غیر منصرف ہے۔
اہل حجاز کے نزدیک فعال کاوزن جب بغیر رالکے ہوتو مبنی ہوتا ہے کیونکہ "قَطَامِ" دراصل ایک مؤنث علم (خاص نام) ہے جو ہمیشہ کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، یعنی اس پر رفع اور نصب کی حالت میں بھی زیر ہی آتا ہے۔

فائدہ؛

عدل کبھی بھی وزن فعل کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا وجہ اس کی یہ ہے کہ عدل کے مخصوص اوزان ہیں اور فعل ان میں سے کسی بھی وزن پر نہیں آتا عدل کے اوزان یہ ہیں:(۱) فُعَالُ جیسے ثُلَاثُ (۲) مَفْعَلُ جیسے مَثْلَثَ (۳)فُعَلُ جیسے عُمَرُ زُفر (۴)فَعْلِ جیسے اَمْسِ(۵)فَعَلَ جیسے سَحَرَ (۶) فَعَالِ جیسے قَطَامِ۔
عدل علمیت اور وصف کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔

عدل مع العلمیت کی مثال :

عُمَرُ،زُفَرُ۔

عدل مع الوصف کی مثال:

ثُلَاثُ،مَثْلَثُ،اُخَرُ،جُمَعُ۔

دوسرا سبب وصف

اَلْوَصْفُ :شَرْطُهُ أَنْ يَكُونَ وَصْفًا فِي الْأَصْلِ،فَلَا تَضُرُّهُ الْغَلَبَةُ،فَلِذٰلِكَ صُرِفَ (أَرْبَعٌ) فِي :(مَرَرْتُ بِنِسْوَةٍ أَرْبَعٍ)،وَامْتَنَعَ (أَسْوَدُ)،وَ(أَرْقَمُ) لِلْحَيَّةِ،وَ(أَدْهَمُ)لِلْقَيْدِ،وَضَعُفَ مَنْعُ (أَفْعَى) لِلْحَيَّةِ،وَ(أَجْدَلَ) لِلصَّقْرِ،وَ(أَخْيَلَ) لِلطَّائِرِ.

ترجمہ :وصف :اس کی شرط یہ ہے کہ وہ اصل میں وصف ہو، پس غلبہ اسے نقصان نہیں دیتا، اسی لیے (أَرْبَعٌ) کو (مَرَرْتُ بِنِسْوَةٍ أَرْبَعٍ) میں منصرف پڑھا گیا ہے، اور (أَسْوَدُ) اور سانپ کے لیے (أَرْقَمُ) اور قید کے لیے (أَدْهَمُ) غیر منصرف قرار پائے ہیں، اور سانپ کے لیے (أَفْعَى) اور باز کے لیے (اَجْدَلَ) اور پرندے کے لیے (أَخْيَلَ) کے غیر منصرف ہونے کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی دوسری علت یعنی "وَصْف" کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

وصف کے لغوی معنی:

لغت میں وصف کہتے ہیں تعریف کرنے کو۔

وصف کا اصطلاحی معنی:

نحویین کی اصطلاح میں وصف ایک ایسا اسم ہے جو وضع یا استعمال کی وجہ سے ایسی ذات مبہم پر دلالت کرے جس میں وہ وصف پایا جائے جیسے اَسْوَدُ اور اَرْقَمُ کہ اَسْوَدُ کہتے ہیں کالے کو جس میں سیاہی کی صفت پائی جائے۔اور اَرْقَمُ کہتے ہیں چتکبرے کو جس کو پشتو میں بَرَگ کہتے ہیں۔

وصف کی اقسام:

اَلْوَصْفُ :شَرْطُهُ أَنْ يَكُونَ وَصْفًا فِي الْأَصْلِ،

وصف کے غیر منصرف بننے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اصل وضع میں وصف ہو اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ یہ سمجھیں کہ وصف کی دو ۲ قسمیں ہیں: (۱) اصلی (۲) عارضی۔

وصف اصلی کی تعریف:

کہ اس کی وضع خاص وصف کے لیے ہو۔ اگرچہ وہ بعد میں وصف باقی نہ رہا ہو لیکن اصل وضع میں وصف ہی ہو جیسے؛ **وَامْتَنَعَ (أَسْوَدُ)، وَ (أَرْقَمُ) لِلْحَيَّةِ، وَ (أَدْهَمُ) لِلْقَيْدِ** (اور (أَسْوَدُ) اور سانپ کے لیے (اَرْقَمُ) اور قید کے لیے (اَدْہَمُ) غیر منصرف قرار پائے ہیں): لفظ "اَسْوَدُ" (کالا) اصل میں ایک وصف ہے (رنگ کی صفت) اگرچہ یہ کسی شخص کا نام بھی رکھا جاتا ہے تو بھی اپنی اصلی وصفیت کی وجہ سے غیر منصرف رہے گا۔ لفظ "أَرْقَمُ" (چتکبرا، دھاری دار) سانپ کی صفت بیان کرتا ہے، اگرچہ یہ خاص طور پر سانپ کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے علم کی طرح ہو گیا ہے، لیکن اپنی اصلی وصفیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ لفظ "اَدْہَمُ" (سیاہ) قید کی صفت بیان کرتا ہے، اگرچہ یہ قید کے لیے خاص ہو گیا ہے، لیکن اپنی اصلی وصفیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

وصف عارضی کی تعریف:

کہ وہ اسم عارضی طور پر وصف کے لیے استعمال کیا گیا ہو اصل میں اس کی وضع وصف کے لیے نہ ہوئی ہو جیسے **أَرْبَعٌ** کہ یہ **مَرَرْتُ بِنِسْوَةٍ أَرْبَعٍ** میں منصرف ہے باوجود اس کے کہ اس میں دو سبب موجود ہیں۔ (۱) وصف۔ (۲) وَزْنُ الْفِعْلِ۔ لیکن اصل وضع میں اس کو اس عدد معین کے لیے وضع کیا گیا جو (۳) "تین" اور (۵) "پانچ" کے درمیان ہے لہٰذا یہ منصرف ہے **لِعَدَمِ الْاَصَالَةِ فِي الْوَصْفِيَّةِ**۔

وَضَعُفَ مَنْعُ (أَفْعَى) لِلْحَيَّةِ، وَ (أَجْدَلَ)

(اور سانپ کے لیے (أَفْعَى) اور باز کے لیے (أَجْدَلَ) اور پرندے کے لیے (أَخْيَلَ) کے غیر منصرف ہونے کو ضعیف قرار دیا گیا ہے):

لفظ "اَفْعٰی" (افعی، ایک قسم کا زہریلا سانپ) اگرچہ سانپ کی صفت بیان کرتا ہے، لیکن بعض نحوی اس کے غیر منصرف ہونے کو ضعیف کہتے ہیں کیونکہ یہ خاص طور پر اسی نوع کے سانپ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

لفظ "اَجْدَلَ" (باز، عقاب) اگرچہ صفت ہے، لیکن خاص طور پر اس پرندے کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے اس کے غیر

منصرف ہونے کو بھی بعض ضعیف مانتے ہیں۔

لفظ "اَخْیَلَ" (غرابی، ایک خاص قسم کا پرندہ یا رنگ) کے بارے میں بھی یہی صورتحال ہے کہ اس کے غیر منصرف ہونے کو بعض نحوی ضعیف قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ خاص طور پر اس پرندے یا رنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

فائدہ؛

وصف علمیت کے ساتھ کبھی جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ وصف دلالت کرتی ہے ذات مبہم پر اور علمیت ذات معین پر۔ تو ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں مبہم بھی ہو متعین بھی ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ یا تو وہ چیز مبہم ہو گی یا معین۔ پس وصف اور علمیت جمع ہو ہی نہیں سکتے۔

تیسرا سبب تانیث

اَلتَّأْنِيثُ بِالتَّاءِ :شَرْطُهُ الْعَلَمِيَّةُ، وَالْمَعْنَوِيُّ كَذٰلِكَ، وَشَرْطُ تَحَتُّمِ تَأْثِيرِهِ :اَلزِّيَادَةُ عَلَى الثَّلَاثَةِ، أَوْ تَحَرُّكُ الْأَوْسَطِ، أَوِ الْعُجْمَةُ، فَ(هِنْدٌ) يَجُوزُ صَرْفُهُ، وَ(زَيْنَبُ) وَ(سَقَرُ) وَ(مَاهُ) وَ(جُوْرٌ) مُمْتَنِعٌ، فَإِنْ سُمِّيَ بِهِ مُذَكَّرٌ فَشَرْطُهُ الزِّيَادَةُ عَلَى الثَّلَاثَةِ، فَ(قَدَمٌ) مُنْصَرِفٌ، وَ(عَقْرَبٌ) مُمْتَنِعٌ.

ترجمہ :تاء کے ساتھ تانیث :اس کی شرط علم ہونا ہے، اور معنوی تانیث کی بھی یہی شرط ہے، اور اس کے اثر کو یقینی بنانے کی شرط یہ ہے: تین حروف سے زیادہ ہونا، یا درمیانی حرف کا متحرک ہونا، یا عجمی ہونا، پس (هِنْدٌ) کا منصرف ہونا جائز ہے، اور (زَيْنَبُ) اور (سَقَرُ) اور (مَاهُ) اور (جُوْرٌ) غیر منصرف ہیں، پس اگر کسی مذکر کا نام اس (تانیث والے اسم) سے رکھا جائے تو اس کی شرط تین حروف سے زیادہ ہونا ہے، پس (قَدَمٌ) منصرف ہے، اور (عَقْرَبٌ) غیر منصرف ہے۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی تیسری علت یعنی "تَأْنِيث" (تانیث) کی تفصیل بیان فرما رہے ہیں۔

تانیث کی چار قسمیں ہیں:

(۱) التانیث بالتاء تانیث لفظی۔ (۲) تانیث معنوی۔ (۳) تانیث بالالف المقصورۃ۔ (۴)...تانیث بالالف الممدودۃ۔

تانیث لفظی کی تعریف:

جس میں علامتِ تانیث لفظوں میں موجود ہو جیسے طَلْحَۃُ کہ اس کے آخر میں گول ۃ علامت تانیث لفظوں میں موجود ہے۔

تانیث معنوی کی تعریف:

جس میں تانیث کی علامت لفظوں میں موجود نہ ہو تقدیرا ہو جیسے اَرْضٌ کہ یہ تانیث معنوی ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُرَيْضَۃٌ ہے اور تصغیر سے لفظ کی اصل کا پتہ چل جاتا ہے کہ اصل میں یہ اَرْضَۃٌ ہے۔

تانیث بالالف المقصورہ کی تعریف:

تانیث بالالف المقصورہ وہ اسم ہے کہ جس کے آخر میں الف مقصورہ ہو جیسے حُبْلٰی۔

تانیث بالالف الممدودہ کی تعریف:

تانیث بالالف الممدودہ وہ اسم ہے جس کے آخر میں الف ممدودہ ہو جیسے حُمْرَآءُ۔

شَرْطُهُ الْعَلَمِيَّةُ وَالْمَعْنَوِيُّ كَذٰلِكَ

اس عبارت میں صاحب کتاب نے تانیث کے غیر منصرف بننے کے لیے شرط کو بیان فرمایا ہے کہ وہ اسم علم ہو اس بات کو آپ ذہن میں رکھیں کہ تانیث لفظی کو وجوبًا غیر منصرف پڑھا جاتا ہے جیسے طَلْحَةُ کہ آخر میں گول ۃ علامت تانیث لفظی ہے لہٰذا اس کو غیر منصرف پڑھنا واجب ہے۔

اور تانیث معنوی کو جوازی طور پر منصرف غیر منصرف دونوں پڑھنا جائز ہے لیکن صاحب کتاب نے اس کے لیے تین شرائط کو ذکر کیا ہے۔

تانیث کے اثر کو یقینی بنانے کی شرطیں

وَشَرْطُ تَحَتُّمِ تَأْثِيرِهِ :الزِّيَادَةُ عَلَى الثَّلَاثَةِ أَوْ تَحَرُّكُ الْأَوْسَطِ أَوِ الْعُجْمَةُ

کہ زائد علی ثلاثی ہو تین حرفی سے زائد ہو متحرک الاوسط درمیانہ حرف متحرک ہو عجمی یعنی غیر عربی ہو۔

لھذا ھِنْدٌ دونوں طرح یعنی منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں اس لئے کہ اس میں غیر منصرف کی شرائط نہیں پائی جارہی ہیں کیونکہ یہ عربی بھی ہے سہ حرفی بھی ہے اور ساکن الاوسط بھی ہے۔

منصرف پڑھنے کی وجہ:

یہ ہے کہ جب ایک اسم ثلاثی بھی ہو ساکن الاوسط بھی ہو عربی بھی ہو، عجمی نہ ہو تو درمیانہ حرف ساکن ہونے کی وجہ سے خفت آگئی جو تقاضہ کرتی ہے کہ اس پر کسرہ اور تینوں حرکات آسکیں۔

غیر منصرف پڑھنے کی وجہ:

یہ ہے کہ اس میں اسباب منع صرف میں سے دو سبب ہیں: (۱) یہ کہ یہ عَلَم ہے اور (۲) یہ کہ یہ تانیث معنویہ ہے۔ کیونکہ یہ ایک عورت کا نام ہے۔

پہلی شرط زائد علی الثلاثہ:

جس طرح زینب یہ زائد علی الثلاثہ ہے تو یہ غیر منصرف پڑھنا واجب ہے کیونکہ اس میں دو ۲ سبب اسباب منع صرف میں سے موجود ہیں (۱) کہ یہ علم ہے۔ (۲) کہ یہ تانیث معنوی ہے عورت کا نام ہونے کی وجہ سے۔

دوسری شرط:

کہ درمیانہ حرف متحرک ہو جیسے سَقَرَ کہ اس کو غیر منصرف پڑھنا واجب ہے کیونکہ اس میں دو ۲ سبب پائے جارہے ہیں (۱) علم ہے کیونکہ یہ جہنم کا نام ہے۔ (۲) وزن فعل ہے۔

تیسری شرط:

کہ عجمی ہو تو غیر منصرف پڑھنا واجب ہے جیسے مَاہ وَجُوْر یہ عجمی ہیں اہل عرب کی زبان پر ثقیل ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

مذکر کا مؤنث نام سے موسوم ہونا :

فَإِنْ سُمِّيَ بِهِ مُذَكَّرٌ فَشَرْطُهُ الزِّيَادَةُ عَلَى الثَّلَاثَةِ. فَ(قَدَمٌ) مُنْصَرِفٌ، وَ(عَقْرَبٌ) مُمْتَنِعٌ.

مصنفؒ فرماتے ہیں :فَإِنْ سُمِّيَ بِهِ مُذَكَّرٌ فَشَرْطُهُ الزِّيَادَةُ عَلَى الثَّلَاثَةِ (پس اگر کسی مذکر کا نام اس (تانیث والے اسم) سے رکھا جائے تو اس کی شرط تین حروف سے زیادہ ہونا ہے)۔ اگر کوئی ایسا اسم جو ظاہری طور پر مؤنث کی علامت رکھتا ہو (مثلاً تاء مربوطہ کے ساتھ) لیکن وہ کسی مذکر کا نام رکھ دیا جائے، تو اس کے غیر منصرف ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کے حروف کی تعداد تین سے زیادہ ہو۔

مصنفؒ اس کی مثال دیتے ہیں :فَ(قَدَمٌ) مُنْصَرِفٌ (پس (قدمٌ) منصرف ہے)۔ لفظ "قَدَمٌ" اگر کسی مرد کا نام رکھا جائے تو یہ منصرف ہوگا کیونکہ یہ تین حروف والا ہے۔ لیکن اگر وہ اسم تین حروف سے زیادہ ہو تو وہ غیر منصرف ہوگا، جیسا کہ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :وَ(عَقْرَبٌ) مُمْتَنِعٌ (اور (عَقْرَبٌ) غیر منصرف ہے)۔ لفظ "عَقْرَبٌ" (بچھو) اگر کسی مرد کا نام رکھا جائے تو یہ غیر منصرف ہوگا کیونکہ اس کے حروف کی تعداد چار ہے۔

فائدہ:

تَأْنِيْثُ بِالْأَلِفِ الْمَقْصُوْرَةِ کا حکم یہ ہے کہ یہ غیر منصرف پڑھنا واجب ہے کیونکہ الف مقصورہ دو سببوں کے قائم مقام ہے :(۱) تانیث۔ (۲) لزوم تانیث۔ جیسے حبلی

وَالْمَمْدُوْدَةِ كَحَمْرَاءَ:

تانیث بالف الممدودہ کو بھی غیر منصرف پڑھنا واجب ہے کیونکہ الف ممدودہ بھی الف مقصورہ کی طرح دو سببوں کے قائم مقام ہے۔ (۱) تانیث (۲) لزوم تانیث۔ جیسے حمراء

تانیث اور لزوم تانیث کی تعریف

تانیث :اس کو کہتے ہیں جس کے مد مقابل کوئی مذکر ہو۔ اب یہاں تانیث سے ایسی خاص صفت مراد ہے جو عورت کی ذات کے ساتھ مختص ہو جیسے حُبْلٰی کہ یہ تانیث مؤنث کی خاص صفت ہے۔

لزوم تانیث:

سے مراد یہ ہے کہ الف مقصورہ اور الف ممدودہ کے بغیر حُبْلٰی اور حَمْرَاءُ کا استعمال نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں اسم حَبْلٌ اور حَمْرٌ نہیں پڑھے جا سکتے۔ معلوم ہوا کہ تانیث بالالف مقصورہ اور تانیث بالالف الممدودہ جیسے حُبْلٰی اور حَمْرَاءُ یہ دونوں غیر منصرف ہیں۔

چوتھا سبب معرفہ

اَلْمَعْرِفَةُ :شَرْطُهَا أَنْ تَكُونَ عَلَمِيَّةً.

ترجمہ :معرفہ :اس کی شرط یہ ہے کہ وہ علم ہو۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی چوتھی علت یعنی "اَلْمَعْرِفَۃُ" (معرفہ ہونا) کی وضاحت فرمارہے ہیں۔

معرفہ کی لغوی تعریف:

لغت میں معرفہ کہتے ہیں کسی معروف اور معین چیز کو۔

معرفہ کی اصطلاحی تعریف:

نحویین کی اصطلاح میں معرفہ وہ اسم ہے جو ذات معین یا عدد معین یا کسی شی معین پر دلالت کرے۔

معرفہ کی اقسام:

معرفہ کی سات ۷ قسمیں ہیں:

(۱)...کہ اسم علم ہو۔ جیسے زَيْدٌ۔ (۲)... مضمرات جیسے هُوَ هُمَا هُمْ (۳)...اسمآئے اشارات جیسے هٰذَا هٰذِهٖ ۔(۴)...اسمآئے موصولہ جیسے الذی التی۔ (۵)... مضاف الیٰ احدہا جیسے غُلَامُ زَيْدٍ۔ (۶)... معرف باللام جیسے الرجل۔ (۷)... معرفۂ بندا جیسے يَا زَيْدُ۔

غیر منصرف بننے کے لیے اسباب منع صرف میں معرفہ کی سات ۷ اقسام میں سے صرف پہلی قسم علم معتبر ہے۔

شَرْطُهَا أَنْ تَكُونَ عَلَمِيَّةً.

یہاں سے صاحب کتاب نے فرمایا کہ معرفہ کی تمام اقسام میں صرف اسم علم ہی غیر منصرف کا سبب بن سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مضمرات، اسمائے اشارہ، اسمائے موصولہ اور اسمائے کنایات یہ مبنی کی اقسام ہیں اور غیر منصرف اسم معرب کی قسم ہے۔اور معرب کبھی مبنی یا مبنی کبھی معرب نہیں بن سکتے۔ معرفۃ بندا اور معرفہ بالف لام کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ جس طرح یا زید ہے اسی طرح يَا أَيُّهَا الزَّيْدُ بھی ہے۔ تو معرفہ بندا اور معرفہ بالف لام یہ دونوں ایک حکم میں ہیں۔

معرفہ باندا اور معرفہ بالف لام اور مضاف لاحدہا یہ دونوں غیر منصرف سے مانع ہیں للذا معرفہ کی تمام اقسام میں سے صرف ایک ہی قسم رہ گئی اسباب منع صرف کا سبب بننے کے لیے اور وہ ہے اسم علم۔

فائدہ:

عَلَم اسباب منع صرف میں سے سوائے وصف کے باقی اقسام کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ وصف دلالت کرتا ہے۔ ذات مبہم پر اور "علم" دلالت کرتا ہے ذات معین پر تو ایک چیز یا تو مبہم ہو گی یا معین۔ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں مبہم بھی ہو

معین بھی ہو ایسا نہیں ہو سکتا للذا علم اور وصف کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔

پانچواں سبب عجمہ

العجمة :شرطها أن تكون علميّة في العجميّة، وتحرّك الأوسط، أو زيادة على الثلاثة، ف(نوح) منصرف، و(شتر) و(ابراهيم) ممتنع.

ترجمہ : عجمہ :اس کی شرط یہ ہے کہ وہ عجمی زبان میں علم ہو، اور درمیانی حرف کا متحرک ہونا، یا تین حروف سے زیادہ ہونا، پس (نُوحٌ) منصرف ہے، اور (شَتَرُ) اور (إِبْرَاهِيمُ) غیر منصرف ہیں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی پانچویں علت یعنی "اَلْعُجْمَةُ" (عجمی ہونا) کی وضاحت فرما رہے ہیں۔

عجمہ کا لغوی معنی:

عجمہ کہتے ہیں گونگے کو۔

عجمہ کا اصطلاحی معنی:

نحویین کی اصطلاح میں عجمہ کہتے ہیں عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں وہ اسم علم ہو۔ ایسے اسم کو جو عجمی زبان میں علم ہو اس کو عجمہ کہا جاتا ہے۔

غیر منصرف بننے کے لیے شرط نمبر(۱):

:شرطها أن تكون علميّة في العجميّة،

یہ ہے کہ وہ علم ہو عجمی زبان میں عجمہ کے غیر منصرف کا سبب بننے کے لئے علیت کو اس لیے شرط قرار دیا گیا کہ اہل عرب کی عادت ہوتی ہے کہ وہ آسانی کے لئے دوسری زبانوں کے کلمات کے حروف کو کم کر دیتے ہیں لیکن اگر وہ علم ہو تو کم نہیں کرتے۔

علم کی دو قسمیں ہیں:

(۱)۔ علم حقیقی۔ (۲)۔ علم حکمی۔

علم حقیقی کی تعریف:

علم حقیقی وہ اسم ہے جو عربی و عجمی ہر زبان میں علم ہو جیسے :ابراهیم

علم حکمی کی تعریف:

علم حکمی وہ اسم ہے جو عجمی زبان میں تو علم نہ ہو لیکن اہل عرب اسے کسی خصوصیت کی وجہ سے علم کے طور پر استعمال کرتے ہوں۔ جیسے :قَالُوْن کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے ہر عمدہ چیز کو عبرانی زبان میں قالون کہا جاتا ہے۔

تو اہل عرب نے اچھا پڑھنے کی وجہ سے ایک قاری کو قالون کہنا شروع کر دیا۔ یہ تجوید کے بہت بڑے امام ہیں "امام قالون"۔

اہل عرب نے عمدہ قرات کی وجہ سے ان کا یہ نام رکھ دیا۔

غیر منصرف کا سبب بننے کے لیے شرط نمبر ۲:

وتحرّك الأوسط، أو زيادة على الثلاثة

اس کے دو جز ہیں: (۱) وہ اسم زائد علی الثلاثہ ہو، (۲) سہ حرفی ہو لیکن متحرک الاوسط

سہ حرفی کی مثال "شَتَرْ" یہ ایک قلعے کا نام ہے، اس کے تین حروف ہیں جن میں شین کے بعد تاء کا متحرک ہونا مراد ہے۔ اس لیے یہ غیر منصرف ہے۔

زائد علی الثلاثہ کی مثال ابراهيم، ایک مشہور عجمی نام ہے اور اس کے حروف کی تعداد تین سے زیادہ ہے، اس لیے یہ غیر منصرف ہے۔

فَ(نُوحٌ)مُنْصَرِفٌ

(پس (نُوحٌ) منصرف ہے)۔ لفظ "نُوحٌ" اگرچہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام ہے اور عجمی الاصل ہے، لیکن اس کے حروف کی تعداد تین ہے اور اس کا درمیانی حرف ساکن ہے۔ اس لیے اس میں غیر منصرف ہونے کی شرائط پوری نہیں ہوتیں اور یہ منصرف ہے۔

اَلْفَائِدَةُ لِلْعُلَمَاءِ والطلباءِ

قَالَ صَاحِبُ الدِّرَايَةِ فِيْ شَرْحِهِ:

اِعْلَمْ اَنَّ جَمِيْعَ الْاَسْمَاءِ الْمَلٰئِكَةِ وَكَذَا جَمِيْعَ اَسْمَآءِ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ لَا يَنْصَرِفُ اِلَّا سَبْعَةٌ ثَلَاثَةٌ مِنْهَا عَرَبِيَّةٌ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَالِحٌ وَشُعَيْبٌ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ وَاَرْبَعَةٌ مِّنْهَا عَجَمِيَّةٌ نُوحٌ وَلُوْطٌ وَهُوْدٌ وَشِيْثٌ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ۔ لِاَنَّهَا سَابِقَةٌ عَلَى الْعَرَبِ۔ (دراية النحو)

چھٹا سبب جمع منتہی الجموع

الجمع: شرطه صيغة منتهى الجموع بغير هاء، كـ(مساجد) و(مصابيح)، وأما (فرازنة) فمنصرف، و(حضاجر) علما للضّبع غير منصرف، لأنّه منقول عن الجمع، و(سراويل) إذا لم يصرف- وهو الأكثر- فقد قيل: إنّه أعجميّ حمل على موازنه، وقيل: عربيّ جمع (سروالة) تقديرا، وإذا صرف فلا إشكال. ونحو (جوار) رفعا وجرّا كـ(قاض).

ترجمہ: جمع: اس کی شرط صیغہ منتہی الجموع ہونا ہے بغیر ہاء کے، جیسے (مَسَاجِدَ) اور (مَصَابِيحَ)، اور بہر حال (فَرَازِنَةٌ) منصرف ہے، اور (حَضَاجِرُ) جو کہ لکڑ بھگا کا نام ہے غیر منصرف ہے؛ کیونکہ وہ جمع سے منقول ہے، اور (سَرَاوِيلُ) جب منصرف نہ ہو- اور یہی زیادہ مشہور ہے- تو کہا گیا ہے: کہ وہ عجمی ہے اور اپنے وزن پر محمول ہے، اور کہا گیا ہے: کہ وہ عربی ہے اور تقدیراً (سِرْوَالَةٍ) کی جمع ہے، اور اگر وہ منصرف ہو تو کوئی اشکال نہیں۔ اور (جَوَارٍ) جیسے الفاظ حالت رفعی اور جری میں (قَاضٍ) کی طرح ہیں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی چھٹی علت یعنی "اَلْجَمْعُ" (جمع) کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

جمع کے لغوی معنی:

لغت میں جمع کہتے ہیں اکٹھا ہونا۔ یکجا ہونا جمع ہونا۔

جمع کی اصطلاحی تعریف:

عربی زبان کی اصطلاح میں جمع کہتے ہیں اس اسم کو جو تین ۳ یا اس سے زائد افراد پر دلالت کرے۔

اور جمع کا صیغہ واحد کے صیغے میں تبدیل کرکے بنایا جاتا ہے۔ جیسے :رَجُلٌ سے رِجَالٌ اور مَسْجِدٌ سے مَسَاجِدُ۔

جمع کے غیر منصرف بننے کے لیے شرط:

جمع کے غیر منصرف بننے کے لیے دو ۲ شرائط ہیں

:پہلی شرط صیغہ منتہی الجموع

(۱)... جمع کا صیغہ جمع منتہی الجموع کے وزن پر ہو۔

جمع منتہی الجموع کے تین اوزان آتے ہیں:

۱)... الف جمع کے بعد دو حرف ہوں جیسے مَسَاجِدُ۔

۲)...ایک حرف ہو لیکن مشدد ہو جیسے دَوَّابٌّ ۔

۳)... تین حرف ہوں اور درمیانہ ساکن ہو جیسے مَصَابِیْحُ ۔

ان تینوں میں سے کسی وزن پر ہو وہ غیر منصرف کا سبب بن سکتی ہے۔

جمع کی دوسری شرط بغیر ہاء

(۲)... کہ جمع منتہی الجموع کے اوزان میں کوئی ایسا اسم نہ آئے جو "ۃ" کو قبول کرنے والا ہو۔ اسم کے آخر میں ایسی ۃ نہ ہو جو وقف کے وقت ہ بن جاتی ہو جیسے صیاقلة اور فرازنة کہ یہ دونوں منصرف ہیں ہ کے قبول کرنے کی وجہ سے۔

حضاجر کا غیر منصرف ہونا؛

وَ(حَضَاجِرُ)عَلَمًا لِلضَّبُعِ غَيْرُ مُنْصَرِفٍ؛لِأَنَّهُ مَنْقُولٌ عَنِ الْجَمْعِ

(اور (حَضَاجِرُ) جو کہ لکڑ بھگے کا نام ہے غیر منصرف ہے؛ کیونکہ وہ جمع سے منقول ہے) :لفظ "حَضَاجِرُ" اگرچہ بظاہر صیغہ منتہی الجموع پر نہیں ہے لیکن یہ لکڑ بھگے کا علم (خاص نام) ہے اور یہ دراصل "حِضْجَرٌ" کی جمع سے منقول ہے۔ اس لیے جمع سے منقول ہونے کی وجہ سے اسے غیر منصرف مانا جاتا ہے۔ یہاں اگرچہ ظاہری وزن شرط کے مطابق نہیں ہے لیکن معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔

لفظ "سَرَاوِیلُ" (شلوار) کے بارے میں نحویوں کے اقوال ہیں

وَ(سَرَاوِیلُ) إِذَا لَمْ یُصْرَفْ۔ وَھُوَ الْأَکْثَرُ۔ فَقَدْ قِیلَ: إِنَّهُ أَعْجَمِیٌّ حُمِلَ عَلَی مُوَازِنِهِ وَقِیلَ: عَرَبِیٌّ جَمْعُ (سِرْوَالَةٍ) تَقْدِیرًا، وَإِذَا صُرِفَ فَلَا إِشْکَالَ

(اور (سَرَاوِیلُ) جب منصرف نہ ہو۔ اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ تو کہا گیا ہے کہ وہ عجمی ہے اور اپنے وزن پر محمول ہے، اور کہا گیا ہے کہ وہ عربی ہے اور تقدیراً (سِرْوَالَةٍ) کی جمع ہے، اور اگر وہ منصرف ہو تو کوئی اشکال نہیں۔) :

لفظ "سَرَاوِیلُ" (شلوار) کے بارے میں نحویوں کے اقوال ہیں

غالب استعمال عدمِ انصراف :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ عام طور پر اور زیادہ تر استعمال میں لفظ "سَرَاوِیلُ" غیر منصرف ہی آتا ہے۔ یعنی اس پر حالتِ جری میں کسرہ (زیر) نہیں آتا اور یہ تنوین کو بھی قبول نہیں کرتا۔ جیسے آپ کہیں گے: "لَبِسْتُ سَرَاوِیلَ" (میں نے شلوار پہنی)، "نَظَرْتُ إِلَی سَرَاوِیلَ" (میں نے شلوار کی طرف دیکھا)۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ دوسری مثال میں حرفِ جارّ "إِلَی" کے بعد بھی "سَرَاوِیلَ" پر فتحہ آیا ہے، زیر نہیں۔

عجمی الاصل ہونے کا قول :

ایک قول یہ ہے کہ لفظ "سَرَاوِیلُ" دراصل ایک عجمی (غیر عربی) لفظ ہے جس کو عربی میں مستعمل کیا گیا ہے۔ اس قول کے مطابق یہ لفظ اپنے خاص وزن "فَوَاعِیلُ" پر ہے جو کہ صیغہ منتہی الجموع کے اوزان میں سے ایک ہے۔ صیغہ منتہی الجموع وہ جمع ہے جس کے بعد اسی وزن پر کوئی اور جمع نہ آتی ہو اور اس وزن پر آنے والی جمع عام طور پر غیر منصرف ہوتی ہے۔ پس اس رائے کے مطابق "سَرَاوِیلُ" اپنے اس وزنی ساخت کی وجہ سے غیر منصرف ہے، چاہے یہ عربی ہو یا عجمی، لیکن اس قول میں اس کی عجمیت کو بطور خاص وجہ بیان کیا گیا ہے۔

عربی الاصل ہونے کا قول مع تقدیرِ واحد

ایک قول یہ ہے کہ "سَرَاوِیلُ" دراصل ایک عربی لفظ ہے جو کہ واحد "سِرْوَالَةٌ" (شلوار) کی جمع ہے۔ یہاں "تقدیراً" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ "سِرْوَالَةٌ" کا یہ واحد استعمال میں زیادہ معروف نہ ہو یا اب متروک ہو چکا ہو، لیکن لسانی قاعدے کے اعتبار سے "سَرَاوِیلُ" اسی کی جمع مانی جاتی ہے۔ عربی میں بعض اوزان پر آنے والی جمعیں بھی غیر منصرف ہوتی ہیں، جیسے صیغہ منتہی الجموع۔ اگر "سَرَاوِیلُ" کو "سِرْوَالَةٌ" کی جمع مانا جائے اور وہ صیغہ منتہی الجموع کے وزن پر ہو تو اس کا غیر منصرف ہونا قواعد کے مطابق ہے۔ اس قول میں اس کی عربیت کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ اس کا ایک خاص وزن پر جمع ہونا قرار پایا۔

انصراف کی صورت میں کوئی اشکال نہیں :

مصنفؒ آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی وقت یا کسی لغت میں اس لفظ کو منصرف بھی پڑھا جائے (یعنی اس پر زیر اور تنوین آئے)

تو اس میں کوئی نحوی اشکال نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس میں جمعیت کا سبب نہیں پایا جائے گا تو منصرف پڑھنا جائز ہوگا۔

غیر منصرف کا قول ہی راجح ہے

بہر حال، مصنفؒ کا رجحان اس کے عدمِ انصراف (غیر منصرف) کی طرف ہے جیسا کہ انہوں نے فرمایا: "وَهُوَ الْأَكْثَرُ" (اور یہی زیادہ مشہور ہے)۔

جوار کا حکم:

وَنَحْوُ (جَوَارٍ) رَفْعًا وَجَرًّا كَ(قَاضٍ)

(اور (جَوَارٍ) جیسے الفاظ حالت رفعی اور جری میں (قَاضٍ) کی طرح ہیں) لفظ "جَوَارٍ" (لونڈیاں) بھی جمع ہے ("جَارِيَةٌ" کی جمع) اور اس کا وزن "فَوَاعِلُ" ہے۔ ایسے اسماء جن کے آخر میں یاء ہو جس سے پہلے دو حروف ہوں اور وہ دونوں متحرک ہوں (جیسے "جَوَارٍ")، ان کا اعراب حالت رفعی اور جری میں تقدیری ہوتا ہے جیسا کہ لفظ "قَاضٍ" کا ہوتا ہے۔ حالت رفعی میں تقدیراً پیش اور حالت جری میں تقدیراً زیر مانا جاتا ہے جبکہ حالت نصبی میں فتحہ ظاہر ہوتا ہے ("رَأَيْتُ جَوَارِيَ")۔ یہ اگرچہ صیغہ منتہی الجموع پر نہیں ہے لیکن اس کا حکم اس طرح کے دوسرے اسماء کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔

ساتواں سبب ترکیب

التّركيب :شرطه العلميّة، وأن لا يكون بإضافة ولا بإسناد، مثل (بعلبكّ).

ترجمہ :ترکیب :اس کی شرط علم ہونا ہے، اور یہ کہ وہ اضافت کے ذریعے یا اسناد کے ذریعے نہ بنا ہو، جیسے (بَعْلَبَكّ)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی ساتویں علت یعنی "اَلتَّرْكِيبُ" (ترکیب) کی وضاحت فرمارہے ہیں۔

ترکیب کے لغوی معنی:

لغت میں ترکیب کہتے ہیں جوڑنے کو۔

ترکیب کی اصطلاحی تعریف:

نحویین کی اصطلاح میں ترکیب اس کو کہتے ہیں کہ دو اسموں کو جوڑ کر ایک کر لیا گیا ہو اور ان دونوں اسموں میں سے کوئی حرف کو متضمن نہ ہو۔ جیسے بَعْلَبَكّ کہ بعل ایک بُت کا نام ہے اور بک ایک بادشاہ کا ان دونوں اسموں کو ملا کر ایک کر لیا گیا ہے اور دونوں میں سے کوئی بھی اسم حرف کو متضمن نہیں۔

فائدہ:

فائدے کے طور پر ایک بات سمجھ لیں کہ ترکیب کی چھ ۶ قسمیں ہیں:

۱)... مرکب اضافی جیسے غُلَامُ زَیْدٍ۔
۲)... مرکب اسنادی جیسے زَیْدٌ قَائِمٌ ۔
۳)... مرکب توصیفی جیسے رَجُلٌ عَالِمٌ۔
۴)... مرکب صوتی جیسے سِیْبَوَیْهِ۔
۵)... مرکب عددی جیسے خَمْسَةَ عَشَرَ۔
۶)... مرکب امتزاجی یا مرکب منع صرف جیسے بَعْلَبَكّ۔

واضح رہے کہ ان تمام اقسام میں سے صرف مرکب امتزاجی ہی کو اسباب منع صرف میں سبب بنایا جاسکتا ہے لیکن اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ وہ علم ہو اور نسبت اضافی واسنادی نہ ہو جیسے بَعْلَبَكّ۔

غیر منصرف کا سبب بننے کے لیے (۲) دو شرائط

شرطه العلمية، وأن لا يكون بإضافة ولا بإسناد.

یہاں سے صاحب کتاب نے غیر منصرف کا سبب بننے کے لیے (۲) دو شرائط کو بیان فرمایا ہے۔

پہلی شرط:

کہ وہ علم ہو۔

دوسری شرط:

کہ مرکب اضافی واسنادی نہ ہو۔

پہلی شرط کی وجہ:

یہ ہے کہ مرکب امتزاجی ہو اور وہ علم ہو وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز علم بن جاتی ہے تو اس میں تغیر نہیں ہوتا۔

دوسری شرط کی وجہ:

دوسری شرط کہ مرکب اضافی واسنادی نہ ہو وجہ اس کی یہ ہے کہ اضافت اسم غیر منصرف کو منصرف بنادیتی ہے۔
اور مرکب اسنادی نہ ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکیب اسنادی جب کسی کا علم ہو گی تو وہ مبنی ہو گی جبکہ غیر منصرف معرب ہے مبنی نہیں۔

بَعْلَبَكّ:

غیر منصرف ہے۔ کیونکہ یہ دو ۲ اسموں کو ملا کر ایک کر لیا گیا ہے کوئی اسم حرف کو متضمن بھی نہیں تفصیل پیچھے گزر چکی۔

مَعْدِیْکَرِبُ:

غیر منصرف ہے یہ ایک مرد کا نام ہے جو مَعْدِیْ اور کَرِبَ سے مرکب ہے اور دونوں اسموں میں کوئی اسم حرف کو متضمن بھی نہیں اور نہ مرکب اضافی ہے نہ اسنادی ہے بلکہ مرکب امتزاجی یا منع صرف ہے لہٰذا یہ غیر منصرف ہے۔

عبداللہ:

منصرف ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ مرکب اضافی ہے۔

آٹھواں سبب الف ونون زائدتان

الألف والنّون :إن کانا فی اسم فشرطه العلميّة،ك(عمران)، أو فی صفة فانتفاء فعلانة،وقیل :وجود فعلی، ومن ثمّ اختلف فی (رحمان) دون (سکران) و (ندمان).

ترجمہ :الف اور نون :اگر یہ کسی اسم میں ہوں تو اس کی شرط علم ہونا ہے، جیسے (عِمْرَانَ)، یا کسی صفت میں ہوں تو فعلانۃ کے وزن پر (مؤنث) نہ ہونا، اور کہا گیا ہے :فعلی کے وزن پر (مؤنث) کا ہونا، اور اسی وجہ سے (رَحْمَانَ) میں اختلاف کیا گیا ہے نہ کہ (سَكْرَانَ) اور (نَدْمَانَ) میں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی آٹھویں علت یعنی اسم یا صفت کے آخر میں موجود الف اور نون زائدہ کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

کہ کسی اسم میں الف ونون زائد ہوں اصلی نہ ہوں۔ جیسے عمران اور ع ثمان تو یہ غیر منصرف بننے کا سبب ہے کہ علیت اور الف نون زائدتان دو سبب ہیں:

غیر منصرف کا سبب بننے کے لیے شرط:

إن کانا فی اسم فشرطه العلميّة...الخ یہاں سے صاحب کتاب نے دو شرائط ذکر کی ہیں:

پہلی شرط:اسم ذات

إن کانا فی اسم فشرطه العلميّة

یہ ہے کہ اسم علم ہو کیونکہ جب الف نون زائدتان کسی اسم علم کے آخر میں موجود ہوں تو اس وقت اس اسم میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا۔ علیت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

اسم ذات کی تعریف:

اس اسم کو کہتے ہیں جو کسی ذات پر دلالت کرے۔

جیسے مصنفؒ مثال دیتے ہیں :كَ (عِمْرَانَ) (جیسے عمران)۔ لفظ "عِمْرَانَ" ایک علم ہے اور اس کے آخر میں الف اور نون زائدہ ہیں، اس لیے یہ غیر منصرف ہے۔ اگر کسی عام اسم کے آخر میں الف نون زائدہ ہوں تو وہ غیر منصرف نہیں ہوگا۔

دوسری شرط:اسم صفت

أو فی صفة فانتفاء فعلانة،وقیل :وجود فعلی

وہ اسم اگر اسم صفت ہو تو اس کی مؤنث کا فَعْلَانَةٌ کے وزن پر نہ ہونا شرط ہے غیر منصرف بننے کے لیے کیونکہ اگر اس کی مؤنث

فَعْلَانَةٌ کے وزن پر ہو تو اس کے آخر میں ایسی ۃ موجود ہے جو وقف میں ہ بن جاتی ہے اور یہ غیر منصرف میں سبب بننے کے لیے مانع ہے۔
اس بارے میں ایک دوسرا قول بھی ہے کہ صفت میں الف نون زائدہ کے غیر منصرف ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کا مؤنث فَعْلَی کے وزن پر آئے۔

اسم صفت کی تعریف:
اس اسم کو کہتے ہیں جو کسی خاص وصف پر دلالت کرے۔

اختلاف درباره "رَحمان":

ومن ثمّ اختلف في (رحمان) دون (سكران) و (ندمان).

مصنف فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے لفظ (رَحْمَانَ) (بہت رحم کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام) کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ غیر منصرف ہے یا نہیں، جبکہ (سَكْرَانَ) (نشے میں مست) اور (نَدْمَانَ) (پشیمان) کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ "رَحْمَانَ" کے آخر میں الف نون زائدہ ہے۔ پہلے قول کے مطابق اس کا مؤنث "رَحْمَانَةٌ" فعلانة کے وزن پر نہیں آتا، اس لیے یہ غیر منصرف ہونا چاہیے۔ دوسرے قول کے مطابق اس کا مؤنث "رَحْمَى" فعلَى کے وزن پر نہیں آتا (بلکہ "رَحْمَةٌ" آتا ہے)، اس لیے اسے غیر منصرف نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم، اکثر نحوی اسے علم بالغلبہ (بطور اسم خاص استعمال ہونے) کی وجہ سے غیر منصرف مانتے ہیں۔

سکران:
جبکہ "سَكْرَانَ" کا مؤنث "سَكْرَانَةٌ" فعلانة کے وزن پر نہیں آتا ہے، اس لیے پہلے قول کے مطابق یہ غیر منصرف ہے۔ دوسرے قول کے مطابق اس کا مؤنث "سَكْرَى" فعلَى کے وزن پر آتا ہے، اس لیے ان کے ہاں بھی یہ غیر منصرف ہونا چاہیے۔

"نَدْمَانَ"
"نَدْمَانَ" کا مؤنث "نَدْمَانَةٌ" فعلانة کے وزن پر آتا ہے، لہذا یہ بھی پہلے قول کے مطابق منصرف ہے۔ اس کا مؤنث "نَدْمَى" فعلَى کے وزن پر نہیں آتا، اس لیے دوسرے قول کے مطابق بھی یہ منصرف ہی رہے گا۔ اسی لیے ان دو الفاظ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

فائدہ:
نَدْمَانٌ بمعنی ہمنشین منصرف ہے۔ اور اگر یہ نَدْمَانٌ، نَادِمٌ بمعنی پشیماں ہونے کے معنی میں ہو تو بالاتفاق غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اس میں دو سبب پائے جا رہے ہیں: (۱) وصف اور (۲) الف نون زائدتان اس لیے کہ اس کی مؤنث نَدْمَانَةٌ نہیں آتی بلکہ نَدْمٰی آتی ہے۔

نواں سبب وزن فعل

وزن الفعل :شرطه أن يختصّ بالفعل،ك(شمّر)،و(ضرب)،أو يكون في أوّله زيادة كزيادته غير قابل للتّاء،ومن ثمّ امتنع (أحمر)،وانصرف(يعمل)،

ترجمہ :فعل کا وزن :اس کی شرط یہ ہے کہ وہ فعل کے ساتھ خاص ہو، جیسے (شَمَّرَ)، اور (ضَرَبَ)، یا اس کے شروع میں ایسی زیادتی ہو جیسے اس کی زیادتی تاء کو قبول نہ کرے، اور اسی وجہ سے (أَحْمَرُ) (لال) غیر منصرف ہوا، اور (يَعْمَلُ) (وہ کام کرتا ہے) منصرف ہوا۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے غیر منصرف ہونے کی نویں اور آخری علت یعنی "وَزْنُ الْفِعْلِ" (فعل کا وزن) کی وضاحت فرمارہے ہیں۔

غیر منصرف بننے کی پہلی شرط؛

شرطه أن يختصّ بالفعل،ك(شمّر)،و(ضرب)،

وزن فعل یعنی فعل کے وزن پر ہونا شرط ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے وہ فعل ہی کے وزن پر ہو، اور نہ پایا جاتا ہو اس میں مگر فعل سے نقل ہو کر جیسے "شَمَّرَ" یہ حجاج کے گھوڑے کا نام ہے اور "ضُرِبَ" یہ ماضی مجہول ہے اور اگر "ضُرِبَ" کسی شخص کا نام رکھ دیا جائے تو یہ بھی غیر منصرف ہوگا۔

واضح رہے کہ فعل ماضی معروف مبنی ہے وہ غیر منصرف نہیں بن سکتی۔

غیر منصرف بننے کی دوسری شرط؛

أو يكون في أوّله زيادة كزيادته غير قابل للتّاء،ومن ثمّ امتنع (أحمر)،

یہاں سے صاحب کتاب نے غیر منصرف کا سبب بننے کے لیے دوسری شرط کو ذکر فرمایا کہ اگر فعل کے ساتھ خاص نہ ہو تو اس کے شروع میں حروف مضارع میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ حرف مضارع چار ہیں۔(۱)۔"ء" (۲)۔"ت"۔ (۳)۔"ی"۔(۴)۔"ن"۔ کہ مجموعہ ان کا اتین ہے۔

لیکن اس دوسری شرط میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس فعل میں ایسی "ۃ" نہ ہو جو حالت وقف میں "ہ" بن جاتی ہے۔ جیسے احمر اس میں تمام شرائط موجود تو یہ غیر منصرف ہے، اسی طرح احمد یشکر تغلب نرجس یہ سب غیر منصرف ہیں۔

وانصرف (يعمل)، یعمل منصرف ہے؛

کیونکہ اہل عرب کا قول ہے "نَاقَةٌ يَعْمَلَةٌ" تو اس کے آخر میں ایسی "ۃ" موجود ہے جو وقف میں "ہ" بن جاتی ہے لہذا غیر منصرف نہیں بن سکتا۔

دو اہم ضابطے

وما فيه علميّة مؤثّرة إذا نكّر صرف، لما تبيّن من أنّها لا تجامع مؤثّرة إلاّ ما هي شرط فيه، إلاّ العدل ووزن الفعل، وهما

متضادّان، فلا یکون إلاّ أحدھما. فإذا نکّر بقی بلا سبب، أو علی سبب واحد. وخالف سیبویہ الأخفش فی مثل (أحمر) علما إذا نکّر اعتبارا للصّفۃ الأصلیّۃ بعد التّنکیر، ولا یلزمہ باب (حاتم)، لما یلزم من اعتبار المتضادّین فی حکم واحد. وجمیع الباب باللاّم أو الإضافۃ ینجرّ بالکسر.

ترجمہ :اور وہ (اسم) جس میں موثر علیت ہو جب وہ نکرہ کیا جائے تو منصرف ہو جاتا ہے؛ اس لیے کہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ وہ کسی موثر (علت) کے ساتھ جمع نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ اس میں شرط ہو، سوائے عدل اور وزن فعل کے، اور یہ دونوں متضاد ہیں، پس ان میں سے ایک ہی ہو سکتا ہے۔ پس جب وہ نکرہ کیا جائے تو بغیر سبب کے باقی رہتا ہے، یا ایک سبب پر۔ اور سیبویہ نے اخفش کی مخالفت کی ہے جیسے (أَحْمَرَ) علم ہونے کی صورت میں جب وہ نکرہ کیا جائے تو اصلی صفت کا اعتبار کرتے ہوئے تنکیر کے بعد، اور اس پر (حَاتِمٍ) کا باب لازم نہیں آتا؛ اس تضاد کی وجہ سے جو ایک ہی حکم میں دو متضاد چیزوں کے اعتبار سے لازم آتا ہے۔ اور اس باب کے تمام (اسماء) لام کے ساتھ یا اضافت کے ساتھ زیر کے ساتھ مجرور ہوتے ہیں۔

تشریح:

اس عبارت میں مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے دو انتہائی اہم ضابطے بیان فرمائے ہیں۔

وما فیہ علمیّۃ مؤثّرۃ إذا نکّر صرف، لما تبیّن من أنّھا لا تجامع مؤثّرۃ إلاّ ما ھی شرط فیہ، إلاّ العدل ووزن الفعل، وھما متضادّان، فلا یکون إلاّ أحدھما. فإذا نکّر بقی بلا سبب، أو علی سبب واحد.

پہلا ضابطہ:

یہ ہے کہ وہ غیر منصرف جس میں علیت شرط ہے اور وہ چار اسباب ہیں: (۱) تانیث (۲) عجمہ (۳) ترکیب (۴) الف ونون زائدتان، اور وہ غیر منصرف جس میں علیت شرط نہیں بلکہ اتفاقاً جمع ہو گئی ہو اور وہ دو اسباب ہیں: (۱) عدل (۲) وزن فعل تو ان کا حکم یہ ہے کہ جب ان اسباب کو نکرہ بنایا جائے گا تو یہ منصرف ہو جائیں گے جن اسباب میں علیت شرط وہ تو اس لیے منصرف ہو جائیں گے کہ بغیر کسی سبب کے باقی رہ جائیں گے تو اذا عدم الشرط عدم المشروط اور جن اسباب میں علیت شرط نہیں ان میں غیر منصرف کا ایک سبب رہ جائے گا اور ایک سبب سے اسم غیر منصرف نہیں بنتا۔

مثالیں یہ ہیں

غیر منصرف	منصرف
جَاءَنِیْ طَلْحَةُ	وَطَلْحَةٌ اٰخَرَ
قَامَ عُمَرُ	وَعُمَرٌ اٰخَرَ
وَضَرَبَ أَحْمَدُ	وَأَحْمَدٌ اٰخَرَ

وجہ:

جب کوئی اسم جو علیت کی وجہ سے غیر منصرف تھا، اسے نکرہ کر دیا جاتا ہے تو اس میں غیر انصراف کی وجہ ختم ہو جاتی ہے (کیونکہ علیت باقی نہیں رہتی) اور وہ بغیر کسی سبب کے یا صرف ایک سبب کے ساتھ منصرف ہو جاتا ہے۔

احمر کے متعلق اختلافِ سیبویہ و اخفش:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام سیبویہؒ نے امام اخفشؒ سے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے۔ سیبویہؒ کے نزدیک اگر لفظ "أَحْمَرَ" (جو کہ فعل کے وزن اور وصف پر ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے) کسی خاص شخص کا نام بن جائے (وصف ختم ہو کر علم ہو جائے) اور پھر اسے نکرہ استعمال کیا جائے (مثلاً کہا جائے "رَأَيْتُ أَحْمَرَ" یعنی میں نے ایک سرخ رنگ والے کو دیکھا، جہاں "احمر" کسی خاص شخص کے لیے استعمال نہیں ہو رہا)، تو سیبویہؒ کے نزدیک پھر بھی یہ غیر منصرف ہو جائے گا، کیونکہ اب اس میں علمیت نہیں رہی لیکن اس کی اصلی صفت (لال ہونا) کا اعتبار کیا جائے گا تو دو اسباب منع صرف موجود ہیں (1) وزن فعل (2) وصف۔ جبکہ امام اخفشؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کے نزدیک تنکیر کے بعد بھی اس میں وصف کے لوٹنے کا اعتبار نہیں ہوگا لہٰذا یہ منصرف ہوگا۔

بابِ "حَاتِم" پر اعتراض :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر سیبویہؒ کا قول تسلیم کر لیا جائے تو ان پر بابِ "حَاتِم" کے ذریعے اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اگر وہ وصف کے لوٹنے کا اعتبار کرتے ہیں تو پھر حاتم جو کہ اصل معنی میں وصف ہے اگر وہ کسی کا علم ہو جائے تو پھر غیر منصرف ہونا چاہیے کیونکہ وصف اور علم دو اسباب ہوں گے تو یہ غیر منصرف بن جائے گا صاحب کافیہ فرماتے ہیں کہ یہ قول درست نہیں کیونکہ جب کوئی وصف کسی کا علم بن جائے تو پھر وصفی معنی باقی نہیں رہتا کیونکہ وصف اور علم آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں کیونکہ وصف کسی صفتی معنی پر دلالت کرتی ہے اور علم ذات پر دلالت کرتا ہے تو یہ دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

دوسرا ضابطہ

وجميع الباب باللام أو الإضافة ينجرّ بالكسر.

... صاحب کتاب نے دوسرا ضابطہ یہ بیان فرمایا کہ ہر غیر منصرف جبکہ اس کی اضافت کی جائے یا اس پر الف لام داخل ہو تو اس پر کسرہ آسکتا ہے۔

دخول کسرہ کی وجہ:

وجہ اس کی یہ ہے کہ وزن فعل کی مشابہت ہے فعل کے ساتھ اور جب وزن فعل کی اضافت کی جائے یا اس پر الف لام آجائے تو مشابہت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اضافت اور الف لام یہ اسم کی علامات ہیں جب مشابہت ختم ہوئی تو حکم بھی تبدیل ہو جائے گا۔

مثال جیسے :اضافت کی مثال :" مَرَرْتُ بِأَحْمَدِكُمْ "

اس مثال میں " كُمْ " ضمیر کی طرف " أَحْمَدِ " کی "اضافت" ہو رہی ہے۔

"مَرَرْتُ بِالْأَحْمَدِ" یہاں پر "الاحمد" "معرف باللام" ہے جس کی وجہ سے مکسور ہے۔

المرفوعات

هو ما اشتمل على علم الفاعليّة.

ترجمہ :مرفوعات وہ (اسم) ہے جو فاعلیت کی علامت پر مشتمل ہو۔

تشریح

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے علم نحو کے ایک نئے باب کا آغاز فرمارہے ہیں جو "اَلْمَرْفُوْعَاتُ" (مرفوعات) کے بیان میں ہے۔ مرفوعات سے مراد وہ اسماء ہیں جو جملے میں ایک خاص اعرابی حالت میں ہوتے ہیں جسے رفع کہتے ہیں اور جس کی ظاہری علامت عام طور پر پیش (ضمہ) ہوتی ہے۔

نحو کے تین مقاصد؛

پہلا مقصد:...مرفوعات کے بیان میں ہے۔دوسرا مقصد:...منصوبات کے بیان میں ہے۔ تیسرا مقصد:...مجرورات کے بیان میں ہے۔

اعتراض:

مرفوعات کو منصوبات اور مجرورات پر کیوں مقدم کیا؟

جواب:

اس کا یہ ہے کہ جملے میں مرفوع اصل ہے کیونکہ ترکیب اسنادی۔ مسند الیہ مرفوع ہے، مرفوع عمدہ ہے جبکہ منصوبات اور مجرورات میں مسند الیہ بننے کی صلاحیت نہیں اس لیے مرفوعات کو مقدم کیا۔

مرفوع کی تعریف؛

مصنفؒ مرفوعات کی ایک جامع تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرفوع وہ اسم ہے جو فاعلیت کی علامت پر مشتمل ہو۔

اس مختصر سے جملے میں امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ نے تمام مرفوعات کا جوہر بیان فرمادیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جملے میں جو بھی اسم ایسی نحوی حیثیت رکھتا ہو جس سے کسی فعل کے کرنے والے (فاعل) یا کسی مبتدا کی خبر دینے والے (خبر) یا کسی اور طرح کی اسناد کا فاعل ہونا سمجھا جائے، وہ مرفوع کہلائے گا۔اس تعریف کی روشنی میں علم نحو میں آنے والے تمام مرفوعات شامل ہو جاتے ہیں،

جیسے:اَلْفَاعِلُ (فاعل) :وہ اسم جو کسی فعل کے کرنے والے پر دلالت کرے، جیسے "جَاءَ زَيْدٌ" (زید آیا) میں "زَيْدٌ" فاعل ہے اور مرفوع ہے۔

نَائِبُ الْفَاعِلِ (نائب فاعل) :وہ اسم جو اس وقت فاعل کی جگہ لے جب فاعل معلوم نہ ہو یا اسے ذکر نہ کیا گیا ہو، جیسے "ضُرِبَ زَيْدٌ" (زید مارا گیا) میں "زَيْدٌ" نائب فاعل ہے اور مرفوع ہے۔

اَلْمُبْتَدَأُ (مبتدا) :وہ اسم جس سے جملہ اسمیہ شروع ہو اور جس کے بارے میں کوئی خبر دی جائے، جیسے "زَيْدٌ قَائِمٌ" (زید کھڑا ہے) میں "زَيْدٌ" مبتدا ہے اور مرفوع ہے۔

اَلْخَبَرُ (خبر) :وہ اسم یا جملہ جو مبتدا کے بارے میں کوئی اطلاع دے، جیسے "زَيْدٌ قَائِمٌ" میں "قَائِمٌ" خبر ہے اور مرفوع

ہے۔

اِسْمُ كَانَ وَأَخَوَاتِهَا (کان اور اس کے اخوات کا اسم) :وہ اسم جو کان اور اس کے مشابہ افعال کے بعد آئے اور ان کا فاعل یا مبتدا بنے، جیسے "كَانَ زَيْدٌ قَائِمًا" (زید کھڑا تھا) میں "زَيْدٌ" اسم کان ہے اور مرفوع ہے۔

خَبَرُ إِنَّ وَأَخَوَاتِهَا (اِن اور اس کے اخوات کی خبر) :وہ اسم جو اِن اور اس کے مشابہ حروف کے بعد آئے اور ان کی خبر بنے، جیسے "إِنَّ زَيْدًا قَائِمٌ" (بے شک زید کھڑا ہے) میں "قَائِمٌ" خبر اِن ہے اور مرفوع ہے۔

مصنفؒ کی یہ تعریف اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ رفع کی حالت جملے میں فاعل کی بنیادی حیثیت کو ظاہر کرتی ہے، چاہے وہ صراحتاً فاعل ہو، اس کا قائم مقام ہو، یا کسی جملہ اسمیہ کا مبتدا ہو جس کے بارے میں خبر دی جا رہی ہو۔ گویا رفع ایک ایسی اعرابی حالت ہے جو کلام میں کسی اسم کی ابتدائی یا اساسی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے۔

پہلا مرفوع(الفاعل):

فمنه الفاعل :وهو ما أسند إليه الفعل أو شبهه، وقدّم عليه على جهة قيامه به، مثل: (قام زيد)، و(زيد قائم أبوه). والأصل أن يلي فعله، فلذلك جاز (ضرب غلامه زيد) وامتنع (ضرب غلامه زيدا).

ترجمہ :پس ان مرفوعات میں سے فاعل ہے :اور وہ (اسم) ہے جس کی طرف فعل یا اس کے مشابہ (اسم فعل، اسم فاعل، صفت مشبہ وغیرہ) کی اسناد کی جائے، اور وہ (اسم) اس (فعل یا شبہ فعل) پر مقدم ہو اس حیثیت سے کہ وہ اس (فعل) کے ساتھ قائم ہو۔ جیسے :(قَامَ زَيْدٌ) (زید کھڑا ہوا)، اور (زَيْدٌ قَائِمٌ أَبُوهُ) (زید کھڑا ہے، اس کا باپ)۔ اور اصل یہ ہے کہ وہ اپنے فعل کے فوراً بعد آئے، پس اسی لیے (ضَرَبَ غُلَامَهُ زَيْدٌ) جائز ہے اور (ضَرَبَ غُلَامَهُ زَيْدًا) منع ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، مرفوعات کی اقسام بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے فاعل کا ذکر فرما رہے ہیں۔

فاعل کو باقی مرفوعات پر مقدم کرنے کی وجہ:

پہلی وجہ:

فاعل کو باقی تمام مرفوعات پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر نحویین کے نزدیک فاعل ہی جملے میں اصل ہوتا ہے کیونکہ یہ جملہ فعلیہ کا جز بنتا ہے اور جملہ فعلیہ اصل ہے۔

دوسری وجہ:

یہ ہے کہ فاعل کا عمل قوی ہے کیونکہ اس کا عامل لفظی ہے اور لفظی عامل قوی ہوتا ہے لہٰذا فاعل مقدم رہے گا۔

تیسری وجہ:

تیسری وجہ تقدیم یہ ہے کہ فاعل کو حذف کرنا جائز نہیں یعنی صرف فعل کو ذکر کیا جائے اور فاعل کو ذکر ہی نہ کیا جائے ایسا

نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ فاعل قوی ہے اور قوی کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

فاعل کی تعریف:

الفاعل :وهو ما أسند إليه الفعل أو شبهه، وقدّم عليه على جهة قيامه به، مثل: (قام زيد)، و(زيد قائم أبوه).

یعنی فاعل ہر وہ اسم ہے کہ اس کی طرف فعل یا شبہ فعل کی نسبت کی جارہی ہو اس طرح کہ وہ فعل و شبہ فعل اس فاعل پر مقدم ہو اور اسی فاعل کے ساتھ قائم ہو نہ یہ کہ اس پر واقع ہو جیسے قَامَ زَيْدٌ کہ اس مثال میں قیام کی نسبت زید کی طرف ہو رہی ہے، و(زيد قائم أبوه)۔ میں قائم کی نسبت ابوہ کی طرف ہو رہی ہے'۔

فوائد وقیود:

الفاعل :وهو ما؛ یہ اسم جنس ہے تمام اسمآئے مرفوعہ اس میں داخل ہیں۔

أسند إليه الفعل أو شبهه، وقدّم عليه؛ یہ کل اسم سے پہلی فصل ہے اس سے فاعل کے علاوہ تمام مرفوعات خارج ہو گئے۔

على جهة قيامه به ؛ یہ دوسری فصل ہے اس کے ذریعے نائب فاعل کو خارج کیا گیا کیونکہ نائب فاعل کے ساتھ فعل قائم نہیں ہوتا بلکہ اس پر واقع ہوتا ہے۔

وضاحت؛

اس تعریف کی وضاحت کے لیے مصنفؒ دو مثالیں دیتے ہیں: (قَامَ زَيْدٌ) (زید کھڑا ہوا) :اس مثال میں "قَامَ" فعل ہے اور "زَيْدٌ" اسم ہے۔ فعل "قَامَ" کی اسناد "زَيْدٌ" کی طرف کی گئی ہے، یعنی کھڑے ہونے کا کام زید نے انجام دیا ہے۔ لہٰذا "زَيْدٌ" فاعل ہے اور مرفوع ہے۔ (زَيْدٌ قَائِمٌ أَبُوهُ) (زید کھڑا ہے، اس کا باپ) :اس مثال میں "زَيْدٌ" مبتدا ہے اور "قَائِمٌ" اسم فاعل (شبہ فعل) ہے۔ اسم فاعل "قَائِمٌ" کی اسناد اسم "أَبُوهُ" (اس کا باپ) کی طرف کی گئی ہے، یعنی کھڑے ہونے کا کام اس کے باپ سے سرزد ہوا ہے۔ یہاں "أَبُوهُ" اسم فاعل "قَائِمٌ" کا فاعل ہے اور مرفوع ہے۔

فاعل کا اپنے فعل سے متصل ہونا؛

والأصل أن يلي فعله، فلذلك جاز (ضرب غلامه زيد) وامتنع (ضرب غلامه زيدا).

مصنفؒ فاعل کی جگہ کے بارے میں ایک اہم قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ فاعل اپنے فعل کے فوراً بعد آئے۔ یعنی عام طور پر فعل پہلے ذکر کیا جاتا ہے اور فاعل اس کے بعد۔ اسی اصول کی بنا پر ایک مثال کو جائز اور دوسری کو ناجائز قرار دیتے ہیں: (ضَرَبَ غُلَامَهُ زَيْدٌ) جائز ہے :اس جملے کا ترجمہ ہے "زید نے اپنے غلام کو مارا"۔ یہاں "ضَرَبَ" فعل ہے، "غُلَامَهُ" مفعول بہ ہے اور "زَيْدٌ" فاعل ہے۔ اگرچہ مفعول بہ فاعل سے پہلے آیا ہے لیکن اس صورت میں جواز ہے کیونکہ فاعل اپنے فعل "ضَرَبَ" کے فوراً بعد آیا ہے اگرچہ لفظوں میں مؤخر ہے لیکن رتبے میں مقدم ہے تو اضمار قبل الذکر فقط لفظا ہوا اور یہ جائز ہے۔

(ضَرَبَ غُلَامُهُ زَيْدًا) :اس جملے کا ترجمہ ہے مارا زید کو اس کے غلام نے یہ ترکیب منع ہے :

کیونکہ اس میں اضمار قبل الذکر لفظا ورتبتا ہر اعتبار سے لازم آتا ہے اور یہ ناجائز ہے کیونکہ ہ ضمیر کا مرجع زیدا ہے اور وہ مفعول ہے۔۔

فاعل تقدیم وتاخیر کی وجوبی صورتیں

وإذا انتفى الإعراب لفظا فيهما والقرينة، أو كان مضمرا متّصلا، أو وقع مفعوله بعد (إلّا) أو معناها، وجب تقديمه. وإذا اتّصل به ضمير مفعول، أو وقع بعد (إلّا) أو معناها، أو اتّصل مفعوله وهو غير متّصل به، وجب تأخيره.

ترجمہ :اور جب ان دونوں (فاعل اور مفعول) میں اعراب لفظًا نہ پایا جائے اور نہ کوئی قرینہ ہو، یا (فاعل) ضمیر متصل ہو، یا اس کا مفعول (إلّا) یا اس کے معنی میں آنے والے حروف کے بعد واقع ہو، تو اس کا مقدم ہونا واجب ہے۔اور جب اس (فعل) کے ساتھ مفعول کی ضمیر متصل ہو جائے، یا (فاعل) (إلّا) یا اس کے معنی میں آنے والے حروف کے بعد واقع ہو، یا اس کا مفعول اس کے ساتھ متصل ہو حالانکہ (فاعل) اس کے ساتھ متصل نہ ہو، تو اس کا مؤخر ہونا واجب ہے۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں فاعل اور مفعول کی ترتیب کے بارے میں کچھ احکام بیان فرمار ہے ہیں کہ کن صورتوں میں فاعل کا فعل پر مقدم ہونا ضروری ہے اور کن صورتوں میں مؤخر ہونا لازم ہے۔

فاعل کو مفعول پر مقدم کرنا واجب ہونے کی صورتیں

مصنفؒ نے چار ایسی صورتیں بیان کی ہیں جہاں فاعل کو مفعول پر مقدم کرنا (پہلے لانا) واجب ہوتا ہے

پہلی صورت؛وإذا انتفى الإعراب لفظا فيهما والقرينة،

اگر جملے میں فاعل اور مفعول دونوں کا اعراب (رفع یا نصب) ظاہر نہ ہو (مثلاً یہ دونوں ایسے اسماء ہوں جن پر اعراب ظاہر نہیں ہوتا جیسے 'موسیٰ' یا 'لیلیٰ') اور کوئی سیاق و سباق (قرینہ) بھی ایسا نہ ہو جو یہ واضح کرے کہ کون فاعل ہے اور کون مفعول، تو ایسے میں فاعل کو پہلے لانا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ جملے کا معنی واضح رہے۔

*مثال : * "ضرب موسیٰ عیسیٰ" * یہاں اگر فاعل کو مقدم نہ کیا جائے تو یہ سمجھنا مشکل ہو جائے گا کہ کس نے کس کو مارا۔ لہٰذا، "موسیٰ" (فاعل) کو "عیسیٰ" (مفعول) پر مقدم کرنا واجب ہے۔

فائدہ؛

قرینہ کی تعریف:

یہ ہے کہ جو بغیر وضع تعیینِ مراد یا حذفِ محذوف پر دلالت کرے۔

قرینہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) قرینہ لفظیہ۔(۲) قرینہ معنویہ۔

(۱)...قرینہ لفظیہ وہ ہیں جس میں قرینہ لفظوں میں موجود ہو جیسے ضَرَبَتْ مُوسٰی حُبْلٰی "مارا موسیٰ کو حبلیٰ نے" اس مثال

میں ضَرَبَتْ کا فاعل حُبْلیٰ ہے یہاں قرینہ لفظیہ موجود ہے جو دلالت کرتا ہے حُبْلیٰ کے فاعل بننے پر کہ ضَرَبَتْ کا فاعل حُبْلیٰ ہے۔

(۲)...قرینہ معنویہ وہ یہ ہے کہ قرینہ لفظوں میں موجود نہ ہو بلکہ معنوی طور پر موجود ہو۔جیسے اَکَلَ الْکُمَّثْرٰی یَحْیٰی یہاں قرینہ معنوں میں موجود ہے کہ یحییٰ نے ناشپاتی یا امرود کھایا۔اس لیے کہ کھانے کی صلاحیت یحییٰ میں ہے کھانا یحییٰ کا کام ہے نا کہ ناشپاتی کا۔

دوسری صورت،أو کان مضمرا متّصلا،

اگر فاعل ایک ضمیر کی صورت میں ہو اور وہ ضمیر فعل کے ساتھ ملی ہوئی (متصل) ہو، تو فاعل کو مفعول پر مقدم کرنا واجب ہے تاکہ وہ ضمیر متصل ہی رہے، ورنہ وہ الگ (منفصل) ہو جائے گی جو نحوی اعتبار سے درست نہیں ہو گی۔

*مثال : * "ضربت زیداً" (میں نے زید کو مارا)۔ *یہاں "تُ" (فاعل کی ضمیر) فعل "ضرب" کے ساتھ متصل ہے، اور "زیدًا" مفعول ہے۔لہٰذا، "ضربتُ" کو "زیدًا" پر مقدم کرنا واجب ہے۔اگر ہم "ضرب زیدًا تُ" کہیں تو "تُ" اپنی اصلی حالت میں نہیں رہے گی یعنی منفصل ہو جائے گا۔

تیسری صورت أو وقع مفعوله بعد (إلا)

یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب جملے میں حصر (کسی چیز کو کسی ایک تک محدود کرنا) "اِلّا" کے ذریعے کیا جائے۔ یعنی، جب فعل کا اثر صرف اور صرف فاعل پر محدود کرنا مقصود ہو، تو مفعول کو "اِلّا" کے بعد لایا جاتا ہے۔ایسے جملوں میں فاعل کو مفعول پر مقدم کرنا واجب ہے تاکہ حصر کا مقصد پورا ہو سکے۔اگر مفعول کو مقدم کر دیا جائے تو حصر کا مقصد فوت ہو جائے گا اور معنی بگڑ جائے گا۔

*مثال : * "ما ضرب زیدٌ إلا عمرًوا" (زید نے صرف عمر کو مارا)۔ *یہاں "زیدٌ" فاعل ہے اور "عمرًا" مفعول ہے جو "اِلّا" کے بعد آیا ہے۔اگر ہم "ما ضرب عمرًا إلا زیدٌ" کہیں تو یہ "قلبِ مقصود" ہو جائے گا، یعنی زید کے مارنے کا فعل عمر پر محدود کرنے کے بجائے، عمر کے مارے جانے کا فعل زید پر محدود ہو جائے گا، جو کہ غلط ہو گا۔

چوتھی صورت أو معناها،

یہ صورت بھی حصر سے متعلق ہے، لیکن یہاں "اِلّا" کی بجائے کوئی ایسا کلمہ یا جملہ استعمال ہو جس کا معنی "صرف" کا ہو (جیسے "إنما")۔ایسے جملوں میں بھی وہی اصول لاگو ہوتا ہے جو "اِلّا" والی صورت میں تھا۔ فاعل کو مقدم کرنا واجب ہے تاکہ حصر کا مقصد فوت نہ ہو۔

*مثال : * "إنما ضرب زیدٌ عمرًوا" (بیشک زید نے صرف عمر کو مارا)۔ *"زیدٌ" (فاعل) کو "عمرًا" (مفعول) پر مقدم کرنا واجب ہے تاکہ حصر کا مقصد برقرار رہے۔

مفعول کو فاعل پر مقدم کرنا واجب ہونے کی صورتیں

مصنفؒ نے چار ایسی صورتیں بیان کی ہیں جہاں مفعول کو فاعل پر مقدم کرنا (پہلے لانا) واجب ہوتا ہے :

پہلی صورت وإذا اتّصل به ضمير مفعول،

اگر مفعول ایک ضمیر کی صورت میں ہو اور وہ ضمیر فعل کے ساتھ متصل ہو، تو مفعول کو فاعل پر مقدم کرنا واجب ہے۔

*مثال : * "ضَرَبَنِي زيدٌ" (زید نے مجھے مارا)۔ * یہاں "ی" (ضمیرِ مفعول) فعل "ضرب" کے ساتھ متصل ہے۔ "زیدٌ" فاعل ہے۔ اگر ہم "ضَرَبَ زیدٌ ایای" کہیں تو ضمیر منفصل ہو جائے گی، جو کہ اس موقع پر درست نہیں ہے۔ للذا "ضَرَبَنِي" کو "زیدٌ" پر مقدم کرنا واجب ہے۔

دوسری صورت أو اتّصل مفعوله وهو غير متّصل به

یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب فعل کے ساتھ مفعول کی ضمیر متصل ہو اور فاعل کی ضمیر متصل نہ ہو

اس صورت میں اگر مفعول کو مقدم نہ کیا جائے تو "متصل کو منفصل کرنا" لازم آئے گا، اور یہ نحوی اعتبار سے جائز نہیں۔

*مثال : * "ضربك زيد" (تجھے زید کا مارنا)۔ اگر اس کو ضرب زیدك پڑھا جائے تو ضمیر متصل منفصل ہو جائے گی۔

تیسری صورت أو وقع بعد (إلاّ)

یہ حصر کی ایک اور صورت ہے جہاں فعل کا اثر صرف فاعل پر محدود نہیں کیا جاتا بلکہ مفعول پر محدود ہوتا ہے۔ جب فاعل "إلّا" کے بعد آئے تو مفعول کو فاعل پر مقدم کرنا واجب ہوتا ہے تاکہ حصر کا مقصد صحیح طور پر ادا ہو اور "قلبِ مقصود" نہ ہو، یعنی معنیٰ کا الٹ جانا نہ ہو۔

*مثال : "ما ضرب عمروًا إلا زيدٌ" (عمر کو صرف زید نے مارا)۔ * یہاں "عمرًا" (مفعول) کو "زیدٌ" (فاعل) پر مقدم کرنا واجب ہے جو "إلّا" کے بعد آیا ہے۔ اگر مفعول کو مقدم نہ کیا جائے تو یہ ہوگا "ما ضربَ زیدٌ إلا عمرًا" جو کہ غلط ہے۔

چوتھی صورت أو معناها،

* یہ بھی حصر کی صورت ہے، جہاں فاعل کو کسی کلمہ حصر کے بعد لایا جائے (جیسے 'إنما')۔ ایسے جملوں میں مفعول کو فاعل پر مقدم کرنا واجب ہے تاکہ حصر کا مقصد صحیح رہے۔ اگر مفعول کو مقدم نہ کیا جائے تو معنیٰ بگڑ جائے گا۔

*مثال : * "إنما ضربَ عمرًا زيدٌ" (عمر کو صرف زید نے مارا)۔ * "عمرًا" (مفعول) کو "زیدٌ" (فاعل) پر مقدم کرنا واجب ہے، کیونکہ "زیدٌ" (فاعل) "إنما" کے ذریعے حصر کا حصہ بن رہا ہے۔

حزفِ فعل کی جوازی اور وجوبی صورتیں

وقد يحذف الفعل لقيام قرينة جوازا في مثل (زيد) لمن قال :(من قام؟)، و

ليبك يزيد، ضارع لخصومة ... ومختبط مما تطيح الطوائح

ووجوبا في مثل قوله تعالى :{وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ} وقد يحذفان معا في مثل :(نعم) لمن قال :(أقام زيد؟).

ترجمہ :اور کبھی فعل قرینہ کے موجود ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا جاتا ہے، جواز کے طور پر جیسے (زید) اس شخص کے جواب

میں جس نے کہا : (کون کھڑا ہوا؟)، اور جیسے یہ شعر: چاہئے کہ رویا جائے یزید (کون روئے؟،) جھگڑے کے وقت عاجزرہ جانے والا؛۔ اور آفات میں ہلاک ہونے سے بے وسیلہ سوال کرنے والا۔ اور وجوب کے طور پر جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول :{اور اگر مشرکوں میں سے کوئی ایک}۔ اور کبھی فعل اور فاعل دونوں ایک ساتھ حذف کر دیے جاتے ہیں جیسے :(ہاں) اس شخص کے جواب میں جس نے کہا :(کیا زید کھڑا ہوا؟)۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے فعل کے حذف ہونے کے بارے میں احکام بیان فرما رہے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ فعل کو بعض اوقات کلام میں سے حذف کر دیا جاتا ہے۔ یہ حذف کبھی جائز ہوتا ہے اور کبھی واجب۔

فعل کا جوازاً حذف ہونا :

مصنفؒ اس کی دو مثالیں دیتے ہیں:

پہلی مثال؛

(زَيْدٌ) لِمَنْ قَالَ :(مَنْ قَامَ؟) (زید اس شخص کے جواب میں جس نے کہا :کون کھڑا ہوا؟) :جب کوئی شخص سوال کرے کہ "کون کھڑا ہوا؟" اور جواب میں صرف "زیدٌ" کہا جائے تو دراصل یہاں فعل "قَامَ" (کھڑا ہوا) محذوف ہے، اور جملہ دراصل یوں تھا :"قَامَ زَيْدٌ" (زید کھڑا ہوا)۔ چونکہ سوال میں فعل کا ذکر موجود ہے، اس لیے جواب میں قرینہ موجود ہونے کی وجہ سے فعل کو حذف کرنا جائز ہے۔

دوسری مثال؛

لِيُبْكَ يَزِيدُ، ضَارِعٌ لِخُصُومَةٍ. وَمُخْتَبِطٌ مِمَّا تُطِيحُ الطَّوَائِحُ

:چاہئے کہ رویا جائے یزید (کون روئے؟،) جھگڑے کے وقت عاجزرہ جانے والا؛۔ اور آفات میں ہلاک ہونے سے بے وسیلہ سوال کرنے والا۔ اس شعر میں "ضَارِعٌ" سے پہلے فعل "لِيُبْكَ" موجود ہے، جس پر سوال مقدر قرینہ ہے تقدیری عبارت؛

لِيُبْكَ يَزِيدُ، (ای من یبکیہ) (یبکی) ضَارِعٌ لِخُصُومَةٍ. وَمُخْتَبِطٌ مِمَّا تُطِيحُ الطَّوَائِحُ

فعل کا وجوباً حذف ہونا :

مصنفؒ اس کی ایک مثال دیتے ہیں: قَوْلِهِ تَعَالَى :{وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ} (اور اگر مشرکوں میں سے کوئی ایک) :اس آیت میں "إِنْ" شرطیہ ہے اور "أَحَدٌ" فاعل ہے جو کہ مرفوع ہے۔ یہاں فعل محذوف ہے جو شرط کے معنی میں ہے۔ اصل جملہ یوں ہے :"وَإِنِ اسْتَجَارَكَ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" (اور اگر مشرکوں میں سے کوئی ایک تجھ سے پناہ مانگے)۔ یہاں فعل "اسْتَجَارَكَ" قرینہ موجود ہونے کی وجہ سے کہ حرف شرط فعل پر داخل ہوتا ہے اسم پر نہیں تو وجوباً حذف کر دیا گیا ہے۔

فعل اور فاعل دونوں کا ایک ساتھ حذف ہونا :

مصنفؒ اس کی ایک مثال دیتے ہیں: (نَعَمْ) لِمَنْ قَالَ :(أَقَامَ زَيْدٌ؟) (ہاں اس شخص کے جواب میں جس نے کہا :کیا زید

کھڑا ہوا؟) جب کوئی شخص سوال کرے کہ "کیا زید کھڑا ہوا؟" اور جواب میں صرف "نَعَمْ" (ہاں) کہا جائے تو دراصل یہاں فعل اور فاعل دونوں محذوف ہیں۔ اصل جواب یوں تھا :"نَعَمْ، قَامَ زَيْدٌ" (ہاں، زید کھڑا ہوا)۔ سوال میں فعل اور فاعل دونوں کا ذکر موجود ہونے کی وجہ سے جواب میں دونوں کو حذف کرنا جائز ہے۔

تنازع فعلان،

وإذا تنازع الفعلان ظاهرا بعدهما، فقد يكون في الفاعلية مثل :(ضربني وأكرمني زيد)، وفي المفعولية مثل :(ضربت وأكرمت زيدا)، وفي الفاعلية والمفعولية مختلفين. فيختار البصريون إعمال الثاني، والكوفيون إعمال الأوّل

ترجمہ :اور جب دو فعل آپس میں تنازع کریں ایک اسم ظاہر میں جو ان کے بعد ہو اور وہ تو کبھی فاعلیت میں ہوتا ہے جیسے : (ضَرَبَنِي وَأَكْرَمَنِي زَيْدٌ) (مجھے مارا اور مجھے عزت دی زید نے)، اور مفعولیت میں ہوتا ہے جیسے :(ضَرَبْتُ وَأَكْرَمْتُ زَيْدًا) (میں نے مارا اور میں نے عزت دی زید کو)، اور فاعلیت اور مفعولیت میں مختلف ہوتے ہیں۔ تو بصری نحوی دوسرے فعل کو عامل قرار دینا پسند کرتے ہیں اور کوفی نحوی پہلے فعل کو عامل قرار دینا پسند کرتے ہیں۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں علم نحو کے ایک خاص مسئلے یعنی تنازع الفعلین (دو فعلوں کا آپس میں جھگڑنا) کا بیان فرما رہے ہیں۔

تنازع سے مراد یہ ہے کہ جب دو فعل کسی ایک ظاہر اسم سے پہلے آئیں اور ان دونوں فعلوں کے لیے وہ اسم فاعل یا مفعول کی حیثیت رکھ سکتا ہو، تو ان دو فعلوں کے درمیان یہ تنازع ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سا فعل اس اسم پر عمل کرے (یعنی اس کو اپنا فاعل یا مفعول بنائے اس کی تفصیل کو چند ابحاث میں ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی بحث:

تنازع فعلان کی تعریف :

وإذا تنازع الفعلان ظاهرا بعدهما

دونوں فعل تنازع کریں ایک اسم ظاہر میں جو ان دونوں کے بعد واقع ہو اور ہر فعل تقاضہ کرے کہ وہ اس اسم ظاہر میں عمل کرے۔ تو یاد رکھیں کہ صاحب کتاب نے صرف فعل کا ذکر کیا ہے جبکہ فعل کے ساتھ شبہ فعل میں بھی تنازعہ ہوتا ہے۔ صرف فعل کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فعل اور شبہ فعل میں فعل اصل ہے۔ تو جب اصل میں تنازع ہوتا ہے تو فرع میں تو بطریق اولیٰ ہو سکتا ہے۔

تعریف کا دوسرا جز:

ظَاهِرًا صاحب کتاب نے اس جملے کے کہنے سے اشارۃ احتراز کیا ہے ضمیر سے۔ ضمیر منفصل میں تنازع ہو سکتا ہے لیکن ضمیر متصل میں تنازع ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ ضمیر جس فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہو گی اس کی معمول بنے گی جیسے ضَرَبْتُ اور

بَعْدَهُمَا کہہ کر صاحب کتاب نے اس طرف اشارہ کیا کہ جو اسم ظاہر فعل سے پہلے واقع ہو وہ اس کی ضمیر کا معمول بنے گا یا دو فعلوں میں سے اگر اسم ظاہر دو فعلوں کے درمیان ہے تو جس کے بعد آیا ہے اسی کا معمول بنے گا جیسے زَیْدًا ضَرَبْتُ یہاں اسم ظاہر مقدم ہے۔ ضربت کا ہی معمول بنے گا۔ ضَرَبْتُ زَیْدًا وَ اَکْرَمْتُ یہاں بھی زَیْدًا مفعول بہ ضَرَبْتُ کا معمول بنے گا۔

اور ضمیر منفصل میں جیسے مَا ضَرَبَ وَ اَکْرَمَ اِلَّا اَنَا بصریین اور کوفیین والا طریقہ جاری نہیں ہو سکتا۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اعتراض:

یہ ہوتا ہے کہ تنازع ذی روح میں ہوتا ہے جبکہ یہاں دو فعل ہیں اور یہ ذی روح نہیں ہیں تو ان میں تنازع کیسے ممکن ہے؟؟؟

جواب: یہ ہے کہ تنازع سے مراد حقیقی تنازع نہیں بلکہ تقاضہ مراد ہے کہ دو فعل ہوں اور ان دونوں کے بعد ایک اسم ظاہر ہو اور دونوں فعل اسی اسم ظاہر کو اپنا معمول بنانے کا تقاضا کریں۔

دوسری بحث:

تنازع کی ممکنہ چار قسمیں ہیں۔

فقد يكون في الفاعليّة مثل :(ضربني وأكرمني زيد)، وفي المفعوليّة مثل :(ضربت وأكرمت زيدا)، وفي الفاعليّة والمفعوليّة مختلفين. فيختار البصريّون إعمال الثّاني، والكوفيّون إعمال الأوّل

پہلی قسم:

کہ دونوں فعل اس اسم ظاہر کو جو ان دونوں کے بعد واقع ہے اپنا فاعل بنانا چاہیں۔ جیسے؛

ضَرَبَنِيْ وَ اَكْرَمَنِيْ زَيْدٌ۔

دوسری قسم:

کہ دونون فعل تنازع کریں ایک اسم ظاہر میں کہ وہ اس کو اپنا مفعول بنائیں جیسے؛

ضَرَبْتُ وَ اَكْرَمْتُ زَيْدًا

کہ یہاں دو فعل ہیں اور ان دونوں کے بعد ایک اسم ظاہر ہے۔ جس میں دونوں فعل کا تنازع ہے۔

وفي الفاعليّة والمفعوليّة مختلفين.

اور دونوں فاعلیت و مفعولیت کے تقاضے میں مختلف ہوں جیسے تیسری اور چوتھی قسم۔

تیسری قسم:

کہ دونوں فعل تقاضہ کریں فاعلیت اور مفعولیت کا پہلا فاعل بنانا چاہے اور دوسرا مفعول جیسے؛

ضَرَبَنِيْ وَ اَكْرَمْتُ زَيْدًا۔

چوتھی قسم:

یہ تیسری قسم کے الٹ ہے وہاں پہلا فعل فاعلیت کا اور دوسرا فعل مفعولیت کا تقاضہ کر رہا تھا اور یہاں اس کے برعکس ہے کہ پہلا مفعولیت کا اور دوسرا فاعل کا تقاضہ کرے۔ جیسے؛

ضَرَبتُ وَاَکرَمَنِی زَیدٌ۔

تیسری بحث

افضل وغیر افضل میں اختلاف

فیختار البصریّون إعمال الثّانی، والکوفیّون إعمال الأوّل

جمہور نحویین کا اتفاق ہے کہ فعل اوّل اور فعل ثانی دونوں کو عمل دینا جائز ہے لیکن افضل اور عمدہ اور بہتر فعل اول کو عمل دینا ہے یا فعل ثانی کو تو اس میں بصرہ اور کوفہ کے نحویین کا اختلاف ہے صرف افضلیت میں اختلاف ہے جواز اور عدم جواز میں نہیں
۔

بصریین کا مذہب؛

بصرہ کے نُحات فرماتے ہیں کہ دونوں فعلوں کو عمل دینا جائز ہے لیکن فعل ثانی کو عمل دینا افضل ہے اول کے مقابلے میں کیونکہ الحق للقریب ثم للعبید اسم ظاہر فعل ثانی کے قریب ہے لہٰذا اسی کو عمل دیا جائے گا

کوفیین کا مذہب؛

کوفیین کا مذہب ہے کہ وہ فعل اوّل کے عمل کو افضل قرار دیتے ہیں۔ ثانی کے مقابلے میں کیونکہ اَلسَّابِقُ اَحق من اللاحق اور اَلاَوَّلُ فَالاَوَّلُ۔

بصریین کے مذهب کی تفصیل

فإن أعملت الثّانی أضمرت الفاعل فی الأوّل علی وفق الظّاهر دون الحذف، خلافاً للکسائیّ، وجاز۔خلافاً للفرّاء۔ وحذفت المفعول إن استغنی عنه، وإلاّ أظهرت.

ترجمہ :پس اگر دوسرے فعل کو عامل بنایا جائے تو پہلے فعل میں ظاہر کے موافق ضمیر فاعل پوشیدہ کی جائے گی حذف کرنے کے بغیر، برخلاف کسائی کے، اور جائز ہے۔ برخلاف فراء کے۔، اور مفعول حذف کر دیا جائے گا اگر اس سے بے نیاز ہو جائیں، ورنہ اسے ظاہر کیا جائے گا۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں تنازع الفعلین کے مسئلے میں بصری نحویوں کے مسلک کی وضاحت فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، بصری نحوی تنازع کی صورت میں دوسرے فعل کو عامل قرار دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

چوتھی بحث

بصریین کے مذہب کی تفصیل اور قطع تنازع کا طریقہ کار

مصنف نے بصریین کے مذہب کو پہلے ذکر کیا وجہ اس کی یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک بصریین کا مذہب راجح ہے۔ بصریین کے مذہب کو ذکر کرنے سے پہلے دو باتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلی بات :

اگر فعل ثانی کو عمل دیا جائے تو فعل اول کے خوش کرنے کے تین ۳ طریقے ہیں: (۱) حذف۔ (۲) ذکر۔ (۳) ضمیر۔ تو ہم دیکھیں گے کہ فعل کا تقاضہ کیا ہے اگر فعل کا تقاضہ فاعل کا ہو، تو فاعل کو حذف نہیں کر سکتے کیونکہ فاعل عمدہ ہوتا ہے اور عمدہ کا حذف جائز نہیں اور ذکر بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ذکر کرنے سے تکرار لازم آتا ہے اور تکرار کلام فصیح کے خلاف ہے لہٰذا ہم ضمیر لائیں گے۔ اگرچہ اس میں بھی اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے لیکن بشرط التفسیر اضمار قبل الذکر جائز ہے اس کی تائید آیتِ قرآن سے ہوتی ہے جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ کہ یہاں هُو ضمیر کا مرجع لفظ اللہ ہے۔

بصریین کے اس قول سے امام کسائیؒ اور امام فراءؒ نے اختلاف کیا ہے

امام کسائیؒ کا قول؛

وفق الظّاهر دون الحذف، خلافاً للكسائيؒ

اس مسئلے میں امام کسائیؒ کا نظریہ بصری نحویوں سے مختلف ہے؛ ان کے نزدیک پہلے فعل میں سے فاعل کو حذف کر دیا جائے گا تاکہ اضمار قبل الذکر لازم نہ آئے۔

ثمرہ اختلاف

بصریین کے نزدیک مثال یہ بنے گی

ضربانی واکرمنی الزیدان

فعل اول کے لئے اسم ظاہر کے مطابق فاعل کی ضمیر

امام کسائیؒ کے نزدیک مثال یہ بنے گی

ضربنی واکرمنی الزیدان

امام فراءؒ کا قول؛

وجاز خلافاً للفرّاء۔

فرماتے ہیں کہ پہلی اور تیسری صورت میں یعنی دونوں فعل ایک اسم ظاہر کو اپنا فاعل بنانا چاہیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ پہلا فعل فاعلیت کا تقاضہ کرے اور دوسرا فعل مفعولیت کا تقاضہ کرے تو ان دونوں صورتوں میں امام فراء کے نزدیک فعل اوّل کو عمل دیا جائے گا فعل ثانی کو عمل دینا جائز ہی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کیونکہ اگر ہم فعل ثانی کو عمل دیتے ہیں تو دو خرابیوں میں سے ایک لازم آتی ہے۔ اور وہ ہے۔ یا فاعل کا حذف کرنا یا اضمار قبل الذکر۔ یعنی فاعل کو حذف کرنا جائز نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ فاعل عمدہ ہوتا ہے اور عمدہ کا حذف جائز نہیں۔ اور اگر ہم ضمیر لوٹاتے ہیں تو اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے۔ جو جائز نہیں۔ لہٰذا فعل

اوّل کو عمل دیا جائے گا فعل ثانی کو عمل دینا جائز نہیں ہے۔

بصریین علماء نحو کی طرف سے امام فراء کو جواب:

بصرہ کے نحویین فرماتے ہیں کہ حذف الفاعل جائز نہیں کیونکہ فاعل عمدہ ہوتا ہے اور عمدہ کا حذف جائز نہیں۔اس کو ہم مانتے ہیں لیکن اضمار قبل الذکر ممکن ہے کہ بشرط التفسیر اضمار قبل الذکر قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔لہٰذا فعل اوّل اور فعل ثانی دونوں کو عمل دینا جائز ہے۔

اضمار قبل الذکر بشرط التفسیر مثال قرآنِ عظیم سے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱

یہاں ھُوَ ضمیر منفصل لفظ اللہ کی طرف راجح ہے اور یہ بشرط التفسیر جائز ہے۔

دوسری بات :

یہ ہے کہ ضمیر اور مرجع میں پانچ ۵ چیزوں میں مطابقت لازم ہے۔ (۱) افراد۔ (۲) تثنیہ۔ (۳) جمع۔ (۴) تذکیر۔ (۵) تانیث تو یہاں آپ مثالوں میں دیکھیں گے کہیں زیدٌ اور کہیں اَلزَّیدَانِ اور کہیں اَلزَّیدُونَ ہے۔ یعنی ضمیر اور مرجع میں مطابقت کی وجہ سے زیدٌ کی حالت تبدیل ہو رہی ہے۔

قطع تنازع کی تفصیل؛

فَاِنْ اَعْمَلْتَ الثَّانِیْ...الخ اس عبارت میں قطع تنازع کی صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ قطع تنازع کی تین صورتیں ہیں: (۱) ذکر۔ (۲) حذف۔ (۳) اضمار۔ تو اس عبارت میں صاحب کتاب نے فرمایا کہ اگر آپ پہلے فعل کو چھوڑ کر دوسرے کو عمل دیں بصریین کے مذہب پر تو پس دیکھیں کہ فعل اوّل کس چیز کا تقاضہ کرتا ہے۔

پہلی صورت:

اگر فاعل کا تقاضہ کرتا ہے تو آپ فعل اول میں ضمیر کو ذکر کریں اس لئے کہ قطع تنازع میں حذف کر ہی نہیں سکتے فاعل کا کیونکہ فاعل عمدہ ہوتا ہے اور عمدہ کا حذف جائز نہیں۔اور ذکر کر نہیں سکتے اس لیے کہ تکرار لازم آئے گا للذا قطع تنازع کی ایک ہی صورت رہ گئی۔ ضمیر تو ہم نے ضمیر کو ذکر کیا۔ جیسے متوافقین میں یعنی جب دونوں فعلوں کا تنازع فاعلیت میں ہو

ضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمَنِیْ زَیْدٌ اور وَضَرَبَانِیْ وَاَکْرَمَنِیْ الزیدانِ اور ضَرَبُوْنِیْ وَاَکْرَمَنِیْ الزَّیْدُوْنَ

یہاں پہلی مثال میں ھُوَ اور دوسری میں ھُمَا اور تیسری میں ھُم فاعل ہے۔

دوسری صورت :

اور اسی طرح متخالفین میں یعنی فعل اول فاعل اور فعل ثانی مفعول کا تقاضہ کرے جیسے؛

ضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمْتُ زَیْدًا اور ضَرَبَانِیْ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدَیْنِ اور ضَرَبُوْنِیْ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدَیْنَ

کہ یہاں پہلی مثال میں ھُوَ دوسری میں ھُمَا اور تیسری میں ھُم فاعل ہے۔ یہ دو صورتیں ہوئی:
تیسری صورت:

وحذفت المفعول إن استغنی عنه،

یہ ہے اگر دونوں فعل تقاضا مفعول کا کریں اور دونوں فعل افعال قلوب میں سے بھی نہ ہوں تو قطع تنازع کی تین صورتوں میں سے حذف کیا جائے گا فعل اول کے مفعول کو اور اسم ظاہر کو فعل ثانی کا معمول بنایا جائے گا جیسے متوافقین میں جیسے؛

ضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُ زَیْدًا اور ضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدَیْنِ اور ضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدِیْنَ

کہ یہاں فعل اول کے مفعول کو حذف کیا ہے اور فعل ثانی کو عمل دے کر اسم ظاہر کو فعل ثانی کا معمول بنایا گیا ہے۔
چوتھی صورت:
یہ ہے کہ اگر دونوں فعل متخالفین ہو موافق نہ ہوں یعنی پہلا فعل مفعول بہ کو اور دوسرا فعل فاعل کو طلب کرے اور دونوں فعل افعال قلوب میں سے بھی نہ ہوں تو یہاں بھی فعل اوّل کے مفعول کو حذف کر کے فعل ثانی کو اسم ظاہر کا عامل بنائیں گے جیسے

ضَرَبْتُ وَاَکْرَمَنِیْ زَیْدٌ اور ضَرَبْتُ وَاَکْرَمَنِیْ اَلزَّیْدَانِ اور ضَرَبْتُ وَاَکْرَمَنِیْ الزَّیْدُوْنَ

کہ یہاں ان تینوں مثالوں میں فعل اوّل کے مفعول کو حذف کر کے معمول بنایا اسم ظاہر کو فعل ثانی کا۔
پانچویں صورت:

وإلاّ أظهرت.

پانچویں صورت یہ ہے کہ دونوں فعل افعال قلوب میں سے ہوں "افعال قلوب یہ ہیں :علمت وجدت حسبت خلت وغیرہ تفصیل آگے آئے گی۔"
فرماتے ہیں اگر دونوں فعل افعال قلوب میں سے ہوں تو واجب ہے اظہار کرنا فعل اول کے مفعول کا کیونکہ افعال قلوب متعدی بہ دو مفعول ہوتا ہے اور اس کے ایک بھی مفعول کو حذف کرنا جائز نہیں۔ جیسے

حسبنی منطلقا وحسبت زیدا منطلقًا

اب یہاں قطع تنازع کی تین صورتوں میں سے حذف اور اضمار قبل الذکر جائز نہیں ہے ایک ہی صورت رہ گئی ذکر کرنے کی تو لا محالہ مفعول ذکر کیا گیا۔ اصل عبارت اس طرح ہے :

حسبنی وحسبت زیدًا منطلقًا

اس مثال میں دونوں فعل منطلقًا کو اپنا مفعول ثانی بنانا چاہتے ہیں ہم نے بصریین کے مذہب کے مطابق فعل ثانی کو عمل دیا تو اب فعل اوّل بھی افعال قلوب میں سے اور قطع تنازع کے طریقوں میں حذف پر عمل نہیں ہو سکتا، کیونکہ افعال قلوب کا کوئی مفعول حذف نہیں ہوتا اضمار پر بھی عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ اضمار قبل الذکر لازم آئے گا، ایک ہی صورت رہ جاتی ہے ذکر کی تو فعل اوّل

کے لیے مفعول ثانی کو ذکر کیا گیا تو عبارت یہ بنی:

حسبنی منطلقًا وحسبت زیدًا منطلقًا۔

کوفیین کے مذہب کی تفصیل؛

وإن أعملت الأوّل أضمرت الفاعل في الثّاني، والمفعول على المختار، إلاّ أن يمنع مانع فتظهر. وقول امرء القيس:

..... كفاني-ولم أطلب-قليل من المال.-ليس منه، لفساد المعنى.

ترجمہ :اور اگر پہلے فعل کو عامل بنایا جائے تو دوسرے فعل میں فاعل کی ضمیر پوشیدہ کی جائے گی، اور مفعول بھی، مختار قول کے مطابق، مگر یہ کہ کوئی مانع ہو تو وہ ظاہر کیا جائے گا۔ اور امرؤالقیس کا قول..... مجھے کافی ہوا۔ اور میں نے طلب نہیں کیا۔ تھوڑا سا مال۔ یہ اس (باب تنازع) سے نہیں ہے؛ معنی کے فساد کی وجہ سے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں تنازع الفعلین کے مسئلے میں کوفیین کے مذہب کی تفصیل بیان فرماتے ہیں

پانچویں بحث

کوفیین کے مذہب کے دلائل اور قطع تنازع کا طریقہ کار

کوفیین کے مذہب میں فعل اوّل کو عمل دینا مختار ہے کوفیین کے مذہب کی چند صورتیں ہیں:

پہلی صورت:

وإن أعملت الأوّل أضمرت الفاعل في الثّاني

اگر فعل ثانی فاعل کا تقاضہ کرتا ہے تو اسم ظاہر کو فعل اوّل کا معمول بنائیں گے اور فعل ثانی میں ضمیر نکالیں گے۔ کیونکہ قطع تنازعہ کی تین ہی صورتیں ہیں: (۱) حذف (۲) ذکر (۳) اضمار۔ فاعل کو حذف کر نہیں سکتے اس لیے کہ فاعل عمدہ ہوتا ہے اور عمدہ کا حذف جائز نہیں اور ذکر کر نہیں سکتے اس لیے کہ ذکر کرنے سے تکرار لازم آتا ہے اور کلام فصیح میں تکرار فصاحت کے خلاف ہے ۔لہٰذا قطع تنازع کی ایک ہی صورت رہ گئی اضمار۔ اگرچہ اس میں بھی اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے لیکن یہ ایک ہی صورت ہے قطع تنازع کی متوافقین میں یعنی جب دونوں فعل فاعل کا تقاضہ کرنے میں متفق ہوں تو اسم ظاہر کو فعل اوّل کا معمول بنائیں گے اور فعل ثانی میں فاعل کی ضمیر لائیں گے۔ جیسے ضَرَبَنِيْ وَأَكْرَمَنِيْ زَيْدٌ کہ یہاں فعل اوّل کو اسم ظاہر کا عامل بنایا اور فعل ثانی میں فاعل کی ضمیر ھُوَ لائے وَضَرَبَنِيْ وَأَكْرَمَانِي الزَّيْدَانِ کہ یہاں فعل اول کو اسم ظاہر کا عامل بنایا اور فعل ثانی میں تثنیہ کی ضمیر لائے۔

وَضَرَبَنِيْ وَأَكْرَمُوْنِي الزَّيْدُوْنَ یہاں فعل اول کو اسم ظاہر کا عامل بنایا اور فعل ثانی یں جمع کی ضمیر بطور فاعل کے لے

آئے۔

متخالفین :

اختلافی صورت کہ جب فعل اوّل مفعول کا اور فعل ثانی فاعل کا تقاضہ کرے تو اوّل کو عمل دیں گے اور ثانی میں ضمیر لوٹائیں گے۔

ضَرَبْتُ وَاَکْرَمَنِیْ زَیْدًا   وَضَرَبْتُ وَاَکْرَمَانِیْ الزَّیْدَیْنِ   وَضَرَبْتُ وَاَکْرَمُوْنِیْ الزَّیْدِیْنَ

کہ یہاں تینوں مثالوں میں اسم ظاہر کو فعل اوّل کا معمول بنایا اور فعل ثانی میں ضمیر نکالی فاعل کی اَکْرَمَ میں ھُوَ اور اَکْرَمَا میں ھُمَا اور اَکْرَمُوْا میں ھُمْ۔

دوسری صورت:

والمفعول علی المختار

اگر دونوں فعل افعال قلوب میں سے بھی نہ ہوں اور فعل ثانی مفعول کا تقاضہ کرے تو اس میں دو صورتیں جائز ہیں:

(۱)...حذف المفعول۔

(۲)...اضمار۔

اگرچہ تقاضہ مفول کے وقت حزف واضمار دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن مصنفؒ کے ہاں مختار حزف ہی ہے تاکہ ملفوظ مراد کے مطابق ہو جائے۔

حزف؛

پس حذف تو تیرا کہنا متوافقین میں:

ضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُ زَیْدًا   وَضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدَیْنِ   وَضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدِیْنَ

یہاں ہم نے فعل اوّل کو عامل بنایا اسم ظاہر کا اور فعل ثانی کے مفعول کو حذف کر دیا۔

اور متخالفین میں یعنی فعل اوّل فاعل کا اور فعل ثانی مفعول کا تقاضہ کرے تو ہم اسم ظاہر کو فعل اوّل کا معمول بنائیں گے اور فعل ثانی کے مفعول کو حذف کر دیں گے جیسے مثالوں میں بات واضح ہے:

ضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمَنِیْ زَیْدٌ وَضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدَانِ وَضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمْتُ الزَّیْدُوْنَ۔

ضمیر؛

اور دوسری وجہ قطع تنازع کی اضمار یعنی ضمیر دینا ہے جیسے آپ کا قول متوافقین میں۔

ضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُهٗ زَیْدًا وَضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُهُمَا الزَّیْدَیْنِ وَضَرَبْتُ وَاَکْرَمْتُهُمْ الزَّیْدِیْنَ۔

کہ یہاں پر بھی فعل اوّل کا معمول بنایا اسم ظاہر کو اور فعل ثانی میں ضمیر ذکر کی۔ اور متخالفین میں یعنی فعل اوّل فاعل کا تقاضہ کرے اور فعل ثانی مفعول کا تقاضہ کرے تو اسم ظاہر کو فعل اوّل کا معمول بنائیں گے اور فعل ثانی میں ضمیر لائیں گے۔ جیسے:

ضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمْتُهٗ زَیْدٌ وَضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمْتُهُمَا الزَّیْدَانِ وَضَرَبَنِیْ وَاَکْرَمْتُهُمْ الزَّیْدُوْنَ۔

تیسری صورت:

،إلاّ أن يمنع مانع فتظهر.

یہ ہے کہ اگر دونوں فعل تنازع کریں مفعولیت میں اور دونوں فعل افعال قلوب میں سے ہوں تو فعل ثانی کے مفعول کو ذکر کرنے میں ہی دفع تنازع ہے۔ جیسے:

حَسِبَنِيْ وَحَسِبْتُهُمَا مُنْطَلِقَيْنِ الزَّيْدَانِ مُنْطَلِقًا.

اصل عبارت اس طرح ہے: حَسِبَنِيْ وَحَسِبْتُهُمَا اَلزَّيْدَانِ مُنْطَلِقًا۔ یہاں تنازع ہے مُنْطَلِقًا میں۔

ہم نے عمل دے دیا فعل اوّل کو اور مُنْطَلِقًا کو مفعول بنایا کوفیین کے مذہب پر تو قطع تنازع کی تین صورتیں ہیں: (۱) ذکر۔ (۲) حذف۔ (۳) ضمیر۔ ان میں سے ہم ضمیر منفصل کو لے آئے یعنی اس طرح کہ حَسِبَنِيْ وَحَسِبْتُهُمَا اِيَّاهُ الزَّيْدَانِ مُنْطَلِقًا تو اس میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ مفعول ثانی مفعول اول کے مطابق نہیں کیونکہ اِیَّاہُ مفرد ہے اور ھُمَا تثنیہ ہے لہٰذا یہ جائز نہیں ہے۔ اور اگر ہم تثنیہ کی ضمیر لائیں گے تو بھی خرابی لازم ہے کیونکہ مُنْطَلِقًا مفرد ہے اور اِیَّاھُمَا تثنیہ ہے اور راجع اور مرجع میں مطابقت ضروری ہے یعنی ہم اس طرح بھی نہیں لاسکتے۔ حَسِبَنِيْ وَحَسِبْتُهُمَا اِيَّاهُمَا الزَّيْدَانِ مُنْطَلِقًا قطع تنازع کی ایک صورت حذف بھی ہے یعنی آپ فعل ثانی کے مفعول ثانی کو حذف کردو اور یہ بھی جائز نہیں کیونکہ افعال قلوب کے دو مفعول میں سے کسی ایک کو بھی حذف کرنا جائز نہیں ہے۔

تو جب اضمار اور حذف دونوں صورتیں جائز نہیں تو ایک آخری صورت رہ گئی ذکر کی تو لامحالہ مفعول ثانی کو ذکر کیا جائے گا عبارت یہ بنے گی۔ حَسِبَنِيْ وَحَسِبْتُهُمَا مُنْطَلِقَيْنِ الزَّيْدَانِ مُنْطَلِقًا۔

کوفیین کا شعر سے استدلال اور مصنفؒ کا ان پر رد:

وقول امرء القيس:

...... كفاني -ولم أطلب- قليل من المال. ليس منه؛ لفساد المعنى.

کوفی نحویوں کا استدلال:

کوفی نحویوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ دو فعلوں میں سے پہلے والے کو عمل دینے میں ترجیح حاصل ہے، امرؤ القیس کے اس شعر کو بطور دلیل پیش کیا ہے: شعر:

وَلَوْ أَنَّ مَا أَسْعَى لِأَدْنَى مَعِيشَةٍ كَفَانِي، وَلَمْ أَطْلُبْ، قَلِيلٌ مِنَ الْمَالِ

کوفی نحویوں کا کہنا ہے کہ اس شعر میں دو فعل — كَفَانِي اور وَلَمْ أَطْلُبْ — ایک ہی اسم قَلِيلٌ مِنَ الْمَالِ پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔

*پہلا فعل (كَفَانِي) تقاضا کرتا ہے کہ قَلِيلٌ اس کا فاعل بنے اور حالتِ رفع (پیش) میں ہو۔

*دوسرا فعل (وَلَمْ أَطْلُبْ) تقاضا کرتا ہے کہ قَلِيلٌ اس کا مفعول بنے اور حالتِ نصب (زبر) میں ہو۔ کوفیین کے مطابق، امرؤ القیس، جو عرب کے فصیح ترین شاعروں میں سے ہیں، نے پہلے فعل کو عمل دیا (یعنی قَلِيلٌ کو فاعل بنایا)۔ اس سے کوفی یہ

دلیل لاتے ہیں کہ اگر پہلے فعل کو عمل میں ترجیح حاصل نہ ہوتی تو امرؤالقیس جیسا شاعر اسے کبھی منتخب نہ کرتا، کیونکہ اس بات کا کوئی قائل نہیں کہ دونوں فعلوں کو عمل کرنے کا برابر حق ہے۔

مصنف کا جواب اور بصریوں کا نقطہ نظر؛

مصنفؒ کہتا ہے: "اور امرؤالقیس کا یہ قول (كَفَانِي وَلَمْ أَطْلُبْ قَلِيلٌ مِنَ الْمَالِ) تنازع فعلین کی مثال نہیں ہے، کیونکہ اگر اسے تنازع مانا جائے تو معنی میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔" معنی میں خرابی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ :

حرف لَوْ کا استعمال؛

حرف لَوْ ایک شرطیہ لفظ ہے جو حقیقت کے برعکس بات کے لیے آتا ہے۔ یہ اپنے بعد آنے والے مثبت جملے کو معنی کے لحاظ سے منفی، اور منفی جملے کو مثبت بنا دیتا ہے۔ اس لیے یہاں ایک منطقی تضاد پیدا ہو جائے گا

* شعر کا مطلب پھر کچھ یوں ہوگا کہ شاعر ادنی زندگی کے لیے کوشش نہیں کرتا۔ * تھوڑا مال اسے کافی نہیں ہے۔ *اور وہ تھوڑا مال طلب کرتا ہے، جو کہ پہلی دو باتوں کے بالکل خلاف (منافی) ہے۔

صحیح نحوی توجیہ؛

فعل لَمْ أَطْلُبْ کا مفعول محذوف مانا جائے۔ "یعنی، اصل میں جملہ یوں ہے :لَمْ أَطْلُبِ الْعِزَّ وَالْمَجْدَ (میں نے عزت اور بزرگی طلب کی)۔ یہاں "عزت اور بزرگی" کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن وہ مراد ہے۔ اس بات کی دلیل شاعر کا ایک اگلا شعر ہے جو اس کے بعد آتا ہے:

وَلَكِنَّمَا أَسْعَى لِمَجْدٍ مُؤَثَّلٍ، وَقَدْ يُدْرِكُ الْمَجْدَ الْمُؤَثَّلَ أَمْثَالِي

:"بلکہ میں تو ایک مضبوط و دائمی بزرگی کے لیے کوشاں ہوں ... اور کبھی کبھی مجھ جیسے لوگ بھی ایسی بزرگی کو پا لیتے ہیں۔" یہ شعر واضح کرتا ہے کہ شاعر کا اصل مقصد "بزرگی" کا حصول ہے، نہ کہ "تھوڑا مال"۔

دوسرا مرفوع [مفعول ما لم يسمّ فاعله]: نائب فاعل

[مفعول ما لم يسمّ فاعله]: كلّ مفعول حذف فاعله وأقيم هو مقامه. وشرطه أن تغيّر صيغة الفعل إلى (فعل) أو (يفعل)، ولا يقع المفعول الثّاني من باب (علمت)، ولا الثّالث من باب (أعلمت)، والمفعول له، والمفعول معه كذلك. وإذا وجد المفعول به تعيّن له، تقول :(ضرب زيد يوم الجمعة أمام الأمير ضربا شديدا في داره)، فتعيّن (زيد)، فإن لم يكن فالجميع سواء، والأوّل من باب (أعطيت) أولى من الثّاني.

ترجمہ :[مفعول وہ جس کا فاعل بیان نہ کیا گیا ہو] :وہ ہر مفعول جس کا فاعل حذف کر دیا جائے اور وہ خود اس کی جگہ قائم مقام ہو جائے۔ اور اس کی شرط یہ ہے کہ فعل کا صیغہ (فُعِلَ) یا (يُفْعَلُ) میں بدل دیا جائے، اور باب (عَلِمْتُ) کا مفعول ثانی اور باب (أَعْلَمْتُ) کا مفعول ثالث اس کی جگہ واقع نہیں ہوں گے، اور مفعول لہ اور مفعول معہ بھی اسی طرح ہیں۔ اور جب مفعول بہ موجود ہو تو وہی اس کا مستحق ہے، جیسے آپ کہتے ہیں :(ضُرِبَ زَيْدٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَمَامَ الْأَمِيرِ ضَرْبًا شَدِيدًا فِي دَارِهِ)

(زید کو مارا گیا جمعہ کے دن امیر کے سامنے سخت مار اس کے گھر میں)، تو (زید) ہی متعین ہوا۔ اور اگر مفعول بہ نہ ہو تو سب برابر ہیں، اور باب (أُعْطِيتُ) کا مفعول اول مفعول ثانی سے زیادہ حقدار ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے "مفعول مالم یسمّ فاعلہ" یعنی اس مفعول کا بیان شروع فرمارہے ہیں جس کا فاعل ذکر نہ کیا گیا ہو، جسے اردو میں عموماً نائب فاعل کہتے ہیں۔ آپؒ اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

[مفعول مالم يسمّ فاعله]: كلّ مفعول حذف فاعله وأقيم هو مقامه

یہ وہ مفعول ہوتا ہے جس کے فاعل کو حذف کر دیا جاتا ہے اور اس مفعول کو فاعل کی جگہ پر قائم مقام کر دیا جاتا ہے۔ جب فعل معروف میں ہوتا ہے تو اس میں فاعل مذکور ہوتا ہے اور مفعول پر فعل کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب فعل مجہول میں تبدیل ہوتا ہے تو فاعل کو حذف کر کے مفعول کو فاعل کی طرح پیش کیا جاتا ہے اور اس پر رفع کی حرکت آتی ہے۔ جیسے: ضُرِبَ زَيْدٌ مارا گیا زید کو۔ یہاں زید معنًا مفعول بہ ہے لیکن اس کے فاعل کو حذف کر کے مفعول کو اس کی جگہ ذکر کیا۔

نائب الفاعل بنانے کی شرائط:

قوله :وشرطه أن تغيّر صيغة الفعل...إلخ

پھر مصنفؒ نائب الفاعل بنانے کی بنیادی شرط بیان فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس کی شرط یہ ہے کہ فعل کی ہیئت اور صیغے کو تبدیل کیا جائے۔

***فعل ماضی میں تبدیلی :**

اگر فعل ماضی ہو تو اس کے پہلے حرف کو ضمہ (پیش) اور دوسرے آخری حرف (ما قبل آخر) کو کسرہ (زیر) دیا جائے گا۔ جیسے ضَرَبَ سے ضُرِبَ۔

***فعل مضارع میں تبدیلی :**

اگر فعل مضارع ہو تو اس کے پہلے حرف (حرفِ مضارع) کو ضمہ (پیش) اور دوسرے آخری حرف (ما قبل آخر) کو فتحہ (زبر) دیا جائے گا۔ جیسے يَضْرِبُ سے يُضْرَبُ۔ یہ تبدیلی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فعل کی نسبت اس کے فاعل کی طرف نہیں بلکہ مفعول کی طرف کی گئی ہے، یعنی یہ فعل مجہول ہے۔

جو مفعول نائب فاعل نہیں بن سکتے:

قوله :ولا يقع المفعول الثّاني من باب علمت...إلخ

مصنفؒ یہاں ان مفعولات کا ذکر فرمارہے ہیں جو نائب فاعل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اگرچہ وہ مفعول ہی کیوں نہ ہوں۔

***باب "عَلِمَ" کا دوسرا مفعول :**

افعالِ قلوب جیسے عَلِمَ، رَأَی، ظَنّ وغیرہ جو دو مفعولوں پر داخل ہوتے ہیں جن کی اصل مبتدا اور خبر ہوتی ہے، ان میں سے صرف پہلا مفعول ہی نائب فاعل بن سکتا ہے، دوسرا نہیں۔ مثلاً "عَلِمْتُ زَيْدًا فَاضِلاً" میں جب فعل کو مجہول بنائیں گے تو "عُلِمَ زَيْدٌ فَاضِلاً" کہیں گے۔ یہاں "زَيْدٌ" نائب فاعل بن گیا اور "فَاضِلاً" بدستور مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہی رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا مفعول خبر کے معنی میں ہوتا ہے اور اس کا تعلق صرف پہلے مفعول سے ہوتا ہے، فعل سے براہِ راست نہیں۔

*** باب "اَعْلَمَ" کا تیسرا مفعول :**

وہ افعال جو تین مفعولوں کو نصب دیتے ہیں جیسے أَعْلَمَ اور أَرَى، ان کا تیسرا مفعول بھی نائب فاعل نہیں بن سکتا۔ جیسے "أَعْلَمْتُ زَيْدًا عَمْرًا قَائِمًا" میں جب مجہول بنائیں گے تو "أُعْلِمَ زَيْدٌ عَمْرًا قَائِمًا" کہا جائے گا۔ یہاں بھی صرف پہلا مفعول نائب فاعل بنے گا۔

*** مفعول لہ :**

یہ فعل کے وقوع کا سبب بیان کرتا ہے، اور چونکہ یہ مصدر ہوتا ہے، اس لیے فعل کا وقوع اس پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے نائب فاعل بنانا درست نہیں۔

*** مفعول معہ :**

یہ واو بمعنی "مع" کے بعد آتا ہے اور فعل کے وقوع کے وقت فاعل کا مصاحب ہوتا ہے، اس پر فعل واقع نہیں ہوتا، لہٰذا یہ بھی نائب فاعل نہیں بن سکتا۔

نائب فاعل کے تعین کا اصول:

قولہ :وإذا وجد المفعول به تعيّن له...إلخ

مصنفؒ یہاں ایک اہم قاعدہ بیان فرمارہے ہیں کہ اگر کلام میں ایک سے زائد اقسام کے مفعول (مثلاً مفعول بہ، ظرف، جار مجرور، مصدر) موجود ہوں تو نائب فاعل کسے بنایا جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ اگر کلام میں مفعول بہ (صریح) موجود ہو تو پھر وہی نائب فاعل بننے کے لیے متعین ہے، اس کی موجودگی میں کسی اور کو نائب فاعل بنانا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل کا اثر براہِ راست مفعول بہ پر واقع ہوتا ہے، لہٰذا وہ فاعل کا قائم مقام بننے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ اس کی مثال مصنفؒ نے دی :

"ضُرِبَ زَيْدٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَمَامَ الْأَمِيرِ ضَرْبًا شَدِيدًا فِيْ دَارِهِ" (زید کو جمعہ کے دن، امیر کے سامنے، اس کے گھر میں، سخت مارا گیا)۔ اس مثال میں :* زَيْدٌ :مفعول بہ تھا جو اب نائب فاعل بن کر مرفوع ہے۔ * يَوْمَ الْجُمُعَةِ :ظرف زمان (منصوب) * أَمَامَ الْأَمِيرِ :ظرف مکان (منصوب) * ضَرْبًا شَدِيدًا :مصدر (منصوب) * فِيْ دَارِهِ :جار و مجرور چونکہ یہاں "زید" مفعول بہ تھا، اس لیے اسی کو نائب فاعل بنایا گیا اور باقی تمام معمولات اپنی حالت پر منصوب رہے۔

مفعول بہ کے سوا سب برابر؛

قولہ :فإن لم یکن فالجمیع سواء...إلخ

پھر مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کلام میں مفعول بہ موجود نہ ہو، تو باقی چیزیں یعنی ظرف، جار و مجرور، اور مصدر میں سے کسی ایک کو بھی نائب فاعل بنایا جاسکتا ہے اور ان سب کا درجہ برابر ہے۔ مثلاً "سِيْرَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ" (جمعہ کے دن چلا گیا) یا "جُلِسَ فِي الدَّارِ" (گھر میں بیٹھا گیا)۔

باب اعطیت کے مفاعیل کا حکم:

قولہ :والأوّل من باب أعطیت أولی من الثّانی

آخر میں مصنفؒ باب "أَعْطَى" جیسے افعال کا حکم بیان فرمارہے ہیں جو دو مفعول چاہتے ہیں لیکن ان کی اصل مبتدا خبر نہیں ہوتی۔ فرماتے ہیں کہ ان میں سے پہلے مفعول کو نائب فاعل بنانا بہتر (اولیٰ) ہے، اگرچہ دوسرے کو بنانا بھی جائز ہے۔ مثلاً "أُعْطِيَ زَيْدٌ دِرْهَمًا" کہنا "أُعْطِيَ دِرْهَمٌ زَيْدًا" کہنے سے بہتر ہے، کیونکہ پہلا مفعول فاعل کے معنیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے (لینے والا) جبکہ دوسرا مفعول خالص مفعولیت پر دلالت کرتا ہے (لی گئی چیز)۔

تیسرا اور چوتھا مرفوع مبتداء وخبر

ومنها المبتدأ والخبر .فالمبتدأ :هو الاسم المجرّد عن العوامل اللفظیّة،مسندا إلیه،أو الصّفة الواقعة بعد حرف النّفی وألف الاستفهام،رافعة لظاهر مثل (زید قائم)،و (ما قائم الزّیدان)،و (أقائم الزّیدان؟)،فإن طابقت مفردا جاز الأمران.

والخبر :هو المجرّد المسند به المغایر للصّفة المذکورة.

ترجمہ :اور ان مرفوعات میں سے مبتدا اور خبر ہیں۔ پس مبتدا :وہ اسم ہے جو عوامل لفظیہ سے خالی ہو، جس کی طرف اسناد کی گئی ہو، یا وہ (صیغہ) صفت جو حرف نفی اور الف استفہام کے بعد واقع ہو کر اسم ظاہر کو رفع دے، جیسے (زَيْدٌ قَائِمٌ) (زید کھڑا ہے)، اور (مَا قَائِمٌ الزَّيْدَانِ) (نہیں کھڑے دو زید)، اور (أَقَائِمٌ الزَّيْدَانِ؟) (کیا کھڑے دو زید؟)، پس اگر وہ مفرد کے مطابق ہو تو دونوں امر جائز ہیں۔اور خبر :وہ مجرد (اسم) ہے جس کے ذریعے اسناد کی جائے اور وہ اس صفت مذکور سے مختلف ہو۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، مرفوعات کی اقسام بیان کرتے ہوئے یہاں سے مبتدا اور خبر کا ذکر فرمارہے ہیں۔ جملہ اسمیہ کے یہ دو اہم اجزاء ہوتے ہیں۔

مبتدا کی تعریف :

مصنفؒ مبتدا کی تعریف دو طرح سے بیان فرماتے ہیں: هُوَ الِاسْمُ الْمُجَرَّدُ عَنِ الْعَوَامِلِ اللَّفْظِيَّةِ، مُسْنَدًا إِلَيْهِ (وہ اسم جو عوامل لفظیہ سے خالی ہو، جس کی طرف اسناد کی گئی ہو) :مبتدا وہ اسم ہوتا ہے جو عام طور پر جملے کے شروع میں آتا ہے اور اس پر کوئی لفظی عامل (جیسے حرف جار یا حرف ناصب) اثر انداز نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اس کی اعرابی حالت بدلے۔ بلکہ اس

کی طرف کسی خبر کی اسناد کی جاتی ہے، یعنی اس کے بارے میں کوئی اطلاع دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر (زَيْدٌ قَائِمٌ) (زید کھڑا ہے)، یہاں "زیدٌ" مبتدا ہے جو عوامل لفظیہ سے خالی ہے اور اس کی طرف "قائمٌ" (خبر) کی اسناد کی گئی ہے۔

أَوِ الصِّفَةُ الْوَاقِعَةُ بَعْدَ حَرْفِ النَّفْيِ وَأَلِفِ الِاسْتِفْهَامِ، رَافِعَةً لِظَاهِرٍ (یا وہ صیغہ صفت جو حرف نفی اور الف استفہام کے بعد واقع ہو کر اسم ظاہر کو رفع دے) :بعض اوقات مبتدا ایک صفت بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ حرف نفی (جیسے ما، لا) یا حرف استفہام (جیسے أ) کے بعد آئے اور کسی اسم ظاہر کو رفع دے کر اس کا فاعل بنے اور مبتدا کا کام دے۔ مثال کے طور پر (مَا قَائِمٌ الزَّيْدَانِ) (نہیں کھڑے دو زید)، یہاں "قائمٌ" صفت ہے جو حرف نفی "ما" کے بعد واقع ہوئی ہے اور اس نے اسم ظاہر "الزَّیدانِ" کو رفع دے کر فاعل بنایا ہے۔ اسی طرح (أَقَائِمٌ الزَّيْدَانِ؟) (کیا کھڑے دو زید؟)، یہاں "قائمٌ" صفت ہے جو حرف استفہام "أَ" کے بعد آئی ہے اور اسم ظاہر "الزَّیدانِ" اس کا فاعل بن رہا ہے۔

مطابقت کی صورت :

مصنفؒ فرماتے ہیں :فَإِنْ طَابَقَتْ مُفْرَدًا جَازَ الْأَمْرَانِ (پس اگر وہ مفرد کے مطابق ہو تو دونوں امر جائز ہیں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب صفت (جو مبتدا کا کام دے رہی ہے) مفرد ہو اور اس کے بعد اسم ظاہر بھی مفرد کی صورت میں آئے تو اس صفت کے لیے دو صورتیں جائز ہیں :

پہلی صورت؛

یا تو وہ صیغہ صفت مبتداء ہو اور اسم ظاہر قائم مقام خبر ہو۔ جیسے ماقائم زید اور اقائم زید

دوسری صورت؛

یہ کہ صیغہ صفت خبر مقدم ہو اور اسم ظاہر مبتداء مؤخر ہو۔

خبر کی تعریف :

مصنفؒ خبر کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:وَالْخَبَرُ :هُوَ الْمُجَرَّدُ الْمُسْنَدُ بِهِ الْمُغَايِرُ لِلصِّفَةِ الْمَذْكُورَةِ (اور خبر :وہ مجرد (اسم) ہے جس کے ذریعے اسناد کی جائے اور وہ اس صفت مذکور سے مختلف ہو) :خبر وہ اسم یا جملہ ہوتا ہے جس کے ذریعے مبتدا کے بارے میں کوئی اطلاع دی جاتی ہے یا اس کی کیفیت بیان کی جاتی ہے۔ یہ بھی عام طور پر عوامل لفظیہ سے خالی ہوتا ہے۔ اور یہ اس صفت سے مختلف ہوتا ہے جو مبتدا کا کام دے رہی ہوتی ہے (یعنی مبتدا اور خبر دو الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں، اگرچہ کبھی خبر بھی صفت ہو سکتی ہے لیکن وہ اس صفت سے الگ ہو گی جو نفی یا استفہام کے بعد واقع ہوئی ہے)۔ مثال کے طور پر "زَيْدٌ قَائِمٌ" میں "قَائِمٌ" خبر ہے جو "زیدٌ" کے بارے میں اطلاع دے رہی ہے۔

فائدہ؛

مبتدا خبر میں عامل کیا چیز ہے اس کے بارے میں (۳) تین قول ہیں۔

(۱) پہلا قول :...یہ ہے کہ ان دونوں میں عامل معنوی ہے اور وہ ہے ابتدا۔ یہ بصریین کا مذہب صاحب کتاب نے اپنی کتاب

میں اس کو ذکر فرمایا ہے اور اسی کو پسند کیا ہے یعنی صاحب کتاب کا بھی یہی مذہب ہے کہ مبتدا اور خبر میں عامل معنوی ہوتا ہے اور وہ ہے ابتداء۔

(۲) دوسرا قول:... یہ ہے کہ مبتدا کا عامل خبر ہے اور خبر کا عامل مبتدا ہے۔

(۳) تیسرا قول:... یہ ہے کہ مبتدا کا عامل ابتدا ہے اور خبر کا عامل مبتدا ہے

مبتداء کا مقام

وأصل المبتدأ التقديم، ومن ثمّ جاز (في داره زيد)، وامتنع (صاحبها في الدّار).

ترجمہ :اور مبتدا کی اصل تقدیم ہے، اور اسی وجہ سے (فِي دَارِهِ زَيْدٌ) جائز ہے، اور (صَاحِبُهَا فِي الدَّارِ) منع ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں مبتدا کی اصلی اور بنیادی جگہ کے بارے میں بیان فرما رہے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ مبتدا کا اصل مقام جملے میں مقدم ہونا یعنی پہلے ذکر کیا جانا ہے۔ عام طور پر جملہ اسمیہ مبتدا سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد خبر آتی ہے۔ مصنفؒ اس قاعدے کی روشنی میں ایک جملے کے جواز اور دوسرے کے عدم جواز کی وضاحت فرماتے ہیں:

(فِي دَارِهِ زَيْدٌ) جائز ہے:

(فِي دَارِهِ زَيْدٌ) جائز ہے :اس جملے کا ترجمہ ہے "(اس کے گھر میں زید ہے)"۔ یہاں "زَيْدٌ" مبتدا موخر ہے اور "فِي دَارِهِ" جار مجرور مل کر خبر مقدم ہیں، ہ ضمیر کا مرجع زید مبتدا اگرچہ لفظوں میں موخر ہے لیکن رتبے میں مقدم ہے اسی وجہ سے یہ ترکیب جائز ہے۔

(صَاحِبُهَا فِي الدَّارِ) منع ہے:

:(صَاحِبُهَا فِي الدَّارِ) منع ہے اس جملے کا ترجمہ ہے "(اس کا صاحب گھر میں ہے)"۔

عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مبتدا صاحبھا میں ھا ضمیر کا مرجع خبر میں الدار ہے تو اضمار قبل الذکر لفظا اور تبتا دونوں طرح لازم آئے گا اور وہ نائز ہے

مبتدا اور خبر کا حکم

وقد يكون المبتدأ نكرة إذا تخصّصت بوجه ما، مثل: {وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ}، و (أرجل في الدّار أم امرأة؟)، و (ما أحد خير منك)، و (شرّ أهرّ ذا ناب)، و (في الدّار رجل)، و (سلام عليك).

ترجمہ :اور کبھی مبتدا نکرہ ہوتا ہے جب وہ کسی نہ کسی طرح مخصوص ہو جائے، جیسے :{اور البتہ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے}، اور (کیا گھر میں مرد ہے یا عورت؟)، اور (کوئی شخص تجھ سے بہتر نہیں)، اور (شر سخت چیخنے والا ہے، دانت والا)، اور (گھر میں ایک مرد ہے)، اور (سلام ہو تجھ پر)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں مبتدا کے نکرہ ہونے کے بارے میں بیان فرمار ہے ہیں۔
اس عبارت کو سمجھنے سے پہلے آپ یہ سمجھیں کہ مبتدا میں اصل یہ ہے کہ معرفہ ہو۔ کیونکہ یہ محکوم علیہ ہوتا ہے اس کے ذریعے سے حکم لگایا جاتا ہے۔اور خبر میں اصل یہ ہے کہ نکرہ ہو اس لیے کہ خبر محکوم بہ ہے اس پر حکم لگایا جاتا ہے۔

چھ صورتوں میں نکرہ کا مبتداء بننا

وقد يكون المبتدأ نكرة إذا تخصّصت بوجه ما،

اوپر بیان ہوا کہ مبتدا معرفہ ہوتا ہے اور خبر نکرہ ہوتی ہے۔اور نکرہ کبھی مبتدا نہیں بن سکتی لیکن یہاں چند صورتیں ہیں جس میں اسم نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا واقع ہے۔اور یہ کل چھ مقامات ہیں:

پہلا مقام؛

(۱)۔ قَوْلِهٖ تَعَالٰی :وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ۔

کہ جب نکرہ کی صفت لائی جائے تو اس میں تخصیص آجانے کی وجہ سے نکرہ مبتدا بن سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ کہ مومن غلام بہتر ہے مشرک سے۔اب یہاں عَبْدٌ نکرہ ہے لیکن اگلا جملہ اس کی صفت ہے لہٰذا یہ موصوف بن کر مبتدا بن سکتا ہے تخصیص کی وجہ سے۔

دوسرا مقام؛

(۲)۔ و (أرجل في الدّار أم امرأة؟)،

کہ جب کوئی دوسری وجہ ہو نکرہ کے خاص ہونے کی اس وقت بھی نکرہ مبتدا بن سکتا ہے جیسے اَرَجُلٌ فِی الدَّارِ اَمْ اِمْرَأَةٌ کہ گھر میں مرد ہے یا عورت؟ یعنی جب ءَ استفہام اور اَمْ متصلہ کے ذریعے متکلم تعین کو چاہے اس وقت بھی نکرہ مبتدا بن سکتا ہے ۔اور مذکورہ مثال میں متکلم کا سوال تعین میں ہے کیونکہ اس کے پاس علم ہے کہ گھر میں کوئی ہے اب کون ہے اس تعین کے لیے سوال کیا ہے اور اس صورت میں نکرہ مبتدا بن سکتا ہے۔

تیسرا مقام؛

(۳)۔وَمَا اَحَدٌ خَيْرٌ مِّنْكَ؛

اور نہیں ہے کوئی ایک بھی آپ سے بہتر کہتے ہیں کہ جب نکرہ تحت النفی ہو تو اس وقت عموم کا فائدہ دیتا ہے: لِاَنَّ النَّكِرَةَ سِيَاقِ النَّفِيِّ تُفِيْدُ الْعُمُوْمَ۔اور اسی عموم سے تخصیص پیدا ہو جاتی ہے۔

چوتھا مقام؛

(۴)۔وَشَرٌّ اَهَرَّ ذَا نَابٍ ؛

کہ جب نکرہ کی صفت مقدر ہو تو اس وقت بھی نکرہ موصوف بن جانے کی وجہ سے مبتداء بن سکتا ہے جیسے شَرٌّ اَهَرَّ ذَا نَابٍ اصل عبارت اس طرح ہے۔ شَرٌّ عَظِيْمٌ لَّا حَقِيْرٌ اَهَرَّ ذَا نَابٍ کہ یہاں صفت عَظِيْمٌ لَّا حَقِيْرٌ مقدر ہے یہاں شرٌّ کی جو تنوین ہے یہ تنوین تنکیر ہے یہ صفت عَظِيْمٌ لَّا حَقِيْرٌ مقدر پر دلالت کر رہی ہے۔

پانچواں مقام؛

(۵)۔وَفِي الدَّارِ رَجُلٌ؛

کہ جب خبر مقدم ہو جیسے وَفِي الدَّارِ رَجُلٌ اور قانون ہے اَلتَّقْدِيْمُ مَا حَقُّهُ التَّاخِيْرُ تُفِيْدُ الْحَصْرَ وَالْاِخْتِصَاصَ کہ جس چیز کا مقدم ہونا حق ہو اور اسے مؤخر کیا جائے تو وہ حصر اور اختصاص کا فائدہ دیتی ہے۔ جیسے : وَفِي الدَّارِ رَجُلٌ یہاں بھی نکرہ مبتدا ہے حصر اور اختصاص کی وجہ سے۔

چھٹا مقام؛

(۶)۔وَسَلَامٌ عَلَيْكَ؛

ہر وہ صیغہ جو بصورت جملہ اسمیہ ہو یعنی معدول ہوا ہو جملہ اسمیہ سے جملہ فعلیہ کی طرف تو وہ بھی نکرہ ہونے کے باوجود مبتدا بن سکتا ہے جیسے سَلَامٌ عَلَيْكَ اصل میں یہ اس طرح ہے۔

سَلَّمْتُ سَلَامًا عَلَيْكَ اب یہاں سَلَّمْتُ کو حذف کر دیا اور سَلَامًا کے نصب کو رفع سے تبدیل کیا اس لیے کہ نصب دلالت کرتی ہے حدوث پر اور رفع دلالت کرتا ہے دوام اور استمرار پر اور چونکہ یہ دعا کا موقع ہے اور دعا میں استمرار اور دوام ہی مطلوب ہوتا ہے۔ پس یہ رہ گیا سَلَامٌ عَلَيْكَ سلامتی ہو آپ پر۔

خبر کا جملہ واقع ہونا؛

والخبر قد يكون جملة، مثل (زيد أبوه قائم)، و (زيد قام أبوه)، فلا بدّ من عائد، وقد يحذف. وما وقع ظرفا فالأكثر أنّه مقدّر بجملة.

ترجمہ :اور خبر کبھی جملہ ہوتی ہے، جیسے (زَيْدٌ أَبُوْهُ قَائِمٌ) (زید، اس کا باپ کھڑا ہے)، اور (زَيْدٌ قَامَ أَبُوْهُ) (زید، اس کا باپ کھڑا ہوا)، پس عائد (ضمیر جو مبتدا کی طرف لوٹے) کا ہونا ضروری ہے، اور کبھی اسے حذف بھی کر دیا جاتا ہے۔ اور جو ظرف واقع ہو تو اکثر وہ ایک جملے کے مقدر ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں خبر کی ایک اور قسم بیان فرمارہے ہیں کہ خبر کبھی ایک مکمل جملہ بھی ہو سکتی ہے۔

اصل قاعدہ تو یہ ہے کہ خبر مفرد ہوتی ہے لیکن کبھی خبر جملہ بھی ہوا کرتی ہے۔ مصنفؒ اس کی مختلف قسمیں بیان فرماتے ہیں

پہلی قسم جملہ اسمیہ:

والخبر قد يكون جملة، مثل (زيد أبوه قائم)، کہ کبھی خبر جملہ اسمیہ ہوا کرتی ہے جیسے زَيْدٌ اَبُوْهُ قَائِم کہ اس مثال میں زَيْدٌ مبتدا ہے اور اَبُوْهُ قَائِمٌ پورا جملہ اسمیہ مبتداء کی خبر ہے۔

دوسری قسم جملہ فعلیہ:

و (زيد قام أبوه)، یہ ہے کہ خبر کبھی جملہ فعلیہ بھی ہوا کرتی ہے جیسے زَيْدٌ قَامَ اَبُوْهُ کہ اس مثال میں زَيْدٌ مبتدا ہے اور قَامَ اَبُوْهُ میں قَامَ فعل ہے اَبُوْهُ مضاف مضاف الیہ مل کر فعل کا فاعل۔ فعل فاعل مل کر جملہ فعلیہ خبر یہ ہو کر خبر مبتدا کی۔

مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

خبر جملہ واقع ہو تو عائد (رابط) کا ہونا ضروری ہے؛

فلابدّ من عائد، وقد یحذف.

اس عبارت میں صاحب کتاب اس صورت کی وضاحت بیان فرمار ہے ہیں کہ جب مبتدا کی خبر جملہ واقع ہو جائے تو یہ مسئلہ یاد رکھیں کہ جملہ مستقل بِنَفْسِهَا ہوتا ہے اس کا ما قبل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اور مبتدا اور خبر میں ربط اور تعلق ہوتا ہے اور جملے اور مبتدا کے اندر بھی ایک ربط اور تعلق پیدا کرنے کے لیے کسی رابط کا ہونا ضروری ہے تاکہ مبتدا کی طرف لوٹنے والی ضمیر اور مبتدا میں ربط پیدا ہو جائے۔

ربط کی چند صورتیں ہیں:

ربط کی پہلی صورت:

ربط بشکل ضمیر ہو جیسے زَيْدٌ اَبُوْهُ قَائِمٌ اس مثال میں اَبُوْهُ کے اندر جو ہُ ضمیر ہے یہ زَیْدٌ مبتدا اور قَائِمٌ خبر کے درمیان ربط ہے۔

ربط کی دوسری صورت:

یہ ہے کہ ربط بشکل الف لام ہو جیسے نِعْمَ الرَّجُلُ زَيْدٌ کہ اس مثال میں الرَّجُلُ میں جو الف لام ہے یہ ربط ہے نِعْمَ اور زَیْدٌ میں۔

ربط کی تیسری صورت:

یہ ہے کہ ربط بصورت عین مبتدا ہو جیسے قُلْ ہُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کہ یہاں ھُو ربط بھی اور لفظ اللہ کی تفسیر بھی ہے۔

ربط کی چوتھی صورت:

یہ کہ ربط بشکل اسم ظاہر بمقام ضمیر ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان سورۂ قارعہ میں اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ ۲ کہ تقدیری عبارت اس طرح ہے اَلْقَارِعَۃُ مَاھِیَ کہ اُوپر آیت قرآن میں ھی کی جگہ یعنی ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اَلْقَارِعَۃُ ہے۔

عائد (ربط) کا حذف

وقد یحذف... صاحبِ کتابؒ نے فرمایا کہ اس ربط کا حذف کرنا کسی قرینے کے پائے جانے کے وقت جائز ہے۔

جیسے اَلسَّمَنُ مَنَوَانِ بِدِرْهَمٍ اور اَلْبُرُّ الْکُرُّ بِسِتَّيْنِ دِرْهَمًا کہ یہاں مِنْهُ، مِنْهُ کو حذف کر دیا گیا ہے اصل میں تھا اَلسَّمَنُ مَنَوَانُ مِنْهُ بِدِرْهَمٍ اور اَلْبُرُّ الْکُرُّ مِنْهُ بِسِتَّيْنِ دِرْهَمًا یہاں ان دونوں مثالوں میں منہ کو حذف کر دیا گیا وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں قرینہ موجود ہے اور وہ یہ کہ گھی بیچنے والا گھی کے دام بتا رہا ہے اور گندم بیچنے والا گندم کے دام بتا رہا ہے کسی اور چیز کے تو نہیں۔

تیسری قسم: جملہ ظرفیہ:

وما وقع ظرفا یہ کہ خبر جملہ ظرفیہ بھی ہوتی ہے اور ظرف دو طرح کا ہوتا ہے ظرف زمان۔ ظرف مکان۔

ظرف زمان: جیسے زَیْدٌ خَلْفَکَ اس مثال میں زَیْدٌ مبتدا ہے خَلْفَکَ مضاف مضاف الیہ مل کر جملہ ظرف زمان ہو کر خبر مبتدا زَیْدٌ کی۔ مبتدا مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

ظرف مکان: جیسے عَمْرٌو فِي الدَّارِ اس مثال میں عَمْرٌو مبتدا ہے اور فی الدَّارِ جار مجرور مل کر ظرف مکان اِسْتَقَرَّ کے متعلق ہو کر خبر ہوئی مبتدا کی۔ مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

ظرف کا متعلق؛

فالأكثر أنّه مقدّر بجملة.

اس عبارت میں صاحبِ کتابؒ نے ظرف کا متعلق بیان کیا ہے کہ ظرف اکثر جملے کے متعلق ہوتا ہے۔

ظرف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ظرف لغو۔ (۲) ظرف مستقر۔

ظرف لغو: اس کو کہتے ہیں جس کا متعلق لفظوں میں موجود ہو جیسے ضَرَبْتُ زَيْدًا بِالْخَشَبَةِ کہ یہاں متعلق لفظوں میں موجود ہے بِالْخَشَبَةِ کا متعلق ضرب فعل ہے۔

ظرف مستقر: ظرف مستقر اس کو کہتے ہیں کہ جس کا متعلق لفظوں میں موجود نہ ہو بلکہ مقدر ماننا پڑے۔ اور پھر اس میں اختلاف ہے کہ متعلق جملہ اسمیہ کے ساتھ ہو یا جملہ فعلیہ کے ساتھ۔

بصریین کا مذہب:

یہ ہے کہ متعلق جملہ فعلیہ ہو کیونکہ متعلق اپنے متعلّق میں عمل کرتا ہے۔ اور عمل میں فعل اصل ہے لہٰذا متعلق جملہ فعلیہ میں سے نکالیں گے جیسے زَيْدٌ فِي الدَّارِ اور عَمْرٌو فِي الدَّارِ یہاں متعلق جملہ فعلیہ نکالیں گے۔ یہ بصریین کا مذہب ہے اور اسی کو صاحب کتاب نے اختیار کیا ہے اسی وجہ سے فرمایا عِنْدَ الأکْثَرِ۔ تقدیری عبارت زَيْدٌ اِسْتَقَرَّ فِي الدَّارِ۔ وَعَمْرٌو اِسْتَقَرَّ فِي الدَّارِ۔

کوفیین کا مذہب:

کوفی نحات فرماتے ہیں کہ متعلق جملہ اسمیہ میں سے نکالیں گے۔ یعنی اسم فاعل نکالیں گے تاکہ مبتدا خبر میں موافقت پیدا ہو جائے۔ تقدیری عبارت اس طرح ہو گی: زَيْدٌ ثَابِتٌ فِي الدَّارِ۔ وَعَمْرٌو ثَابِتٌ فِي الدَّارِ۔

فائدہ:

جہاں بھی ظرف کا متعلق افعال خاصہ میں سے آنے کے لیے کوئی دلیل یا قرینہ موجود ہو تو وہاں افعال خاصہ میں سے اس کا متعلق نکالیں گے جیسے بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس کا متعلق اَقْرَأُ ہے اور میں کھا رہا ہوں اس کا متعلق اٰکُلُ میں پی رہا ہوں اس متعلق اَشْرَبُ سے آئے گا یعنی جس فعل کا ذکر ہو چکا ہو خاص اسی فعل سے متعلق نکالیں گے۔

اور جہاں کوئی دلیل یا قرینہ موجود نہ ہو وہاں افعال عامہ میں سے متعلق نکالیں گے۔ افعال عامہ چار ہیں: (۱) کَوْنٌ۔ (۲) ثُبُوْتٌ

۔(۳) حُصُوْلٌ۔(۴) وُجُوْدٌ۔ ان چار میں سے کسی کو بھی متعلق نکالیں گے۔

تقدیم مبتداء کی وجوبی صورتیں

وإذا کان المبتدأ مشتملا علی ما له صدر الکلام مثل :(من أبوك؟)، أو کانا معرفتین مثل :(زید القائم)، أو متساویین مثل :(أفضل منك أفضل منّی)، أو کان الخبر فعلا له مثل :(زید قام) وجب تقدیمه.

ترجمہ :اور جب مبتدا ایسی چیز پر مشتمل ہو جس کے لیے صدرِ کلام ہونا ضروری ہے جیسے :(مَنْ أَبُوكَ؟) (تمہارا باپ کون ہے؟)، یا وہ دونوں معرفہ ہوں جیسے :(زَيْدٌ الْقَائِمُ) (زید وہ کھڑا ہونے والا)، یا وہ دونوں برابر ہوں جیسے :(أَفْضَلُ مِنْكَ أَفْضَلُ مِنِّي) (تم سے افضل مجھ سے افضل ہے)، یا خبر اس کے لیے فعل ہو جیسے :(زَيْدٌ قَامَ) (زید کھڑا ہوا) تو اس کا مقدم ہونا واجب ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ان صورتوں کا بیان فرما رہے ہیں جن میں مبتدا کا جملے میں مقدم ہونا واجب ہے، یعنی اسے خبر پر پہلے ذکر کرنا ضروری ہے۔ آپؒ چار ایسی صورتیں بیان فرماتے ہیں:

پہلی صورت:

إِذَا كَانَ الْمُبْتَدَأُ مُشْتَمِلًا عَلَى مَا لَهُ صَدْرُ الْكَلَامِ (جب مبتدا ایسی چیز پر مشتمل ہو جس کے لیے صدرِ کلام ہونا ضروری ہے) :اس سے مراد یہ ہے کہ اگر مبتدا میں کوئی ایسا اسم شامل ہو جس کا یہ نحوی اصول ہے کہ وہ کلام کے شروع میں ہی آنا چاہیے، تو ایسے مبتدا کا مقدم ہونا واجب ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلُ :(مَنْ أَبُوكَ؟) (جیسے :تمہارا باپ کون ہے؟)۔ یہاں مبتدا لفظ "مَنْ" (کون) پر مشتمل ہے جو کہ اسم استفہام ہے اور اسمائے استفہام کا قاعدہ ہے کہ وہ صدرِ کلام ہوتے ہیں، یعنی جملے کے شروع میں آتے ہیں۔ اس لیے یہاں "مَنْ أَبُوكَ؟" میں مبتدا ("مَنْ") ("أَبُوكَ") خبر پر مقدم ہے۔

دوسری صورت:

أَوْ كَانَا مَعْرِفَتَيْنِ (یا وہ دونوں معرفہ ہوں) :جب مبتدا اور خبر دونوں اسم معرفہ ہوں تو مبتدا کا مقدم ہونا واجب ہے۔ اگر خبر کو مبتدا پر مقدم کیا جائے تو یہ ابہام پیدا ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کون مبتدا ہے اور کون خبر۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلُ :(زَيْدٌ الْقَائِمُ) (جیسے :زید وہ کھڑا ہونے والا)۔ یہاں "زَيْدٌ" بھی معرفہ ہے (اسم علم) اور "الْقَائِمُ" بھی معرفہ ہے (الف لام کی وجہ سے)۔ اس لیے "زیدٌ" مبتدا ہے اور "القائمُ" خبر اور مبتدا کو پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری صورت:

أَوْ مُتَسَاوِيَيْنِ (یا وہ دونوں برابر ہوں) :جب مبتدا اور خبر دونوں وصف میں برابر ہوں (مثلاً دونوں اسم تفضیل ہوں اور کسی قرینے سے ان کی تمیز ممکن نہ ہو) تو مبتدا کا مقدم ہونا واجب ہے۔ اگر خبر کو پہلے ذکر کیا جائے تو یہ واضح نہیں ہو سکے گا کہ کس کو کس پر فضیلت دی جا رہی ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلُ :(أَفْضَلُ مِنْكَ أَفْضَلُ مِنِّي) (جیسے :تم سے افضل مجھ

سے افضل ہے)۔ یہاں پہلا "أَفْضَلُ" مبتدا ہے اور دوسرا "أَفْضَلُ" خبر ہے۔ دونوں اسم تفضیل ہیں اور اگر خبر کو مقدم کیا جائے تو معنی مبہم ہو جائے گا۔

چوتھی صورت؛

أَوْ كَانَ الْخَبَرُ فِعْلًا لَه (یا خبر اس کے لیے فعل ہو) :جب خبر کوئی فعل ہو مبتداء کا تو مبتدا کا مقدم ہونا واجب ہے۔ اگر فعل کو پہلے ذکر کیا جائے تو التباس فعل و فاعل کے ساتھ ہو جائے گا۔

مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلَ :(زَيْدٌ قَامَ) (جیسے :زید کھڑا ہوا)۔ یہاں "زَيْدٌ" مبتدا ہے اور "قَامَ" خبر ہے۔

اگر کہا جائے "قَامَ زَيْدٌ" تو یہ جملہ فعلیہ بن جائے گا جس میں "قَامَ" فعل اور "زَيْدٌ" فاعل ہوگا۔ اس لیے جب خبر فعل ہو جس کا فاعل مبتدا ہو تو مبتدا کا مقدم ہونا ضروری ہے۔

تقدیم خبر کی وجوبی صورتیں

وإذا تضمّن الخبر المفرد ماله صدر الكلام مثل :(أين زيد؟)، أو كان مصحّحا له مثل :(في الدّار رجل)، أو لمتعلّقه ضمير في المبتدأ مثل :(على التّمرة مثلها زبدا)، أو كان خبرا عن (أنّ) مثل :(عندي أنك قائم)، وجب تقديمه.

ترجمہ :اور جب خبر مفرد ایسی چیز پر مشتمل ہو جس کے لیے صدرِ کلام ہونا ضروری ہے جیسے :(أَيْنَ زَيْدٌ؟) (زید کہاں ہے؟)، یا وہ اس (مبتدا) کی تصحیح کرنے والی ہو جیسے :(فِي الدَّارِ رَجُلٌ) (گھر میں ایک مرد ہے)، یا اس کے متعلق میں مبتدا کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہو جیسے :(عَلَى التَّمْرَةِ مِثْلُهَا زُبْدًا) (کھجور پر اس جیسی مکھن ہے)، یا وہ (أَنَّ) کی خبر ہو جیسے :(عِنْدِي أَنَّكَ قَائِمٌ) (میرے نزدیک بے شک تو کھڑا ہے)، تو اس کا مقدم ہونا واجب ہے۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ان صورتوں کا بیان فرما رہے ہیں جن میں خبر کا مبتدا پر مقدم ہونا واجب ہے۔ آپؒ چار ایسی صورتیں بیان فرماتے ہیں:

پہلی صورت؛

إِذَا تَضَمَّنَ الْخَبَرُ الْمُفْرَدُ مَا لَهُ صَدْرُ الْكَلَامِ (جب خبر مفرد ایسی چیز پر مشتمل ہو جس کے لیے صدرِ کلام ہونا ضروری ہے) :اس سے مراد یہ ہے کہ اگر خبر میں کوئی ایسا اسم شامل ہو جس کا یہ نحوی اصول ہے کہ وہ کلام کے شروع میں ہی آنا چاہیے، تو ایسی خبر کا مقدم ہونا واجب ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلَ :(أَيْنَ زَيْدٌ؟) (جیسے :زید کہاں ہے؟)۔ یہاں خبر لفظ "أَيْنَ" (کہاں) پر مشتمل ہے جو کہ اسم استفہام ہے اور اسمائے استفہام کا قاعدہ ہے کہ وہ صدرِ کلام ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں "أَيْنَ زَيْدٌ؟" میں خبر ("أَيْنَ") مبتدا ("زَيْدٌ") پر مقدم ہے۔

دوسری صورت؛

أَوْ كَانَ مُصَحِّحًا لَهُ (یا وہ اس (مبتدا) کی تصحیح کرنے والی ہو) :اس سے مراد وہ صورت ہے جب خبر مقدم ہو کر مبتدا کو نکرہ

ہونے کی صورت میں درست قرار دے، یعنی خبر کے مقدم ہونے کی وجہ سے مبتدا نکرہ ہونے کے باوجود استعمال ہو سکے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلَ :(فِي الدَّارِ رَجُلٌ) (جیسے :گھر میں ایک مرد ہے)۔ یہاں خبر "فِي الدَّارِ" جار مجرور مل کر مقدم ہے اور مبتدا "رَجُلٌ" نکرہ اور موخر ہے۔ خبر کے ظرف (جار مجرور) ہونے کی وجہ سے مبتدا کا نکرہ ہونا جائز ہو گیا ہے اور اس لیے خبر کا مقدم ہونا ایک طرح سے مبتدا کی تصحیح کر رہا ہے۔

تیسری صورت؛

أَوْ لِمُتَعَلِّقِهِ ضَمِيرٌ فِي الْمُبْتَدَأِ (یا اس کے متعلق کی ضمیر ہو مبتداء میں) :اس سے مراد یہ ہے کہ خبر کا کوئی متعلق (جیسے جار مجرور یا ظرف) ہو اور اس متعلق کی طرف لوٹنے والی ضمیر مبتدا میں ہو، تو خبر کا مقدم ہونا واجب ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں: مِثْلَ :(عَلَى التَّمْرَةِ مِثْلُهَا زُبْدًا) (جیسے :کھجور پر اس جیسی مکھن ہے)۔ یہاں خبر "عَلَى التَّمْرَةِ" جار مجرور مل کر مقدم ہے اور مبتدا موخر ہے۔ خبر کے متعلق التمرۃ کی طرف لوٹنے والی ضمیر "مِثْلُهَا" میں ضمیر "هَا" ہے، اب اگر خبر کو مبتداء پر مقدم نہ کیا جائے تو اضمار قبل الذکر لازم آئے گا اور وہ ناجائز ہے۔

چوتھی صورت؛

-أَوْ كَانَ خَبَرًا عَنْ (أَنَّ) (یا وہ (أَنَّ) کی خبر ہو) :اس سے مراد یہ ہے کہ جب خبر کسی ایسے جملے کی ہو جو "أَنَّ" اور اس کے اسم پر مشتمل ہو (یعنی "أَنَّ" اور اس کا اسم مل کر ایک موول بالصریح مصدر بنتے ہیں جو مبتدا کا کام دیتا ہے) تو خبر کا مقدم ہونا واجب ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلَ :(عِنْدِي أَنَّكَ قَائِمٌ) (جیسے :میرے نزدیک بے شک تو کھڑا ہے)۔ یہاں مبتدا موخر "أَنَّكَ قَائِمٌ" موول بالصریح مصدر ہے (تقدیراً :"قیامک") اور خبر مقدم "عِنْدِي" ظرف مکان ہے۔ یہاں خبر کے مقدم ہونے کی وجہ سے یہ ہے کہ أَن کا التباس إِن کے ساتھ نہ ہو جائے کیونکہ إِن کسرہ ہمزہ کے ساتھ فقط کلام کے شروع میں ہوتی ہے۔

ایک مبتداء کی متعدد خبریں

وقد يتعدّد الخبر، مثل :(زيد عالم عاقل).

ترجمہ :اور خبر کبھی متعدد ہوتی ہے، جیسے :(زَيْدٌ عَالِمٌ عَاقِلٌ) (زید عالم ہے، عاقل ہے)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں خبر کی ایک اور صورت بیان فرما رہے ہیں کہ خبر ایک سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ مبتدا کے لیے صرف ایک ہی خبر ہو۔ بعض اوقات مبتدا کے بارے میں ایک سے زیادہ باتیں بتائی جا سکتی ہیں اور وہ سب خبریں شمار ہوں گی۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلَ :(زَيْدٌ عَالِمٌ عَاقِلٌ) (جیسے : زید عالم ہے، عاقل ہے)۔ اس جملے میں "زَيْدٌ" مبتدا ہے اور "عَالِمٌ" اس کی پہلی خبر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ زید علم والا ہے۔ اس کے بعد "عَاقِلٌ" اسی مبتدا کی دوسری خبر ہے جس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ زید عقل مند بھی ہے۔ یہاں دونوں

الفاظ "عَالِمٌ" اور "عَاقِلٌ" مبتدا "زَیْدٌ" کے بارے میں الگ الگ خبریں دے رہے ہیں اور اس لیے یہ دونوں خبریں کہلائیں گے، وجہ اس کی یہ ہے کہ خبر حکم کو کہا جاتا ہے اور حکم صفت کو کہا جاتا ہے تو ایک ہی موصوف کی بہت ساری صفات ممکن ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی صفت دوسری صفت کے متضاد نہ ہو خلاف نہ ہو ساری صفات ایک دوسرے کے موافق ہوں جیسے زَیْدٌ عَالِمٌ جَاهِلٌ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ انسان یا تو عالم ہو گا یا جاہل۔ پس تمام صفات کا موافق ہونا ضروری ہے جیسے :زَیْدٌ عَالِمٌ عَاقِلٌ۔ زیدٌ مبتداء ہے عالم، عاقل یہ تمام مبتداء کی خبریں ہیں۔

مبتداء کی خبر پر فا کا داخل کرنا

وقد يتضمّن المبتدأ معنى الشّرط فيصحّ دخول الفاء في الخبر، وذلك الاسم الموصول بفعل أو ظرف، أو النّكرة الموصوفة بهما، مثل (الّذي يأتيني، أو في الدّار، فله درهم)، و (كلّ رجل يأتيني، أو في الدّار، فله درهم)، و (ليت) و (لعلّ) مانعان بالاتّفاق، وألحق بعضهم (إنّ) بهما.

ترجمہ :اور کبھی مبتدا شرط کا معنی دیتا ہے تو خبر میں فاء کا داخل ہونا درست ہو جاتا ہے، اور وہ اسم موصول ہے جو فعل یا ظرف کے ساتھ صلہ کیا گیا ہو، یا وہ نکرہ ہے جس کی صفت ان دونوں کے ساتھ بیان کی گئی ہو، جیسے (اَلَّذِي يَأْتِينِي، أَوْ فِي الدَّارِ، فَلَهُ دِرْهَمٌ) (جو میرے پاس آئے، یا گھر میں ہو، تو اس کے لیے ایک درہم ہے)، اور (كُلُّ رَجُلٍ يَأْتِينِي، أَوْ فِي الدَّارِ، فَلَهُ دِرْهَمٌ) (ہر وہ مرد جو میرے پاس آئے، یا گھر میں ہو، تو اس کے لیے ایک درہم ہے)، اور (لَيْتَ) اور (لَعَلَّ) بالاتفاق مانع ہیں، اور بعض نے (إِنَّ) کو بھی ان کے ساتھ ملحق کیا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ایک خاص صورت بیان فرما رہے ہیں جس میں مبتدا جملے میں شرط کا معنی دیتا ہے اور اس وجہ سے خبر میں حرف فاء (ف) کا آنا جائز ہو جاتا ہے۔ عام طور پر مبتدا کے بعد خبر بغیر فاء کے آتی ہے، لیکن جب مبتدا میں شرط کا مفہوم پیدا ہو جائے تو خبر جزائیہ کی طرح فاء کے ساتھ مربوط ہو سکتی ہے۔ آپؒ اس کی چند صورتیں بیان فرماتے ہیں:

پہلی صورت مبتداء اسم موصول

وَذَلِكَ الِاسْمُ الْمَوْصُولُ بِفِعْلٍ أَوْ ظَرْفٍ (اور وہ اسم موصول ہے جو فعل یا ظرف کے ساتھ صلہ کیا گیا ہو) :جب مبتدا کوئی اسم موصول (جیسے الَّذِی - وہ جو، مَنْ - جو کوئی) ہو اور اس کا صلہ (وہ جملہ یا شبہ جملہ جو اسم موصول کے بعد آتا ہے) فعل پر مشتمل ہو یا کسی ظرف پر، تو ایسا مبتدا شرط کا معنی دیتا ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلُ (الَّذِي يَأْتِينِي، أَوْ فِي الدَّارِ، فَلَهُ دِرْهَمٌ) (جیسے :جو میرے پاس آئے، یا گھر میں ہو، تو اس کے لیے ایک درہم ہے)۔ یہاں "الَّذِی" مبتدا ہے جس کا صلہ "يَأْتِينِي" (فعل) ہے اور دوسرا صلہ "فِي الدَّارِ" (ظرف) ہے۔ خبر "لَهُ دِرْهَمٌ" فاء کے ساتھ آئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ مبتدا شرط کا معنی دے رہا ہے۔ گویا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی میرے پاس آئے یا گھر میں ہو تو اس کے لیے ایک درہم ہے۔

دوسری صورت مبتداء نکرہ موصوفہ

أَوِ النَّكِرَةُ الْمَوْصُوفَةُ بِهِمَا (یا وہ نکرہ ہے جس کی صفت ان دونوں کے ساتھ بیان کی گئی ہو) :جب مبتدا کوئی نکرہ اسم ہو اور اس کی صفت کسی فعل یا ظرف کے ذریعے بیان کی گئی ہو تو ایسا مبتدا بھی شرط کا معنی دیتا ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :وَ (كُلُّ رَجُلٍ يَأْتِينِي، أَوْ فِي الدَّارِ، فَلَهُ دِرْهَمٌ) (جیسے :ہر وہ مرد جو میرے پاس آئے، یا گھر میں ہو، تو اس کے لیے ایک درہم ہے)۔ یہاں "كُلُّ رَجُلٍ" مبتدا ہے جو کہ نکرہ ہے اور اس کی صفت "يَأْتِينِي" (فعل) اور "فِي الدَّارِ" (ظرف) کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ خبر "فَلَهُ دِرْهَمٌ" فاء کے ساتھ آئی ہے جو مبتدا کے شرطی معنی پر دلالت کر رہی ہے۔

مانع حروف :(لَيْتَ) وَ (لَعَلَّ)

مصنفؒ کچھ ایسے حروف کا ذکر کرتے ہیں جو مبتدا کے شرط کا معنی دینے میں مانع ہوتے ہیں، یعنی اگر مبتدا ان حروف کے بعد واقع ہو تو خبر میں فاء کا آنا جائز نہیں ہوتا۔

(لَيْتَ) وَ (لَعَلَّ) مَانِعَانِ بِالِاتِّفَاقِ (اور (لیت) اور (لعل) بالاتفاق مانع ہیں) :حروف مشبہ بالفعل "لَيْتَ" (کاش) اور "لَعَلَّ" (شاید) اگر جملے میں موجود ہوں تو مبتدا شرط کا معنی نہیں دیتا اور اس لیے خبر میں فاء نہیں آتی۔

حرف مشبہ بالفعل "إِنَّ" کا حکم

وَأَلْحَقَ بَعْضُهُمْ (إِنَّ) بِهِمَا (اور بعض نے (إنّ) کو بھی ان کے ساتھ ملحق کیا ہے) :کچھ نحویوں نے حرف مشبہ بالفعل "إِنَّ" (بے شک) کو بھی "لَيْتَ" اور "لَعَلَّ" کے حکم میں شامل کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک "إِنَّ" کی موجودگی میں بھی مبتدا شرط کا معنی نہیں دیتا اور خبر میں فاء نہیں آتی۔

حزفِ مبتداء

وقد يحذف المبتدأ لقيام قرينة جوازا، كقول المستهل :(الهلال والله!).

ترجمہ :اور کبھی مبتدا قرینہ کے موجود ہونے کی وجہ سے جوازاً حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے چاند دیکھنے والے کا قول :(چاند، اللہ کی قسم!)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں مبتدا کے حذف ہونے کے بارے میں بیان فرما رہے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ مبتدا کو بعض اوقات کلام میں سے حذف کر دینا جائز ہوتا ہے، بشرطیکہ کوئی قرینہ موجود ہو جس سے حذف شدہ مبتدا کا علم ہو سکے۔ مصنفؒ اس کی ایک مثال دیتے ہیں :كَقَوْلِ الْمُسْتَهِلِّ :(الْهِلَالُ وَاللّٰهِ!) (جیسے چاند دیکھنے والے کا قول :چاند، اللہ کی قسم!)۔ جب کوئی شخص رمضان یا عید کا چاند دیکھتا ہے تو وہ اس کو دیکھ کر کہتا ہے "الْهِلَالُ وَاللّٰهِ!"۔ اس جملے کا ظاہری ترجمہ ہے "(یہ) چاند، اللہ کی قسم!"۔ لیکن اگر نحوی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہاں مبتدا محذوف ہے اور وہ ہے لفظ "هٰذَا" (یہ) یا کوئی اس معنی کا دوسرا لفظ۔ اصل جملہ یوں تھا :"هٰذَا الْهِلَالُ وَاللّٰهِ!" (یہ چاند ہے، اللہ کی قسم!)۔ یہاں مبتدا "هٰذَا"

کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ کلام کے سیاق و سباق اور چاند دیکھنے والے کے عمل سے یہ بات واضح ہے کہ وہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پس قرینہ موجود ہونے کی وجہ سے مبتدا کو حذف کرنا جائز ہے۔

حزفِ خبر جوازی ووجوبی

والخبر جوازا ،مثل (خرجت فإذا السّبع)، ووجوبافيما التزم في موضعه غيره، مثل :(لولا زيد لكان كذا)، و(ضربي زيدا قائما)، و(كلّ رجل وضيعته) و (لعمرك لأفعلنّ كذا).

ترجمہ :اور خبر جوازاً حذف ہوتی ہے جیسے (خَرَجْتُ فَإِذَا السَّبُعُ) (میں نکلا تو اچانک شیر)۔ اور وجوباً ان صورتوں میں جن میں اس کی جگہ کسی اور چیز کا ہونا لازم ہو جیسے :(لَوْلَا زَيْدٌ لَكَانَ كَذَا) (اگر زید نہ ہوتا تو ایسا ایسا ہوتا)، اور (ضَرْبِي زَيْدًا قَائِمًا) (میرا زید کو مارنا کھڑے ہوئے)، اور (كُلُّ رَجُلٍ وَضَيْعَتُهُ) (ہر آدمی اور اس کا حال) اور (لَعَمْرُكَ لَأَفْعَلَنَّ كَذَا) (تیری عمر کی قسم میں ضرور ایسا کروں گا)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں خبر کے حذف ہونے کے بارے میں بیان فرما رہے ہیں۔ جس طرح مبتدا کو حذف کرنا جائز ہوتا ہے، اسی طرح خبر کو بھی حذف کیا جا سکتا ہے۔ یہ حذف کبھی جائز ہوتا ہے اور کبھی واجب۔

خبر کا جوازاً حذف ہونا :

مصنفؒ اس کی ایک مثال دیتے ہیں:(خَرَجْتُ فَإِذَا السَّبُعُ) (میں نکلا تو اچانک شیر) :اس جملے میں "خَرَجْتُ" فعل اور فاعل ہے۔ اس کے بعد "فَإِذَا" حرف مفاجات ہے جس کے بعد "السَّبُعُ" مبتدا ہے۔ یہاں خبر محذوف ہے جس کا تقدیر ہے "مَوْجُودٌ" (موجود ہے)۔ یعنی اصل جملہ یوں تھا :"خَرَجْتُ فَإِذَا السَّبُعُ مَوْجُودٌ" (میں نکلا تو اچانک شیر موجود تھا)۔ قرینہ موجود ہونے کی وجہ سے خبر کو حذف کرنا جائز ہے۔

خبر کا وجوباً حذف ہونا :

ووجوبا فيما التزم في موضعه غيره...إلخ

مصنف رحمہ اللہ، مبتدا کی خبر کے جوازاً حذف ہونے کے مقامات بیان کرنے کے بعد، اب ان مقامات کو بیان فرما رہے ہیں جہاں مبتدا کی خبر کو وجوبی طور پر (یعنی لازماً) حذف کیا جاتا ہے۔ اس کا ضابطہ اور اصول بیان کرتے ہوئے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ خبر کا حذف وجوبی ہر اس مقام پر ہوتا ہے جہاں خبر کی جگہ کسی اور چیز نے لے لی ہو اور وہ چیز خبر کے معنی پر دلالت کر رہی ہو، جس کی وجہ سے خبر کو ذکر کرنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ کلام کی فصاحت کے خلاف ہو جاتا ہے۔ یعنی کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جو خبر کا کام دے رہا ہو اور اسے ذکر کرنے سے بے نیاز کر دے۔ پھر مصنفؒ اس قاعدے کی چار مشہور مثالیں ذکر فرماتے ہیں۔

.1: مثالِ اول :

(لولا زيد لكان كذا) ترجمہ :(اگر زید نہ ہوتا تو ایسا ہو جاتا)۔ یہاں "لولا" حرفِ شرط ہے جو "ایک چیز کے ہونے کی وجہ سے

دوسری چیز کے نہ ہونے" پر دلالت کرتا ہے (حرف امتناع لوجود)۔ اس کے بعد آنے والا اسم "زیدٌ" مبتدا ہے اور اس کی خبر وجوبی طور پر محذوف ہے۔

وجہ حذف :

خبر یہاں پر "کونِ عام" ہے یعنی کوئی عام ہونا یا وجود، جیسے "موجودٌ"۔ اصل عبارت تھی "لولا زيدٌ موجودٌ لكان كذا"۔ لیکن "لولا" کا جواب یعنی "لكان كذا" خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ زید کا وجود شرط ہے، للذا خبر "موجودٌ" کو ذکر کرنا محض تکرار ہے جس کی ضرورت نہیں۔ جوابِ شرط نے خبر کی جگہ لے لی ہے اور اس پر دلالت کر رہا ہے۔ للذا یہاں خبر کو حذف کرنا واجب ہے۔

.2 مثالِ دوم :

(ضربي زيدا قائما) ترجمہ : (میرا زید کو مارنا اس حال میں کہ وہ کھڑا تھا)۔ اس مثال میں "ضربي" (ضربٌ مضاف بہ یاء متکلم) مبتدا ہے، جو کہ مصدر ہے۔ "زيدا" اس کا مفعول بہ ہے۔ "قائما" یہ "زيدا" سے حال ہے۔ یہاں مبتدا "ضربي" کی خبر محذوف ہے اور اس کا حذف واجب ہے۔

وجہ حذف :

یہاں حال یعنی "قائما" نے خبر کی جگہ لے لی ہے اور اس کے معنی پر دلالت کر رہا ہے۔ اصل تقدیرِ عبارت یوں تھی :"ضربي زيدا إذا كان قائما" (میرا زید کو مارنا اس وقت ہے جب وہ کھڑا ہو)۔ تو "إذا كان" جو کہ خبر ہے، اس کا مفہوم "قائما" کے حال سے ہی ادا ہو رہا ہے۔ جب حال ذکر کر دیا جائے تو وہ خبر کو ذکر کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ للذا، یہاں خبر کا حذف واجب ہے۔

.3 مثالِ سوم :

(كلّ رجل وضيعته) ترجمہ :(ہر آدمی اپنے کام کے ساتھ ہے)۔ اس مثال میں "كلُّ رجلٍ" مبتدا ہے اور "واو" یہاں پر "واوِ مَعِیَّت" ہے یعنی "ساتھ" کا معنی دے رہی ہے۔ "ضيعتَه" اس پر معطوف ہے۔ یہاں بھی مبتدا "كل رجل" کی خبر وجوبی طور پر محذوف ہے۔

وجہ حذف :

یہاں "واوِ معیت" خود اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ مبتدا اور اس کے بعد والا اسم آپس میں ایک ساتھ اور لازم وملزوم ہیں۔ خبر کی تقدیر "مقترنان" یا "متلازمان" (ساتھ ساتھ ہیں) ہے۔ اصل عبارت تھی "كلُّ رجلٍ وضيعتُه مقترنان"۔ چونکہ "واو" نے ہی "مَعَ" (ساتھ) کا معنی ادا کر دیا ہے، اس لیے خبر "مقترنان" کو ذکر کرنا کلام میں حشو (غیر ضروری اضافہ) شمار ہوگا، للذا اس کا حذف واجب ہے۔

.4 مثالِ چہارم :

(لعمرك لأفعلنّ كذا)ترجمہ : (تمہاری زندگی کی قسم، میں ضرور ایسا کروں گا)۔ یہ قسم کا صیغہ ہے۔ یہاں "لَعَمْرُكَ" مبتدا ہے۔ "لَ" لامِ ابتدا ہے اور "عَمْرٌ" بمعنی زندگی مبتدا ہے، جو "كَ" ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ یہ مبتدا ایسا ہے جو قسم میں صریح ہے (یعنی واضح طور پر قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے)۔

وجہ حذف :

جب مبتدا قسم میں صریح ہو تو اس کی خبر کو وجوباً حذف کیا جاتا ہے۔ اس کی خبر "قَسَمِيْ" (میری قسم) یا "يَمِيْنِيْ" (میری قسم) محذوف ہے۔ اصل عبارت تھی "لعمرُكَ قسمي" (تمہاری زندگی میری قسم ہے)۔ چونکہ "لعمرك" خود قسم ہونے میں اتنا مشہور اور واضح ہے کہ اس کی خبر "قسمي" کو ذکر کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ بلکہ جوابِ قسم "لأفعلنّ كذا" اس خبر پر دلالت کر رہا ہے اور اس کی جگہ لے چکا ہے، للذا یہاں خبر کا حذف واجب ہے۔

پانچواں مرفوع ان اور اس کے اخوات کی خبر

خبر إنّ وأخواتها :هو المسند بعد دخول هذه الحروف، مثل :(إن زيدا قائم)، وأمره كأمر خبر المبتدأ، إلاّ في تقديمه، إلاّ إذا كان ظرفا.

ترجمہ :اور إِنَّ اور اس کے اخوات کی خبر :وہ (اسم) ہے جس کی اسناد ان حروف کے داخل ہونے کے بعد کی جائے، جیسے :(إِنَّ زَيْدًا قَائِمٌ) (بے شک زید کھڑا ہے)، اور اس کا حکم مبتدا کی خبر کے حکم کی طرح ہے، سوائے اس کے مقدم ہونے میں، مگر جب وہ ظرف ہو۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے إِنَّ اور اس کے اخوات کی خبر کا بیان فرما رہے ہیں۔ إِنَّ اور اس کے اخوات اور یہ کل چھ ٦ ہیں :

١	إِنَّ	ثلاثی ہے بمعنی	حَقَّقْتَ
٢	أَنَّ	ثلاثی ہے بمعنی	حَقَّقْتَ
٣	كَأَنَّ	رباعی ہے بمعنی	شَبَّهْتَ
٤	لٰكِنَّ	خماسی ہے بمعنی	اِسْتَدْرَكْتَ
٥	لَيْتَ	ثلاثی ہے بمعنی	تَمَنَّيْتَ
٦	لَعَلَّ	رباعی ہے بمعنی	تَرَجَّيْتَ

یہ حروف معنئ فعل پر دلالت کرتے ہیں اسی وجہ سے ان حروف کو حُرُوْفِ مُشَبَّهٌ بِالْفِعْلِ کہا جاتا ہے۔

حروف مشبہ بالفعل ہیں جو جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں اور مبتدا کو نصب (زبر) دے کر اسمِ إِنَّ بناتے ہیں اور خبر کو رفع (پیش) دے کر خبرِ إِنَّ بناتے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ إِنَّ اور اس کے اخوات کی خبر وہ اسم یا جملہ ہے جس کی اسناد ان حروف کے جملے میں داخل ہونے کے بعد کی جاتی ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلُ :(إِنَّ زَيْدًا قَائِمٌ) (جیسے :بے شک زید کھڑا ہے)۔ اس

جملے میں "اِنَّ" حرف مشبہ بالفعل ہے، "زیدًا" اسم اِنَّ ہے جو منصوب ہے، اور "قائمٌ" خبر اِنَّ ہے جو مرفوع ہے۔

خبر اِنَّ کا حکم :

وأمره كأمر خبر المبتدأ.

یہاں سے صاحب کتاب حروف مشبہ بالفعل کی خبر کے حکم کو بیان فرمارہے ہیں کہ مفرد یا جملہ ہونے میں اور معرفہ یا نکرہ ہونے میں اس کا وہی حکم ہے جو مبتدا کی خبر کا ہے۔ یعنی جس طرح مبتداء کی خبر مفرد آسکتی، انکی خبر مفرد بھی آسکتی ہے جیسے اِنَّ زیدًا قائمٌ اور اسی طرح جیسے مبتدا کی خبر جملہ اسمیہ، فعلیہ شرطیہ ظرفیہ آسکتی ہے اسی طرح اِنَّ اور اس کے اخوات کی خبر بھی آسکتی ہے جیسے:

اِنَّ زَيْدًا اِنْ جَاءَنِيْ فَاَكْرَمْتُهٗ۔ اِنَّ زَيْدًا ابوه قَائِمٌ. اِنَّ زيدًا فی الدار . اِنَّ زَيْدًا الْمُنْطَلِقٌ۔

تقدیم کا استثناء : اِلّا فی تقدیمہ،

مصنفؒ آگے ایک اہم فرق بیان فرماتے ہیں اور وہ ہے خبر کی تقدیم کا مسئلہ۔ آپؒ فرماتے ہیں : إِلَّا فِي تَقْدِيمِهِ (سوائے اس کے مقدم ہونے میں)۔ مبتدا کی خبر بعض خاص شرائط کے ساتھ مبتدا پر مقدم ہو سکتی ہے، لیکن اِنَّ اور اس کے اخوات کی خبر عام طور پر اپنے اسم پر مقدم نہیں ہوتی۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اِنَّ اور اس کا اسم آتا ہے اور پھر اس کی خبر۔

مگر جب وہ ظرف ہو :

مصنفؒ اس قاعدے سے ایک استثناء بیان فرماتے ہیں : إِلَّا إِذَا كَانَ ظَرْفًا (مگر جب وہ ظرف ہو)۔ اگر اِنَّ اور اس کے اخوات کی خبر ظرف ہو (یعنی ظرف زمان، ظرف مکان یا جار مجرور ہو) تو ایسی صورت میں اس خبر کا اپنے اسم پر مقدم ہونا جائز ہے۔ مثال کے طور پر آپ کہہ سکتے ہیں: (إِنَّ عِنْدَكَ زَيْدًا) (بے شک تیرے پاس زید ہے) - یہاں "عِنْدَكَ" ظرف مکان ہے جو خبر اِنَّ مقدم ہے اور "زیدًا" اسم اِنَّ مؤخر ہے۔ (إِنَّ فِي الدَّارِ عَمْرًا) (بے شک گھر میں عمرو ہے) - یہاں "فِي الدَّارِ" جار مجرور مل کر خبر اِنَّ مقدم ہیں اور "عمرًا" اسم اِنَّ مؤخر ہے۔

چھٹا مرفوع لائے نفی جنس کی خبر

خبر (لا) الّتی لنفی الجنس :هو المسند بعد دخولها، مثل :(لا غلام رجل ظریف فیها). ویحذف كثیرا، وبنو تمیم لا یثبتونه.

ترجمہ : اور (لَا) کی خبر جو نفی جنس کے لیے ہے : وہ (اسم) ہے جس کی اسناد اس کے داخل ہونے کے بعد کی جائے، جیسے : (لَا غُلَامَ رَجُلٍ ظَرِيفٌ فِيهَا) (کوئی غلام کسی مرد کا، جو ظریف ہو، اس میں نہیں ہے)۔ اور وہ (خبر) بکثرت حذف کی جاتی ہے، اور بنو تمیم اسے ثابت نہیں کرتے (یعنی اس کا اثبات نہیں کرتے ہیں)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے (لَا) نافیہ جنس کی خبر کا بیان فرمارہے ہیں۔ (لَا) نافیہ جنس وہ حرف

ہے جو جملہ اسمیہ پر داخل ہو کر پوری جنس کی نفی کرتا ہے۔ یہ (إِنَّ) اور اس کے اخوات کی طرح عمل کرتا ہے، یعنی اسم کو نصب دے کر اسم (لَا) بناتا ہے اور خبر کو رفع دے کر خبرِ (لا) بناتا ہے۔آپؒ فرماتے ہیں کہ (لَا) نافیہ جنس کی خبر وہ اسم یا جملہ ہے جس کی اسناد اس حرف کے جملے میں داخل ہونے کے بعد کی جاتی ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :مِثْلُ :(لَا غُلَامَ رَجُلٍ ظَرِيفٌ فِيهَا) (جیسے :کوئی غلام کسی مرد کا، جو ظریف ہو، اس میں نہیں ہے)۔ اس جملے میں "لَا" نافیہ جنس ہے، "غُلَامَ رَجُلٍ" (غلام کسی مرد کا) اسمِ (لَا) ہے جو مضاف اور مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اور "ظَرِيفٌ" خبرِ (لَا) ہے جو مرفوع ہے اور "فِيهَا" اس خبر سے متعلق ظرف ہے۔اس جملے کا معنی یہ ہے کہ اس جگہ میں کسی ایسے مرد کا کوئی غلام نہیں ہے جو ظریف (ذہین یا چالاک) ہو۔

خبر کا حذف :

مصنفؒ فرماتے ہیں :وَيُحْذَفُ كَثِيرًا (اور وہ (خبر) بکثرت حذف کی جاتی ہے)۔ (لا) نافیہ جنس کی خبر اکثر اوقات کلام میں سے حذف کر دی جاتی ہے اگر قرینہ موجود ہو جس سے اس کا علم ہو سکے۔اس کی بہت سی مثالیں عربی زبان میں موجود ہیں جیسے:لا الہ الا اللہ(ای موجود)لافتی الا علی (ای موجود)وغیرہ۔

بنو تمیم کا مسلک :

مصنفؒ مزید فرماتے ہیں :وَبَنُو تَمِيمٍ لَا يُثْبِتُونَهُ (اور بنو تمیم اسے ثابت نہیں کرتے)۔اس قول کی ایک توجیہ یہ ہے کہ بنو تمیم (جو کہ ایک مشہور عرب قبیلہ ہے) اس ترکیب میں خبر کا اثبات نہیں کرتے یعنی ان کی لغت میں خبر کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے اور وہ اصلاً اسے محذوف رکھتے ہیں جیسے:لا اهل ولا مال بنو تمیم کے نزدیک انتفی الاهل والمال کے معنی میں ہے خبر کی ضرورت نہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے نزدیک اس طرح کی ترکیب میں خبر وجوباً حذف ہوتی ہے۔

ساتواں مرفوع ما ولا مشابہ بلیس کا اسم

اسم(ما)و(لا) المشبّهتين ب(ليس) :هو المسند إليه بعد دخولهما، مثل :(ما زيد قائما)و(لا رجل أفضل منك)، وهو في(لا) شاذّ.

ترجمہ :اور (ما) اور (لا) کا اسم جو (لَيْسَ) کے مشابہ ہیں :وہ (اسم) ہے جس کی طرف ان کے داخل ہونے کے بعد اسناد کی جائے، جیسے :(مَا زَيْدٌ قَائِمًا) (زید کھڑا نہیں)، اور (لَا رَجُلٌ أَفْضَلَ مِنْكَ) (کوئی شخص تجھ سے افضل نہیں)، اور وہ (لا) میں شاذ ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، فرماتے ہیں مرفوعات کی ساتویں قسم ما اور لا کے بیان میں ہے جو مشابہ ہیں لَيْسَ کے۔

ماوَلَا کی لَیْسَ کے ساتھ دو طرح کی مشابہت ہے:

(۱)... یہ کہ جس طرح لَیْسَ میں نفی کے معنی ہیں اسی طرح ماوَلَا میں بھی نفی کے معنی ہیں۔

(۲)... یہ کہ جس طرح لَیْسَ مبتدا خبر پر داخل ہوتا ہے اسی طرح ماوَلَا بھی مبتدا خبر پر داخل ہوتے ہیں۔

ماوَلَا کے دخول کے بعد مسند الیہ کو ان کا اسم کہا جاتا ہے اور مسند کو ان کی خبر کہا جاتا ہے۔ جیسے مَازَیْدٌ قَائِمًا اور لَا رَجُلٌ اَفْضَلَ مِنْکَ۔ ان دونوں مثالوں میں سے پہلی مثال میں زَیْدٌ اسم ہے ما کا اور قَائِمًا خبر ہے۔ اور دوسری مثال میں رَجُلٌ اسم ہے لا کا اور اَفْضَلَ مِنْكَ خبر ہے۔

لا کا عمل شاذ ہے؛

وھو فی (لا) شاذّ.

مصنفؒ فرماتے ہیں :وَهُوَ فِي (لَا) شَاذٌّ (اور وہ (لَا) میں شاذ ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (لَا) کا (لَیْسَ) کی طرح عمل کرنا فصیح اور عام استعمال میں نہیں ہے۔ عام طور پر (لَا) نافیہ جنس کی طرح عمل کرتا ہے جو مبتدا کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے۔ (لَا) کا (لَیْسَ) کی طرح عمل کرنا بعض خاص مواقع اور شاذ استعمالات میں پایا جاتا ہے، اس لیے مصنفؒ نے اسے شاذ قرار دیا ہے۔

فائدہ: ما اور لا کے درمیان فرق؛

ما اور لا کے درمیان تین طرح کا فرق ہے:

(۱)... لا خاص ہے نکرہ کے ساتھ اور ما عام ہے معرفہ نکرہ دونوں کے لیے۔

(۲)... دوسرا فرق یہ ہے کہ ما حال کی نفی کرتا ہے اور لا مطلق نفی کرتا ہے۔

(۳)... تیسرا فرق یہ ہے کہ ما کی خبر پر "ب" داخل ہوتی ہے اور لا کی خبر پر "ب" داخل نہیں ہوتی۔ یہ جائز ہی نہیں۔

منصوبات کا بیان

اَلْمَنْصُوْبَاتُ :هُوَ مَا اشْتَمَلَ عَلَى عَلَمِ الْمَفْعُوْلِيَّةِ.

ترجمہ :منصوبات :وہ (اسم) ہے جو مفعولیت کی علامت پر مشتمل ہو۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے علم نحو کے ایک نئے باب کا آغاز فرما رہے ہیں جو "اَلْمَنْصُوْبَاتُ" (منصوبات) کے بیان میں ہے۔

منصوبات یہ جمع ہے منصوبٌ کی۔

منصوب کی تعریف:

منصوب وہ اسم ہے جس میں علامت مفعول پائی جائے۔ علامت مفعول (۴) چار ہیں: (۱) فتحہ (۲) کسرہ (۳) الف (۴) ی یہ

مفعول کی علامات ہیں:

پہلا منصوب مفعول مطلق

فمنه المفعول المطلق، وهو اسم ما فعله فاعل فعل مذ كور بمعناه. ويكون للتّأ كيد، والنّوع، والعدد، مثل (جلست جلوسا، وجلسة، وجلسة). فالأوّل لا يثنّى ولا يجمع، بخلاف أخويه. وقد يكون بغير لفظه، مثل: (قعدت جلوسا). وقد يحذف الفعل لقيام قرينة جوازا، كقولك لمن قدم: (خير مقدم).

ترجمہ: پس ان منصوبات میں سے مفعول مطلق ہے، اور وہ اس اس کو کہتے ہیں جس کو فعلِ مذکور کے فاعل نے کیا ہو اور وہ فعلِ مذکور کے معنی میں ہو۔ اور وہ تاکید، نوعیت اور عدد کے لیے ہوتا ہے، جیسے (جَلَسْتُ جُلُوسًا، وَجَلْسَةً، وَجِلْسَةً) (میں بیٹھا بیٹھنا، اور ایک بیٹھک، اور ایک بیٹھک)۔ پس پہلا (تاکید کے لیے) نہ تثنیہ ہوتا ہے اور نہ جمع، بخلاف اپنے دونوں بھائیوں کے۔ اور کبھی وہ اپنے لفظ کے بغیر ہوتا ہے، جیسے: (قَعَدْتُ جُلُوسًا) (میں بیٹھا بیٹھنا)۔ اور کبھی فعل قرینہ کے موجود ہونے کی وجہ سے جوازاً حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے تیرا قول اس شخص کے لیے جو آیا: (خَيْرَ مقدمٍ) (بہت اچھی آمد)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منصوبات کی اقسام بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے مفعول مطلق کا ذکر فرما رہے ہیں۔

یہ یاد رکھیں کہ تمام منصوبات میں اصل صرف مفاعیل خمسہ ہیں۔ (۱) مفعول مطلق۔ (۲) مفعول بہٖ (۳) مفعول فیہ۔ (۴) مفعول لہٗ۔ (۵) مفعول معہٗ۔ اور ان پانچ مفعولوں میں سے اصل مفعول مطلق ہی ہے کیونکہ اس پر بغیر کسی قید اور شرط کے مفعول کے احکام جاری ہوتے ہیں اسی وجہ سے اس کو مقدم کیا گیا ہے۔

مفعول مطلق کی تعریف مع فوائد و قیود:

المفعول المطلق، وهو اسم ما فعله فاعل فعل مذ كور بمعناه

... کہ مفعول مطلق وہ ایسا مصدر ہے جو فعل مذکور کے بعد واقع ہو اور اسی فعل کے معنی میں ہو۔

اس کی تعریف میں صاحب کتاب نے فرمایا، وهو اسم یہ جنس کے مرتبے میں ہے تمام مصادر اس کے اندر داخل ہیں آگے فرمایا فعل مذکور بمعناه یہ دوسری فصل ہے اس کے ذریعے مفعول مطلق کے سوا تمام مفاعیل کو خارج کر دیا گیا۔ کیونکہ باقی مفاعیل فعل مذکور کے معنی میں نہیں ہوتے۔

مفعول مطلق سے پہلے فعل خواہ حقیقتاً ہو یا حکماً:

دونوں صورتوں میں مفعول مطلق بنے گا۔

مفعول مطلق کا حقیقتاً فعل مذکور ہو جیسے: ضَرَبْتُ ضَرْبًا۔

یا مفعول مطلق کا فعل مذکور ما قبلہٗ حکمی طور پر موجود ہو۔ جیسے: فَضرب الرقاب کہ اس کی تقدیری عبارت اس طرح ہے

اِضْرِبْ ضَرْبَ الرِّقَابِ۔

مفعول مطلق کے استعمال کے لیے دو شرطیں ہیں:

وهو اسم ما فعله فاعل فعل مذکور بمعناه... صاحب کتاب نے دو شرائط ذکر کی ہیں کہ مفعول مطلق کے استعمال کے لیے دو شرطیں ہیں: (۱) یہ کہ وہ مصدر فعل کے بعد واقع ہو۔ (۲) یہ کہ اسی فعل کے معنی میں ہو۔ جیسے ضَرَبْتُ ضَرْبًا۔

مفعول مطلق کی اقسام

ویکون للتّأکید، والنّوع، والعدد، مثل (جلست جلوسا، وجلسة، وجلسة)

...اس عبارت میں صاحب کتاب نے مفعول مطلق کے تین ۳ اقسام ذکر کیے ہیں

تاکید؛

کہ یا تو یہ تاکید کے لیے آئے گا جیسے (جلست جلوسا) میں بیٹھا بیٹھنا۔ کہ یہاں مفعول مطلق تاکید بیان کر رہا ہے۔

نوع؛

(۲) یہ کہ نوع کے لیے۔ یعنی یہ بیان کرے کہ فعل کس قسم کا ہے جیسے جَلَسْتُ جِلْسَةَ الْقَارِیْ میں بیٹھا قاری کی طرح بیٹھنا۔

عدد؛

(۳) یہ کہ بیان عدد کے لیے ہو جیسے جَلَسْتُ جَلْسَةً اَوْ جَلْسَتَیْنِ اَوْ جَلَسَاتٍ۔ میں بیٹھا ایک، دو یا کئی دفعہ بیٹھا۔

تینوں اقسام میں فرق؛

فالأوّل لا یثنّی ولا یجمع، بخلاف أخویه.

مفعول مطلق جب تاکید کے لیے آتا ہے تو اس کی تثنیہ اور جمع نہیں آتی اور جب بیان نوع یا بیان عدد کے لیے آتا ہے تو اس کی تثنیہ جمع آسکتی ہے۔

نوع کی مثال؛ جیسے جَلَسْتُ جَلْسَةً اَوْ جَلْسَتَیْنِ اَوْ جَلَسَاتٍ عدد کی مثال؛ جیسے جَلَسْتُ جِلْسَةً اَوْ جِلْسَتَیْنِ اَوْ جِلسَاتٍ

فعل و مفعول مغایرت؛

وقد یکون بغیر لفظه، مثل :(قعدت جلوسا).

اس عبارت میں صاحب کتاب نے فرمایا کہ مفعول مطلق کبھی فعل مذکور کے علاوہ سے بھی آتا ہے۔ یعنی مادہ الگ ہو لیکن معنی فعل مذکور اور مفعول مطلق کا ایک ہی ہو اور یہ مغایرت دو طرح سے ہوتی ہے:

(۱)...مغایرت فِی الْمَادَۃ۔ (۲)...مغایرت فِی الْباب۔

(۱)... مغایرت فِی الْمَادَۃ جیسے قَعَدْتُ جُلُوْسًا کہ یہاں جُلُوْسًا مفعول مطلق ہے قعدت کا مادہ الگ الگ ہے لیکن معنی دونوں کا

ایک ہی ہے۔

(۲)...مغایرت فی الباب جیسے اَنْبَتَ نَبَاتًا کہ یہاں نَبَاتًا مفعول مطلق ہے اَنْبَتَ فعل مذکور کا۔ اور اَنْبَتَ باب افعال سے ہے اور نَبَاتًا باب نصر سے ہے۔ باب دونوں کا الگ ہے لیکن معنی ایک ہے۔

حزف فعل جوازا:

وقد يحذف الفعل لقيام قرينة جوازا، كقولك لمن قدم :(خير مقدم).

اور کبھی مفعول مطلق کے فعل کو کسی قرینے کی وجہ سے حذف بھی کیا جاتا ہے جیسے کوئی شخص آئے تو آپ اس کی آمد پر کہیں خَیْرَ مَقْدَمٍ آپ کا آنا بہترین ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے کہ :قَدِمْتَ قُدُوْمًا خَيْرَ مَقْدَمٍ۔

اب یہاں پر قَدِمْتَ قُدُوْمًا کو حذف کرکے صرف خَيْرَ مَقْدَمٍ کو ذکر کیا اور یہاں پر قرینہ موجود ہے۔ قرینہ حالیہ موجود ہے اور وہ ہے آنے والے کا آنا اور آپ کا اس سے کہنا۔

ایک اعتراض اور جواب:

اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خَيْرَ مَقْدَمٍ یہ تو خَیر اسم تفضیل ہے مفعول مطلق کیسے بنا حالانکہ مفعول مطلق تو مصدر ہوتا ہے؟۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں خَیْرَ جو ہے یہ یہ قُدُومًا موصوف محذوف کی صفت ہے اور جب موصوف مفعول مطلق بن سکتا ہے تو صفت بھی مفعول مطلق بن سکتی ہے۔

یا دوسرا جواب یہ ہے کہ خیر مضاف ہے مقدمٍ مصدر میمی کی طرف تو یہ مضاف مضاف الیہ مل کر مفعول مطلق بن سکتے ہیں۔

حزف فعل وجوبی سماعی

ووجوبا سماعا مثل :سقيا، ورعيا، وخيبة، وجدعا، وحمدا، وشكرا، وعجبا.

ترجمہ :اور وجوباً، سماعاً جیسے :سَقْيًا (پانی دینا)، وَرَعْيًا (چرانا)، وَخَيْبَةً (ناامیدی)، وَجَدْعًا (ناک کاٹنا)، وَحَمْدًا (تعریف)، وَشُكْرًا (شکر)، وَعَجَبًا (تعجب)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ان صورتوں کا بیان فرما رہے ہیں جن میں فعل کو وجوباً حذف کر دیا جاتا ہے اور صرف مفعول مطلق باقی رہتا ہے۔ اس قسم کا حذف سماعاً ہوتا ہے، یعنی عربوں سے اسی طرح سنا گیا ہے اور اس میں کوئی قیاس نہیں چلتا۔ یہ وہ مخصوص مصادر ہیں جو اپنے فعل کے بغیر ہی بطور مفعول مطلق مستعمل ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ فعل کا ذکر کرنا فصیح نہیں سمجھا جاتا۔

مصنفؒ چند ایسے مصادر کی مثالیں دیتے ہیں:

سَقْيًا (پانی دینا) :

جب کسی کے لیے دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے سیراب کرے تو کہا جاتا ہے "سَقْيًا لَهُ" (اللہ اسے پانی دے کر سیراب کرے)۔

یہاں فعل "سَقَى اللّٰہُ" (اللہ نے سیراب کیا) محذوف ہے اور "سَقْیًا" اس کا مفعول مطلق ہے جو دعا کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

رَعیًا (چرانا) :

اس کا استعمال بھی دعائیہ معنی میں ہوتا ہے، جیسے "رَعیًا لَکَ" (اللہ تجھے چرائی دے یعنی تیری حفاظت کرے اور تجھے خوشحال رکھے)۔ یہاں بھی فعل "رَعَى اللّٰہُ" (اللہ نے چرایا یعنی حفاظت کی) محذوف ہے اور "رَعْیًا" اس کا مفعول مطلق ہے۔

خَیْبَۃً (ناامیدی) :

یہ لفظ کسی کے لیے بددعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے "خَیْبَۃً لَہٗ" (اللہ اسے ناامید کرے)۔ یہاں فعل "خَیَّبَ اللّٰہُ" (اللہ نے ناامید کیا) محذوف ہے اور "خَیْبَۃً" اس کا مفعول مطلق ہے۔

جَدْعًا (ناک کاٹنا) :

یہ بھی بددعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے "جَدْعًا لَہٗ" (اللہ اس کی ناک کاٹے یعنی اسے ذلیل و رسوا کرے)۔ یہاں فعل "جَدَعَ اللّٰہُ" (اللہ نے ناک کاٹا) محذوف ہے اور "جَدْعًا" اس کا مفعول مطلق ہے۔

حَمْدًا (تعریف) :

جب اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جائے تو کہا جاتا ہے "حَمْدًا لِلّٰہِ" (اللہ کے لیے تعریف ہے)۔ یہاں فعل "حَمِدْتُ اللّٰہَ حَمْدًا" (میں نے اللہ کی تعریف کی، تعریف کرنا) میں فعل "حَمِدْتُ" محذوف ہے اور "حَمْدًا" مفعول مطلق ہے۔ یہ بطور اظہار تشکر بھی استعمال ہوتا ہے۔

شُکْرًا (شکر) :

کسی کے احسان پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا جاتا ہے "شُکْرًا لَکَ" (آپ کا شکریہ)۔ یہاں فعل "شَکَرْتُکَ شُکْرًا" (میں نے آپ کا شکر ادا کیا، شکر ادا کرنا) میں فعل "شَکَرْتُ" محذوف ہے اور "شُکْرًا" مفعول مطلق ہے۔

عَجَبًا (تعجب) :

جب کسی چیز پر حیرت کا اظہار کیا جائے تو کہا جاتا ہے "عَجَبًا لِأَمْرِكَ" (تیرے معاملے پر تعجب ہے)۔ یہاں فعل "عَجِبْتُ عَجَبًا" (میں نے تعجب کیا، تعجب کرنا) محذوف ہے اور "عَجَبًا" مفعول مطلق ہے۔

حزف فعل وجوبی قیاسی

وقیاسا في مواضع: منها: ما وقع مثبتا بعد نفي-أو معنى نفي-داخل على اسم لا يكون خبرا عنه. أو وقع مكرّرا مثل (ما أنت إلّا سيرا) و(ما أنت إلّا سير البريد)، و(إنّما أنت سيرا) و(زيد سيرا سيرا). ومنها ما وقع تفصيلا لأثر مضمون جملة متقدّمة، مثل: ﴿فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ ومنها ما وقع للتّشبيه علاجا بعد جملة مشتملة على اسم بمعناه وصاحبه، مثل: (مررت بزيد فإذا له صوت صوت حمار، وصراخ صراخ الثّكلى). ومنها ما وقع مضمون جملة لا محتمل لها غيره، مثل: (له عليّ ألف درهم اعترافا)، ويسمّى توكيدا لنفسه. ومنها ما وقع مضمون جملة لها محتمل غيره، مثل: (زيد

قائم حقًّا)،ویسمّی توکیدا لغیرہ.ومنہا ما وقع مثنّی،مثل :(لبّیك وسعدیك).

ترجمہ :اور قیاس کے طور پر چند مقامات پر (فعل محذوف ہوتا ہے):ان میں سے :وہ (مصدر) جو کسی نفی- یا معنی نفی- کے بعد مثبت ہو کر واقع ہو، جو کسی ایسے اسم پر داخل ہو جو اس کی خبر نہ بن سکتا ہو۔ یا وہ (مصدر) مکرر ہو کر واقع ہو جیسے (مَا أَنْتَ إِلَّا سَيْرًا) (تو تو صرف چلتا ہے) اور (مَا أَنْتَ إِلَّا سَيْرَ الْبَرِيدِ) (تو تو صرف ڈاک کی چال ہے)، اور (إِنَّمَا أَنْتَ سَيْرًا) (تو تو بس چلتا ہے) اور (زَيْدٌ سَيْرًا سَيْرًا) (زید ضرور چل رہا ہے)۔اور ان میں سے :وہ (مصدر) جو کسی متقدم جملے کے مضمون کے اثر کی تفصیل کے طور پر واقع ہو، جیسے :{فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً} (تو مضبوط باندھو؛ پھر یا تو احسان ہے اس کے بعد یا فدیہ)،اور ان میں سے :وہ (مصدر) جو تشبیہ کے علاج کے لیے واقع ہو، کسی ایسے جملے کے بعد جو اسی معنی اور اس کے صاحب کے ساتھ کسی اسم پر مشتمل ہو، جیسے :(مَرَرْتُ بِزَيْدٍ فَإِذَا لَهُ صَوْتٌ صَوْتَ حِمَارٍ، وَصُرَاخٌ صُرَاخَ الثُّكْلَى) (میں زید کے پاس سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی آواز گدھے کی آواز ہے، اور چیخ ماتم کرنے والی عورت کی چیخ ہے)۔اور ان میں سے :وہ (مصدر) جو ایسے جملے کا مضمون ہو جس کا کوئی اور محتمل معنی نہ ہو، جیسے :(لَهُ عَلَيَّ أَلْفُ دِرْهَمٍ اعْتِرَافًا) (اس کے مجھ پر ایک ہزار درہم ہیں، اعتراف کرتے ہوئے)، اور اسے توکید لنفسہ کہتے ہیں۔اور ان میں سے :وہ (مصدر) جو ایسے جملے کا مضمون ہو جس کا کوئی اور محتمل معنی ہو، جیسے :(زَيْدٌ قَائِمٌ حَقًّا) (زید بے شک کھڑا ہے)، اور اسے توکید لغیرہ کہتے ہیں۔اور ان میں سے :وہ (مصدر) جو تثنیہ ہو کر واقع ہو، جیسے :(لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ) (میں حاضر ہوں، تیری خدمت میں، بار بار!)۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، اب ان مقامات کا ذکر فرمارہے ہیں جہاں قیاس کی بنیاد پر فعل کو وجوباً حذف کر دیا جاتا ہے اور مفعول مطلق باقی رہتا ہے:

پہلا مقام؛

منہا :ما وقع مثبتا بعد نفی-أو معنی نفی-داخل علی اسم لا یکون خبرا عنہ.أو وقع مکرّرا

وہ مصدر جو کسی نفی یا معنی نفی کے بعد مثبت ہو کر واقع ہو :جب کسی جملے میں نفی (جیسے ما،لا) یا معنی نفی (جیسے استفہام انکاری) موجود ہو اور اس کے بعد کوئی مصدر مثبت انداز میں آئے اور وہ کسی ایسے اسم پر داخل ہو جو اس کی خبر نہ بن سکتا ہو تو فعل محذوف مانا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر (مَا أَنْتَ إِلَّا سَيْرًا) (تو تو صرف چلتا ہے) میں "سَيْرًا" مصدر ہے جو نفی کے بعد آیا ہے اور اس کا فعل "سِرْتَ سَيْرًا" محذوف ہے۔ اسی طرح (مَا أَنْتَ إِلَّا سَيْرَ الْبَرِيدِ) اور (إِنَّمَا أَنْتَ سَيْرًا) کی مثالیں بھی اسی قبیل سے ہیں۔

دوسرا مقام؛

أو وقع مکرّرا

وہ مصدر جو مکرر ہو کر واقع ہو :جب کوئی مصدر تاکید کے لیے بار بار ذکر کیا جائے تو اس کا فعل محذوف ہوتا ہے۔ مثال کے طور

پر (زَيْدٌ سَيْرًا سَيْرًا) (زید یقیناً چل رہا ہے) میں "سَيْرًا سَيْرًا" مصدر کی تکرار ہے اور فعل "سَارَ سَيْرًا سَيْرًا" محذوف ہے۔

تیسرا مقام:

ومنها ما وقع تفصيلا لأثر مضمون جملة متقدّمة

وہ مصدر جو کسی متقدم جملے کے مضمون کے اثر کی تفصیل کے طور پر واقع ہو :جب کوئی مصدر کسی پہلے جملے کے مفہوم کے نتیجے یا اثر کو تفصیل سے بیان کرے تو اس کا فعل محذوف ہوتا ہے۔ مصنفؒ قرآنی آیت مثال دیتے ہیں :{فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً} (تو مضبوط باندھو؛ پھر یا تو احسان ہے اس کے بعد یا فدیہ)۔ یہاں "مَنًّا" اور "فِدَاءً" مصدر ہیں جو پہلے جملے ("فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" ۔ تو مضبوط باندھو) کے نتیجے میں قیدیوں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی تفصیل بیان کر رہے ہیں اور ان کا فعل "تَمُنُّونَ مَنًّا" اور "تَفْدُونَ فِدَاءً" محذوف ہے۔

چوتھا مقام:

ومنها ما وقع للتّشبيه علاجا بعد جملة مشتملة على اسم بمعناه وصاحبه.

وہ مصدر ہے جو تشبیہ دینے کے لیے آئے۔ اس کی شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک مکمل جملہ ہو جس میں دو چیزیں مذکور ہوں: *صاحب :یعنی وہ ذات جس کی کسی چیز کو تشبیہ دی جارہی ہے (مثلاً زید)۔ *اسم بمعناہ :یعنی وہ چیز جس کو تشبیہ دی جارہی ہے (مثلاً زید کی آواز)۔ اس جملے کے بعد جو مصدر آئے گا، وہ اس چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ دے گا۔ مثال کی وضاحت :* مَرَرْتُ بِزَيْدٍ فَإِذَا لَهُ صَوْتٌ صَوْتَ حِمَارٍ؛ یہاں لَهُ صَوْتٌ ایک جملہ ہے۔ اس میں "صاحب" یعنی موصوف زَيْدٌ (جس کی طرف لَہٗ کی ضمیر لوٹ رہی ہے) اور "اسم بمعناہ" یعنی صَوْتٌ مذکور ہیں۔ اس کے بعد مصدر صَوْتَ حِمَارٍ منصوب آیا ہے۔ یہ مصدر تشبیہ کے لیے ہے اور اصل میں یوں تھا :يُصَوِّتُ صَوْتَ حِمَارٍ (وہ گدھے کی آواز کی طرح آواز نکالتا ہے)۔ یہاں مصدر نے فعل کی جگہ لے لی، اس لیے فعل کو حذف کر دیا گیا۔ *اسی طرح دوسری مثال وَصُرَاخٌ صُرَاخَ الثَّكْلَى میں لَهُ صُرَاخٌ جملہ ہے اور صُرَاخَ الثَّكْلَى مصدر ہے جو تشبیہ کے لیے آیا ہے اصل اس طرح ہے؛"يَصْرَخُ صُرَاخَ الثَّكْلَى"۔

پانچواں مقام:

ومنها ما وقع مضمون جملة لا محتمل لها غيره.

وہ مصدر جو ایسے جملے کا مضمون ہو جس کا کوئی اور محتمل معنی نہ ہو (توکید لنفسہ) :جب کوئی مصدر کسی ایسے جملے کے مضمون کو تاکید کرے جس کا صرف وہی ایک ہی معنی ممکن ہو تو اس کا فعل محذوف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر (لَهُ عَلَيَّ أَلْفُ دِرْهَمٍ اعْتِرَافًا) (اس کے مجھ پر ایک ہزار درہم ہیں، اعتراف کرتے ہوئے)۔ یہاں "اعْتِرَافًا" مصدر ہے جو ہزار درہم کے ہونے کا اعتراف کرنے کے معنی کو تاکید کر رہا ہے اور اس کا فعل "اعْتَرَفْتُ اعْتِرَافًا" محذوف ہے۔

چھٹا مقام:

ومنها ما وقع مضمون جملة لها محتمل غيره.

وہ مصدر جو ایسے جملے کا مضمون ہو جس کا کوئی اور محتمل معنی ہو (تو کید لغیرہ) :جب کوئی مصدر کسی ایسے جملے کے مضمون کو تاکید کرے جس کا کوئی اور معنی بھی ممکن ہو تو اس کا فعل محذوف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر (زَيْدٌ قَائِمٌ حَقًّا) (زید بے شک کھڑا ہے)۔ یہاں "حَقًّا" مصدر ہے جو زید کے کھڑے ہونے کے مضمون کو تاکید کر رہا ہے (حالانکہ کھڑے ہونے میں شک بھی ہو سکتا ہے) اور اس کا فعل "أَحِقُّ حَقًّا" محذوف ہے۔

ساتواں مقام؛

ومنها ما وقع مثنّى،

وہ مصدر ہے جو تثنیہ کے صیغے میں استعمال ہو اور اس کا فعل ہمیشہ محذوف ہو۔ یہ عربی زبان کے کچھ مشہور محاورات ہیں جن میں مصدر کو تثنیہ لا کر تکرار اور مبالغہ کا معنی پیدا کیا جاتا ہے۔ مثال کی وضاحت :* لَبَّيْكَ وَ سَعْدَيْكَ : * لَبَّيْكَ :اس کا واحد لَبٌّ ہے اور اس کا اصل معنی ہے "حاضر ہونا"۔ تثنیہ کا صیغہ لَبَّيْنِ تھا جو اضافت کی وجہ سے لَبَّيْكَ ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے :أُلَبِّي لَكَ تَلْبِيَةً بَعْدَ تَلْبِيَةٍ (میں آپ کی خدمت میں بار بار حاضر ہوں)۔ تکرار کے معنی کی وجہ سے تثنیہ استعمال ہوا۔ * سَعْدَيْكَ :اس کا مطلب ہے: أُسْعِدُكَ إِسْعَادًا بَعْدَ إِسْعَادٍ (میں آپ کو خوش کرنے کے لیے بار بار حاضر ہوں)۔

ان تمام مقامات پر قیاس کی بنیاد پر فعل کو حذف کر کے مفعول مطلق کو باقی رکھا جاتا ہے تاکہ کلام میں اختصار اور زور پیدا ہو۔

دوسرا منصوب مفعول بہ

المفعول به :هو ما وقع عليه فعل الفاعل، مثل :(ضربت زيدا)، وقد يتقدّم على الفعل. وقد يحذف الفعل لقيام قرينة :جوازا، كقولك :(زيدا) لمن قال :(من أضرب؟).

ووجوبا في أربعة أبواب: الأوّل :سماعيّ مثل :(امرأ ونفسه)، و﴿انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ﴾، و(أهلا وسهلا).

ترجمہ :مفعول بہ :وہ (اسم) ہے جس پر فاعل کا فعل واقع ہو، جیسے :(ضَرَبْتُ زَيْدًا) (میں نے زید کو مارا)، اور وہ کبھی فعل پر مقدم بھی ہو جاتا ہے۔ اور کبھی فعل قرینہ کے موجود ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا جاتا ہے :جوازاً، جیسے تیرا قول :(زَيْدًا) اس شخص کے جواب میں جس نے کہا :(میں کس کو ماروں؟)۔ اور وجوباً چار ابواب میں :پہلا باب :سماعی ہے جیسے :(امْرَأً وَنَفْسَهُ) (آدمی اور اس کا نفس)، اور ﴿انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ﴾ (باز آجاؤ، یہ تمہارے لیے بہتر ہے)، اور (أَهْلًا وَسَهْلًا) (خوش آمدید اور آسانی ہو)۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منصوبات کی اقسام بیان کرتے ہوئے مفعول بہ کی تعریف فرمارہے ہیں۔

مفعول بہ کی تعریف:

المفعول به :هو ما وقع عليه فعل الفاعل

کہ مفعول بہ وہ ایسا اسم ہے کہ فاعل کا فعل اس پر واقع ہو۔

فوائد و قیود:

مفعول بہ کی تعریف میں صاحب کتاب نے فرمایا **ھُوَ مَا** اس میں تمام اسمائے منصوبات داخل تھے۔ **مَاوَقَعَ عَلَیْهِ فِعْلُ الْفَاعِلِ** یہ فصل ہے اس کے ذریعے مفعول بہ کے سوا تمام کو خارج کر دیا گیا کیونکہ باقی منصوبات میں فاعل کا فعل واقع نہیں ہوتا کسی اسم پر۔ جیسے مثال یہ ہے :(ضَرَبْتُ زَیْدًا) (میں نے زید کو مارا)۔ اس جملے میں "ضَرَبْتُ" فعل اور فاعل ہے، اور "زَیْدًا" وہ اسم ہے جس پر مارنے کا فعل واقع ہوا ہے، للذا یہ مفعول بہ ہے اور منصوب ہے۔

مفعول کا فعل پر مقدم ہونا:

وقد يتقدّم على الفعل.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مفعول بہ کبھی فعل پر مقدم بھی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اصل ترتیب فعل، فاعل اور پھر مفعول بہ ہے، لیکن بعض صورتوں میں مفعول بہ کو فعل سے پہلے ذکر کرنا جائز یا فصیح ہوتا ہے، جیسے "زَیْدًا ضَرَبْتُ" (زید کو میں نے مارا)۔ اس طرح کلام میں مفعول بہ کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

وَقَدْ يَتَقَدَّمُ عَلَى الْفَاعِلِ ... الخ یہاں سے صاحب کتاب نے مفعول بہ کو فاعل پر مقدم کرنے کو بیان کیا ہے کہ کبھی کبھی مفعول بہ کو فاعل پر مقدم ہوتا ہے لیکن اگر التباس کا خوف ہو تو فاعل کو مفعول پر مقدم کرنا واجب ہے جیسے : ضَرَبَ زَیْدٌ عمرًا کو ضَرَبَ عمرًا زَیْدٌ پڑھنا۔

مثال مذکور میں التباس کا خوف نہیں للذا مفعول بہ کو فاعل پر مقدم کرنا جائز ہے اور جہاں التباس کا خوف ہو تو وہاں واجب ہے فاعل کا مفعول پر مقدم کرنا جیسے :(۱) ضَرَبَ مُوسٰی عِیْسٰی۔ ضَرَبَ فعل موسٰی فاعل عِیسٰی مفعول بہ۔

اس مثال میں فاعل اور مفعول بہ دونوں اسم مقصور ہیں دونوں کے اعراب ایک جیسے ہیں۔ التباس کا خوف ہونے کی وجہ سے فاعل کو مقدم کیا۔

حذف فعل جوازاً:

وقد يحذف الفعل لقيام قرينة :جوازا، كقولك :(زيدا) لمن قال :(من أضرب؟).

اس عبارت میں صاحبِ کتاب نے فرمایا کہ مفعول بہ کے فعل کو کبھی حذف کیا جاتا ہے کسی قرینے کے پائے جانے کی وجہ سے جیسے زَیْدًا اس شخص کے جواب میں جو کہے مَنْ اَضْرِبُ ؟ "میں کسی کو ماروں؟" بصیغۂ متکلم تو اس کو صرف یہ کہہ دیجیے زَیْدًا کافی ہے۔

یہ کہنا اِضْرِبْ زَیْدًا یعنی دوبارہ فعل کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہاں فعل کے حذف پر قرینہ موجود ہے متکلم کا کلام۔ جس کو قرینہ مقالیہ کہتے ہیں۔

حذف فعل وجوبی سماعی:

ووجوبا في أربعة أبواب: الأوّل :سماعيّ مثل :(امرأ ونفسه)، و{انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ}، و(أهلا وسهلا).

اس عبارت میں صاحب کتاب نے فرمایا کہ چار مقامات ایسے ہیں جہاں مفعول بہ کے فعل کو وجوبًا حذف کیا جاتا ہے۔

اَلْاَوَّلُ سِمَاعِیٌّ :

ان چار ۴ ابواب میں سے پہلا سماعی ہے سماعی کی تعریف پہلے بھی گزرچکی ہے کہ ہم نے صرف اہل عرب سے سنا ہے باقی کوئی مستقل دلیل موجود نہیں ہے یہ تین مثالیں جو صاحب کتاب نے اپنی کتاب میں ذکر فرمائی ہیں وہ تینوں میں ہم نے اہلِ عرب سے اسی طرح سُنا ہے کہ وہ مفعول بہ کے فعل کو حذف کرتے ہیں تو ہم نے بھی حذف کیا تین مثالیں یہ ہیں:

پہلی مثال:

اِمْرَءً وَنَفْسَهٗ چھوڑدو اس کے نفس کو اور اس کو تقدیری عبارت اس کی اس طرح ہے۔ اُتْرُکْ اِمْرَءً وَ نَفْسَهٗ کہ یہاں اُتْرُکْ فعل کو وجوبا حذف کیا ہے۔

دوسری مثال:

اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ نصاریٰ کو خطاب ہے کہ باز آجاؤ تمہارے لیے بہتر ہے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ تین خداؤں کے قائل تھے جس کو اقالیم ثلاثہ کہا جاتا ہے۔

ایک اللہ پاک۔ باپ کے مرتبے میں۔

دوسری حضرت مریم علیہا السلام ماں کے مرتبے میں۔

تیسرے حضرت عیسیٰ بیٹے کے مرتبے میں۔

نعوذ باللہ۔ العیاذ باللہ۔ معاذ اللہ۔

ان لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے اس آیت مبارکہ میں اصل عبارت اس طرح ہے۔

اِنْتَهُوْا يَا مَعْشَرَ النَّصَارٰى مِنَ التَّثْلِيْثِ وَاقْصُدُوا التَّوْحِيْدَ خَيْرًا لَّكُمْ:

کہ اے نصاریٰ کی جماعت باز آجاؤ۔ رُک جاؤ۔ تثلیث سے اور توحید کا قصد کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ یہاں اَقْصُدُوا کو حذف کیا گیا ہے خَيْرًا لَّكُمْ اس کا مفعول بہ ہے۔

تیسری مثال:

صاحب کتاب نے تیسری مثال اَهْلًا وَّسَهْلًا ذکر کی ہے جیسے آپ کسی آنے والے کو اس کی آمد پر اطمیان دلانے کے لیے اور اس کو خوش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ اَهْلًا وَّسَهْلًا اصل اس کی عبارت اس طرح ہے کہ: اَتَيْتَ اَهْلًا وَ وَطِئْتَ سَهْلًا آپ اپنوں میں آئے ہیں آپ شناسہ لوگوں میں آئے ہیں اور آپ نے نرم وخوشگوار زمین کو روندا۔ یہاں اَتَيْتَ اور وَطِئْتَ فعل وجوبًا محذوف ہیں اور اَهْلًا سَهْلًا ان کا مفعول بہ ہے۔

حزف وجوبی کا دوسرا مقام قیاسی؛(منادی)

والثّانی :المنادی،وهو المطلوب إقباله بحرف نائب مناب(أدعو)لفظا أو تقديرا .ويبنى على ما يرفع به إن كان مفردا

معرفة،مثل :(يازيد)،و(يارجل)،و(يازيدان)و(يازيدون).ويخفض بلام الاستغاثة،مثل :(يالزيد).ويفتح لإلحاق ألفها ولالام فيه،مثل:(يازيداه).وينصب ماسواهما،مثل :(ياعبدالله)و(ياطالعاجبلا)،و(يارجلا)لغير معيّن.

ترجمہ :اور دوسرا باب :منادیٰ ہے، اور وہ (اسم) ہے جس کی توجہ طلب کی جائے اس حرف کے ذریعے جو (أَدْعُو) (میں پکارتا ہوں) کا لفظاً یا تقدیراً قائم مقام ہو۔ اور وہ مبنی ہوتا ہے اس چیز پر جس کے ساتھ وہ رفع دیا جاتا اگر وہ مفرد معرفہ ہو، جیسے :(يَا زَيْدُ) (اے زید)، اور (يَا رَجُلُ) (اے مرد)، اور (يَا زَيْدَانِ) (اے دو زید)، اور (يَا زَيْدُونَ) (اے زیدو)۔ اور وہ مجرور ہوتا ہے لام استغاثہ کے ساتھ، جیسے :(يَا لَزَيْدٍ) (اے زید! (مدد کے لیے))، اور وہ مفتوح ہوتا ہے اس کے الف کے لاحق ہونے کی وجہ سے اور اس میں لام نہ ہو، جیسے :(يَا زَيْدَاهُ) (اے زید!)۔ اور وہ منصوب ہوتا ہے ان کے سوا (دیگر صورتوں میں)، جیسے: (يَا عَبْدَ اللّٰهِ) (اے اللہ کے بندے)، اور (يَا طَالِعًا جَبَلًا) (اے پہاڑ پر چڑھنے والے)، اور (يَا رَجُلًا) (اے مرد!) غیر معین کے لیے۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ان چار ابواب میں سے دوسرے باب کا ذکر فرمارہے ہیں جن میں مفعول بہ کا فعل وجوباً محذوف ہوتا ہے، اور یہ باب منادیٰ کا ہے۔

منادیٰ کے لغوی معنیٰ:

لغت میں منادیٰ کہتے ہیں جس کو پکارا جائے۔ ندا کے لغوی معنی ہیں پکارنا اور منادِی کہتے ہیں پکارنے والے کو۔

منادی کی تعریف:

المنادى،وهو المطلوب إقباله بحرف نائب مناب (أدعو) لفظاً أو تقديراً.

منادیٰ وہ ایسا اسم ہے جو حرف ندا کے ساتھ مدعو ہو لفظی یا تقدیری یعنی حرف ندا کے ساتھ کسی کو پکارا جائے یا حرف ندا لفظوں میں موجود نہ ہو بلکہ مقدر ہو۔ جیسے يَا عَبْدَاللهِ یعنی اَدْعُوْ عَبْدَ اللهِ میں پکارتا ہوں عبداللہ کو۔ یہاں حرف ندا یا لفظوں میں موجود ہے یہ قائم مقام ہے اَدْعُوْ فعل کے۔ یہاں فعل اَدْعُوْ کو کو حذف کرنا واجب ہے کیونکہ حروف ندا اور وہ فعل جس کا یہ قائم مقام ہے دونوں ایک ساتھ ذکر نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے کہ اس سے اصل اور فرع کا اجتماع لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا۔ یہاں حرف ندا لفظوں میں موجود نہیں بلکہ مقدر ہے۔ تقدیری عبارت ہے يَا يوسف اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا۔

حروف نداء پانچ ہیں:

(۱) يَا (۲) اَيَا (۳) هَيَا (۴) اَيْ (۵) همزہ مفتوحہ۔ پس ایْ اور همزہ مفتوحہ قریب کے لیے آتے ہیں اور اَیا اور هَیا دور بعید کے لیے آتے ہیں اور یا قریب اور بعید دونوں کے لیے آتا ہے۔

اعراب کے اعتبار سے منادیٰ کی چھ ۶ قسمیں ہیں:

ویبنی علی ما یرفع به إن کان مفردا معرفة،مثل :(یازید)،و (یارجل)،و (یازیدان)و (یازیدون). ویخفض بلام الاستغاثة،مثل :(یالزید)، ویفتح لإلحاق ألفها ولا لام فیه،مثل:(یازیداه). وینصب ما سواهما،مثل :(یاعبدالله)و (یا طالعا جبلا)،و (یارجلا)لغیر معیّن.

اس عبارت میں صاحب کتاب نے فرمایا باعتبار اعراب کے منادیٰ کی چھ قسمیں ہیں

پہلی قسم:

ویبنی علی ما یرفع به إن کان مفردا معرفة،مثل

پہلی قسم یہ ہے منادیٰ اگر مفرد معرفہ ہو تو مبنی بر علامت رفع ہوتا ہے جیسے یَا زَیْدُ اور یَا رَجُلُ یہ ضمہ اعراب بالحرکت ہے اگرچہ "رَجُلُ" نکرہ ہے لیکن اگر کسی خاص معین مرد کو پکارا جا رہا ہو تو یہ معرفہ حکمی ہو کر رفع کی علامت (ضمہ) پر مبنی ہوگا۔
اور اعراب بالحرف میں مبنی بر علامت رفع کی مثال؛(یَا زَیْدَانِ) (اے دو زید!) - یہاں "زَیْدَانِ" تثنیہ ہے اور رفع کی علامت (الف) پر مبنی ہے۔(یَا زَیْدُونَ) (اے زیدو!) - یہاں "زَیْدُونَ" رفع کی علامت (واو) پر مبنی ہے۔

فائدہ:

مفرد چار ۴ چیزوں کے مقابلے میں آتا ہے۔
(۱)...مرکب کے مقابلے میں۔(۲)...جملہ کے مقابلے میں۔(۳)...تثنیہ اور جمع کے مقابلے میں۔(۴)...مضاف اور شبہ مضاف کے مقابلے میں۔
واضح رہے کہ منادی کی بحث میں جو مفرد کہا گیا ہے وہ مضاف اور مشبہ مضاف کے مقابلے میں آتا ہے۔ مرکب یا جملہ یا تثنیہ جمع کے مقابلے میں نہیں آتا۔ جیسے یَا زَیْدُ ،یَا رَجُلُ ،یَا زَیْدَانِ ، یَا زَیْدُوْنَ ۔

دوسری قسم:

ویخفض بلام الاستغاثة،مثل :(یالزید)،

منادی کی دوسری قسم صاحب کتاب نے لام استغاثہ کی ذکر فرمائی ہے۔ جیسے یَا لَزَیْدٍ مستغاث بلام کو مجرور پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ اسم ایک ہے اور اس کے عامل دو ہیں: (۱) لام استغاثہ اور یا حرف ندا۔
یہاں ہم نے لامِ استغاثہ کو عمل دیا ہے کیونکہ لام استغاثہ عمل میں قوی ہے اور یا حرف ندا عمل میں ضعیف ہے اور دوسری وجہ ہے کہ لام استغاثہ براہِ راست عمل کرتا ہے اور حرف ندا براہِ راست عمل نہیں کرتا۔

فائدہ:

بطورِ فائدہ کے یہ اصطلاحات یاد رکھیں کہ؛

مُسْتَغَاثٌ کہتے ہیں اس کو جس سے مدد مانگی جائے اور ۔مُسْتَغِیْثٌ کہتے ہیں اس کو جو مدد طلب کرے ۔مُسْتَغَاثٌ لَهٗ کہتے

ہیں اس کو جس کے لیے مدد مانگی جائے۔
اب یہاں یَالَزَیْدٍ لِلْقَوْمِ میں زید منادیٰ مستغاث ہے اور قوم مستغاث لہٗ ہے۔

لَامِ استغاثہ اور لامِ جارہ کے درمیان فرق؛

لَامِ استغاثہ اور لامِ جارہ کے درمیان فرق کرنے اور التباس سے بچنے کے لیے لَامِ استغاثہ کو ہمیشہ مفتوح پڑھا جاتا ہے اور لامِ جارہ ہمیشہ مجرور پڑھا جاتا ہے۔ عمل دونوں کا ایک ہی ہے اسم کو جر دینا لیکن لَامِ استغاثہ منادی کو جر دیتا ہے یہ منادی کے ساتھ خاص ہے اور لامِ جارہ عام ہے ہر اسم کو جر دیتا ہے۔

تیسری قسم:

ویفتح لإلحاق ألفها ولا لام فيه، مثل: (یازیداه)

جب منادیٰ کے آخر میں الف کا اضافہ کیا جائے (یہ الف ندبہ کے لیے آتا ہے یعنی کسی افسوس یا درد سے پکارنے کے لیے) اور اس میں لام (لامِ استغاثہ) موجود نہ ہو تو وہ مفتوح (زبر والا) ہوتا ہے، کیونکہ جب الف ملایا تو الف پر حرکت آ ہی نہیں سکتی تو ہم نے الف کے ما قبل کو الف کی اخت یعنی زبر "فتحہ" دے دی۔ جیسے :یَازَیْدَاہُ۔

چوتھی قسم:

ینصب ما سواهما، مثل :(یاعبدالله)

یعنی ان مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ منادیٰ منصوب (زبر والا) ہوتا ہے۔ اس میں کئی قسمیں شامل ہیں:
چوتھی قسم منادی کی یہ ہے کہ جب مضاف ہوتا ہے تو منادی منصوب پڑھا جاتا ہے۔ جیسے یَا عَبْدَ اللهِ۔ اب یہ جو مضاف ہے عَبْدَ یہ اپنے معنی مضاف الیہ لفظ الله سے ملے بغیر نہیں بتا سکتا تھا یہ معنی بتانے میں مضاف الیہ کا محتاج ہے۔

پانچویں قسم:

یَاطَالِعًا جَبَلًا...

منادی کی پانچویں قسم یہ ہے کہ منادی مضاف کے مشابہ ہو کیونکہ اگر کوئی یہ کہتا رہے یَا طَالِعًا ،یَا طَالِعًا تو بات سمجھ نہیں آئے گی جب تک وہ اگلا لفظ ذکر نہ کرے جَبَلًا۔ کہ اے پہاڑ پہ چڑھنے والے۔ یعنی یہ بھی مضاف کی طرح اپنا معنی بتانے میں مضاف الیہ کا محتاج ہے اسی وجہ سے اس کو مشابہ مضاف کہا۔ منادیٰ مشابہ مضاف بھی منصوب ہوتا ہے جیسے :یَاطَالِعًا جَبَلًا۔

چھٹی قسم:

یَارَجُلًا...

منادی کی چھٹی قسم یہ ہے کہ نکرہ غیر معینہ ہو جیسے اندھے کا قول یَا رَجُلًا خُذْ بِیَدِیْ کہ اے مرد پکڑ میرا ہاتھ۔ اب یہ نکرہ غیر معینہ ہے کیونکہ نابینہ جس کو کچھ نظر نہیں آتا وہ اندھا کسی کو معین نہیں کر سکتا کہ تو میرا ہاتھ پکڑ بلکہ اس نے غیر معین طور پر کہا کہ کوئی مرد میرا ہاتھ پکڑے۔ اور اگر اندھا کسی کو معین کر کے خُذْ بِیَدِیْ کہتا تو منادی کے اعراب وہ پہلی قسم کے ہوتے

کہ منادی مفرد معرفہ مبنی بر علامت رفع ہوتا ہے۔ جبکہ یہاں اندھے نے کسی کو معین نہیں کیا تو اعراب بھی چھٹی قسم کے رہیں گے اور وہ ہے نکرہ غیر معینہ۔

توابع منادی

وتوابع المنادی المبنیّ المفردۃ-من التّأکید،والصّفۃ،وعطف البیان،والمعطوف بحرف،الممتنع دخول (یا) علیہ-ترفع علی لفظہ،وتنصب علی محلّہ،مثل (یازید العاقل والعاقل).

والخلیل فی المعطوف یختار الرّفع،وأبو عمرو النّصب،وأبو العبّاس إن کان ك(الحسن) فکالخلیل،وإلا فکأبی عمرو.

والمضافۃ تنصب،والبدل،والمعطوف غیر ماذکر حکمہ حکم المستقلّ مطلقا.

ترجمہ :اور منادیٰ مبنی مفرد کے توابع - تاکید، صفت، عطف بیان اور حرف کے ساتھ عطف کیا گیا وہ (اسم) جس پر (یا) کا داخل ہونا ممتنع ہے - اس کے لفظ کی بنا پر رفع دیے جاتے ہیں، اور اس کے محل کی بنا پر نصب دیے جاتے ہیں، جیسے (یَا زَیْدُ الْعَاقِلُ وَالْعَاقِلَ) (اے زید، عقل مند، اور عقل مند کو)۔اور خلیل معطوف میں رفع کو اختیار کرتے ہیں، اور ابو عمرو نصب کو، اور ابو العباس اگر (الْحَسَنِ) کی طرح ہو تو خلیل کی طرح ہے، ورنہ ابو عمرو کی طرح۔اور مضاف منصوب ہوتا ہے، اور بدل، اور اس کے سوا عطف کیا گیا جس کا ذکر ہوا اس کا حکم مطلقاً مستقل منادیٰ کی طرح ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منادی کے اعراب کے بیان سے فارغ ہونے کے بعد، اب اُس منادی کے توابع کے احکام کو بیان فرما رہے ہیں جو مبنی بر ضم ہوتا ہے۔

یہاں سے مصنفؒ یہ فرماتے ہیں:

پہلا حکم :منادی مبنی مفرد کے توابع کا اعراب؛

وتوابع المنادی المبنیّ المفردۃ-من التّأکید،والصّفۃ،وعطف البیان،

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "منادی مبنی مفرد" کے توابع کا کیا حکم ہے۔ *منادی مبنی مفرد سے مراد :وہ منادی جو نہ مضاف ہو اور نہ شبہ مضاف، جیسے "یا زیدُ" یا "یا رجلُ"۔اسے "مبنی" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ رفع کی علامت (ضمہ) پر مبنی ہوتا ہے، اگرچہ اس کا محل نصب کا ہوتا ہے کیونکہ یہ دراصل فعل "أدعو" (میں پکارتا ہوں) کا مفعول بہ ہوتا ہے۔ تو "یا زیدُ" کا لفظ مرفوع (علامت ضمہ) ہے، لیکن اس کا محل منصوب ہے۔

***توابع سے مراد :**

مصنفؒ نے ان توابع کو شمار کیا ہے جن پر یہ قانون لاگو ہوتا ہے :

***التأکید (تاکید) :**

جیسے "یا تمیمُ کلُّھم"۔

***الصفۃ (صفت) :**

جیسے "یا زیدُ العاقلُ"۔

*عطف البیان (عطف بیان) :

جیسے "یا غلامُ بِشراً"۔

*المعطوف بحرف (معطوف بحرف) :

لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ ایسا معطوف ہو جس پر براہِ راست حرفِ ندا "یا" داخل نہیں ہو سکتا، جیسے وہ اسم جس پر الف لام (ال) لگا ہو، مثلاً "یا زیدُ والغلامُ"۔

*اعراب کے دو (دو صورتیں) :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان توابع میں دو اعراب جائز ہیں :

*الرفع علی اللفظ (لفظ کی اتباع میں رفع) :

چونکہ منادی (مثلاً "زیدُ") کے آخر میں ضمہ (پیش) موجود ہے جو کہ لفظاً ظاہر ہے، تو اس کا تابع بھی اس ظاہری علامت کی پیروی کرتے ہوئے مرفوع ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آپ کہیں گے : "یا زیدُ العاقلُ"۔

*النصب علی المحل (محل کی اتباع میں نصب) :

چونکہ منادی مبنی دراصل مفعول بہ ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہوتا ہے (یعنی اس کی اصلی جگہ نصب کی ہے)، تو اس کا تابع اس کے محل کی پیروی کرتے ہوئے منصوب بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آپ کہیں گے : "یا زیدُ العاقلَ"۔

مصنفؒ نے اپنی مثال "یا زیدُ العاقلُ والعاقلَ" میں دونوں صورتوں کو جمع فرما کر اس قاعدے کو واضح کر دیا ہے۔

دوسرا حکم : معطوف بحرف میں نحویوں کا اختلاف؛

والخليل في المعطوف يختار الرّفع، وأبو عمرو النّصب، وأبو العبّاس إن كان ك(الحسن) فكالخليل، وإلا فكأبي عمرو.

پھر مصنفؒ اس قاعدے میں سے ایک جزئی، یعنی "المعطوف بحرف" (جس پر "ال" ہو) کے بارے میں ائمۂ نحو کے اختلاف کو تفصیل سے بیان فرماتے ہیں :

*امام خلیل بن احمد الفراہیدیؒ کا مسلک :

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام خلیلؒ ایسے معطوف میں رفع کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک "یا زیدُ والغلامُ" کہنا بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح تابع اور متبوع (منادی) میں لفظی مطابقت باقی رہتی ہے۔

*امام ابو عمرو بن العلاءؒ کا مسلک :

ان کے برعکس، امام ابو عمروؒ نصب کو اختیار کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک "یا زیدُ والغلامَ" کہنا بہتر ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ معطوف کو منادی کے اصلی اور حقیقی اعراب (یعنی محلِ نصب) پر عطف کرنا زیادہ قوی ہے۔

*امام ابو العباس المبردؒ کی تفصیل :

امام مبردؒ اس مسئلے میں ایک تفصیلی موقف رکھتے ہیں۔

*پہلی صورت :
اگر معطوف "الحسن" کی طرح کا اسم ہو، تو وہ امام خلیلؒ کے مسلک کو اختیار کرتے ہیں (یعنی رفع کو ترجیح دیتے ہیں)۔ "الحسن" سے مراد وہ عَلَم (خاص نام) ہے جس پر الف لام داخل ہو اور وہ اس کے نام کا حصہ بن چکا ہو (اسے عَلَم بالغلبہ کہتے ہیں، جیسے الحسن، العباس، الفضل)۔ تو اس صورت میں کہا جائے گا: "یا زیدُ والحسنُ"۔
*دوسری صورت :
اور اگر معطوف "الحسن" کی طرح کا اسم نہ ہو (یعنی کوئی عام نکرہ ہو جس پر "ال" تعریف کے لیے آیا ہو، جیسے "الغلام")، تو وہ امام ابو عمروؒ کے مسلک کو اختیار کرتے ہیں (یعنی نصب کو ترجیح دیتے ہیں)۔ تو اس صورت میں کہا جائے گا "یا زیدُ والغلامَ"۔
تیسرا حکم :وہ توابع جن کا حکم مختلف ہے؛
والمضافة تنصب،
آخر میں، مصنفؒ ان توابع کا ذکر فرما رہے ہیں جو پہلے قاعدے سے مستثنیٰ ہیں اور ان کا اپنا الگ حکم ہے :
*المضافة (تابع جب مضاف ہو) :
* مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر منادی مبنی کا تابع مضاف ہو (جیسے "صاحبَ عمروٍ") تو وہ ہمیشہ منصوب ہو گا۔ مثال کے طور پر : "یا زیدُ صاحبَ عمروٍ"۔
*وجہ :
اس کی وجہ یہ ہے کہ مضاف مبنی نہیں ہو سکتا۔ جب وہ مبنی نہیں ہو سکتا تو وہ لفظ میں منادی (زیدُ) کی پیروی نہیں کر سکتا (یعنی مرفوع نہیں ہو سکتا)۔ لہٰذا اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے، اور وہ ہے منادی کے محل (نصب) کی پیروی کرنا۔ اس لیے یہ ہمیشہ منصوب ہوتا ہے۔
*البدل (بدل) اور وہ معطوف جس پر "یا" آسکتا ہے :
والبدل، والمعطوف غیر ماذکر حکمه حکم المستقلّ مطلقا.
ان کا حکم یہ ہے کہ انہیں ایک مستقل منادی سمجھا جائے گا (حکمه حکم المستقلّ مطلقا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ فرض کریں گے کہ ان سے پہلے بھی حرفِ ندا "یا" موجود ہے۔ پھر اس منادی کا جو حکم بنتا ہے، وہی اس کا اعراب ہو گا۔
*البدل کی مثال :
اگر آپ کہیں "یا سعیدُ کرزُ" (کرز، سعید کا بدل ہے)، تو ہم "کرز" کو ایک الگ منادی مانیں گے۔ چونکہ "کرز" بھی مفرد عَلَم ہے، اس لیے اس پر ضمہ آئے گا، بالکل "یا کرزُ" کی طرح۔ اگر مثال ہو "یا زیدُ أبا عبدِاللهِ"، تو یہاں "أبا عبدالله" بدل ہے اور یہ مضاف ہے۔ تو ہم اسے "یا أبا عبدَاللهِ" فرض کریں گے، اور چونکہ منادی مضاف منصوب ہوتا ہے، اس لیے یہ منصوب ہو گا۔

*المعطوف غیر ماذکر (وہ معطوف جس کا ذکر اوپر نہیں ہوا) :
اس سے مراد وہ معطوف ہے جس پر "یا" داخل ہو سکتا ہے (یعنی وہ اسم جس پر "ال" نہ ہو)۔ مثال کے طور پر :"یا زیدُ وعمروٌ"۔ یہاں ہم "عمرو" کو ایک مستقل منادی "یا عمروُ" مانیں گے۔ چونکہ یہ بھی مفرد عَلَم ہے، یہ ضمہ پر مبنی ہوگا۔

مناديٰ کے چند مخصوص احکام

والعلم الموصوف ب(ابن) مضافا إلى علم آخر يختار فتحه. وإذا نودي المعرّف باللاّم قيل :(ياأيّها الرّجل)، و(ياهذا الرّجل)، و(ياأيّهذا الرّجل). والتزموا رفع (الرّجل)، لأنّه هو المقصود بالنّداء، وتوابعه لأنّها توابع معرب، وقالوا :(ياالله) خاصّة. ولك في مثل: ياتيم تيم عديّ... الضّمّ والنّصب.

ترجمہ :اور وہ عَلَم (اسمِ خاص) جس کی صفت "ابن" کے ساتھ لائی گئی ہو جو (ابن) خود ایک دوسرے عَلَم کی طرف مضاف ہو، تو اس (پہلے عَلَم) کو فتحہ (نصب) دینا مختار (پسندیدہ) ہے۔ اور جب کسی ایسے اسم کو پکارا جائے جس پر لامِ تعریف (ال) ہو تو کہا جائے گا :"يا أَيُّهَا الرَّجُلُ" (اے مرد!)، اور "يا هذا الرَّجُلُ" (اے اس مرد!)، اور "يا أَيُّهذا الرَّجُلُ" (اے اس مرد!)۔ اور نحویوں نے "الرَّجُلُ" کے رفع کو لازم قرار دیا ہے، کیونکہ وہی ندا سے مقصود ہے، اور اس کے توابع کو بھی (رفع دیا جائے گا) کیونکہ وہ ایک معرب کے توابع ہیں۔ اور انہوں نے خاص طور پر "يا الله" کہنا (بغیر کسی واسطے کے) جائز رکھا ہے۔ اور آپ کے لیے "ياتيمُ تيمَ عديٍّ" جیسی مثال میں (پہلے تیم پر) ضمہ (رفع) اور نصب دونوں جائز ہیں۔

تشریح:
مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منادی کے عمومی احکام کے بعد اب چند مخصوص اور اہم صورتوں کے احکام بیان فرمارہے ہیں۔

پہلی صورت :
وہ عَلَم جس کی صفت "ابن" ہو؛
مصنفؒ یہاں سے ایک خاص قسم کے منادی کا حکم بیان فرماتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر منادی ایک عَلَم (اسمِ خاص) ہو اور اس کی صفت لفظ "ابن" سے لائی جائے، اور یہ "ابن" آگے ایک اور عَلَم کی طرف مضاف ہو، تو ایسی صورت میں منادی (پہلے عَلَم) کو مبنی بر ضم پڑھنے کے بجائے منصوب (مفتوح) پڑھنا زیادہ پسندیدہ اور مختار ہے۔

* شرائط :
اس قاعدے کے لیے تین شرطیں ہیں :
* منادی عَلَم ہو (مثلاً زید، عمر)۔ *اس کے فوراً بعد اس کی صفت لفظ "ابن" آئے۔ * یہ "ابن" آگے کسی دوسرے عَلَم کی طرف مضاف ہو (مثلاً ابنُ عمروٍ)۔

*مثال :
"يا زيدَ بنَ عمروٍ"۔ * قاعدے کے مطابق "زید" مفرد منادی ہے، اسے "يا زيدُ" ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مذکورہ شرائط پائے

جانے کی وجہ سے اسے "یا زیدَ" (فتہ کے ساتھ) پڑھنا افضل ہے۔

*وجہ :

اس کی وجہ تخفیف (کلام میں آسانی اور ہلکا پن پیدا کرنا) ہے۔"یا زیدُ بنُ عمرٍو"میں دو ضمے (پیش) ایک ساتھ آنے سے کلام میں ایک بھاری پن پیدا ہوتا ہے۔ اہل عرب نے اس ثقالت سے بچنے کے لیے فتحہ (زبر) کو ترجیح دی۔ نیز، اس طرح کی ترکیب (عَلَم + ابن + عَلَم) ایک مرکب کی طرح ہو جاتی ہے، اور منادی جب مرکب (جیسے مضاف) ہو تو وہ منصوب ہی ہوتا ہے، اس لیے مشابہت کی وجہ سے بھی نصب کو ترجیح دی گئی۔

دوسری صورت :

معرف باللام کو پکارنے کا طریقہ؛

مصنفؒ اب اس اسم کو پکارنے کا طریقہ بتا رہے ہیں جس پر الف لام (ال) داخل ہو۔ یہ ایک مشہور قاعدہ ہے کہ حرفِ ندا "یا" اور "ال" ایک اسم پر براہِ راست جمع نہیں ہو سکتے۔ یعنی آپ "یا الرجل" نہیں کہہ سکتے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے ایک واسطہ لانا ضروری ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں :

*أیُّھا کا واسطہ :

مذکر کے لیے "أیُّھا" اور مؤنث کے لیے "أیَّتُھا" استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے :"یا أیُّھا الرَّجُلُ" (اے مرد!) اور "یا أیَّتُھا المرأةُ" (اے عورت!)۔

*اسمِ اشارہ کا واسطہ :

اسمِ اشارہ کو واسطہ بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے :"یا ھذا الرَّجُلُ" (اے اس مرد!)۔

*دونوں کا واسطہ :

کبھی دونوں کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ جیسے :"یا أیُّھذا الرَّجُلُ"۔

*الرجل کا اعراب :

مصنفؒ آگے وضاحت فرماتے ہیں کہ ان صورتوں میں "الرجل" (یعنی ال والا اسم) کو ہمیشہ رفع (پیش) دیا جائے گا ("والتزموا رفع الرجل")۔

*وجہ :

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ندا سے مقصودِ اصلی وہی اسم ہے جس پر "ال" ہے ("الرجل")۔ "أيُّ" یا "ھذا" تو محض ایک ذریعہ اور واسطہ ہیں تاکہ اس اسم تک پہنچا جا سکے۔ چونکہ "الرجل" ہی مقصود بالنداء ہے، اس لیے اسے رفع دیا جاتا ہے گویا کہ وہی منادی ہے۔

*اس کے توابع کا حکم :

"الرجل" کے توابع (مثلاً اس کی صفت) بھی مرفوع ہوں گے، کیونکہ "الرجل" اب ایک معرب اسم کے حکم میں ہے جس پر

رفع آیا ہے، تو اس کے توابع بھی اسی کی پیروی کریں گے۔

***مستثنیٰ صورت:**

اس قاعدے سے کہ "یا" اور "ال" جمع نہیں ہوتے، صرف ایک اسم مستثنیٰ ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں :"وقالوا :(يا الله) خاصّة"۔ یعنی صرف اسمِ جلالت "اللہ" پر براہِ راست "یا" داخل کرنا جائز ہے اور کثرتِ استعمال کی وجہ سے اسے خاص طور پر اجازت دی گئی ہے۔

تیسری صورت :

مکرر منادی کا حکم:

آخر میں مصنفؒ ایک اور خاص ترکیب کا حکم بیان کرتے ہیں، جسے منادی مکرر کہتے ہیں۔

*مثال :"يا تيمُ تيمَ عديٍّ"۔ (یہ ایک مشہور شعر کا ٹکڑا ہے :يا تيمَ تيمَ عديٍّ لا أبا لكمُ...) *اس مثال میں "تیم" کو پکارا گیا اور پھر اسی کو دوبارہ ذکر کیا گیا، لیکن دوسری بار وہ "عدیّ" کی طرف مضاف ہے۔

***اعراب کی دو صورتیں :**

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس جیسی ترکیب میں پہلے والے "تیم" کو پڑھنے کے دو طریقے جائز ہیں :

***الضمّ (ضمہ کے ساتھ) :**

آپ "يا تيمُ" کہہ سکتے ہیں۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ یہ مفرد عَلَم ہے اور منادی مفرد مبنی بر ضم ہوتا ہے۔ اس صورت میں دوسرا والا "تيمَ عديٍّ" یا تو پہلے والے سے بدل ہوگا یا عطفِ بیان، اور چونکہ وہ مضاف ہے، اس لیے منصوب ہوگا۔

***النصب (نصب کے ساتھ) :**

آپ "يا تيمَ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب منادی کو اس طرح مکرر لایا جائے اور دوسرا مضاف ہو، تو یہ پوری ترکیب ایک مضاف کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ گویا اصل میں "يا تيمَ عديٍّ" پکارا گیا تھا۔ چونکہ منادی مضاف منصوب ہوتا ہے، اس لیے اس مشابہت کی وجہ سے پہلے والے "تیم" کو بھی نصب دینا جائز ہے۔

یائے متکلم کی اضافت اور بعض مخصوص کلمات

والمضاف إلى ياء المتكلّم يجوز فيه (يا غلامي) و (يا غلامي)، و (يا غلامِ)، و (يا غلاما)، وبالهاء وقفا. وقالوا :(يا أبي) و (يا أمّي)، و (يا أبت) و (يا أمّت) فتحا و كسرا، وبالألف دون الياء. و (يا ابن أمّ)، و (يا ابن عمّ) خاصّة مثل باب (يا غلامي)، وقالوا: (يا ابن أمّ)، و (يا ابن عمّ).

ترجمہ: اور وہ اسم جو یائے متکلم کی طرف مضاف ہو، اس میں جائز ہے کہ اسے "يا غُلامِي" اور "يا غُلامِ" اور "يا غُلامُ" اور "يا غُلامَا" پڑھا جائے، اور وقف کی صورت میں ہاء کے ساتھ (یاغُلامَہ) بھی جائز ہے۔ اور علماء نحو نے "يا أَبِيْ" اور "يا أُمِّيْ" اور "يا أَبَتِ" اور "يا أُمَّتِ" فتحہ اور کسرہ کے ساتھ (یعنی تاء پر زبر اور زیر دونوں طرح) پڑھنا جائز قرار دیا ہے، اور الف کے ساتھ یائے متکلم کے بغیر (یا أَبَا اور یا أُمَّا)۔ اور "يا ابنَ أُمِّ" اور "يا ابنَ عَمِّ" خاص طور پر باب "يا غُلامِي" کی طرح ہیں، اور

انہوں نے "یا ابنَ اُمَّ" اور "یا ابنَ عَمَّ" بھی کہا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے منادی مضاف بیائے متکلم کے احکام بیان فرما رہے ہیں، یعنی جب کسی اسم کو حرف ندا (یا) کے بعد یائے متکلم کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کی کتنی صورتیں جائز ہیں۔

منادی مضاف بیائے متکلم کے احکام:

چنانچہ مصنف فرماتے ہیں کہ جب کوئی اسم جیسے "غُلام" یائے متکلم کی طرف مضاف ہو تو اس میں چار طرح سے پڑھنا جائز ہے

*** یاغُلامِیْ :**

یہاں اسم کے آخر میں اصلی کسرہ برقرار رکھا گیا ہے اور یائے متکلم کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اصل اور فصیح ترین صورت ہے۔

*** یاغُلامِ :**

یہاں اسم کے آخر سے یائے متکلم کو حذف کر دیا گیا ہے اور آخری حرف پر کسرہ کو باقی رکھا گیا ہے۔ یہ حذف تخفیف (آسانی) کے لیے کیا جاتا ہے۔

*** یاغُلامُ :**

اس صورت میں بھی یائے متکلم کو حذف کر دیا گیا ہے، لیکن آخری حرف پر کسرہ کو ضمہ سے بدل دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضمہ واو کی جنس سے ہے اور کبھی یائے متکلم کو واو سے بدل دیا جاتا تھا، تو اس مناسبت سے یہاں کسرہ کو ضمہ سے بدل دیا گیا۔

*** یاغُلامَا :**

یہاں یائے متکلم کو الف سے بدل دیا گیا ہے اور ما قبل کو فتحہ دیا گیا ہے۔ یہ تبدیلی بھی تخفیف کے لیے ہوتی ہے۔

مصنف مزید فرماتے ہیں کہ وقف کی صورت میں ایک اور صورت جائز ہے، وہ یہ کہ یائے متکلم کی جگہ ہائے سکت (خاموشی کی ہا) لائی جائے، جیسے "یا غُلامَہْ"۔ یہ ہا صرف وقف کی صورت میں تلفظ ہوتی ہے اور اس کا مقصد کلام کو ختم کرنا اور آواز کو کھینچنا ہے۔

اب اور ام مضاف بیائے متکلم:

اس کے بعد مصنف اب اور ام کے بارے میں خاص حکم بیان کرتے ہیں کہ جب یہ دونوں اسم یائے متکلم کی طرف مضاف ہوں تو ان میں دو صورتیں جائز ہیں :

*** یااَبِیْ اور یااُمِّیْ :**

کسرہ کے ساتھ اور یائے متکلم کے اثبات کے ساتھ۔ یہ اصل صورت ہے۔

*** یااَبَتِ اور یااُمَّتِ :**

تاء کے ساتھ، اور تاء پر فتحہ اور کسرہ دونوں طرح جائز ہے۔ یہ تاء دراصل یائے متکلم کے عوض میں لائی جاتی ہے اور یہ تخفیف

اور اختصار کے لیے مستعمل ہے۔
نیز مصنف یہ بھی فرماتے ہیں کہ "یَا أَبَا" اور "یَا أُمَّا" بھی جائز ہے، یعنی یائے متکلم کو حذف کرکے آخر میں الف لانا بھی درست ہے۔ یہ صورت بھی تخفیف اور وسعت کے لیے ہے۔

"ابن ام" "ابن عم" مضاف بیائے متکلم:

آخر میں مصنف "ابن ام" (اے ماں کے بیٹے) اور "ابن عم" (اے چچا کے بیٹے) کے بارے میں خاص حکم بیان کرتے ہیں کہ یہ دونوں ترکیبیں عام طور پر باب "یَا غُلَامِيْ" کی طرح ہیں، یعنی جتنی صورتیں یاغلامی میں جائز ہیں یہاں بھی جائز ہیں اور ان میں کسرہ اور یائے متکلم دونوں کو ثابت رکھنا فصیح ہے۔ لیکن بعض اوقات تخفیف کے لیے انہیں "یَا ابنَ أُمَّ" اور "یَا ابنَ عَمَّ" فتحہ کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ترخیم منادی

وترخيم المنادى جائز، وفي غيره ضرورة. وهو حذف في آخره تخفيفا. وشرطه أن لا يكون مضافا، ولا مستغاثا، ولا جملة. ويكون إمّا علما زائدا على ثلاثة أحرف، وإمّا بتاء التّأنيث. فإن كان في آخره زيادتان في حكم الواحدة، ك(أسماء) و(مروان)، أو حرف صحيح قبله مدّة، وهو أكثر من أربعة أحرف حذفتا، وإن كان مركّبا حذف الاسم الأخير، وإن كان غير ذلك فحرف واحد، وهو في حكم الثّابت على الأكثر، فيقال: (يا حار) و(يا ثمو)، و(يا كرو)، وقد يجعل اسما برأسه فيقال: (يا حار) و(يا ثمي) و(يا كرا).

ترجمہ: اور منادیٰ کا ترخیم جائز ہے، اور اس کے غیر میں ضرورت کی بنا پر (یعنی شعر وغیرہ میں)۔ اور وہ تخفیف کے لیے اس کے آخر سے حذف ہے۔ اور اس کی شرط یہ ہے کہ وہ مضاف نہ ہو، اور نہ مستغاث ہو، اور نہ جملہ ہو۔ اور وہ یا تو تین حرف سے زائد علم ہو، یا تاء تانیث والا ہو۔ پس اگر اس کے آخر میں دو زیادتیاں ہوں جو ایک کے حکم میں ہوں، جیسے (أَسْمَاءَ) اور (مَرْوَانَ)، یا کوئی صحیح حرف ہو جس سے پہلے مد ہو، اور وہ چار حرف سے زیادہ ہو تو وہ دونوں حذف کر دی جاتی ہیں، اور اگر وہ مرکب ہو تو آخری اسم حذف کر دیا جاتا ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو ایک حرف حذف کیا جاتا ہے، اور وہ اکثر ثابت کے حکم میں ہوتا ہے، پس کہا جاتا ہے: (يَا حَارُ) (اے حارث)، اور (يَا ثَمُو) (اے ثمود)، اور (يَا كَرُو) (اے کرو)، اور کبھی اسے بذات خود ایک اسم بنا دیا جاتا ہے پس کہا جاتا ہے: (يَا حَارِ) (اے حار)، اور (يَا ثَمِي) (اے ثمی)، اور (يَا كَرَا) (اے کرا)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں منادیٰ کے احکام میں سے ترخیم کا بیان فرما رہے ہیں۔

ترخیم کا لغوی معنیٰ:

لغت میں ترخیم کہتے ہیں نرم کرنا اور آسان کرنا۔

ترخیم کی اصطلاحی تعریف:

نحویین کی اصطلاح میں منادی مرخم کی تعریف وَهُوَ حَذْفٌ فِيْ اٰخِرِهٖ تَخْفِيْفًا..." یعنی "یہ کلمے کے آخر سے کچھ حذف کرنا ہے

تاکہ کلمہ ہلکا ہو جائے"۔اس کا مقصد صرف اور صرف کلمے کو بولنے میں آسانی پیدا کرنا اور تخفیف لانا ہے۔

ترخیم کا حکم اور مقصد؛

مصنف رحمہ اللہ ابتدا ہی میں وضاحت فرماتے ہیں کہ *مناد ی کا ترخیم جائز ہے :یعنی اگر کوئی لفظ منادی بن کر آئے تو اس کا ترخیم کرنا بلا ضرورت اور بلا مجبوری جائز ہے۔ یہ ایک اختیاری امر ہے۔

***غیر منادی میں ترخیم ضرورت کی بناپر :**

منادی کے علاوہ کسی بھی دوسرے مقام پر ترخیم کرنا صرف شاعرانہ ضرورت کی بنا پر جائز ہوتا ہے، عام حالت میں اس کی اجازت نہیں۔ یعنی یہ ایک خلاف قیاس امر ہے۔

ترخیم کی شرائط؛

مصنف رحمہ اللہ ترخیم کے جواز کے لیے تین بنیادی شرائط بیان کرتے ہیں :

*أن لا يكون مضافا :

یعنی وہ منادی جس کا ترخیم کیا جا رہا ہے، وہ مضاف نہ ہو۔ جیسے "عبد الله" مضاف ہے، اس کا ترخیم "يا عبدُ" نہیں کیا جائے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اضافت میں ایک قسم کا تعلق اور مضبوطی ہوتی ہے، اور ترخیم میں حذف کرنا اس تعلق کو کمزور کر سکتا ہے۔

*ولا مستغاثا :

یعنی وہ منادی مستغاث نہ ہو۔ مستغاث وہ کلمہ ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی سے فریاد کی جائے۔ جیسے "يا لَزيدٍ" میں "زید" مستغاث ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مستغاث میں ایک خاص قسم کی تاکید اور تعظیم ہوتی ہے، جو ترخیم کی تخفیف کے منافی ہے۔

***ولا جملة :**

یعنی وہ منادی جملہ نہ ہو۔ بعض اوقات جملہ بھی منادی بن سکتا ہے، جیسے "يا ايها القائمون"، یہاں "القائمون" اگرچہ اسم ہے لیکن یہ جملے کے حکم میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جملے کا مقصد مکمل معنی دینا ہوتا ہے، اور ترخیم سے معنی کی وضاحت میں خلل آسکتا ہے۔

ترخیم کن الفاظ میں ہوتی ہے؟

مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ منادی جس کا ترخیم کیا جائے گا، اس کی دو صورتیں ہوں گی :

*إمّا علما زائدا على ثلاثة أحرف :

یعنی علم ہو اور اس کے حروف کی تعداد تین سے زیادہ ہو۔ جیسے "جعفر"، "عثمان" وغیرہ۔

*وإمّا بتاء التأنيث :

یعنی وہ کلمہ تائے تانیث (گول تا) پر ختم ہوتا ہو۔ خواہ وہ علم ہو یا نہ ہو، اور خواہ وہ تین حروف کا ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے "فاطمة"،

"عائشة" وغیرہ۔

ترخیم کی کیفیت (کتنے حروف حذف ہوں گے؟)

مصنف رحمہ اللہ ترخیم کی کیفیت کو مختلف صورتوں میں تقسیم کرتے ہیں:

***إذا كان في آخره زيادتان في حكم الواحدة:**

اگر منادی کے آخر میں ایسی دو زیادتیاں ہوں جو ایک حرف کے حکم میں سمجھی جاتی ہیں (یعنی دونوں مل کر ایک وزن یا صیغہ بناتی ہیں)، جیسے "أسماء" (الف اور ہمزہ زائد ہیں) اور "مروان" (الف اور نون زائد ہیں)، تو (ترخیم میں) وہ دونوں (زیادتیاں) حذف کر دی جائیں گی۔ چنانچہ "أسماء" سے "یا اسمُ" اور "مروان" سے "یا مروُ" کہا جائے گا۔

***أو حرف صحيح قبله مدة، وهو أكثر من أربعة أحرف:**

یا اگر منادی کے آخر میں کوئی حرف صحیح ہو اور اس سے پہلے حرف مدہ (الف، واو، یا یاء ساکنہ) ہو، اور کلمہ کے کل حروف چار سے زیادہ ہوں (تاکہ تین حروف سے زائد ہونے کی شرط پوری ہو)، تو (ترخیم میں) وہ دونوں (حرف صحیح اور مدہ) حذف کر دی جائیں گی۔ جیسے "سلمیٰ" سے "یا سلمُ" اور "مسکین" سے "یا مسکُ"۔

***وإن كان مركبا حذف الاسم الأخير:**

اور اگر منادی مرکب ہو (یعنی دو اسموں سے مل کر بنا ہو، جیسے "بعلبک"، "بیت لحم")، تو آخر والا اسم حذف کر دیا جائے گا۔ چنانچہ "بعلبک" سے "یا بعلُ" اور "بیت لحم" سے "یا بیتُ" کہا جائے گا۔

***وإن كان غير ذلك فحرف واحد:**

اور اگر منادی مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی نہ ہو (یعنی وہ علم ہو جو تین سے زائد حروف پر مشتمل ہو، یا تائے تانیث پر ختم ہو، لیکن اس کے آخر میں دو زیادتیاں یا مدہ نہ ہو، اور نہ ہی وہ مرکب ہو)، تو (ترخیم میں) صرف ایک حرف حذف کیا جائے گا۔ جیسے "حارث" سے "حارِ" (جس کی مزید تفصیل نیچے آئے گی)، "جعفر" سے "جعفُ"۔

ترخیم کے بعد بقیہ حصے کا اِعراب:

مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترخیم کے بعد جو حصہ بچ جاتا ہے، اس کے اعراب کے بارے میں دو قول ہیں:

***وهو في حكم الثابت على الأكثر:**

اکثر نحویوں کے نزدیک ترخیم کے بعد بچ جانے والا حصہ اپنے اصلی حالت (اعراب) پر برقرار رہتا ہے۔ یعنی اگر ترخیم سے پہلے وہ مرفوع تھا تو اب بھی مرفوع رہے گا، جیسے: * "یا حارِ": یہاں "حارث" سے ترخیم کیا گیا اور باقی ماندہ "حار" کو کسرہ کے اعراب پر برقرار رکھا گیا ہے۔ * "یا ثمِي": یہاں "ثمود" سے ترخیم کیا گیا اور باقی ماندہ "ثمی" کے ساتھ یاء زائد لائی گئی، اور اسے کسرہ دیا گیا۔ * "یا کرَا": یہاں "کروان" سے ترخیم کیا گیا اور باقی ماندہ "کرا" کے ساتھ الف زائد لایا گیا، اور اسے فتحہ دیا گیا گویا کہ ترخیم سے پہلے ما قبل والے حرف جو اعراب تھا ترخیم کے بعد بھی وہی اعراب رہے گا۔

*وقد یجعل اسما برأسہ :

اور کبھی کبھار ترخیم کے بعد بچ جانے والے حصے کو ایک مستقل اسم سمجھ لیا جاتا ہے اور اس وہی اعراب دیا تاہے جو مستقل منادی کا ہوتا ہے۔ جیسے "حارث" سے "یا حارُ" (جہاں ثاء ضمہ کے ساتھ باقی رہتا ہے لیکن یہاں اسے ختم کرکے راپر ضمہ دیا گیا ہے)؛ "ثمود" سے "یا ثموُ"؛اور "کروان" سے "یا کروُ"۔

مندوب کی بحث

وقد استعملوا صیغة النّداء فی المندوب-وھو المتفجّع علیہ-ب(یا)أو(وا)،واختصّ ب(وا)۔

وحکمہ فی الإعراب والبناء حکم المنادی،ولك زیادة الألف فی آخرہ.فإن خفت اللّبس قلت :(واغلامکیہ، واغلامکموہ)،ولك الھاء فی الوقف.

ولا یندب إلاّ المعروف،فلا یقال :(وارجلاہ)،وامتنع (وازید الظّویلاہ)،خلافا لیونس.

ترجمہ :اور صیغہ ندا کو مندوب (یعنی جس پر افسوس کیا جائے) کے لیے استعمال کیا گیا ہے، (یَا) یا (وَا) کے ساتھ، اور (وَا) اس کے ساتھ خاص ہے۔اور اعراب اور بناء میں اس کا حکم منادیٰ کا حکم ہے، اور تیرے لیے اس کے آخر میں الف کا اضافہ جائز ہے، پس اگر تجھے اشتباہ کا خوف ہو تو تو کہے گا :(وَاغُلَامَکِیہْ، وَاغُلَامَکُموْہْ)، اور تیرے لیے وقف میں ہاء ہے۔اور مندوب صرف معروف ہوتا ہے، پس یہ نہیں کہا جائے گا :(وَارِجُلَاہْ)، اور (وَا زَیْدُ الطَّوِیلَاہْ) کہنا منع ہے، یونس کے برعکس۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں منادیٰ کے ایک اور متعلقہ مبحث یعنی مندوب کا بیان فرما رہے ہیں۔ مندوب اس اسم کو کہتے ہیں جس پر افسوس اور تاسف کا اظہار کیا جائے، جس کے فراق پر درد محسوس کیا جائے۔

حروف ندا کا استعمال؛

قولہ :وَقَدِ اسْتَعْمَلُوا صِیغَةَ النِّدَاءِ فِی الْمَنْدُوبِ...

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اہل عرب نے "مندوب" کے لیے وہی صیغہ استعمال کیا ہے جو ندا کے لیے ہے، یعنی حرفِ ندا کے بعد اسم کا ذکر کرنا۔اس کے بعد مصنفؒ نے مندوب کی تعریف خود ہی واضح فرمادی (وَھُوَ الْمُتَفَجَّعُ عَلَیْہِ)، یعنی مندوب وہ ہے جس پر "تفجّع" کیا جائے، یعنی جس کے لیے غم اور درد کا اظہار کیا جائے۔مثلاً کسی کے انتقال پر افسوس کرتے ہوئے کہنا "ہائے زید!" یا اپنی کمر میں درد کی شکایت کرتے ہوئے کہنا "ہائے میری کمر!"۔

یا اور وا کے استعمال میں فرق؛

قولہ :بِ(یَا)أَوْ(وَا)،وَاخْتُصَّ بِ(وَا)۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ندبہ کے لیے دو حرف استعمال ہوتے ہیں :"یا" اور "وا"۔

* "یا" :یہ حرفِ ندا اصل میں تو کسی کو پکارنے کے لیے ہے، لیکن ندبہ کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔مثلاً اگر کوئی کہے "یا

زَيْدُ"، تو اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ وہ زید کو پکار رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ زید پر افسوس کر رہا ہے۔
* "وا" : یہ حرف ندبہ کے ساتھ خاص ہے۔ (وَاخْتُصَّ بِ (وَا)) کا یہی مطلب ہے کہ جب "وا" استعمال ہوگا تو اس کا مقصد لازماً اور یقینی طور پر ندبہ ہی ہوگا، کسی کو پکارنا نہیں ہوگا۔ اسی لیے یہ ندبہ کا اصل حرف سمجھا جاتا ہے۔ جیسے "وَا زَيْدَاهْ" (ہائے زید!)۔

مندوب کا اعرابی حکم؛

قولہ :وَحُكْمُهُ فِي الْإِعْرَابِ وَالْبِنَاءِ حُكْمُ الْمُنَادَى.

مصنفؒ یہاں مندوب کا اعرابی حکم بیان فرما رہے ہیں کہ مندوب پر وہی قواعد لاگو ہوں گے جو عام منادی پر ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے :

*اگر مندوب مفرد علم ہو؛

جیسے "زید"، تو وہ مبنی بر ضمہ ہوگا، یعنی اس پر پیش آئے گا (اگرچہ وہ الف کی وجہ سے ظاہر نہ ہو)۔ جیسے "وَا زَيْدُ" جو بعد میں "وَا زَيْدَا" بن جائے گا۔

*اگر مندوب مضاف ہو،

جیسے "امیر المومنین"، تو وہ منصوب ہوگا، جیسے "وَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ" جو بعد میں "وَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَا" بن جائے گا۔ پس اعراب کے معاملے میں مندوب اور منادی میں کوئی فرق نہیں۔

مندوب کے آخر میں الف کا اضافہ؛

قولہ :وَلَكَ زِيَادَةُ الْأَلِفِ فِي آخِرِهِ.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ندبہ کی ایک خاص علامت یہ ہے کہ آپ مندوب کے آخر میں ایک الف کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس الف کو "الفِ ندبہ" کہتے ہیں۔ اس کا فائدہ آواز کو کھینچنا اور لمبا کرنا ہے تاکہ غم اور حسرت کا بھرپور اظہار ہو۔ جیسے "وَا زَيْدُ" سے "وَا زَيْدَا"۔

قولہ :فَإِنْ خِفْتَ اللَّبْسَ قُلْتَ :(وَا غُلَامَكِيهْ، وَا غُلَامَكُمُوهْ).

ضمائر کا اضافہ برائے وضاحت:

یہ ایک اہم اور دقیق مسئلہ ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر الفِ ندبہ لگانے سے التباس اور شک کا خوف ہو تو اس سے بچنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔

*التباس کی صورت :

اگر کسی خاص شخص یا چیز پر افسوس کیا جا رہا ہو اور اشتباہ کا اندیشہ ہو کہ سننے والا کسی اور کو مراد لے سکتا ہے تو وضاحت کے لیے ضمائر کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مصنفؒ مثال دیتے ہیں :(وَا غُلَامَكِيهْ) یہاں "کِ" ضمیر واحد مخاطب کی مونث کے لیے ہے یعنی

واغلامکہ۔ اب اس کے آخر میں الف وہا کااضافہ کریں تو یہ واغلامکاہ بن جائے گااور اس صورت میں اس کاالتباس آئے گامذکر مخاطب کے ساتھ اسی وجہ سے اس کے آخر میں یالگادی کہ مؤنث مخاطب پر دلالت کرے۔

اور (وَاغُلَامَکُمُوہُ) (ہائے تمہارے غلام!) یہاں "کُم" ضمیر جمع مذکر کی ہے اب اگرآخر میں الف وہاکااضافہ ہوتو یہ واغلامکماہ بن جائے گااس صورت میں اس کاالتباس آئے گاتثنیہ مخاطب کے ساتھ اسی وجہ سے اس کے آخر میں واولگادی تاکہ جمع پر دلالت کرے۔

ندبہ کے آخر میں "ہاء" کااضافہ؛

قولہ :وَلَكَ الْهَاءُ فِي الْوَقْفِ.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب آپ مندوب پر وقف کریں (یعنی اس پر اپنی بات ختم کریں) توآپ کو اختیار ہے کہ الفِ ندبہ کے بعد ایک "ہاء" کا اضافہ کر دیں۔ اس "ہاء" کو "ہاء السکت" (وقف کی ہاء) کہتے ہیں۔ اس کا مقصد صرف وقف کی حالت میں تلفظ کو سہل اور واضح بنانا ہے۔ جیسے "وَا زَيْدَا" کو وقف میں "وَا زَيْدَاهْ" پڑھا جائے گا۔ اگر وقف نہ ہو تو یہ "ہاء" نہیں لائی جائے گی۔

صرف معروف پر ہو سکتا ہے،

قولہ :وَلَا يُنْدَبُ إِلَّا الْمَعْرُوفُ.

مصنفؒ ایک اہم شرط بیان فرمارہے ہیں کہ ندبہ صرف معروف پر ہو سکتا ہے، نکرہ (غیر معیّن) پر نہیں۔ معروف سے مراد وہ اسم ہے جو معیّن اور جانا پہچانا ہو، جیسے کوئی علم (زید)، یا مضاف (امیر المومنین)، یا اسم اشارہ وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افسوس اور غم کااظہار کسی خاص اور معیّن ذات یا شے کے لیے ہی ہوتا ہے۔آپ کسی انجان، غیر معیّن شخص کے لیے ندبہ نہیں کرتے۔اسی لیے مصنفؒ نے مثال دی (فَلَا يُقَالُ :وَا رَجُلَاهْ)، یعنی "ہائے ایک مرد!" کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ "رجل" نکرہ ہےاور اس سے کوئی معیّن مرد مراد نہیں۔

صفت پر ندبہ اور نحویین کااختلاف؛

قولہ :وَامْتَنَعَ (وَا زَيْدَا الطَّوِيلَاهْ)،خِلَافًا لِيُونُسَ.

مصنفؒ آخری مسئلہ یہ بیان فرمارہے ہیں کہ جمہور نحویوں کے نزدیک موصوف کی صفت پر ندبہ کرنا منع ہے (وامتنع)۔ مثال کے طور پر اگر آپ "زيد الطويل" (لمبا زید) پر ندبہ کرنا چاہیں توآپ کو موصوف یعنی "زید" پر ندبہ کرنا ہوگا، اس کی صفت "الطویل" پر نہیں۔

* صحیح طریقہ :

"وَا زَيْدُ الطَّوِيلُ" (اے لمبے زید! (افسوس))

*غلط طریقہ :

"وَا زَيْدَ الطَّوِيلَاهْ"غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ندبہ کا تعلق براہِ راست ذات (موصوف) سے ہوتا ہے، اس کی صفت سے

نہیں۔آپ زید کی ذات پر افسوس کرتے ہیں، نہ کہ اس کے لمبے ہونے پر۔آخر میں مصنفؒ نے نحویوں کے اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے (خِلَافًا لِیُونُسَ)، یعنی بصرہ کے مشہور نحوی امام یونس بن حبیبؒ اس کی اجازت دیتے تھے اور ان کے نزدیک صفت پر بھی ندبہ کیا جا سکتا ہے۔تاہم جمہور کا مسلک وہی ہے جسے مصنفؒ نے اختیار کیا ہے یعنی یہ منع ہے۔

حرف نداء اور منادی کا حذف

ویجوز حذف حرف النّداء إلا مع اسم الجنس والإشارة، والمستغاث، والمندوب نحو {یُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هذا}، و (أيّها الرّجل)، وشذّ (أصبح ليل)، و (افتد مخنوق)، و (أطرق كرا) وقد يحذف المنادى لقيام قرينة جوازا، نحو ألا يا اسجدوا

ترجمہ :اور حرف ندا کا حذف کرنا جائز ہے سوائے اسم جنس اور اسم اشارہ اور مستغاث اور مندوب کے، جیسے {یُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا} (اے یوسف! اس سے منہ پھیر لو)، اور (أَيُّهَا الرَّجُلُ) (اے مرد!)۔اور شاذ ہے (أَصْبِحَ لَيْلُ) (اے رات! صبح ہو جا)، اور (اُفْتَدِ مَخْنُوقُ) (اے دم گھٹنے والے! فدیہ دے)، اور (أَطْرِقْ كَرَا) (اے کَرا! سر جھکا)۔اور کبھی منادیٰ کو قرینہ کے موجود ہونے کی وجہ سے جوازاً حذف کر دیا جاتا ہے، جیسے أَلَا يَا اسْجُدُوا (سنو! اے لوگو سجدہ کرو)۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں حرف ندا اور خود منادیٰ کے حذف ہونے کے بارے میں بیان فرما رہے ہیں:

مصنفؒ کا مقصد:

مصنفؒ یہاں سے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کن حالات میں حرفِ نداء (جیسے یا، أَيا، ہَيا وغیرہ) کو ذکر کرنا ضروری ہے اور کن حالات میں اسے حذف کیا جا سکتا ہے۔اس کے بعد وہ ایک دوسرا قاعدہ بیان کرتے ہیں کہ کبھی حرفِ نداء کے بجائے خود منادی (جس کو پکارا جارہا ہے) کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے۔

پہلا قاعدہ :

حرفِ نداء کا حذف

قولہ :(وَيَجُوزُ حَذْفُ حَرْفِ النِّدَاءِ) مصنفؒ فرماتے ہیں کہ کلامِ عرب میں حرفِ نداء کو حذف کرنا بالعموم جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منادی پر آنے والا ضمہ (پیش) یا اس کا مبنی بر ضمہ ہونا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں حرفِ نداء محذوف ہے، کیونکہ یہ اعراب ندا کی وجہ سے ہی آتا ہے۔

پہلی مثال:

مصنفؒ نے جواز کی دلیل قرآنِ مجید سے دی: قولہ :(نَحْوُ {يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا}) یہاں اصل عبارت "يَا يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا" تھی۔حرفِ نداء "یا" کو حذف کر دیا گیا اور یہ بالاتفاق جائز اور فصیح ہے۔

دوسری مثال:

قولہ :(و (أيّها الرّجل)) مصنفؒ نے {يُوسُفُ...} کے بعد اس مثال کو حرف نداء کے حذف کے جواز میں پیش کیا ہے۔

یعنی جس طرح علم سے پہلے حرف نداء حذف ہو سکتا ہے، اسی طرح "أَيُّهَا" سے پہلے بھی حذف ہو سکتا ہے، کیونکہ ایھا یہ خاص ہے نداء کے ساتھ لہٰذا (أيها الرّجل ' کہنا جائز ہے اصل عبارت (ياأيها الرّجل) ہے۔

وہ مقامات جہاں حرفِ نداء کا حذف جائز نہیں؛

(مستثنیات)

قوله :(إِلَّا مَعَ اسْمِ الْجِنْسِ وَالْإِشَارَةِ وَالْمُسْتَغَاثِ وَالْمَنْدُوبِ)

مصنفؒ اب وہ چار صورتیں بیان فرمارہے ہیں جہاں حرفِ نداء کو حذف کرنا جائز نہیں ہے اور اس کا ذکر کرنا واجب ہے۔

*اسم الجنس :

وہ اسم جو کسی غیر معین فرد پر دلالت کرے، جیسے "رَجُلٌ" (کوئی مرد)۔ جب آپ کسی خاص آدمی کو پکارنا مقصود ہو جو آپ کے سامنے ہے تو "يَا رَجُلُ" کہتے ہیں۔ یہاں "یا" کو حذف کرکے صرف "رَجُلُ" کہنا جائز نہیں، کیونکہ اگر "یا" کو حذف کر دیا جائے تو سننے والے کو یہ وہم ہو سکتا ہے کہ یہ ندا نہیں بلکہ کسی جملے کا حصہ ہے۔ حرفِ نداء اس بات کو متعین کرتا ہے کہ یہاں اسم جنس سے ایک معین فرد مراد ہے جسے پکارا جا رہا ہے۔

*اسم الاشارۃ :

جیسے "هَذَا"، "هَذِهِ"۔ جب انہیں منادی بنایا جائے تو "يَا هَذَا" کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی حرفِ نداء کو حذف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسم اشارہ اپنی اصل وضع میں ندا کے لیے نہیں بنا، لہٰذا حرفِ نداء کو ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ ندا کا معنی واضح ہو جائے۔

*المستغاث :

وہ شخص جسے مدد کے لیے پکارا جائے۔ جیسے "يَا لَزَيْدٍ لِعَمْرٍو" (اے زید! عمرو کی مدد کو پہنچو)۔ استغاثہ (مدد طلب کرنا) ایک خاص اسلوب ہے جس کا بنیادی رکن حرفِ نداء "یا" ہے۔ اگر اسے حذف کر دیا جائے تو استغاثہ کا مخصوص معنی اور اسلوب ہی ختم ہو جائے گا۔

*المندوب :

وہ شخص جس پر افسوس یا درد کا اظہار کرتے ہوئے اسے پکارا جائے۔ جیسے "وَا زَيْدَاهُ" (ہائے زید!) یا "يَا زَيْدَاهُ"۔ ندبہ (نوحہ کرنا) کا اسلوب بھی حرفِ نداء "وَا" یا "یا" پر ہی قائم ہے۔ اس کے بغیر ندبہ کا تصور ممکن نہیں۔

شاذ و نادر مثالیں (قاعدے سے استثناء)

قوله :(وَشَذَّ (أَصْبِحْ لَيْلُ)، و(افْتَدِ مَخْنُوقُ)، و(أَطْرِقْ كَرَا))

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے جو قاعدہ بیان کیا کہ اسم جنس سے حرفِ نداء کو حذف کرنا جائز نہیں، اس کے خلاف عربوں سے کچھ مثالیں سنی گئی ہیں، لیکن وہ شاذ ہیں (یعنی قاعدے کے خلاف اور نادر ہیں)۔ ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں عام بول چال میں استعمال کرنا چاہیے۔

*(أَصْبِحْ لَيْلُ) :

اصل میں "يَا لَيْلُ أَصْبِحْ" (اے رات! صبح ہو جا) تھا۔ یہاں "لَيْل" اسمِ جنس ہے لیکن حرفِ نداء حذف کر دیا گیا، جو کہ شاذ ہے۔

*(افْتَدِ مَخْنُوقُ) :

اصل میں "يَا مَخْنُوقُ افْتَدِ" (اے گلا گھونٹے ہوئے! فدیہ دے کر خود کو چھڑا لے) تھا۔ "مَخْنُوق" بھی اسمِ جنس ہے، یہاں سے بھی "یا" کا حذف شاذ ہے۔

*(أَطْرِقْ كَرَا) :

یہ ایک مصرع کا حصہ ہے، "أَطْرِقْ كَرَا إِنَّ النَّعَامَ فِي الْقُرَى" (اے کروان نامی پرندے! سر جھکا لے، کیونکہ شتر مرغ بستیوں میں ہیں)۔ یہاں "كَرَا" (کروان پرندہ) اسمِ جنس ہے اور اس سے پہلے "یا" کا حذف شاذ ہے۔

دوسرا قاعدہ :

مناد یٰ کا حذف؛

قولہ :(وَقَدْ يُحْذَفُ الْمُنَادَى لِقِيَامِ قَرِينَةٍ جَوَازًا)

اب مصنفؒ ایک بالکل مختلف صورت بیان فرما رہے ہیں۔ پہلی بحث حرفِ نداء کو حذف کرنے کی تھی، اب یہ بحث خود منادی (جسے پکارا گیا) کو حذف کرنے کی ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ کبھی کلام میں کوئی ایسا قرینہ (اشارہ یا علامت) موجود ہوتا ہے جس سے معلوم ہو رہا ہو کہ کس کو پکارا جا رہا ہے، تو اس صورت میں منادی کو حذف کرنا جائز ہے۔ مثال: قولہ :(نَحْوُ أَلَا يَا اسْجُدُوا) اس کی اصل عبارت یوں ہے :"أَلَا يَا قَوْمِ اسْجُدُوا" (خبردار! اے میری قوم! سجدہ کرو)۔ *حرفِ نداء :"یَا" موجود ہے۔ *منادی :"قَوْمِ" کو حذف کر دیا گیا ہے۔ *قرینہ :آگے آنے والا فعل "اسْجُدُوا" صیغہ جمع ہے، جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ پکارے جانے والی ایک جماعت ہے۔ یہی جمع کا صیغہ وہ قرینہ ہے جس کی وجہ سے منادی "قوم" کو حذف کرنا جائز ہوا کیونکہ حرف نداء فعل پر داخل نہیں ہوتا۔

حزف وجوبی کا تیسرا مقام (ما أضمر عامله على شريطة التّفسير)

الثّالث :ما أضمر عامله على شريطة التّفسير، وهو كلّ اسم بعده فعل أو شبهه مشتغل عنه بضميره أو متعلّقه، لو سلّط عليه هو أو مناسبه لنصبه، مثل :(زيدا ضربته)، و(زيدا مررت به)، و(زيدا ضربت غلامه)، و(زيدا حبست عليه)، ينصب بفعل يفسّره ما بعده، أي، (ضربت) و(جاوزت)، و(أهنت) و(لابست).

ترجمہ : تیسرا باب :وہ (اسم) جس کا عامل شرط تفسیر کے تحت مضمر کیا گیا ہو، اور وہ ہر اسم ہے جس کے بعد فعل یا اس کے مشابہ (اسم فعل وغیرہ) ہو جو اس (اسم) سے اس کی ضمیر یا اس کے متعلق کی وجہ سے مشغول ہو، اگر اس (فعل) کو یا اس کے مناسب کو اس (اسم) پر مسلط کیا جاتا تو وہ اسے نصب دیتا، جیسے :(زَيْدًا ضَرَبْتُهُ) (زید کو میں نے مارا)، اور (زَيْدًا مَرَرْتُ بِهِ) (زید کے پاس سے میں گزرا)، اور (زَيْدًا ضَرَبْتُ غُلَامَهُ) (زید کے غلام کو میں نے مارا)، اور (زَيْدًا حَبَسْتُ عَلَيْهِ) (زید پر میں نے پابندی لگائی)، وہ منصوب ہوتا ہے ایسے فعل کی وجہ سے جس کی تفسیر اس کے بعد والا (فعل) کرتا ہے، یعنی (ضَرَبْتُ)، اور

(جَاوَزْتُ)، اور (أَهَنْتُ)، اور (لَابَسْتُ)۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ان چار ابواب میں سے تیسرے باب کا ذکر فرما رہے ہیں جن میں مفعول بہ کا فعل وجوباً محذوف ہوتا ہے، اور یہ باب مااُضْمِرَ عَامِلُہٗ عَلٰی شَرِیْطَۃِ التَّفْسِیْرِ یعنی وہ اسم جس کا عامل شرط تفسیر کے تحت مضمر کیا گیا ہو۔ اس نحوی اصطلاح کو اشتِغَال کہتے ہیں۔

مااُضْمِرَ عَامِلُہٗ عَلٰی شَرِیْطَۃِ التَّفْسِیْرِ کی تعریف:

.وهو كلّ اسم بعده فعل أو شبهه مشتغل عنه بضميره أو متعلّقه، لو سلّط عليه هو أو مناسبه لنصبه.

تعریف کا خلاصہ:

کہ اس سے مراد ہر وہ اسم ہے جس کے بعد فعل یا شبہ فعل ہو اور وہ فعل اس اسم میں عمل کرنے سے اعراض کر رہا ہو اس کی ضمیر میں عمل کرنے کی وجہ سے اس حیثیت سے کہ اگر اس فعل کو اس اسم پر مسلط کر دیا جائے تو وہ اس کو نصب دے گا جیسے زَیْدًا ضَرَبْتُہٗ ۔ تقدیری عبارت ضَرَبْتُ زَیْدًا ضَرَبْتُہٗ یہ فعل کی مثال ہے۔

شبہ فعل کی مثال زَیْدًا اَنْتَ ضَارِبُہٗ تقدیر اس طرح ہے اَنْتَ ضَارِبٌ زَیْدًا ضَارِبُہٗ۔

فوائد و قیود:

صاحب کتاب نے تعریف میں فرمایا وَھُوَ کُلُّ اِسْمٍ یہ بمنزلہ جنس کے ہے تمام اسماء داخل ہیں لیکن آگے فرمایا: بَعْدَہٗ فِعْلٌ اَوْ شِبْھُہٗ فصل ہے اس سے وہ اسماء خارج ہو گئے جن کے بعد فعل یا شبہ فعل نہیں ہوتا جیسے زَیْدٌ اَبُوْکَ ، مشتغل عنه بضميره أو متعلّقه یہ دوسری فصل ہے اور، لو سلّط عليه هو أو مناسبه لنصب یہ تیسری فصل ہے اس سے اس فعل کو نکال دیا جو نصب نہ دیتا ہو جیسے ضُرِبَ زَیْدٌ۔

عمل کے اعتبار سے مااُضْمِرَ عَامِلُہٗ عَلٰی شَرِیْطَۃِ التَّفْسِیْرِ کی چار صورتیں بنتی ہیں:

وهو كلّ اسم بعده فعل أو شبهه مشتغل عنه بضميره أو متعلّقه، لو سلّط عليه هو أو مناسبه لنصبه، مثل :(زيدا ضربته)، و (زيدا مررت به)، و (زيدا ضربت غلامه)، و (زيدا حبست عليه).

پہلی صورت:

ہر وہ ایسا اسم ہے کہ اس کے بعد فعل یا شبہ فعل ہو۔ اور وہ فعل اس اسم میں عمل کرنے سے اعراض کر رہا ہو اس کی ضمیر میں عمل کرنے کی وجہ سے اس حیثیت سے کہ اگر اس فعل کو اس اسم پر مقدم کر دیا جائے، مسلط کر دیا جائے تو وہ فعل اس اسم کو نصب دے جیسے زَیْدًا ضَرَبْتُہٗ کہ یہاں ضَرَبْتُہٗ اسم میں یعنی زَیْدًا میں عمل نہیں کر رہا بلکہ اس کی ضمیر میں عمل کر رہا ہے اور اگر ہم اس کو اسم پر مسلط کر دیں تو عبارت اس طرح ہو گی ضَرَبْتُ زَیْدًا ضَرَبْتُہٗ اب یہاں جو پہلا فعل ہے ضَرَبْتُ یہ مُفَسَّرْ ہے اور بعد والا فعل ضَرَبْتُہٗ یہ مُفَسِّرْ اس کی تفسیر ہے۔ اب ہم پہلے والے فعل کو جو مُفَسَّر ہے وجوباً حذف کر رہے ہیں

کیونکہ ایک ہی جملے میں مُفَسَّر اور مُفَسِّر کا اجتماع جائز نہیں ہے۔

دوسری صورت:

یا فعل کے مناسب کو اس اسم پر مسلّط کر دیا جائے جو اس اسم کو نصب دے۔ مناسب فعل کی دو صورتیں ہیں: (ا) مناسب لازم (۲) مناسب مترادف۔

مناسب مترادف سے مراد وہ فعل ہے جو فعل مذکور کے معنی میں ہو جیسے زَیْدٌ مَرَرْتُ بِہٖ اب اس مثال میں اگر ہم مررت فعل کو اسم پر مسلط کر دیں تو وہ اس کو نصب نہیں دے گا، اس لیے مررت فعل کے مناسب مترادف جاوزت کو اس پر مسلط کر دیا تو عبارت یہ بنی جاوزت زیدًا مررت بِہٖ۔

تیسری صورت:

مناسب لازم سے مراد وہ فعل ہے جو فعل مذکور کے معنی میں نہ ہو لیکن فعل مذکور کے معنی کے لیے لازم ہو جیسے زیدًا ضَرَبْتُ غلامَہٗ اب اس مثال میں ضَربت کو زَیْدًا پر مسلط نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے معنی مطلوب حاصل نہیں ہوگا اس لیے کہ ضرب والا فعل غلام زید پر واقع ہوا ہے نہ کہ زید پر لہٰذا ضَرَبَ فعل کا مناسب لازم مسلط کریں گے اور وہ اَھَنْتُ ہے کیونکہ زید کے غلام کو مارنے میں زید کی توہین ہے تقدیری عبارت یہ بنے گی:

اَھَنْتُ زَیْدًا ضَرَبْتُ غُلَامَہٗ۔

چوتھی صورت:

(زَیْدًا حُبِسْتُ عَلَیْہِ) (زید پر میں نے پابندی لگائی) یہاں "زَیْدًا" شروع میں آیا ہے۔ اس کے بعد فعل "حُبِسْتُ" (میں نے پابندی لگائی) ہے جو جار مجرور "عَلَیْہِ" (علی + ضمیر جو زید کی طرف لوٹ رہی ہے) میں مشغول ہے۔ اگر یہ جار مجرور نہ ہوتا تو فعل "حُبِسْتُ" کسی دوسرے مناسب فعل جیسے "لَابَسْتُ" (میں نے لازم پکڑا) کے ذریعے "زَیْدًا" کو منصوب کر سکتا تھا، تقدیری عبارت یہ بنے گی:

("لَابَسْتُ زَیْدًا حُبِسْتُ عَلَیْہِ")۔ پس یہاں "زَیْدًا" محذوف فعل ("لَابَسْتُ زَیْدًا") کی وجہ سے منصوب ہے۔

ما اضمر عاملہ کی باعتبار اعراب پانچ صورتیں

ویختار الرّفع بالابتداء عند عدم قرینة خلافه، أو عند وجود أقوى منها، ك(أمّا) مع غير الطّلب، و(إذا) للمفاجأة. ويختار النّصب بالعطف على جملة فعليّة للتّناسب، وبعد حرف النّفي، وحرف الاستفهام، و(إذا) الشّرطيّة، و(حيث)، وفي الأمر والنّهي، إذ هي مواقع الفعل، وعند خوف لبس المفسّر بالصّفة مثل: ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ ويستوي الأمران في مثل: (زيد قام وعمرو أكرمته)، ويجب النّصب بعد حرف الشّرط، وحرف التّحضيض، مثل: (إن زيدا ضربته ضربك) و(ألا زيدا ضربته)، وليس مثل (أزيد ذهب به؟) منه، فالرّفع لازم، وكذلك ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ﴾، ونحو ﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا﴾ الفاء بمعنى الشّرط عند المبرّد، وجملتان عند سيبويه، وإلا فالمختار النّصب.

ترجمہ: اور رفع کو ابتداء کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے جب اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ ہو، یا جب اس سے زیادہ قوی قرینہ موجود

ہو، جیسے (إمّا) غیر طلب کے ساتھ، اور (إذا) اچانک ہونے کے معنی میں۔ اور نصب کو فعلیہ جملے پر عطف کے طور پر تناسب کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے، اور حرف نفی کے بعد، اور حرف استفہام کے بعد، اور (إذا) شرطیہ کے بعد، اور (حَيْثُ) کے بعد، اور امر اور نہی میں؛ کیونکہ یہ فعل کی جگہیں ہیں، اور جب مفسر کے صفت کے ساتھ التباس کا خوف ہو جیسے: {إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ} (بے شک ہم نے ہر چیز کو اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے)۔ اور دونوں امر برابر ہیں جیسے: (زَيْدٌ قَامَ وَعَمْرًا أَكْرَمْتُهُ) (زید کھڑا ہوا اور عمرو کی میں نے تکریم کی)۔ اور نصب واجب ہے حرف شرط کے بعد، اور حرف تحضیض کے بعد، جیسے: (إِنْ زَيْدًا ضَرَبْتُهُ ضَرَبَكَ) (اگر زید کو میں نے مارا تو وہ تجھے مارے گا) اور (أَلَا زَيْدًا ضَرَبْتُهُ) (کیا زید کو میں نے مارا نہیں!)، اور (أَزَيْدٌ ذَهَبَ بِهِ؟) اس طرح نہیں ہے؛ پس رفع لازم ہے، اور اسی طرح {وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ} (اور ہر وہ چیز جو انہوں نے لکھی ہوئی کتابوں میں کی)، اور جیسے {الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا} (زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد، سو ہر ایک کو ان میں سے کوڑے مارو) مبرد کے نزدیک فاء شرط کے معنی میں ہے، اور سیبویہ کے نزدیک یہ دو جملے ہیں، ورنہ مختار نصب ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے ما اضمر عاملہ علی شریطۃ التفسیر (مشتغل عنہ) کے اعراب (رفع یا نصب) کے بارے میں مختلف صورتیں بیان فرما رہے ہیں:

۱۔ رفع کا مختار (راجح) ہونا:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اسم مشتغل عنہ کو رفع دینا دو صورتوں میں نصب دینے پر راجح ہوتا ہے:

پہلی صورت:

جب نصب کا کوئی قرینہ نہ پایا جائے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں: "ويختار الرّفع بالابتداء عند عدم قرينة خلافه"۔ یعنی جب کوئی ایسا لفظی یا معنوی قرینہ موجود نہ ہو جو نصب کو ترجیح دیتا ہو تو اس اسم کو مبتدا بنا کر رفع دینا افضل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم سے کلام کی ابتدا کرنا اصل ہے اور اسے مبتدا بنانا کسی عامل کو مقدر ماننے (جو نصب کا تقاضا کرتا ہے) سے زیادہ بہتر ہے، کیونکہ عدمِ تقدیر، تقدیر سے اولیٰ ہے۔ مثلاً: "زيدٌ ضربتُه" (زید، میں نے اسے مارا)۔ یہاں "زیدٌ" کو رفع دینا "زیداً" نصب پڑھنے سے بہتر ہے۔

دوسری صورت:

جب رفع کا قرینہ نصب کے قرینے سے زیادہ قوی ہو۔ مصنفؒ فرماتے ہیں: "أو عند وجود أقوى منها، كـ (إمّا) مع غير الطّلب، و (إذا) للمفاجأة"۔ یعنی اگرچہ نصب کا قرینہ موجود ہو لیکن رفع کا قرینہ اس سے زیادہ قوی ہو تب بھی رفع کو اختیار کیا جائے گا۔ مصنفؒ نے اس کی دو مثالیں دی ہیں:

*(إمّا):

جب اسمِ مشتغل عنہ سے پہلے "إمّا" آئے جو شرط اور جزا کے لیے ہوتا ہے، تو رفع مختار ہے۔ جیسے :"إمّا زيدٌ فأكرمْه" (بہر حال زید، تو اس کی عزت کر)۔ یہاں "إمّا" کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کلام کا پہلا جز شرط پر مشتمل ہے اور اسم کا فعل سے کوئی تعلق نہیں، للذا اسے مبتدا بنانا راجح ہے۔ مصنف نے "مع غير الطلب" کی قید اس لیے لگائی کہ اگر طلب ہو تو وہاں فعل کو مقدم کرنا ضروری ہوتا ہے جو نصب کا تقاضا کرتا ہے۔

*(إذا) المفاجاتيه :

جب اسم سے پہلے "إذا" اچانک اور ناگہانی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے آئے، تب بھی رفع مختار ہے۔ جیسے :"خرجتُ فإذا زيدٌ يضربه عمروٌ" (میں نکلا تو اچانک زید کو عمرو مار رہا تھا)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "إذا" مفاجاتیہ ہمیشہ جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے، اور جملہ اسمیہ کا پہلا جز مبتدا ہوتا ہے۔ للذا اس کے بعد آنے والے اسم کو مبتدا بنا کر رفع دینا ہی راجح ہے۔

۲. نصب کا مختار (راجح) ہونا:

پھر مصنفؒ ان مقامات کا ذکر فرماتے ہیں جہاں اسمِ مشتغل عنہ کو نصب دینا رفع دینے سے بہتر اور راجح ہے: مصنفؒ فرماتے ہیں :"ويختار النّصب بالعطف على جملة فعليّة للتّناسب، وبعد حرف النّفي، وحرف الاستفهام، و (إذا) الشّرطيّة، و (حيث)، وفي الأمر والنّهي؛ إذ هي مواقع الفعل"۔

ان تمام صورتوں میں نصب کو ترجیح دینے کی مشترکہ وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سیاق و سباق فعل کے متقاضی ہوتے ہیں، للذا اسم کو ایک مقدر فعل کے ذریعے نصب دینا کلام کے ظاہری اور معنوی ربط کو زیادہ مضبوط کرتا ہے۔

*جملہ فعلیہ پر عطف :

جب اس جملے کا عطف کسی ایسے جملے پر ہو جو فعلیہ ہے، تو مناسبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس جملے کو بھی فعلیہ (ایک فعل مقدر مان کر) بنایا جائے۔ جیسے :"قام زيدٌ وعمراً أكرمتُه" (زید کھڑا ہوا اور عمرو کی میں نے عزت کی)۔ یہاں "عمراً" کا نصب اس لیے راجح ہے تاکہ اس کا عطف "قام زيدٌ" پر درست ہو جائے۔

*حرفِ نفی کے بعد :

جیسے "ما زيداً رأيتُه"۔ چونکہ نفی اصل میں فعل پر داخل ہوتی ہے، اس لیے یہاں فعل مقدر مان کر اسم کو نصب دینا اولیٰ ہے۔

*حرفِ استفہام کے بعد :

جیسے "أزيداً ضربتَه؟" (کیا تو نے زید کو مارا؟)۔ استفہام بھی اصل میں فعل کے بارے میں ہوتا ہے، للذا یہاں بھی فعل مقدر ماننا بہتر ہے۔

*(إذا) شرطیہ اور (حیث) کے بعد :

چونکہ "إذا" شرطیہ اور "حیث" اپنے بعد فعل چاہتے ہیں، اس لیے ان کے بعد آنے والے اسم کو نصب دینا راجح ہے۔ جیسے :"إذا

زیداً لقیتہ فأکرمہ" (جب تو زید سے ملے تو اس کی عزت کر)۔

***امر و نہی میں :**

امر (حکم) اور نہی (ممانعت) بھی فعل ہی کے صیغے ہوتے ہیں۔ للذا اگر اسم مشتغل عنہ امر یا نہی کے سیاق میں آئے تو اسے نصب دینا راجح ہے۔ جیسے :"زیداً اضربہ" (زید کو مار) اور "زیداً لا تضربہ" (زید کو مت مار)۔

***لبس کا خوف :**

مصنفؒ ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں جہاں نصب راجح ہوتا ہے :"وعند خوف لبس المفسّر بالصّفة" یعنی جب اس بات کا التباس ہو کہ بعد والا جملہ، اسم کی صفت ہے یا اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ اس کی مثال قرآن کی آیت ہے :"{إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ}"۔ اگر یہاں "كلَّ" کو رفع کے ساتھ "كلٌّ" پڑھا جائے تو "خلقناه بقدر" اس کی صفت بن جائے گا، اور معنی ہوگا :"ہم، یعنی وہ ہر چیز جو ہم نے ایک اندازے سے بنائی ہے..." جو کہ صحیح معنی نہیں ہے۔ جبکہ نصب کے ساتھ پڑھنے پر "خلقنا" ایک مقدر فعل "خلقنا" کی تفسیر کرے گا اور معنی ہوگا :"بے شک ہم نے (پیدا کیا) ہر چیز کو (اور اس کی تفسیر یہ ہے کہ) ہم نے اسے ایک اندازے سے پیدا کیا"۔ یہ معنی درست ہے، للذا یہاں نصب راجح ہے۔

۳۔رفع و نصب کا برابر ہونا؛

مصنفؒ فرماتے ہیں :"ويستوي الأمران في مثل :(زيد قام وعمرو أكرمته)"۔ یعنی بعض صورتوں میں رفع اور نصب دونوں برابر ہوتے ہیں، کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر جب اس جملے کا عطف ایک ایسے جملے پر ہو جو خود جملہ اسمیہ ہے، جیسے "زيد قام وعمرو أكرمته"۔ یہاں "عمرو" سے پہلے واو عاطفہ ہے اور اس کا عطف "زيد قام" پر ہے۔ چونکہ معطوف علیہ جملہ اسمیہ ہے، اس لیے "عمرو" کو رفع دے کر اسے بھی جملہ اسمیہ بنانا جائز ہے۔ اور چونکہ "عمرو" کے بعد فعل ہے، تو اسے نصب دے کر جملہ فعلیہ بنانا بھی جائز ہے تاکہ جملے کے اندرونی اجزاء میں مناسبت پیدا ہو۔

۴۔ نصب کا واجب ہونا؛

آخر میں مصنفؒ ان صورتوں کا ذکر کرتے ہیں جہاں اسم کو نصب دینا واجب ہے اور رفع جائز نہیں:

مصنفؒ فرماتے ہیں :"ويجب النّصب بعد حرف الشّرط، وحرف التّحضيض"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حروفِ شرط (إن، لو) اور حروفِ تحضیض (جیسے ألا، هلا) اپنے معنی کے اعتبار سے خاص طور پر فعل پر ہی داخل ہوتے ہیں، ان کے بعد اسم نہیں آسکتا۔ للذا اگر ان کے بعد بظاہر کوئی اسم نظر آئے تو وہاں فعل کو مقدر ماننا واجب ہو جاتا ہے۔

***حرف شرط کے بعد :**

جیسے "إن زيداً ضربتہ ضربك"۔ یہاں "إن" شرطیہ کے بعد فعل کا آنا ضروری ہے، للذا "زيداً" ایک محذوف فعل "إن ضربتَ زيداً" کی وجہ سے منصوب ہے۔

***حرف تحضیض کے بعد :**

جیسے "ألا زيداً ضربتَه" (تو نے زید کو کیوں نہیں مارا؟)۔ یہاں بھی "ألا" فعل پر داخل ہوتا ہے، للذا فعل مقدر مانا جائے گا۔

چند مثالوں سے احتراز:

وليس مثل (أزيد ذهب به؟) منه، فالرّفع لازم، وكذلك {وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ} ونحو {الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا} الفاء بمعنى الشّرط عند المبرّد وجملتان عند سيبويه وإلا فالمختار النّصب.

پھر مصنفؒ کچھ مثالوں سے احتراز کرتے ہیں جہاں نصب واجب نہیں ہوتا

:* "أزيد ذهب به؟"

:فرمایا کہ یہ مثال اشتغال کے باب سے نہیں ہے جہاں نصب واجب ہو۔ یہاں "الہمزہ" استفہام کے لیے ہے اور اس کا تقاضا فعل نہیں ہے، بلکہ یہاں سوال "زید" کی ذات کے بارے میں ہے کہ آیا اس کے ساتھ جانے کا عمل ہوا ہے یا نہیں۔ للذا "زید" مبتدا ہے اور "ذہب بہ" اس کی خبر ہے، اور رفع لازم ہے۔

* " {وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ} " :

یہاں "كلُّ" کو رفع دینا واجب ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اور "فعلوہ" کا جملہ اس کی صفت ہے، اور "في الزبر" خبر ہے۔ اگر اسے منصوب پڑھا جائے تو معنی میں خلل واقع ہوگا۔

* " {الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا...} " :

اس آیت میں "الزانية" اور "الزاني" کو رفع پڑھا گیا ہے لیکن بظاہر بعد میں امر کا صیغہ "فاجلدوا" موجود ہے جو نصب کا تقاضا کرتا ہے۔ مصنفؒ اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں نحویوں کے دو قول ہیں :

***مبرّد کا قول :**

وہ فرماتے ہیں کہ یہاں "فاء" شرط کے معنی میں ہے، اور تقدیر عبارت یوں ہے :"إن كان هذا هو الحكم فالزانية والزاني فاجلدوا"۔ شرط کی وجہ سے یہاں نصب مختار ہونا چاہیے تھا، لیکن آیت میں رفع آیا ہے جو ایک دوسری قراءت کی طرف اشارہ ہے۔

***سیبویہ کا قول :**

وہ فرماتے ہیں کہ یہ دو الگ جملے ہیں۔ "الزانية والزاني" ایک مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے، یعنی "فيما يتلى عليكم حكمهما" (جو آگے تم پر پڑھا جارہا ہے وہ ان کا حکم ہے)۔ اور "فاجلدوا" ایک دوسرا جملہ ہے جو اس حکم کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ اس توجیہ کے مطابق رفع بالکل درست ہے۔ آخر میں مصنف اپنا مختار بیان کرتے ہیں :

"وإلا فالمختار النّصب"۔

یعنی اگر یہ توجیہات (جو مبرّد اور سیبویہ نے کی ہیں) نہ ہوتیں، تو قاعدے کے مطابق یہاں "فاء" اور "امر" کی وجہ سے نصب ہی مختار ہوتا جیسا کہ ایک قراءت شاذہ اس پر دلالت کرتی ہے۔

حزف وجوبی کا چوتھا مقام تحذیر

الرّابع :التّحذير،وهو معمول بتقدير (اتّق)، تحذيرا ممّا بعده،أو ذكر المحذّر منه مكرّرا،مثل :(إيّاك والأسد)،و(إيّاك وأن تحذف)،و(الطّريق الطّريق)،وتقول :(إيّاك من الأسد) و(من أن تحذف)،و(إيّاك أن تحذف) بتقدير (من)،ولا تقول: (إيّاك الأسد)؛لامتناع تقدير (من).

ترجمہ :چوتھا باب :تحذیر ہے، اور وہ (اسم) ہے جو (اتَّقِ) (بچو) کے مقدر ہونے کی بنا پر منصوب ہوتا ہے؛ اس چیز سے ڈرانے کے لیے جو اس کے بعد ہے، یا اس چیز کا تکرار سے ذکر جس سے ڈرایا جا رہا ہو، جیسے :(إِيَّاكَ وَالْأَسَدَ) (اپنے آپ کو شیر سے بچاؤ)، اور (إِيَّاكَ وَأَنْ تَحْذِفَ) (اپنے آپ کو حذف کرنے سے بچاؤ)، اور (الطَّرِيقَ الطَّرِيقَ) (راستہ! راستہ!)۔ اور تو کہے گا: (إِيَّاكَ مِنَ الْأَسَدِ) (اپنے آپ کو شیر سے بچاؤ) اور (مِنْ أَنْ تَحْذِفَ) (حذف کرنے سے)، اور (إِيَّاكَ أَنْ تَحْذِفَ) (اپنے آپ کو حذف کرنے سے) (مِنْ) کے مقدر ہونے کے ساتھ۔ اور تو نہیں کہے گا :(إِيَّاكَ الْأَسَدَ)؛ (مِنْ) کے مقدر ہونے سے منع ہونے کی وجہ سے۔

تشریح

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے فعل کے حزف وجوبی کے چوتھے مقام کو ذکر فرما رہے ہیں

التحذیر کی تعریف:

عربی زبان میں اَلتَّحْذِيْرُ کہتے ہیں ڈارنے کو اور مُحَذِّرُ کہتے ہیں ڈرانے والے کو اسم فاعل۔ اور مُحَذَّرُ اسم مفعول کہتے ہیں جس کو ڈرایا جائے اور مُحَذَّرُ مِنْهُ اس کو کہتے ہیں جس چیز سے ڈرایا جائے۔

اصلاحی تعریف:

صاحب کتاب نے اس کی تعریف کو ذکر فرمایا ہے اور تعریف کی دو شقیں ہیں:

پہلی شق:

التّحذير،وهو معمول بتقدير (اتّق)، تحذيرا ممّا بعده،

وہ اِتَّقِ کی تقدیر کا ایسا معمول ہے جس کو مابعد سے ڈرایا جائے جیسے اِيَّاكَ وَالْاَسَدَ بچا اپنے آپ کو شیر سے کہ کہ اصل میں یہ اِتَّقِكَ وَالْاَسَدَ تھا فعل کو حزف کر کے ضمیر منصوب متصل کو ہٹا کر ضمیر منصوب منفصل اِيَّاكَ کو ذکر کیا اسی طرح (إيّاك وأن تحذف)، ہے۔

تعریف کی دوسری شق:

أو ذكر المحذّر منه مكرّرا،

صاحب کتاب نے تعریف کی دوسری شق یہ بیان فرمائی ہے کہ محذر منہ کو مکرر ذکر کیا جائے۔

یہاں صاحب کتاب نے فرمایا اَوْ ذِكْرَ الْمُحَذَّرُمنه مُكَرَّرًا بطور تحذیر محذر منہ کو مکرر ذکر کیا جائے تنگیٔ وقت کی وجہ سے

جیسے الطَّرِیْقُ الطَّرِیْقُ کہ اصل میں یہ اتق الطَّرِیْقُ الطَّرِیْقُ تھا۔ کہ اگر ہم پورا جملہ کہیں گے تو کیا پتہ شیر اس مخاطب پر حملہ آور ہو جائے یا راستے میں جس چیز سے ڈرایا جارہا ہے اس کا نقصان پہنچ جائے اس لیے تنگیٔ وقت کی وجہ سے دونوں مثالوں میں ہم نے فعل کو بطورِ قیاس کے حذف کیا ہے باقاعدہ دلیل موجود ہے۔ تنگیٔ وقت، سماعا حذف نہیں کیا۔ جس طرح ہمارے ہاں بھی اگر سانپ نظر آجائے تو ہم بھی صرف اتنا کہتے ہیں سانپ سانپ یہ نہیں کہتے کہ سانپ سے بچو سانپ سے بچو کیونکہ تنگیٔ وقت کی بناء پر ہم فعل کو حذف کردیتے ہیں۔

(إيَاكَ) کے ساتھ حرف جر (مِن) کا استعمال :

وتقول :(إيّاك من الأسد) و (من أن تحذف)، و (إيّاك أن تحذف) بتقدير (من)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ تحذیر میں "إِيَّاكَ" کے ساتھ حرف جر "مِنْ" (سے) کا استعمال بھی جائز ہے، جیسے (إِيَّاكَ مِنَ الْأَسَدِ) اور (مِنْ أَنْ تَحْذِفَ) اور (إِيَّاكَ أَنْ تَحْذِفَ) (یہاں "أَنْ تَحْذِفَ" سے پہلے "مِنْ" مقدر مانا گیا ہے کیونکہ اسم تاویلی میں من کی تقدیر جائز ہے)۔ ان صورتوں میں بھی تقدیراً فعل "اتَّقِ" ہی محذوف ہوتا ہے۔

غلط استعمال :

ولا تقول :(إيّاك الأسد)؛ لامتناع تقدير (من).

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ (إِيَّاكَ الْأَسَدَ) کہنا درست نہیں ہے کیونکہ یہاں "إِيَّاكَ" کے بعد حرف عطف "وَ" یا حرف جر "مِنْ" موجود نہیں ہے اور "الْأَسَدَ" اسم صریح ہے یہاں "مِنْ" کا تقدیر کرنا جائز نہیں ہے۔ تحذیر کے لیے ان مخصوص تراکیب کا استعمال ضروری ہے۔

تیسرا منصوب مفعول فیہ

المفعول فيه :هو ما فعل فيه فعل مذكور من زمان أو مكان، وشرط نصبه تقدير (في). وظروف الزّمان كلّها تقبل ذلك، وظرف المكان إن كان مبهما قبل ذلك، وإلّا فلا. وفسّر المبهم بالجهات السّتّ، وحمل عليه (عند) و (لدى) وشبههما لإبهامها، ولفظ (مكان) لكثرته، وما بعد (دخلت) نحو (دخلت الدّار) في الأصحّ. وينصب بعامل مضمر وعلى شريطة التّفسير.

ترجمہ :مفعول فیہ :وہ (اسم) ہے جس میں کوئی مذکورہ فعل واقع ہو، زمانے سے ہو یا جگہ سے، اور اس کے نصب کی شرط (فی) (میں) کا مقدر ہونا ہے۔ اور تمام ظروف زمان یہ قبول کرتے ہیں، اور ظرف مکان اگر مبہم ہو تو یہ قبول کرتا ہے، ورنہ نہیں۔ اور مبہم کی تفسیر چھ جہتیں ہیں، اور اس پر (عِنْدَ) (پاس) اور (لَدَى) (نزدیک) اور ان جیسے دوسرے کو ان کے مبہم ہونے کی وجہ سے محمول کیا گیا ہے، اور لفظ (مَكَانَ) (جگہ) اپنی کثرت کی وجہ سے، اور (دَخَلْتُ) کے بعد والا جیسے (دَخَلْتُ الدَّارَ) (میں گھر میں داخل ہوا) اصح قول کے مطابق۔ اور وہ عامل مضمر کی وجہ سے اور شرط تفسیر کے تحت منصوب ہوتا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منصوبات کی اقسام میں سے مفعول فیہ کا بیان فرمارہے ہیں۔ مفعول فیہ اس اسم کو کہتے ہیں جو کسی فعل کے واقع ہونے کا وقت (ظرف زمان) یا جگہ (ظرف مکان) بتائے۔

مفعول فیہ کی تعریف:

المفعول فیہ :**هو ما فعل فيه فعل مذكور من زمان أو مكان،** الخ... کہ مفعول فیہ وہ ایسا اسم ہے کہ جس میں فعل مذکور کیا گیا ہو اور اس کو ظرف کہتے ہیں۔ یعنی جو اسم فعل کے وقت یا جگہ کو بیان کرے اس کو مفعول فیہ کہتے ہیں اور تعریف میں صاحب کتاب نے ھُوَما فرمایا۔ یہ جنس ہے اس میں تمام اسما داخل تھے پھر آگے **فعل فيه فعل مذكور** فرما کر مفعول فیہ کے سوا تمام مفاعیل کو خارج کر دیا۔ مِنَ الزَّمَانِ وَالْمَكَانِ فصل ہے۔

ظرف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ظرف زمان (۲) ظرف مکان

پھر ان میں سے ہر ایک کی دو ۲ دو ۲ قسمیں ہیں : مبہم اور محدود۔

(۱) ظرف زمان مبہم (۲) ظرف زمان محدود۔ (۳) ظرف مکان مبہم۔ (۴) ظرف مکان محدود۔

ظرف زمان مبہم کی تعریف:

جس کی حد متعین نہ ہو وہ ہے ظرف زمان مبہم جیسے دَهْرٍ زمانہ اور حِيْنٍ وقت کہ ان کی کوئی حد معین نہیں۔

ظرف زمان محدود کی تعریف:

ظرف زمان محدود وہ ہے کہ اس کی کوئی حد متعین ہو جیسے يَوْمٍ اور لَيْلَةٍ اور شَهْرٍ اور سَنَةٍ وغیرہ کہ دن، رات، مہینہ اور سال ان سب کی ایک حد معین ہے۔

ظروف مکان کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ظروف مکان مبہم:

جس کے لیے کوئی حد معین نہ ہو جیسے جَلَسْتُ خَلْفَكَ وَأَمَامَكَ کہ یہاں آگے، سامنے اور پیچھے ہونے کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

ظرف مکان محدود:

جس کے لیے کوئی حد معین ہو جیسے جَلَسْتُ فِي الدَّارِ وَفِي السُّوْقِ وَفِي الْمَسْجِدِ کہ یہاں گھر، بازار اور مسجد کی حد معین ہے۔

مفعول فیہ کا اعراب:

وشرط نصبه تقدير (في) الخ... یہاں سے صاحبِ کتاب مفعول فیہ کے اعراب کو بیان فرمارہے ہیں کہ شروع کی جو تین قسمیں ہیں ان میں فِی مقدر ہوتا ہے۔ یعنی ظرف زمان مبہم، ظرف زمان محدود اور ظرف مکان مبہم۔ ان تینوں قسموں میں

فی محذوف ہوتا ہے اور سب کی مثالیں یہ ہیں:

ظرف زمان مبہم کی مثال :اور محدود کی مثال:

صُمْتُ دَهْرًا اصل عبارت یعنی صُمْتُ فِيْ دَهْرٍ اور سَافَرْتُ شَهْرًا یعنی سَافَرْتُ فِيْ شَهْرٍ۔ کہ فی مقدر ہے لفظوں میں موجود نہیں ہے۔

ظرف مکان مبہم کی مثال:

جَلَسْتُ خَلْفَکَ وَاَمَامَکَ یعنی جَلَسْتُ فِيْ خَلْفِکَ وَ فِيْ اَمَامِکَ یہاں فی لفظوں میں موجود نہیں بلکہ مقدر ہے۔

ظرف مکان محدود میں نحویوں کا اختلاف ہے:

وشرط نصبه تقدير (في). وظروف الزّمان كلّها تقبل ذلك، وظرف المكان إن كان مبهما قبل ذلك، وإلاّ فلا.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مفعول فیہ کے منصوب ہونے کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس میں حرفِ جر "فِيْ" پوشیدہ طور پر موجود مانا جا سکے۔ یعنی اگر آپ اس اسم سے پہلے "فِيْ" لگا دیں تو معنی درست رہے۔ مثلاً "صُمْتُ فِيْ يَوْمِ الْخَمِيْسِ"۔ اگر "فِيْ" کو ظاہر کر دیا جائے تو اسم مجرور ہو جائے گا، لیکن اگر اسے مقدر (پوشیدہ) مانا جائے تو اسم بطورِ مفعول فیہ منصوب ہوگا۔

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جہاں فی لفظاً مذکور ہو گا وہ مفعول فیہ نہیں بلکہ مفعول بہ بنے گا اور بعض حضرات کے نزدیک مفعول فیہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱)...فی لفظوں میں موجود ہو۔ (۲)... مقدر ہو موجود نہ ہو لفظوں میں۔ اس کی تفصیل ان شآء اللہ شرح جامی میں آجائے گی۔

عند، لدی، مکان

وحمل عليه (عند) و (لدى) وشبههما لإبهامهما، ولفظ (مكان) لكثرته

مصنفؒ نے مبہم کی وضاحت چھ جہات (آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں) سے کی ہے۔ اور ان پر لفظ "عِنْدَ" اور "لَدَی" اور ان جیسے دوسرے ظروف کو بھی محمول کیا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ایک معین جگہ کی طرف واضح اشارہ نہیں کرتے۔ نیز لفظ "مَكَانَ" (جگہ) کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ یہ کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور کسی خاص جگہ کی تعیین نہیں کرتا۔

مخصوص صورتیں (مستثنیات):

،وما بعد (دخلت) نحو (دخلت الدّار) في الأصحّ.

مصنفؒ ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہیں کہ بعض افعال کے بعد ظرفِ مکانِ محدود بھی مفعول فیہ بن جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "دَخَلْتُ" (میں داخل ہوا) جیسے افعال کے بعد آنے والا اسم مکان، اصح قول کے مطابق، مفعول فیہ ہوتا ہے۔ جیسے "دَخَلْتُ الدَّارَ" (میں گھر میں داخل ہوا)۔ اگرچہ "الدار" ایک محدود مکان ہے، لیکن فعل "دخول" اپنے معنی کے لحاظ سے ہی کسی مکان "میں" جانے پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا یہاں "فِيْ" کا معنی شدت سے موجود ہے اور اسے مقدر مان کر "الدار" کو منصوب پڑھا جاتا ہے۔

عامل نصب:

وینصب بعامل مضمر وعلی شریطة التّفسیر۔

آخر میں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مفعول فیہ کا عامل (منصوب کرنے والا فعل) کبھی مضمر (پوشیدہ) بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے کوئی پوچھے "مَتَی السَّفَرُ؟" (سفر کب ہے؟) تو جواب میں کہا جائے "یَومَ الْجُمُعَۃِ"۔ یہاں "یَومَ" ایک پوشیدہ فعل "اُسَافِرُ" کی وجہ سے منصوب ہے۔اور کبھی یہ "شریطۃ التفسیر" کی بناپر منصوب ہوتا ہے، جو کہ علمِ نحو میں "باب مااضمر عاملہ" کا ایک قاعدہ ہے۔ جیسے "یَوْمَ الْجُمُعَۃِ صُمْتُ فِیْہِ"۔ یہاں "یَوْمَ" کو بعد والے فعل "صُمْتُ" نے نصب نہیں دیا کیونکہ وہ "فِیْہِ" کی ضمیر میں مشغول ہے، بلکہ ایک مقدر فعل "صُمْتُ" نے نصب دیا ہے جو اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ تقدیرِ عبارت یوں ہے "صُمْتُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ صُمْتُ فِیْہِ"۔

چوتھا منصوب مفعول لہٗ

المفعول له :هو ما فعل لأجله فعل مذكور مثل :(ضربته تأديبا)،و (قعدت [عن الحرب] جبنا)، خلافا للزّجّاج فإنّه عنده مصدر، وشرط نصبه تقدير اللاّم، وإنّما يجوز حذفها إذا كان فعلا لفاعل الفعل المعلّل، ومقارنا له في الوجود.

ترجمہ؛ مفعول لہ :وہ (اسم) ہے جس کے لیے کوئی مذکورہ فعل کیا جائے، جیسے :(ضَرَبْتُهُ تَأْدِيبًا) (میں نے اسے ادب سکھانے کے لیے مارا)، اور (قَعَدْتُ [عَنِ الْحَرْبِ] جُبْنًا) (میں جنگ سے ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا)، زجاج کے برعکس؛ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مصدر ہے۔اور اس کے نصب کی شرط لام کا مقدر ہونا ہے، اور اس کا حذف صرف اس وقت جائز ہے جب وہ فعل معلل کے فاعل کا فعل ہو، اور وجود میں اس کے ساتھ ہو۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منصوبات کی ایک اور قسم مفعول لہ کا بیان فرمارہے ہیں۔

مفعول لہٗ کی تعریف:

المفعول له :هو ما فعل لأجله فعل مذكور مثل :(ضربته تأديبا)،و (قعدت [عن الحرب] جبنا)،

مفعولہٗ وہ ایسا اسم ہے جس کے حصول کے لیے یا جس کے سبب وجود کے لیے فعل مذکور کیا گیا ہو جیسے :

ضَرَبْتُهٗ تَأْدِيْبًا اَیْ لِلتَّادِيْبِ۔

میں نے اس کو مارا ادب سکھانے کے لیے۔

یہ حصول فعل کی مثال ہے کہ ضَرَبَ کا فعل حصول ادب کے لیے واقع ہوا ہے۔

اور دوسری مثال جیسے :

قَعَدْتُ عَنِ الْحَرْبِ جُبْنًا

کہ میں بزدلی کی وجہ سے لڑائی سے (پیچھے ہٹ کر) بیٹھ گیا۔

یہ فعل کے وجود کی مثال ہے کہ یہاں جُبْنُ بزدلی پائی گئی اسی وجہ سے فعل مذکور قَعَدْتُ واقع ہوا ہے۔

فوائد و قیود:

مفعول لہٗ کی تعریف میں صاحب کتاب نے هُوَ مافرمایا یہ بمنزلہ جنس کے ہے کہ تمام اسما اس میں شامل ہیں مَالِاَجْلِهٖ یہ فصل ہے اس کے ذریعے مفعول لہٗ کے سوا تمام مفاعیل بھی خارج ہو گئے کیونکہ جس کے لیے فعل واقع ہوا ہو وہ صرف مفعول لہٗ ہی ہے۔

تعریف میں فعل مذکور کے اندر جو فعل ہے اس سے مراد فعل حدثی ہے جو معنی فعل کے معنی پر دلالت کرے اس سے مراد وہ فعل نہیں ہے جو اصطلاحی فعل ہے اسم اور حرف کے مقابلے میں جو ذکر کیا جاتا ہے وہ مراد نہیں بلکہ فعل حدثی مراد ہے نا کہ فعل اصطلاحی۔

مفعول لہٗ کے مصدر اور مفعول لہٗ ہونے میں اختلاف:

خلافا للزّجّاج فإنّه عنده مصدر،

یہاں سے صاحب کتاب نے امام زجاج اور جمہور نحویین کے درمیان اختلاف کو ذکر فرمایا ہے۔

امام زجاج کا قول:

امام زجاج کے نزدیک مفعول لہٗ مصدر ہے الگ سے مستقل مفعول نہیں ہے جیسے ضَرَبْتُهٗ تَأْدِيْبًا اَیْ اَدَّبْتُهٗ بِالضَّرْبِ تَأْدِيْبًا ۔اور دوسری مثال میں جیسے قَعَدْتُ عَنِ الْحَرْبِ جُبْنًا اَیْ جَبَنْتُ بِالْقُعُوْدِ عَنِ الْحَرْبِ جُبْنًا۔امام زجاج کے نزدیک یہ مفعول مطلق ہے من غیر لفظہ۔ مغایرت فی المادہ۔

جمہور کا قول:

جمہور کے نزدیک مفعول لہٗ الگ سے مستقل مفعول ہے مصدر نہیں ہے۔ مفعول مطلق کا حصہ نہیں بلکہ الگ سے مستقل مفعول لہٗ ہے۔

نصب کی شرائط:

وشرط نصبه تقدير اللاّم،

مصنفؒ کے نزدیک مفعول لہ کے منصوب ہونے کے لیے چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے :

***لامِ تعلیل کا مقدر ہونا :**

اس کے نصب کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے سبب بیان کرنے والا حرفِ جر "لام" (لِ) مقدر ہو۔ مثلاً "ضَرَبْتُهٗ لِتَأْدِيْبٍ"۔ اگر لام مذکور ہو تو اسم مجرور ہوگا، اور اگر مقدر ہو تو منصوب۔

***لام کو حذف کرنے کی شرائط :**

وإنّما يجوز حذفها إذا كان فعلا لفاعل الفعل المعلّل، ومقارنا له في الوجود.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس لام کو حذف کرکے اسم کو منصوب پڑھنا صرف تب جائز ہے جب دو مزید شرطیں پائی جائیں :

***اتحادِ فاعل (فاعل کا ایک ہونا) :**

یعنی اصل فعل کا فاعل اور سبب بننے والے مصدر کا فاعل ایک ہی شخص ہو۔ مثال "قَعَدْتُ جُبْنًا" میں "بیٹھنے والا" بھی "میں" ہوں اور "بزدل" بھی "میں" ہوں۔ اگر فاعل مختلف ہوں تو لام کا ذکر ضروری ہے، جیسے :"جِئْتُکَ لِحُبِّکَ إِیَّایَ" (میں تمہارے پاس آیا تمہاری مجھ سے محبت کی وجہ سے)۔ یہاں "آنے والا" میں ہوں اور "محبت کرنے والے" تم ہو۔ فاعل مختلف ہونے کی وجہ سے "لِحُبِّکَ" کہا گیا، "حُبَّکَ" منصوب نہیں پڑھا گیا۔

***اتحادِ زمان (زمانے کا ایک ہونا) :**

یعنی فعل اور اس کا سبب ایک ہی وقت میں پائے جائیں۔ "قَعَدْتُ جُبْنًا" میں "بیٹھنے" کا عمل اور "بزدلی" کی کیفیت ایک ہی وقت میں موجود ہے۔ اگر سبب کا زمانہ فعل کے زمانے سے مختلف ہو تو لام ذکر کرنا ضروری ہے، جیسے :"تَأَهَّبْتُ لِلسَّفَرِ" (میں نے سفر کے لیے تیاری کی)۔ یہاں "تیاری" پہلے ہے اور "سفر" بعد میں ہوگا، لہٰذا "لِلسَّفَرِ" کہا گیا۔

پانچواں منصوب مفعول معه

المفعول معه :هو المذكور بعد الواو لمصاحبة معمول فعل لفظا أو معنى، فإن كان الفعل لفظا، وجاز العطف، فالوجهان مثل :(جئت أنا وزيد-وزيدا)، وإن لم يجز العطف تعيّن النصب مثل :(جئت وزيدا)، وإن كان الفعل معنى، وجاز العطف تعيّن العطف، مثل :(ما لزيد وعمرو؟)، وإلاّ تعيّن النّصب مثل :(ما لك وزيدا؟)، و(ما شأنك وعمرا؟)؛ لأنّ المعنى :ما تصنع؟

ترجمہ :مفعول معه :وہ (اسم) ہے جو واو کے بعد مصاحبت کے لیے مذکور ہو کسی فعل کے معمول کا، لفظاً یا معناً، پس اگر فعل لفظاً ہو، اور عطف جائز ہو، تو دونوں صورتیں جائز ہیں جیسے :(جِئْتُ أَنَا وَزَيْدٌ-وَزَيْدًا) (میں اور زید آئے - اور زید کو)، اور اگر عطف جائز نہ ہو تو نصب متعین ہے جیسے :(جِئْتُ وَزَيْدًا) (میں زید کے ساتھ آیا)۔اور اگر فعل معنیً میں ہو، اور عطف جائز ہو تو عطف متعین ہے جیسے :(مَا لِزَيْدٍ وَعَمْرٍو؟) (زید اور عمرو کو کیا ہوا؟)، اور ورنہ نصب متعین ہے جیسے :(مَا لَكَ وَزَيْدًا؟) (تمہیں زید سے کیا کام؟)۔اور (مَا شَأْنُكَ وَعَمْرًا؟) (تیرا اور عمرو کا کیا حال ہے؟)؛ کیونکہ معنی ہے :تو کیا کر رہا ہے؟

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منصوبات کی قسم مفعول معه کا بیان فرما رہے ہیں۔

مفعول معہٗ کی تعریف:

المفعول معه :هو المذكور بعد الواو لمصاحبة معمول فعل لفظا أو معنى

مفعول معہٗ وہ اسم ہے جو ایسی واو کے بعد ذکر کیا جائے جو مَعَ کے معنی میں ہو بوجہ فعل کے معمول کی مصاحبت کے؛

جیسے جَاءَ الْبَرْدُ وَالْجُبَّاتِ سردی آئی جُبوں کے ساتھ اور جِئْتُ أَنَا وَزَيْدًا میں آیا زید کے ساتھ۔اَیْ مَعَ الْجُبَّاتِ وَمَعَ

زَیْدٍ یعنی مع جُبّوں کے اور مَعَ زید کے۔

یہاں دونوں مثالوں میں واؤ مَعَ کے معنی میں ہے پہلی مثال میں اَلْجُبَاتِ اور دوسری مثال میں زَیْدً مفعول معہ ہیں کیونکہ یہ دونوں اسم ایسے واؤ کے بعد مذکور ہیں جو مَعَ کے معنی ہے اور معمول فعل کا مصاحب ہیں۔ الجبات یہ معمول ہے جَاءت فعل کا اور زَیْدٌ مصاحب ہے جِئْتُ فعل کا۔

عامل لفظی و معنوی؛

اس کا عامل فعل کبھی لفظاً مذکور ہوتا ہے (جیسے جِئْتُ) اور کبھی معنیً سمجھا جاتا ہے (جیسے مَالكَ ای ما تصنع؟)۔

احکام اور صورتیں:

،فإن كان الفعل لفظا، وجاز العطف، فالوجهان مثل :(جئت أنا وزيد-وزيدا)، وإن لم يجز العطف تعيّن النصب مثل: (جئت وزيدا). وإن كان الفعل معنى، وجاز العطف تعيّن العطف، مثل :(ما لزيد وعمرو؟)، وإلاّ تعيّن النّصب مثل :(ما لك وزيدا؟). و (ما شأنك وعمرا؟)؛ لأنّ المعنى :ما تصنع؟

مصنفؒ نے نہایت خوبصورت ترتیب سے اس کے چار احکام بیان فرمائے ہیں:

۱۔جب فعل لفظوں میں ہو اور عطف بھی جائز ہو:

اس صورت میں واو کے بعد والے اسم کو مرفوع (بطورِ عطف) اور منصوب (بطورِ مفعول معہ) دونوں طرح پڑھنا جائز ہے، لیکن دونوں کے معنی میں باریک سا فرق ہوگا۔ مثال :"جِئْتُ أَنَا وَ زَيْدٌ / وَ زَيْدًا"

***وَزَیْدٌ (رفع) :**

یہاں واو عاطفہ ہے اور "زید" کا عطف ضمیر "أنا" پر ہے۔ معنی :"میں اور زید آئے"۔ (شرکت فی الفعل)

***وَزَیْدًا (نصب) :**

یہاں واو بمعنی "مع" ہے اور "زیدًا" مفعول معہ ہے۔ معنی :"میں زید کے ساتھ آیا"۔ (مصاحبت)۔ یہاں "أنا" تاکید کے لیے لایا گیا تاکہ عطف جائز ہو سکے۔

۲۔جب فعل لفظوں میں ہو لیکن عطف جائز نہ ہو:

اس صورت میں واو کے بعد والے اسم کو صرف مفعول معہ بنا کر منصوب پڑھنا واجب ہے۔ مثال :"جِئْتُ وَ زَيْدًا" یہاں "زید" کا عطف "جئت" کی مستتر (پوشیدہ) ضمیر "أنا" پر براہِ راست نہیں ہو سکتا کیونکہ نحوی قاعدہ ہے کہ ضمیر متصل یا مستتر پر عطف کرنے کے لیے پہلے ضمیر منفصل سے اس کی تاکید لانا ضروری ہے۔ چونکہ یہاں تاکید (أنا) نہیں، اس لیے عطف جائز نہیں، لہٰذا صرف نصب ہی متعین ہے۔

۳۔جب فعل معنیً ہو اور عطف جائز ہو:

کہ اگر فعل معنًا ہو لفظًا نہ ہو اور عطف جائز ہو تو عطف متعین ہے جیسے :"مَالِزَيْدٍ وَ عَمْرٍو"

وجہ اس کی یہی ہے کہ عامل معنوی اور عامل لفظی میں سے عامل لفظی جو کہ "حرف جارہ" ہے یہ عمل میں قوی ہے کیونکہ یہ عامل لفظی ہے اور فعل لفظی نہیں معنوی ہے لہٰذا عطف متعین ہے نصب جائز نہیں۔

۴۔جب فعل معنیً ہو اور عطف جائز نہ ہو:

اس صورت میں اسم کو مفعول معہ بنا کر منصوب پڑھنا واجب ہے۔مثال :"مَا لَکَ وَ زَیْدًا؟" (تمہیں زید سے کیا کام؟) یہاں "زید" کا عطف ضمیر مجرور "کَ" پر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ حرفِ جر "لام" کو دوبارہ نہ لایا جائے (یعنی مَا لَکَ وَلِعَمْرٍو)۔ چونکہ ایسا نہیں ہے، اس لیے عطف ممنوع ہے اور نصب بطورِ مفعول معہ واجب ہے۔ مصنفؒ اس کی معنوی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں معنیٰ ہے "مَا تَصْنَعُ مَعَ زَیْدٍ؟" (تم زید کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟)۔ یہ پوشیدہ فعل "تَصْنَعُ" ہی ہے جو "زیدًا" کو بطورِ مفعول معہ نصب دے رہا ہے۔اسی طرح "مَا شَأْنُکَ وَ عَمْرًا؟" کا بھی یہی حکم ہے۔

چھٹا منصوب حال

الحال :ما يبيّن هيئة الفاعل أو المفعول به لفظاً أو معنى، نحو :(ضربت زيداً قائماً)، و(زيد في الدّار قائماً)، و(هذا زيد قائماً). وعاملها الفعل، أو شبهه، أو معناه. وشرطها أن تكون نكرة وصاحبها معرفة غالباً. وأرسلها العراك....... و (مررت به وحده) ونحوه متأوّل. و (مررت به وحده) ونحوه متأوّل.

ترجمہ :الحال :وہ (اسم) جو فاعل یا مفعول بہ کی حالت کو بیان کرے لفظاً یا معناً، جیسے :(ضَرَبْتُ زَیْدًا قَائِمًا) (میں نے زید کو کھڑے ہوئے مارا)، اور (زَیْدٌ فِي الدَّارِ قَائِمًا) (زید گھر میں کھڑے ہوئے ہے)، اور (هٰذَا زَیْدٌ قَائِمًا) (یہ زید ہے کھڑا ہوا)۔ اور اس کا عامل فعل ہے، یا اس کا مشابہ، یا اس کا معنیٰ۔ اور اس کی شرط یہ ہے کہ وہ نکرہ ہو اور اس کا صاحب غالباً معرفہ ہو۔ اور اس نے اسے لڑائی میں بھیجا۔ . . .. اور (مَرَرْتُ بِهٖ وَحْدَهٗ) (میں اس کے پاس سے اکیلا گزرا) اور اس جیسی مثالیں متأوّل ہیں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، منصوبات کی اقسام میں سے حال کا بیان فرما رہے ہیں۔

حال کی تعریف:

قوله :(الحَالُ :مَا يُبَيِّنُ هَيْئَةَ الْفَاعِلِ أَوِ الْمَفْعُولِ بِهٖ...)

مصنفؒ یہاں سے حال کی تعریف فرما رہے ہیں :

حال لغت میں کسی چیز کی کیفیت اور حالت کو کہتے ہیں، اور نحویوں کی اصطلاح میں وہ اسم منصوب ہے جو فاعل یا مفعول بہ کی ہیئت یعنی حالت کو بیان کرنے کے لیے لایا جائے۔

فوائد و قیود:

مصنف کا قول "ما يبين" (جو بیان کرے) جنس ہے جو تمام بیان کرنے والی چیزوں کو شامل ہے، اور "هيئة الفاعل أو

المفعول به" (فاعل یا مفعول بہ کی حالت) کہہ کر باقی منصوبات مثلاً تمیز وغیرہ کو تعریف سے خارج کر دیا جو ذات کی ابہام کو دور کرتی ہے نہ کہ ہیئت کو۔

لفظاً أو معنی :

مصنفؒ کا یہ قول اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صاحبِ حال (یعنی فاعل یا مفعول بہ) کا کلام میں لفظی طور پر موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ معنوی طور پر موجود ہونا بھی کافی ہے۔

*فاعل لفظی :

(ضَرَبْتُ زَيْدًا قَائِمًا) میں "قائماً" حال ہے "تُ" ضمیر فاعل سے جو کہ لفظوں میں موجود ہے۔

*مفعول بہ لفظی :

اسی مثال میں "قائماً" کو اگر زید سے حال مانا جائے تو یہ مفعول بہ سے حال ہے جو کہ لفظ "زیداً" ہے۔

*فاعل معنوی :

(زَيْدٌ فِي الدَّارِ قَائِمًا) میں "قائماً" زید سے حال ہے جو کہ مبتدا ہے۔ یہاں "في الدار" خبر ہے جو ایک فعل "استقر" یا "ثبت" کے متعلق ہے۔ تو اصل عبارت (زید استقر في الدار) ہے، اور "قائماً" اس "استقر" فعل کے فاعل (جو ضمیر مستتر ہے اور زید کی طرف لوٹ رہی ہے) سے حال ہے۔ لہٰذا صاحبِ حال (ذوالحال) یہاں معنوی طور پر فاعل ہے۔

*مفعول بہ معنوی :

(هَذَا زَيْدٌ قَائِمًا) میں "قائماً" زید سے حال ہے۔ یہاں عامل اسم اشارہ "هذا" ہے جو "أنبه" فعل کے معنی میں ہے۔ گویا اصل عبارت (أنبه زيداً حال كونه قائماً) ہے "میں زید کی طرف کھڑے ہونے کی حالت میں اشارہ کرتا ہوں"۔ اس تقدیر پر "زید" مفعول بہ ہے اور "قائماً" اس سے حال ہے۔ پس صاحبِ حال معنوی طور پر مفعول بہ ہے۔

حال کا عامل؛

قوله :(وَعَامِلُهَا الْفِعْلُ أَوْشِبْهُهُ أَوْمَعْنَاهُ)

مصنفؒ یہاں حال میں عمل کرنے والے (یعنی اسے نصب دینے والے) عوامل کو بیان فرمارہے ہیں :

*الفعل :

حال کا اصل عامل فعل ہی ہے، جیسے (جَاءَ زَيْدٌ رَاكِبًا) میں "راکباً" کو "جاء" فعل نے نصب دیا ہے۔

*شبہ الفعل :

اس سے مراد وہ اسماء ہیں جو فعل کا عمل کرتے ہیں، جیسے اسم فاعل (هذا زيدٌ ضاربٌ عمرًا راكبًا)، اسم مفعول (مررت برجل مضروبٍ راكبًا)، اور صفتِ مشبہ (مررت برجلٍ حسنٍ ضاحكًا)۔ ان تمام مثالوں میں حال کو ان مشتقات نے نصب دیا ہے جو فعل کے مشابہ ہیں۔

*معنی الفعل :

اس سے مراد وہ الفاظ ہیں جن میں فعل کا معنی تو پایا جاتا ہے لیکن وہ فعل کی طرح عمل نہیں کرتے، مگر حال کو نصب دے سکتے ہیں۔ جیسے اسماءِ اشارہ (هذا زيدٌ قائماً)، حروفِ تشبیہ (كأن زيدًا أسدٌ صائلًا)، حروفِ تمنی و ترجی (ليت زيدًا أميرٌ عادلًا)، اور ظرف و جار و مجرور جب وہ خبر واقع ہوں (زيد عندك جالسًا، زيد في الدار قائمًا)۔ ان سب میں چونکہ اشارہ کرنے، تشبیہ دینے، تمنا کرنے اور استقرار کا معنی پایا جاتا ہے، اس لیے یہ حال کو نصب دیتے ہیں۔

فائدہ:

واضح رہے کہ شبہ فعل پانچ ہیں۔

(۱)۔ فاعل۔ (۲)۔ مفعول۔ (۳)۔ صفت مشبہ۔ (۴)۔ اسم تفضیل۔ (۵) مصدر۔

اور معنی فعل چھ (۶) ہیں۔

(۱)۔ حروف نداء۔ (۲)۔ حروف تنبیہ۔ (۳)۔ اسمائے اشارہ۔ (۴)۔ تمنی۔ (۵) ترجی۔ (۶)۔ حروف تشبیہ۔

حال اور صاحبِ حال (ذوالحال) کے لیے غالب شرط

قوله :(وَشَرْطُهَا أَنْ تَكُونَ نَكِرَةً وَصَاحِبُهَا مَعْرِفَةً غَالِبًا)

مصنفؒ یہاں حال اور صاحبِ حال کے لیے غالب شرط بیان فرمارہے ہیں :

حال کی اصل یہ ہے کہ وہ نکرہ ہو کیونکہ ہیئت (کیفیت) میں ابہام ہوتا ہے اور نکرہ بھی مبہم ہوتا ہے، لہٰذا مناسبت قائم ہو گئی۔ اور صاحبِ حال کی اصل یہ ہے کہ وہ معرفہ ہو کیونکہ حالت بیان کرنے سے پہلے اس ذات کا متعین اور معروف ہونا ضروری ہے جس کی حالت بیان کی جارہی ہے، ورنہ کلام میں فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ مصنف کا قول "غالبًا" (اکثر) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ یعنی حال معرفہ بھی آسکتا ہے اور صاحبِ حال نکرہ بھی۔

غالب شرط کی خلاف ورزی کی مثالیں؛

قوله :(وَ(أَرْسَلَهَا الْعِرَاكَ) وَ(مَرَرْتُ بِهِ وَحْدَهُ) وَنَحْوُهُ مُتَأَوَّلٌ)

مصنفؒ یہاں اس غالب شرط کی خلاف ورزی کی مثالیں اور ان کی توجیہ بیان فرمارہے ہیں: یہاں دو مثالیں ہیں جہاں حال بظاہر معرفہ آیا ہے۔

*أرسلها العراك :

یہ ایک شعر کا ٹکڑا ہے جس کا مطلب ہے "اس (جنگلی گدھے) نے اپنی اٹنیوں (گدھیوں) کو باہم دھکم پیل اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے کی حالت میں (پانی پر) چھوڑ دیا،"۔ یہاں "العراك" بظاہر معرفہ ہے کیونکہ اس پر الف لام ہے، اور یہ حال واقع ہوا ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ "مُتَأَوَّلٌ" ہے یعنی اس کی تاویل کی جائے گی۔ تاویل یہ ہے کہ "العراك" یہاں مصدر ہے بمعنی "معتركة" جو کہ اسم فاعل ہے اور نکرہ کے حکم میں ہے۔ گویا یہ لفظاً معرفہ اور معناً نکرہ ہے۔

*مررت بہ وحدہ :

"میں اس کے پاس سے گزرا جبکہ وہ اکیلا تھا"۔ یہاں "وحدَہ" حال ہے جو ضمیر کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے معرفہ ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ "وحدہ" ہمیشہ حالیت پر ہی دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد "منفرداً" (اکیلا) ہوتا ہے جو کہ نکرہ ہے۔ گویا اس لفظ کو اس کے معنیٰ (نکرہ) پر محمول کیا گیا ہے نہ کہ اس کے لفظ (معرفہ) پر۔

ذوالحال کے نکرہ ہونے کی صورت کا حکم

فإن كان صاحبها نكرة وجب تقديمها .ولا يتقدّم على العامل المعنويّ بخلاف الظّرف، ولا على المجرور في الأصحّ .وكل ما دلّ على هيئة صحّ أن يقع حالا، مثل :(هذا بسرا أطيب منه رطبا).

ترجمہ؛ پس اگر اس کا صاحب نکرہ ہو تو اس کا مقدم ہونا واجب ہے۔ اور وہ عامل معنوی پر مقدم نہیں ہوتا، برخلاف ظرف کے، اور نہ مجرور پر اصح قول کے مطابق۔ اور ہر وہ چیز جو حالت پر دلالت کرے وہ حال واقع ہو سکتی ہے، جیسے :(هٰذَا بُسْرًا أَطْيَبُ مِنْهُ رُطَبًا) (یہ کچا کھجور اس سے زیادہ میٹھا ہے پکا ہوا ہونے کی حالت میں)۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، حال کی مزید تفصیلات بیان فرما رہے ہیں:

قوله :(فَإِنْ كَانَ صَاحِبُهَا نَكِرَةً وَجَبَ تَقْدِيمُهَا)

مصنفؒ یہاں صاحبِ حال کے نکرہ ہونے کی صورت کا حکم بیان فرما رہے ہیں:

قاعدہ یہ ہے کہ اگر صاحبِ حال نکرہ ہو تو پھر حال کو اس پر مقدم کرنا واجب ہے تاکہ نکرہ کی صفت کے ساتھ التباس نہ ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ کہیں (جاء رجلٌ راکبًا) "ایک سوار آدمی آیا"، تو یہاں "راکبًا" کو "رجل" کی صفت بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس التباس سے بچنے کے لیے حال کو مقدم کر کے یوں کہا جائے گا :(جاء راکبًا رجلٌ) "سوار ہونے کی حالت میں ایک آدمی آیا"۔ اب "راکبًا" کا حال ہونا متعین ہو گیا ہے۔

حال کے اپنے عامل پر مقدم ہونے کے بعض مسائل

قوله :(وَلَا يَتَقَدَّمُ عَلَى الْعَامِلِ الْمَعْنَوِيِّ بِخِلَافِ الظَّرْفِ، وَلَا عَلَى الْمَجْرُورِ فِي الْأَصَحِّ)

مصنفؒ یہاں حال کے اپنے عامل پر مقدم ہونے کے بعض مسائل بیان فرما رہے ہیں :

*ولا یتقدم علی العامل المعنوی :

حال اپنے عاملِ معنوی (جیسے اسمِ اشارہ، حرفِ تشبیہ وغیرہ) پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ "قائماً هذا زيدٌ" نہیں کہہ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عاملِ معنوی کا عمل ضعیف ہوتا ہے، وہ اپنے معمول (حال) پر تصرف کرنے کی وہ قوت نہیں رکھتا جو فعل یا شبہِ فعل کو حاصل ہے۔

*بخلاف الظرف :

برخلاف اس صورت کے جب معمول ظرف ہو کیونکہ ظرف اپنے عاملِ معنوی پر مقدم ہو سکتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں "في الدار زيدٌ"۔

*ولا علی المجرور فی الأصح :

اگر صاحبِ حال مجرور ہو، خواہ حرفِ جر کی وجہ سے یا اضافت کی وجہ سے، تو اصح مذہب کے مطابق حال اس پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ "راکباً مررت بزیدٍ" نہیں کہہ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرفِ جر اور مضاف بھی عاملِ ضعیف ہیں۔

حال کے مفہوم میں وسعت

قولہ :(وَكُلُّ مَا دَلَّ عَلَى هَيْئَةٍ صَحَّ أَنْ يَقَعَ حَالًا...)

مصنفؒ یہاں حال کے مفہوم میں وسعت بیان فرمارہے ہیں :

حال صرف مشتقات (اسم فاعل، مفعول) تک محدود نہیں، بلکہ ہر وہ لفظ جو کسی نہ کسی طرح حالت اور کیفیت پر دلالت کرے، وہ حال بن سکتا ہے، خواہ وہ جامد ہی کیوں نہ ہو۔ مثال :(هَذَا بُسْرًا أَطْيَبُ مِنْهُ رُطَبًا) "یہ کچی کھجور کی حالت میں زیادہ لذیذ ہے پکی ہوئی کھجور کی حالت سے"۔ یہاں "بُسْرًا" (کچی کھجور) اور "رُطَبًا" (پکی کھجور) دونوں اسم جامد ہیں لیکن چونکہ یہ حالت کو بیان کر رہے ہیں، اس لیے حال واقع ہوئے ہیں۔

حال کی دوسری قسم، یعنی جملہ حالیہ،

وتكون جملة خبرية. فالاسمية بالواو والضّمير، أو بالواو، أو بالضّمير على ضعف. والمضارع المثبت بالضّمير وحده. وما سواهما بالواو والضّمير، أو بأحدهما. ولا بدّ في الماضي المثبت من (قد) ظاهرة أو مقدّرة. ويجوز حذف العامل، كقولك للمسافر :(راشدا مهديّا). ويجب في المؤكّدة مثل (زيد أبوك عطوفا)، أي أحقّه، وشرطها أن تكون مقرّرة لمضمون جملة اسميّة.

ترجمہ:اور وہ جملہ خبریہ ہوتی ہے، پس اسمیہ واو اور ضمیر کے ساتھ، یا صرف واو کے ساتھ، یا ضمیر کے ساتھ ضعف کے ساتھ۔ اور مضارع مثبت صرف ضمیر کے ساتھ، اور ان کے سوا واو اور ضمیر کے ساتھ، یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ۔ اور ماضی مثبت میں (قَدْ) کا ہونا ضروری ہے ظاہراً یا تقدیراً۔ اور عامل کا حذف جائز ہے، جیسے تیرا مسافر سے قول :(رَاشِدًا مُهْدِيًّا) (ہدایت یافتہ، رہنمائی کرنے والا)۔ اور موکدہ میں واجب ہے جیسے (زَيْدٌ أَبُوكَ عَطُوفًا) (زید تیرا باپ ہے مہربان ہوتے ہوئے)، یعنی میں اسے حق سمجھتا ہوں، اور اس کی شرط یہ ہے کہ وہ جملہ اسمیہ کے مضمون کو مقرر کرنے والی ہو۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، حال کی دوسری قسم بیان فرمارہے ہیں:

جملہ حالیہ

قولہ :(وَتَكُونُ جُمْلَةً خَبَرِيَّةً...)

مصنفؒ اب حال کی دوسری قسم، یعنی جملہ حالیہ، کو بیان فرمارہے ہیں: حال جس طرح مفرد ہوتا ہے، اسی طرح جملہ بھی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ جملہ خبریہ ہو (انشائیہ نہ ہو)۔ پھر اس جملے کو صاحبِ حال سے جوڑنے کے لیے ایک رابط کی ضرورت ہوتی ہے۔

*فالاسمية :

اگر حال جملہ اسمیہ ہو تو رابط تین طرح سے آسکتا ہے :

*واواور ضمیر دونوں کے ساتھ :

یہ سب سے بہتر اور فصیح صورت ہے۔ جیسے قرآن میں ہے :(لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ) "نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ"۔ یہاں "واو" حالیہ اور "أنتم" ضمیر دونوں رابط ہیں۔

*صرف واو کے ساتھ :

جیسے (جاء زيدٌ والشمسُ طالعةٌ) "زید آیا اس حال میں کہ سورج طلوع ہو رہا تھا"۔

*صرف ضمیر کے ساتھ :

یہ صورت ضعیف ہے، جیسے (جاء زيدٌ هو فارسٌ)۔

*والمضارع المثبت :

اگر حال جملہ فعلیہ ہو اور اس کی فعل مضارع مثبت ہو، تو رابط صرف ضمیر ہوگی۔ واو کا استعمال یہاں نہیں ہوتا۔ جیسے (جاء زيدٌ يضحكُ) "زید ہنستے ہوئے آیا"۔ یہاں "يضحك" فعل میں ضمیر مستتر "ہو" رابط ہے۔

*وماسواهما :

ان دو صورتوں (جملہ اسمیہ اور مضارع مثبت) کے علاوہ جتنی صورتیں ہیں (مثلاً جملہ ماضیہ مثبت یا منفی، اور جملہ مضارع منفی)، ان میں رابط واو اور ضمیر دونوں بھی آسکتے ہیں اور صرف ایک بھی آسکتا ہے۔

ماضی مثبت

جیسے ماضی مثبت میں (جاء زيدٌ وقد ركب فرسَه)

ماضی منفی

اور ماضی منفی میں (جاء زيدٌ وما ركب فرسَه)۔

جملہ حالیہ کی ایک خاص شرط

قولہ :(وَلَا بُدَّ فِي الْمَاضِي الْمُثْبَتِ مِنْ (قَدْ) ظَاهِرَةٍ أَوْ مُقَدَّرَةٍ)

مصنفؒ جملہ حالیہ کی ایک خاص شرط بیان فرمارہے ہیں :اگر حال جملہ فعلیہ ماضی مثبت ہو (یعنی فعل ماضی ہو اور اس پر نفی نہ ہو)، تو اس جملے کو حال کے زمانہ کے قریب کرنے کے لیے اس پر "قد" کا داخل کرنا ضروری ہے، خواہ وہ لفظوں میں موجود ہو جیسے (جاء زيدٌ وقد طلع الفجرُ) یا مقدر ہو جیسے (جاء زيد ركب فرسَه) یعنی (وقد ركب فرسه)۔

حال کے عامل کا حذف جوازی

قولہ :(وَيَجُوزُ حَذْفُ الْعَامِلِ...)

مصنفؒ یہاں سے عامل حال کے حذف کے احکام بیان فرمارہے ہیں: حال کے عامل کو حذف کرنا جائز ہے اگر کوئی قرینہ موجود ہو۔ جیسے کوئی سفر پر جارہا ہو تو آپ اسے کہیں :(رَاشِدًا مَهْدِيًّا) "ہدایت یافتہ اور راہ یاب ہو کر (جاؤ)"۔ یہاں فعل "اِذْهَبْ" یا "سِرْ" محذوف ہے، یعنی (اذهب راشدًا مهديًّا)۔

حال کے عامل کا حذف وجوبی

قولہ :(وَيَجِبُ فِي الْمُؤَكِّدَةِ...)

مصنفؒ یہاں عامل کے وجوبی حذف کی صورت بیان فرمارہے ہیں: کبھی حال تاکید کے لیے آتا ہے۔ اسے حالِ موکدہ کہتے ہیں۔ اگر حالِ موکدہ کسی جملہ اسمیہ کے مضمون کی تاکید کے لیے آئے تو اس کے عامل کو حذف کرنا واجب ہے۔ مثال :(زَيْدٌ أَبُوكَ عَطُوفًا) "زید تمہارا باپ ہے، شفیق ہونے کی حالت میں"۔ یہاں "عطوفًا" حال ہے جو (زيد أبوك) کے مضمون کی تاکید کر رہا ہے۔ اس کا عامل "أُحِقُّهُ" فعل ہے جو وجوبی طور پر محذوف ہے۔ یعنی اصل عبارت ہے :(أُحقُّه عطوفًا) "میں اس کے شفیق ہونے کو ثابت کرتا ہوں"۔ اس حال کی شرط یہ ہے کہ اس کا عامل اور اس کے صاحبِ حال کا عامل ایک ہی ہو، اور یہ جملہ اسمیہ ہو جس کے دونوں جز معرفہ اور جامد۔

ساتواں منصوب تمییز

التّمييز :ما يرفع الإبهام المستقرّ عن ذات مذكورة أو مقدّرة. فالأوّل :عن مفرد مقدار غالبا إما في عدد نحو: (عشرون درهما) وسيأتي، وإما في غيره نحو :(رطل زيتا) و(منوان سمنا) و(على التّمرة مثلها زبدا). فيفرد إن كان جنسا، إلاّ أن يقصد الأنواع، ويجمع في غيره. ثمّ إن كان بالتّنوين، أو بنون التّثنية جازت الإضافة، وإلاّ فلا. وعن غير مقدار، مثل :(خاتم حديدا)، والخفض أكثر.

ترجمہ :تمیز :وہ اسم ہے جو کسی مذکور یا مقدر ذات سے پائے جانے والے مبہم مفہوم کو دور کرتا ہے۔ پس پہلی قسم (تمیز برائے ذات مذکورۃ) :یہ عام طور پر مفرد مقدار کی ابہام کو دور کرتی ہے، خواہ وہ عدد میں ہو جیسے :(بیس درہم) اور یہ آگے آئے گا، یا غیر عدد میں ہو جیسے :(ایک رطل تیل) اور (دو من گھی) اور (کھجور پر اس کے برابر مکھن)۔ پس یہ مفرد استعمال ہوتی ہے اگر جنس مراد ہو، مگر یہ کہ انواع مراد ہوں، اور غیر جنس میں جمع استعمال ہوتی ہے۔ پھر اگر یہ تنوین والی ہو یا تثنیہ کے نون کے ساتھ ہو تو اضافت جائز ہے، ورنہ نہیں۔ اور غیر مقدار کے لیے جیسے :(لوہے کی انگوٹھی)، اور جر زیادہ ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، تمیز کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

تمیز کی تعریف:

التّمییز :ما یرفع الإبهام المستقرّ عن ذات مذکورة أو مقدّرة.

مصنفؒ تمییز کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمییز وہ (اسم) ہے جو کسی ذاتِ مذکورہ یا ذاتِ مقدرہ میں پائے جانے والے ابہام کو دور کرتا ہے۔

*مَا :یہ اسم موصول ہے اور اس سے مراد "اسم" ہے، کیونکہ تمییز ہمیشہ اسم ہوتی ہے۔

*یَرْفَعُ الْإِبْهَامَ :"ابہام کو دور کرتا ہے"۔ ابہام سے مراد پوشیدگی اور غیر واضح ہونا ہے۔

*اَلْمُسْتَقِرَّ :"ثابت اور قائم"۔ یہ ابہام کی صفت ہے۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ صفت مشبہہ جیسی چیزیں تعریف سے خارج ہو جائیں جو اپنے معمول میں عمل کرنے کی وجہ سے ابہام کو دور کرتی ہیں لیکن وہ ابہام مستقر نہیں ہوتا۔

*عَنْ ذَاتٍ :"ذات سے"۔ ذات سے مراد کوئی بھی ایسی چیز ہے جس کا اپنا وجود ہو، خواہ وہ حقیقی ہو یا اعتباری۔

*مَذْكُوْرَةٍ أَوْ مُقَدَّرَةٍ :"مذکورہ ہو یا مقدرہ"۔ یہ ذات کی دو قسمیں بیان کی ہیں، اور اسی بنیاد پر تمییز کی بھی دو قسمیں ہو جائیں گی :

*تمییزِ ذات (یا تمییزِ مفرد) :

جو ذاتِ مذکورہ سے ابہام دور کرے۔

*تمییزِ نسبت (یا تمییزِ جملہ) :

جو ذاتِ مقدرہ (یعنی جملے کی نسبت) سے ابہام دور کرے۔

*تمییزِ ذات (یا تمییزِ مفرد) :

فَالْأَوَّلُ :عَنْ مُفْرَدٍ مِقْدَارٍ غَالِبًا مصنفؒ یہاں سے پہلی قسم یعنی تمییزِ ذات کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

*فَالْأَوَّلُ :یعنی تمییز کی پہلی قسم، جو ذاتِ مذکورہ سے ابہام دور کرتی ہے۔

*عَنْ مُفْرَدٍ :یہ "ذات" کی وضاحت ہے کہ وہ ذات عموماً ایک مفرد لفظ ہوتی ہے، نہ کہ پورا جملہ۔

*مِقْدَارٍ غَالِبًا :فرماتے ہیں کہ اکثر طور پر یہ مفرد لفظ کوئی "مقدار" ہوتا ہے۔ مقدار سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے کسی شے کا ناپ، تول یا پیائش معلوم ہو، جیسے عدد، وزن، پیانہ وغیرہ۔ "غالباً" کی قید اس لیے لگائی کہ کبھی یہ غیر مقدار سے بھی آتی ہے جیسا کہ آگے مثال آئے گی۔

إِمَّا فِيْ عَدَدٍ نَحْوُ :(عِشْرُوْنَ دِرْهَمًا) وَسَيَأْتِيْ پھر مقدار کی مثالیں دیتے ہیں۔

پہلی مثال عدد کی ہے :

* عِشْرُوْنَ دِرْهَمًا :(بیس درہم)۔ یہاں "عشرون" (بیس) ایک عدد ہے جو کہ مقدار ہے۔ یہ لفظ اپنی ذات میں مبہم ہے کہ بیس کیا چیز؟ درہم، دینار یا کچھ اور؟ "درھماً" نے آکر اس ابہام کو دور کر دیا، لہٰذا "درھماً" تمییز ہے اور منصوب ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں "وَسَيَأْتِيْ" یعنی عدد کی تمییز کی مفصل بحث آگے آئے گی۔

دوسری مثال عدد کے علاوہ:

وَإِمَّا فِيْ غَيْرِهِ نَحْوُ :(رِطْلٌ زَيْتًا) وَ (مَنَوَانِ سَمْنًا) وَ (عَلَى التَّمْرَةِ مِثْلُهَا زُبْدًا) دوسری مثال عدد کے علاوہ دیگر مقادیر کی ہے :

* **رِطْلٌ زَيْتًا** :(ایک رطل تیل)۔ "رطل" وزن کی ایک مقدار ہے۔ اس میں ابہام تھا کہ ایک رطل کیا چیز؟ "زیتًا" نے آکر واضح کیا کہ تیل ہے۔

* **مَنَوَانِ سَمْنًا** :(دو من گھی)۔ "منوان" (دو من) بھی وزن ہے۔ "سمنًا" نے اس کے ابہام کو دور کیا۔

* **عَلَى التَّمْرَةِ مِثْلُهَا زُبْدًا** :(کھجور پر اسی کے برابر مکھن)۔ یہاں "مثلھا" (اس کے برابر) ایک پیمائش اور مقدار کو ظاہر کر رہا ہے۔ اس میں ابہام تھا کہ کس چیز میں اس کے برابر؟ "زبداً" نے آکر اس ابہام کو دور کر دیا کہ مکھن میں۔

تمیز کے مفرد یا جمع ہونے کا قاعدہ

فَيُفْرَدُ إِنْ كَانَ جِنْسًا، إِلَّا أَنْ يُقْصَدَ الْأَنْوَاعُ، وَيُجْمَعُ فِيْ غَيْرِهِ

یہاں سے مصنفؒ تمیز کے مفرد یا جمع ہونے کا قاعدہ بیان فرما رہے ہیں :

* **فَيُفْرَدُ إِنْ كَانَ جِنْسًا** :اگر تمیز ایسی چیز واقع ہو جس کا اطلاق قلیل اور کثیر دونوں پر ہوتا ہو (یعنی وہ جنس ہو جیسے پانی، تیل، سونا) تو اسے مفرد لایا جائے گا۔ جیسے "رطلٌ زیتًا" میں "زیت" جنس ہے، اس لیے مفرد آیا۔

* **إِلَّا أَنْ يُقْصَدَ الْأَنْوَاعُ** :ہاں، اگر اس جنس کی انواع (اقسام) بتانا مقصود ہو تو پھر اسے جمع لایا جا سکتا ہے۔ جیسے آپ کہیں "عندي رطلٌ زيوتًا" (میرے پاس ایک رطل مختلف قسموں کے تیل ہیں)۔

* **وَيُجْمَعُ فِيْ غَيْرِهِ** :اور اگر تمیز جنس نہ ہو (یعنی اس کا اطلاق ایک سے زیادہ افراد پر ہوتا ہو جیسے درہم، دینار) تو اسے جمع لایا جائے گا، لیکن یہ قاعدہ اکثر اعداد میں جاری ہوتا ہے۔

ایک اہم نحوی قاعدہ

ثُمَّ إِنْ كَانَ بِالتَّنْوِيْنِ، أَوْ بِنُوْنِ التَّثْنِيَةِ جَازَتِ الْإِضَافَةُ، وَإِلَّا فَلَا

یہاں سے مصنفؒ ایک اہم نحوی قاعدہ بیان فرما رہے ہیں کہ کب ممیز (جس سے ابہام دور کیا جا رہا ہے) کو تمیز کی طرف مضاف کرنا جائز ہے:

* **إِنْ كَانَ بِالتَّنْوِيْنِ، أَوْ بِنُوْنِ التَّثْنِيَةِ** :اگر ممیز پر تنوین ہو جیسے "رطلٌ" یا نونِ تثنیہ ہو جیسے "منوانِ"۔

* **جَازَتِ الْإِضَافَةُ** :تو اضافت جائز ہے۔ یعنی آپ تمیز کو نصب دینے کے بجائے اسے جر دے کر مضاف الیہ بنا سکتے ہیں۔ مثلاً "رطلٌ زیتًا" کی جگہ "رطلُ زیتٍ" اور "منوانِ سمنًا" کی جگہ "مَنَوَا سَمْنٍ" کہہ سکتے ہیں۔ اضافت کی صورت میں تنوین اور نونِ تثنیہ گر جاتے ہیں۔

* **وَإِلَّا فَلَا** :اور اگر ممیز پر نہ تنوین ہو اور نہ نونِ تثنیہ (جیسے عدد "عشرون" میں)، تو وہاں اضافت جائز نہیں ہو گی۔ اسی لیے

"عشرون درھماً" کو "عشرونِ درھمٍ" نہیں کہہ سکتے۔

جب تمیز غیرِ مقدار سے آئے

وَعَنْ غَيْرِ مِقْدَارٍ، مِثْلُ :(خَاتَمٌ حَدِيْدًا)، وَالْخَفْضُ أَكْثَرُ

یہاں مصنفؒ اس صورت کو بیان فرمار ہے ہیں جو انہوں نے "غالباً" کی قید سے مستثنیٰ کی تھی، یعنی جب تمیز غیرِ مقدار سے آئے۔

* خَاتَمٌ حَدِيْدًا :(لوہے کی انگوٹھی)۔ یہاں "خاتم" (انگوٹھی) کوئی مقدار نہیں ہے، بلکہ ایک ذات ہے۔ اس میں ابہام ہے کہ انگوٹھی کس چیز کی ہے؟ سونے کی، چاندی کی یا لوہے کی؟ "حدیدًا" نے آکر اس ابہام کو دور کیا، للذا یہ تمیز ہے۔

* وَالْخَفْضُ أَكْثَرُ :لیکن اس صورت میں تمیز کو جر (خفض) کے ساتھ پڑھنا زیادہ فصیح اور کثیر الاستعمال ہے۔ یعنی "خاتمٌ حدیدًا" کہنے کے بجائے "خاتمُ حدیدٍ" (اضافت کے ساتھ) یا "خاتمٌ من حدیدٍ" (حرف جر "مِن" کے ساتھ) کہنا زیادہ بہتر ہے۔ اس میں "مِن" بیانیہ ہوتا ہے۔

تمیز کی دوسری قسم

والثّاني :عن نسبة في جملة، أو ما ضاهاها، مثل (طاب زيد نفسا)، و (زيد طيّب أبا، وأبوّة، ودارا، وعلما)، أو في إضافة مثل: (يعجبني طيبه أبا وأبوّة ودارا وعلما)، و (لله درّه فارسا). ثمّ إن كان اسما يصحّ جعله لما انتصب عنه جاز أن يكون له ولمتعلّقه، وإلاّ فهو لمتعلّقه. فيطابق فيهما ما قصد، إلاّ أن يكون جنسا إلاّ أن يقصد الأنواع. وإن كان صفة كانت له وطبقه، واحتملت الحال. ولا يتقدّم التّمييز على عامله، والأصحّ أن لا يتقدّم على الفعل، خلافا للمازنيّ والمبرّد

ترجمہ :اور دوسری قسم (تمیز برائے ذات مقدرۃ) :کسی جملے میں یا اس کے مانند کسی چیز میں نسبت کی وضاحت کے لیے ہوتی ہے، جیسے (طَابَ زَيْدٌ نَفْسًا) (زید نفس کے اعتبار سے اچھا ہے)؛ اور (زَيْدٌ طَيِّبٌ أَبًا، وَأُبُوَّةً، وَدَارًا، وَعِلْمًا) (زید باپ کے طور پر، باپ ہونے کے اعتبار سے، گھر کے اعتبار سے، اور علم کے اعتبار سے اچھا ہے)، یا اضافت میں جیسے :(يُعْجِبُنِي طِيبُهُ أَبًا وَأُبُوَّةً وَدَارًا وَعِلْمًا) (مجھے اس کی اچھائی اچھی لگتی ہے باپ کے طور پر، باپ ہونے کے اعتبار سے، گھر کے اعتبار سے، اور علم کے اعتبار سے)، اور (لِلّٰهِ دَرُّهُ فَارِسًا) (اللہ کے لیے اس کی خوبی ہے، ایک شہسوار ہونے کی حیثیت سے)۔ پھر اگر وہ اسم ہو اور جس چیز کی وجہ سے نصب واقع ہوا ہے اس کے لیے اس کا بنانا درست ہو تو اس کے لیے اور اس کے متعلق کے لیے ہونا جائز ہے، ورنہ وہ اس کے متعلق کے لیے ہے، پس ان دونوں میں جس کا ارادہ کیا جائے اس کی مطابقت کرے، مگر یہ کہ وہ جنس ہو مگر یہ کہ انواع مراد ہوں۔ اور اگر وہ صفت ہو تو وہ اسی کے لیے ہے اور اس کی مطابقت کرے گی، اور حال کا احتمال رکھے گی۔ اور تمیز اپنے عامل پر مقدم نہیں ہوتی، اور اصح قول یہ ہے کہ وہ فعل پر مقدم نہیں ہوتی، مازنی اور مبرد کے برعکس۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، تمیز کی دوسری قسم، جسے تمیزِ نسبت یا تمیزِ جملہ کہا جاتا ہے، کی وضاحت فرما

رہے ہیں۔

***تمیزِ نسبت (یا تمیزِ جملہ) :**

وَالثَّانِيْ :عَنْ نِسْبَةٍ فِيْ جُمْلَةٍ، أَوْ مَا ضَاهَاهَا

*وَالثَّانِيْ :یعنی تمیز کی دوسری قسم، جو ذاتِ مقدرہ سے ابہام کو دور کرتی ہے۔

*عَنْ نِسْبَةٍ فِيْ جُمْلَةٍ :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمیز کسی جملے میں پائی جانے والی نسبت سے ابہام کو دور کرتی ہے۔ نسبت سے مراد ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ تعلق یا اسناد ہے۔ مثلاً فعلیہ جملے میں فعل کی فاعل کی طرف نسبت اور اسمیہ جملے میں خبر کی مبتدا کی طرف نسبت۔ جب کہا جائے "طَابَ زَيْدٌ" (زید اچھا ہوا)، تو اچھائی کی نسبت زید کی طرف کی گئی ہے، لیکن اس نسبت میں ابہام ہے کہ یہ اچھائی کس جہت سے ہے؟ علم کے لحاظ سے، مال کے لحاظ سے، یا ذات کے لحاظ سے؟ تمیز اسی ابہام کو دور کرتی ہے۔

*أَوْ مَا ضَاهَاهَا :"یا جو جملے کے مشابہ ہو"۔ اس سے مراد وہ کلام ہے جو مکمل جملہ تو نہیں لیکن اس میں نسبت کا معنی پایا جاتا ہے، جیسے مصدر کی اضافت اس کے فاعل یا مفعول کی طرف۔ اس کی مثال آگے آ رہی ہے۔

مثل (طاب زيد نفسا)، و (زيد طيّب أبا، وأبوّة، ودارا، وعلما)

مصنفؒ اب مثالوں سے اس کی وضاحت فرما رہے ہیں :

*طَابَ زَيْدٌ نَفْسًا :(زید کی ذات اچھی ہے)۔ یہ جملہ فعلیہ کی مثال ہے۔ "طاب زید" کہنے سے اچھائی کی نسبت زید کی طرف مبہم تھی۔ "نفسًا" نے آکر واضح کر دیا کہ یہ نسبت ذات اور شخصیت کے اعتبار سے ہے، نہ کہ کسی اور پہلو سے۔

*زَيْدٌ طَيِّبٌ أَبًا ....(زید اچھا ہے باپ کے اعتبار سے...)۔ یہ جملہ اسمیہ کی مثال ہے۔ "زيدٌ طيبٌ" (زید اچھا ہے) میں خبر کی مبتدا کی طرف نسبت مبہم ہے۔ آگے "أباً" (باپ کے اعتبار سے)، "أبوّة" (باپ ہونے کی حیثیت سے)، "داراً" (گھر کے اعتبار سے) اور "علمًا" (علم کے اعتبار سے) نے آکر اس نسبت کی مختلف جہتوں کو واضح کر دیا۔

أو في إضافة مثل :(يعجبني طيبه أبا...)، و (لله درّه فارسا)

یہاں "مَا ضَاهَاهَا" (جملے کے مشابہ کلام) کی مثالیں ہیں :

*يُعْجِبُنِيْ طِيْبُهُ أَبًا ....(مجھے اس کا اچھا ہونا پسند ہے باپ کے اعتبار سے)۔ یہاں "طیبه" (اس کا اچھا ہونا) مصدر ہے جو اپنے فاعل (ضمیر 'ہ') کی طرف مضاف ہے۔ یہ مکمل جملہ نہیں لیکن اس میں "اچھائی کی نسبت اس کی طرف" کا معنی موجود ہے۔ یہ نسبت مبہم تھی جسے "أباً" نے آکر واضح کیا۔

*لِلّٰهِ دَرُّهُ فَارِسًا :(وہ کیا ہی بہترین شہسوار ہے!)۔ یہ تعجب کا صیغہ ہے۔ "لِلّٰهِ دَرُّهُ" کا لفظی مطلب ہے "اس کا دودھ اللہ کے لیے"، جو کنایہ ہے اس کی خوبی اور کمال سے۔ اس میں تعجب کی نسبت مبہم تھی کہ کس کمال پر تعجب کیا جا رہا ہے؟ "فَارِسًا" (شہسوار ہونے کی حیثیت سے) نے آکر اس ابہام کو دور کر دیا۔

تمییزِ نسبت کے فاعلِ معنوی کے اعتبار سے حکم؛

ثمّ إن کان اسما یصحّ جعله لما انتصب عنه...

یہاں سے مصنفؒ تمییزِ نسبت کے فاعلِ معنوی کے اعتبار سے حکم بیان فرمار ہے ہیں، جو کہ ایک دقیق بحث ہے :

*پہلی صورت :

اگر تمییز کوئی اسمِ جامد (جیسے أبٌ، دارٌ) ہو اور اس اسم کو اس ذات (یعنی فاعل یا مبتدا) کے لیے خبر یا مسند بنانا درست ہو (یعنی وہ تمییز در حقیقت اسی ذات کا حصہ یا اس سے قائم ہو)، تو وہ تمییز اس ذات کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اس کے متعلق کے لیے بھی۔

*مثال :"زیدٌ طیِبٌ أباً"۔ یہاں تمییز "أباً" ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں "أبوہ طیِبٌ" (اس کا باپ اچھا ہے)۔للذا یہ تمییز زید کے متعلق (باپ) کے لیے ہے۔اور جب آپ کہتے ہیں "زیدٌ طیِبٌ أبوّۃً" (زید باپ ہونے کی حیثیت میں اچھا ہے)، تو یہ صفت خود زید (ذات) سے قائم ہے۔

*دوسری صورت :

اور اگر اس تمییز کو اس ذات کے لیے خبر بنانا درست نہ ہو تو وہ صرف اس کے متعلق کے لیے ہوگی۔

*مثال :"زیدٌ طیّبٌ داراً"۔ یہاں تمییز "داراً" ہے۔آپ "دارُہ طیِبَۃٌ" تو کہہ سکتے ہیں لیکن "زیدٌ دارٌ" نہیں کہہ سکتے۔ للذا "داراً" صرف زید کے متعلقات میں سے ہے، خود اس کی ذات نہیں۔

دونوں صورتوں کا حکم؛

* فَیُطَابِقُ فِیْهِمَا مَا قُصِدَ :ان دونوں صورتوں میں تمییز اپنے مرجع کے عدد و جنس میں مطابق ہوگی۔

جیسے "الزیدان طابا أنفساً"۔

* إِلَّا أَنْ یَكُوْنَ جِنْسًا :مگر جب تمییز کوئی جنس ہو (جیسے علم، مال) تو وہ ہمیشہ مفرد رہے گی، چاہے اس کا مرجع تثنیہ ہو یا جمع۔ ہاں اگر اس جنس کی انواع بتانا مقصود ہو تو جمع لا سکتے ہیں۔

جب تمییز اسمِ صفت (اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ) ہو

وإن کان صفة کانت له وطبقه، واحتملت الحال

یہاں مصنفؒ اس صورت کو بیان فرمار ہے ہیں جب تمییز اسمِ صفت (اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ) ہو :

* كَانَتْ لَهُ وَطَبَقَهُ :اگر تمییز صفت ہو تو وہ ہمیشہ اسی ذات (فاعل یا مبتدا) کے لیے ہوگی اور عدد و جنس میں اس کے مطابق ہوگی۔ جیسے "لِلّٰهِ دَرُّهُ فَارِسًا" میں "فَارِسًا" صفت ہے اور "ہ" ضمیر واحد مذکر کے مطابق ہے۔

* وَاحْتَمَلَتِ الْحَالَ :اور اس میں حال ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ کیونکہ حال بھی اکثر صفت ہوتا ہے اور فاعل یا مفعول کی حالت بیان کرتا ہے۔ "فارساً" کو نحوی اعتبار سے حال بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ تمییز ذاتِ مبہم کو واضح کرتی ہے جبکہ حال ہیئتِ مبہم کو۔

تمیز کی تقدیم وتاخیر کا مسئلہ

ولا یتقدّم التّمییز علی عامله. والأصحّ أن لا یتقدّم علی الفعل، خلافاً للمازنیّ والمبرّد

آخر میں مصنفؒ تمیز کی تقدیم وتاخیر کا مسئلہ بیان فرمارہے ہیں :

* **وَلَا يَتَقَدَّمُ التَّمْيِيزُ عَلَى عَامِلِهِ** : یہ متفقہ اصول ہے کہ تمیز اپنے عامل (وہ فعل، شبہ فعل یا اسم جس نے اسے نصب دیا ہے) سے مقدم نہیں ہو سکتی۔ آپ "نفسًا طاب زیدٌ" نہیں کہہ سکتے۔

* **وَالْأَصَحُّ أَنْ لَا يَتَقَدَّمَ عَلَى الْفِعْلِ** : اور جمہور نحویوں کے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ تمیز اپنے عامل کے معمول (مثلاً فاعل) پر تو مقدم ہو سکتی ہے لیکن خود فعل پر مقدم نہیں ہو سکتی۔ یعنی "طَابَ نَفْسًا زَيْدٌ" بھی صحیح نہیں ہے۔ تمیز کا مقام ہمیشہ عامل اور اس کے تمام معمولات کے بعد ہوتا ہے۔

* **خِلَافًا لِلْمَازِنِيِّ وَالْمُبَرِّدِ** : مصنفؒ نے بصرہ کے دو عظیم نحویوں، امام مازنی اور امام مبرّد، کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک تمیز کا فعل اور فاعل کے درمیان آنا جائز ہے، یعنی "طَابَ نَفْسًا زَيْدٌ" کہنا درست ہے۔ لیکن مصنفؒ نے جمہور کے قول کو "اصح" قرار دیا ہے۔

آٹھواں منصوب مستثنیٰ

المستثنی: متّصل ومنقطع. فالمتّصل: هو المخرج عن متعدّد لفظاً أو تقديراً ب(إلّا) وأخواتها. والمنقطع: هو المذکور بعدها غیر مخرج. وهو منصوب إذا کان بعد (إلّا) غیر الصّفة فی کلام موجب، أو مقدّماً علی المستثنی منه، أو منقطعاً فی الأکثر، أو کان بعد (خلا) و(عدا) فی الأکثر، و(ما خلا) و(ما عدا) و(لیس) و(لا یکون).

ترجمہ: مستثنیٰ: متصل اور منقطع ہوتا ہے۔ پس متصل: وہ (اسم) ہے جو کسی متعدد سے ۔ لفظاً یا تقدیراً۔ (إِلَّا) اور اس کے اخوات کے ذریعے نکالا جائے۔ اور منقطع: وہ (اسم) ہے جو اس کے بعد مذکور ہو نکالا ہوا نہ ہو۔ اور وہ منصوب ہوتا ہے جب وہ (إِلَّا) کے بعد ہو صفت کے سوا کلام موجب میں، یا مستثنیٰ منہ پر مقدم ہو، یا اکثر صورتوں میں منقطع ہو، یا (خَلَا) اور (عَدَا) کے بعد ہو اکثر صورتوں میں، اور (مَا خَلَا) اور (مَا عَدَا) اور (لَيْسَ) اور (لَا يَكُونُ) کے بعد ہو۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، مستثنیٰ کا بیان فرمارہے ہیں۔

مستثنیٰ کی اقسام وتعریف:

اَلْمُسْتَثْنٰى: مُتَّصِلٌ وَمُنْقَطِعٌ:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مستثنیٰ کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں :

متصل اور منقطع۔

مستثنیٰ متصل کی تعریف

*فَالْمُتَّصِلُ :هُوَ الْمُخْرَجُ عَنْ مُتَعَدِّدٍ-لَفْظًا أَوْ تَقْدِيرًا -بِـ(إِلَّا) وَأَخَوَاتِهَا

یہاں مستثنیٰ متصل کی تعریف کی جارہی ہے۔

* الْمُخْرَجُ :یعنی جسے حکم سے خارج کیا گیا ہو۔ استثناء کا بنیادی معنی ہی کسی کو حکم سے نکالنا ہے۔

* عَنْ مُتَعَدِّدٍ :یہ اخراج کسی متعدد چیز سے ہوتا ہے، یعنی مستثنیٰ منہ (جس سے استثناء کیا جارہا ہے) میں تعدد پایا جانا ضروری ہے۔

* لَفْظًا أَوْ تَقْدِيرًا :یہ تعدد یا تو لفظوں میں موجود ہوگا، جیسے "جَاءَ الْقَوْمُ" (قوم آئی)، یہاں "القوم" لفظاً متعدد پر دلالت کرتا ہے۔ یا پھر تقدیراً (معنوی طور پر) ہوگا، جیسے "مَا جَاءَ أَحَدٌ" (کوئی ایک بھی نہیں آیا)، یہاں "أحد" نکرہ ہے جو نفی کے تحت آکر عموم اور تعدد کا فائدہ دیتا ہے، یعنی جنسِ "آنے والے" میں سے کوئی فرد نہیں آیا۔

* بِـ(إِلَّا) وَأَخَوَاتِهَا :یہ اخراج "إلّا" یا اس جیسے معنی رکھنے والے دیگر ادات (جیسے غیر، سویٰ، خلا، عدا وغیرہ) کے ذریعے ہوتا ہے۔

*خلاصہ :

مستثنیٰ متصل وہ ہے جو مستثنیٰ منہ کی جنس میں سے ہو اور اسے حکم سے خارج کیا جارہا ہو۔ جیسے؛

"جَاءَ الْقَوْمُ إِلَّا زَيْدًا" (قوم آئی سوائے زید کے)۔ یہاں زید قوم کا ہی ایک فرد ہے۔

مستثنیٰ منقطع کی تعریف

*وَالْمُنْقَطِعُ :هُوَ الْمَذْكُورُ بَعْدَهَا غَيْرُ مُخْرَجٍ

یہاں مستثنیٰ منقطع کی تعریف ہے۔

* الْمَذْكُورُ بَعْدَهَا :یعنی وہ اسم جو اداتِ استثناء کے بعد آئے۔

* غَيْرُ مُخْرَجٍ :لیکن وہ حقیقت میں ما قبل (مستثنیٰ منہ) سے خارج نہ ہو، کیونکہ وہ اس کی جنس سے ہی نہیں ہوتا۔

جیسے "جَاءَ الْقَوْمُ إِلَّا حِمَارًا" (قوم آئی مگر گدھا نہیں آیا)۔ یہاں "حمار" (گدھا) "القوم" کی جنس سے نہیں ہے، لہٰذا یہ حقیقی اخراج نہیں بلکہ یہاں "إلاّ" بمعنی "لكن" (لیکن) ہوتا ہے۔

مستثنیٰ کا اعراب؛

وَهُوَ مَنْصُوبٌ إِذَا كَانَ بَعْدَ(إِلَّا)...

مستثنیٰ کی تقسیم کے بعد اس عبارت میں صاحب کتاب نے مستثنیٰ کے اعراب کو بیان کیا ہے کہ مستثنیٰ کا اعراب چار قسم پر ہے۔

(۱) اَلنَّصْبُ (۲) وَالْبَدَلُ اَلنَّصْبُ (۳) عَلَى حَسَبِ الْعَوَامِلِ (۴) اَلْجَرُّ۔

پہلا اعراب النصب:

چند قسموں میں مستثنیٰ کا اعراب منصوب ہوگا

پہلی قسم؛

وھو منصوب إذا کان بعد (إلاّ) غیر الصّفة في کلام موجب، یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ متصل ہو اور اِلّا کے بعد واقع ہو کلامِ موجب میں۔

کلام موجب:

وہ ہے جس میں نفی، نہیں اور استفہام انکاری نہ ہو۔ اور آگے کلام غیر موجب آرہا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں نفی، نہی اور استفہام انکاری ہو۔

اگر مستثنیٰ متصل اِلّا کے بعد کلام موجب میں واقع ہو تو منصوب بڑھا جائے گا۔ جیسے :''جَآءَنِیْ الْقَوْمُ اِلَّا زَیْدًا''

دوسری قسم:

''اَوْ مُقَدَّمًا عَلٰی مُسْتَثْنٰی مِنْهُ'' کہ مستثنیٰ مقدم ہو مستثنیٰ منہ پر جیسے ''مَا جَآءَنِیْ اِلَّا زَیْدًا اَحَدٌ''

تیسری قسم:

*أَوْ مُنْقَطِعًا فِي الْأَکْثَرِ :جب مستثنی منقطع ہو تو اکثر اہل عرب (بنو تمیم) کے نزدیک نصب واجب ہے، جیسے "مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ"۔ جبکہ اہل حجاز یہاں بھی بدل کو جائز سمجھتے ہیں۔

ان تین صورتوں میں مستثنیٰ منصوب ہوگا وجہ اس کی یہی ہے کہ یہاں مستثنیٰ مفعول کے مشابہ ہے اور مفعول منصوب ہوتا ہے۔

چوتھی قسم:

أو کان بعد (خلا) و (عدا) في الأکثر، '' کہ اکثر نحویوں کے نزدیک ''خَلَا'' اور ''عَدَا'' کے بعد مستثنیٰ منصوب ہوگا کیونکہ ''خَلَا'' اور ''عَدَا'' اکثر نحویین کے نزدیک فعل ہے ضمیر فاعل ہے اور مستثنیٰ مفعول ہے اور مفعول منصوب ہوتا ہے جیسے :خَلَا زَیْدًا۔ عَدَا زَیْدًا۔

اور بعض نحویوں کے نزدیک ''خَلَا'' اور ''عَدَا'' حروف جارہ میں سے ہیں اور اس وقت مستثنیٰ مجرور ہوگا جیسے :خَلَا زَیْدٍ۔ عَدَا زَیْدٍ۔ صحیح قول اکثر نحویین کا ہے۔

پانچویں قسم:

''اَوْ مَا خَلَا وَمَا عَدَا وَلَیْسَ وَلَا یَکُوْنُ''... اور جب ان پر "ما" مصدریہ داخل ہو جائے یعنی "ما خلا" اور "ما عدا" یا مستثنیٰ "لیس" اور "لا یکون" کے بعد آئے تو ان کے فعل ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا، لہٰذا مستثنیٰ کا نصب واجب ہو جاتا ہے۔

جیسے مثالیں سب کی یہ ہیں۔ جَآءَنِیْ الْقَوْمُ ما خَلَا زَیْدًا اور جَآءَ نِیْ الْقَوْمُ مَا عَدًا زیدًا اور جَآءَ نِیْ الْقَوْمُ لَیْسَ

زَیْدًا اور جَآءَ نِیَ الْقَوْمُ لَا یَکُوْنُ زَیْدًا۔

جب کلام غیر موجب ہو اور مستثنیٰ منہ بھی مذکور ہو

ویجوز فیہ النّصب، ویختار البدل فیما بعد (إلاّ) فی کلام غیر موجب، وذکر المستثنی منہ مثل {ما فعلوہ إلاّ قلیلٌ}، وإلا قلیلا، ویعرب علی حسب العوامل إذا کان المستثنی منہ غیر مذکور، وھو فی غیر الموجب لیفید مثل: (ما ضربنی إلاّ زید)، إلاّ أن یستقیم المعنی مثل: (قرأت إلاّ یوم کذا)، ومن ثمّت لم یجز (ما زال زید إلاّ عالما)، وإذا تعذّر البدل علی اللّفظ فعلی الموضع، مثل: (ما جاءنی من أحد إلاّ زید)، و(لا أحد فیھا إلاّ عمرو)، و(ما زید شیئا إلاّ شیء لا یعبأ بہ)، لأنّ (من) لا تزاد بعد الإثبات، و(ما) و(لا) لا تقدّران عاملتین بعدہ، لأنّھما عملتا للنّفی، وقد انتقض النّفی ب(إلاّ)، بخلاف (لیس زید شیئا إلاّ شیئا)، لأنّھا عملت للفعلیّۃ، فلا أثر لنقض معنی النّفی، لبقاء الأمر العاملۃ ھی لأجلہ، ومن ثمّ جاز (لیس زید إلاّ قائما) وامتنع (ما زید إلاّ قائما). ومخفوض بعد (غیر) و(سوی) و(سواء)، وبعد (حاشا) فی الأکثر.

ترجمہ: اور اس میں نصب جائز ہے، اور بدل کو اختیار کیا جاتا ہے اس میں جو (اِلَّا) کے بعد ہو کلام غیر موجب میں، اور مستثنیٰ منہ مذکور ہو جیسے {مَا فَعَلُوْہُ اِلَّا قَلِیْلٌ} (انہوں نے نہیں کیا مگر تھوڑا) اور اِلَّا قَلِیْلًا (مگر تھوڑے کو)۔ اور وہ عوامل کے مطابق اعراب دیا جاتا ہے جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو، اور وہ غیر موجب میں اس لیے ہوتا ہے کہ فائدہ دے جیسے: (مَا ضَرَبَنِي اِلَّا زَیْدٌ) (مجھے نہیں مارا مگر زید نے)، مگر یہ کہ معنی درست ہو جیسے: (قَرَأْتُ اِلَّا یَوْمَ کَذَا) (میں نے نہیں پڑھا مگر فلاں دن)، اور اسی وجہ سے (مَا زَالَ زَیْدٌ اِلَّا عَالِمًا) (زید نہیں رہا مگر عالم) جائز نہیں۔ اور جب لفظ پر بدل ممکن نہ ہو تو محل پر بدل ہوتا ہے، جیسے: (مَا جَاءَنِي مِنْ اَحَدٍ اِلَّا زَیْدٌ) (میرے پاس کوئی نہیں آیا مگر زید)، اور (لَا اَحَدٌ فِیْهَا اِلَّا عَمْرٌو) (اس میں کوئی نہیں مگر عمرو)، اور (مَا زَیْدٌ شَیْئًا اِلَّا شَيْءٌ لَا یُعْبَأُ بِهٖ) (زید کچھ نہیں مگر ایسی چیز جس کی پرواہ نہ کی جائے)؛ کیونکہ (مِنْ) اثبات کے بعد زائد نہیں آتی، اور (مَا) اور (لَا) اس کے بعد عاملہ مقدر نہیں ہوتیں؛ کیونکہ انہوں نے نفی کے لیے عمل کیا، اور (اِلَّا) سے نفی ٹوٹ گئی، بخلاف (لَیْسَ زَیْدٌ شَیْئًا اِلَّا شَیْئًا) کے؛ کیونکہ اس نے فعلیہ کے لیے عمل کیا، پس نفی کے معنی کے ٹوٹنے کا کوئی اثر نہیں؛ اس لیے کہ عاملہ کا معاملہ جس کے لیے وہ عمل کر رہی ہے باقی ہے، اور اسی وجہ سے (لَیْسَ زَیْدٌ اِلَّا قَائِمًا) (زید نہیں مگر کھڑا) جائز ہے اور (مَا زَیْدٌ اِلَّا قَائِمًا) (زید نہیں مگر کھڑا) منع ہے۔ اور (غَیْر) اور (سِوَی) اور (سَوَاء) کے بعد مجرور ہوتا ہے، اور (حَاشَا) کے بعد اکثر صورتوں میں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں مستثنیٰ کا وہ حکم بیان کر رہے ہیں جب کلام غیر موجب (منفی، نہی وغیرہ) ہو اور مستثنیٰ منہ بھی مذکور ہو۔

دوسرا اعراب النصب والبدل

وَیَجُوْزُ فِیْهِ النَّصْبُ، وَیُخْتَارُ الْبَدَلُ فِیْمَا بَعْدَ (اِلَّا)...

اس عبارت میں صاحب کتاب نے مستثنیٰ کے اعراب کی دوسری قسم کو بیان کیا ہے جس کو ہم اجمالی طور پر پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ دوسری قسم اعراب کی **النصب والبدل** ہے کہ جب مستثنیٰ کلام غیر موجب میں ہو کلام غیر موجب کی تعریف یہ ہے کہ جس میں نفی نہی اور استفہام انکاری موجود ہو۔ تو مستثنیٰ کلام جب کلام غیر موجب میں اِلّا کے بعد واقع ہو اور مستثنیٰ منہ مذکور ہو تو اس کا اعراب دو طرح کا آتا ہے۔(۱) نصب (۲) ما قبل سے بدل۔

*النصب :

استثناء کی بنا پر نصب دینا۔

*البدل :

مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ سے "بدل" بنانا۔

یعنی جو اعراب مستثنیٰ منہ کا ہے، وہی مستثنیٰ کو دینا۔

* وَيُخْتَارُ الْبَدَلُ :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان دو جائز صورتوں میں سے بدل والی صورت زیادہ فصیح اور مختار ہے۔

*مثال :قرآن کی آیت " {مَا فَعَلُوْهُ إِلَّا قَلِيْلٌ} " میں "قليلٌ" (رفع کے ساتھ) "فَعَلُوْهُ" کی ضمیر فاعل "واو" سے بدل ہے، جو کہ مرفوع ہے۔ اور دوسری قراءت میں "إِلَّا قَلِيْلًا" (نصب کے ساتھ) بھی ہے، جو استثناء کی بنا پر ہے۔

تیسرا اعراب مستثنیٰ مفرغ ؛

وَيُعْرَبُ عَلَى حَسَبِ الْعَوَامِلِ إِذَا كَانَ الْمُسْتَثْنٰى مِنْهُ غَيْرَ مَذْكُوْرٍ...

مستثنیٰ مفرغ کی تعریف:

مستثنیٰ مفرغ اس کو کہتے ہیں جس کا مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو۔ مفرغ یعنی خالی۔ فارغ مستثنیٰ منہ سے۔

کہ اگر مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو یعنی مستثنیٰ مفرغ ہو اور کلام غیر موجب ہو تو اس صورت میں اعراب عامل کے حساب سے ہوں گے۔ عامل رافع ہو تو مرفوع عامل ناصب ہو تو منصوب عامل جار ہو تو مجرور جیسے مَا جَآءَنِيْ إِلَّا زَيْدٌ ، وَمَا رَأَيْتُ إِلَّا زَيْدًا، وَمَا مَرَرْتُ إِلَّا بِزَيْدٍ۔

کبھی کلام موجب میں بھی استثناء مفرغ آسکتا ہے

*وَإِلَّا أَنْ يَسْتَقِيْمَ الْمَعْنٰى :

مصنف ایک استثناء بیان کرتے ہیں کہ کبھی کلام موجب میں بھی استثناء مفرغ آسکتا ہے اگر معنی درست ہو جیسے "قَرَأْتُ إِلَّا يَوْمَ كَذَا"۔ اس کا معنی ہے "قَرَأْتُ كُلَّ وَقْتٍ إِلَّا يَوْمَ كَذَا"۔ یہاں "کل وقت" مقدر ہے۔

"مَا زَالَ زَيْدٌ إِلَّا عَالِمًا" کہنا جائز نہیں،

*وَمِنْ ثَمَّ لَمْ يَجُزْ (مَا زَالَ زَيْدٌ إِلَّا عَالِمًا) :

مصنفؒ فرماتے ہیں اسی قاعدے (کہ استثناء مفرغ نفی کو ختم کرکے اثبات کا معنی دیتا ہے) کی وجہ سے "مَا زَالَ زَيْدٌ إِلَّا عَالِمًا" کہنا جائز نہیں، کیونکہ "مازال" افعال ناقصہ میں سے ہے اور استمرارِ ثبوت (کسی خبر کے مسلسل ثابت رہنے) کا فائدہ دیتا ہے۔ جب "إِلَّا" آئے گا تو وہ نفی کو توڑ دے گا اور "زال" کا معنی (زائل ہونا) باقی رہ جائے گا جو کہ متکلم کی غرض کے خلاف ہے۔

دقیق مسئلہ

وَإِذَا تَعَذَّرَ الْبَدَلُ عَلَى اللَّفْظِ فَعَلَى الْمَوْضِعِ...

یہاں مصنفؒ ایک نہایت دقیق مسئلہ بیان فرمارہے ہیں کہ اگر مستثنیٰ منہ کے لفظ پر بدل بنانا ناممکن ہو تو اس کے محلی اعراب (موضع) پر بدل بنایا جائے گا۔

***مثال ۱ :**

"مَا جَاءَنِيْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا زَيْدٌ"۔ یہاں "اَحد" لفظاً مجرور ہے (مِن زائدہ کی وجہ سے)۔ اگر لفظ پر بدل بنائیں تو "زیدٍ" پڑھنا پڑے گا جو غلط ہے کیونکہ آنے والا تو زید ہے۔ للذا "أحد" کے محل اعراب کو دیکھا جائے گا، جو کہ "جاء" کا فاعل ہونے کی وجہ سے "رفع" ہے، اسی لیے "زیدٌ" مرفوع پڑھا گیا۔

***مثال ۲:**

"لَا أَحَدَ فِيْهَا إِلَّا عَمْرٌو"۔ یہاں "أحدَ" لائے نفی جنس کا اسم ہونے کی وجہ سے مبنی بر فتح ہے (محلاً مرفوع)۔ للذا "عمرٌو" کو اس کے محل پر بطور بدل مرفوع پڑھا گیا۔

***وجہ :**

مصنف اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ "إِلَّا" کے بعد "ما" اور "لا" کا عمل باقی نہیں رہتا کیونکہ ان کا عمل نفی کی وجہ سے تھا اور "إِلَّا" نے آکر نفی کو توڑ کر کلام کو اثبات میں بدل دیا ہے۔

*** بخلاف لَيْسَ** : برخلاف "لیس" کے، کیونکہ وہ فعل ہے اور اس کا عمل صرف نفی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی فعلیت کی وجہ سے ہے۔ للذا اگرچہ "إلاّ" نفی کے معنی کو توڑ دیتا ہے، لیکن "لیس" کی فعلیت باقی رہتی ہے اور وہ عمل کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے "لَيْسَ زَيْدٌ إِلَّا قَائِمًا" جائز ہے (قائماً، لیس کی خبر ہونے کی بنا پر منصوب) لیکن "مَا زَيْدٌ إِلَّا قَائِمًا" (حجازیوں کے نزدیک) ناجائز ہے، کیونکہ "ما" کا عمل نفی کے ساتھ خاص تھا جو "إلاّ" سے ٹوٹ گیا۔

چوتھا اعراب مجرور؛

وَمَخْفُوْضٌ بَعْدَ (غَيْرٍ) وَ(سِوَى).

...اگر مستثنیٰ لفظ غَیرَ اور سِوَی اور سِوَاءَ اور حاشَا کے بعد واقع ہو تو اکثر نحویین کے نزدیک مجرور ہوگا۔ جیسے:

:مَا جَآءَنِيْ غَيْرَ زَيْدٍ۔ مَا جَآءَنِيْ سِوَى زَيْدٍ، مَا جَآءَنِيْ سِوَاءَ زَيْدٍ، مَا جَآءَنِيْ حَاشَا زَيْدٍ۔

غیر کا اعراب

وإعراب (غير) فيه كإعراب المستثنى ب (إلا) على التفصيل، و(غير) صفة حملت على (إلا) في الاستثناء كما حملت (إلا) عليها في الصفة إذا كانت تابعة لجمع منكور غير محصور، لتعذر الاستثناء، نحو {لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا} وضعف في غيره. وإعراب (سوى) و(سواء) النصب على الظرفية على الأصح.

ترجمہ: اور اس میں (غَیر) کا اعراب (اِلَّا) کے ذریعے مستثنیٰ کے اعراب کی طرح ہے تفصیل کے ساتھ، اور (غَیر) صفت ہے جسے استثناء میں (اِلَّا) پر محمول کیا گیا جیسے (اِلَّا) کو اس پر صفت میں محمول کیا گیا جب وہ جمع منکور غیر محصور کی تابع ہو؛ استثناء کے متعذر ہونے کی وجہ سے، جیسے {لَوْكَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا} (اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو وہ ضرور تباہ ہو جاتیں)، اور اس کے غیر میں ضعیف ہے۔ اور (سِوَیٰ) اور (سَوَاء) کا اعراب اصح قول کے مطابق ظرفیت پر نصب ہے۔

تشریح:

"غیر" کے اپنے اعراب کا قاعدہ

وَإِعْرَابُ (غَيْرٍ) فِيهِ كَإِعْرَابِ الْمُسْتَثْنٰى بِ(إِلَّا)

... یہاں "غیر" کے اپنے اعراب کا قاعدہ بیان ہو رہا ہے۔

* قاعدہ :

"غیر" کا اعراب وہی ہوتا ہے جو "إلّا" کے بعد آنے والے اسم کا ہوتا۔

"غَیر" کا اعراب بالکل اِلَّا کے اعراب کی طرح ہے۔

(۱)۔ مستثنیٰ متصل ہو اور کلام موجب ہو جیسے: "جَاءَنِي الْقَوْمُ غَيْرَ زَيْدٍ"۔

(۲)۔ مستثنیٰ منقطع کلام موجب ہو جیسے: "جَاءَنِي الْقَوْمُ غَيْرَ حِمَارٍ"

(۳)۔ مستثنیٰ متصل ہو کلام غیر موجب ہو لیکن مستثنیٰ منہ پر مستثنیٰ کو مقدم کیا جائے جیسے: "جَاءَنِي غَيْرُ زَيْدٍ الْقَوْمُ"

(۴)۔ مستثنیٰ متصل ہو کلام غیر موجب ہو اور مستثنیٰ منہ مذکور ہو تو دو طرح کا اعراب آتا ہے ایک بدل اور دوسرا نصب بدل کی مثال "مَا جَاءَنِي أَحَدٌ غَيْرُ زَيْدٍ" اور نصب کی مثال جیسے: "مَا جَاءَنِي أَحَدٌ غَيْرَ زَيْدٍ"

(۵)۔ مستثنیٰ متصل ہو اور کلام غیر موجب ہو اور مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو تو عامل کے اعتبار سے اعراب آئیں گے۔ جیسے: مَا جَاءَنِي غَيْرُ زَيْدٍ، مَا رَأَيْتُ غَيْرَ زَيْدٍ، مَا مَرَرْتُ بِغَيْرِ زَيْدٍ۔

یعنی ہر حال میں غَیر اور اِلَّا ایک جیسے ہیں۔

غیر اور الا کی تحقیق:

*وَ(غَيْرٌ) صِفَةٌ حُمِلَتْ عَلَى (إِلَّا)

.اس عبارت میں صاحب کتاب نے لفظ "غَیر" اور لفظ "اِلَّا" کے سبب وضع کو بیان کیا ہے تو لفظ "غَیر" جو ہے یہ صفت کے

لئے وضع کیا گیا ہے اور کبھی کبھی یہ استثناء کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح "اِلَّا" یہ استثناء کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کبھی کبھی یہ بطور صفت بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

یعنی صاحب کتاب نے "غَیْرَ" کی اور "اِلَّا" کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) غیر صفتی۔ (۲) غیر استثنائی۔

اور اسی طرح اِلَّا بھی ہے۔

"جَآءَنِی الْقَوْمُ غَیْرَ اَصْحَابِكَ" کہ یہاں اصحاب غیر سے پہلے بھی قوم میں شمار تھے اب بھی ہیں پس آنے کے حکم میں لفظ غیر کے ساتھ اصحاب کو باہر کیا گیا ہے۔

اور یہ بات واضح رہے کہ جہاں اِلَّا کو استثناء کے معنی میں لینے سے خرابی لازم آتی ہو تو صرف اسی صورت میں حرف اِلَّا صفت واقع ہو سکتا ہے کیونکہ وہاں اس کو استثناء میں لینا جائز نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان "لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" یہ سورۃ انبیاء کی آیت نمبر ۲۲ ہے، "ای غیر اللہ" یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتے زمین و آسمان میں تو یہ تباہ و برباد ہو جاتے۔

اس آیت مبارکہ میں اگر حرف اِلَّا کو استثناء کے معنی میں لیا جائے تو اس سے دو خرابیاں لازم آتی ہیں۔

(۱) اگر یہ مستثنیٰ متصل ہو تو "معاذاللہ" اس سے معبودان باطلہ کے وجود کا ثبوت ملے گا یہ مراد لینا صحیح نہیں کیونکہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(۲) اگر مستثنیٰ منقطع ہو تو "معاذ اللہ" اللہ تعالیٰ کی الٰہیت سے انکار لازم آئے گا جو کہ کفر ہے۔ لہٰذا ایک ہی صورت رہ گی کہ حرف "اِلَّا" کو صفتی معنی میں کیا جائے نہ کہ استثنائی معنی میں اور اسی طرح تیرا قول "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" ہے۔

(۱) اگر مستثنیٰ متصل ہو تو معبودان باطلہ کو بھی ماننے یعنی ان کے وجود کا قائل ہونا لازم آتا ہے۔

(۲) اگر مستثنیٰ منقطع ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے الٰہ ہونے کا انکار لازم آتا ہے اور یہ کفر ہے لہٰذا یہاں بھی لفظ اِلَّا کو صفتی معنی میں مراد لیا جائے گا۔ جیسے:

لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا اَیْ غَیْرُ اللّٰهِ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَیْ غَیْرُ اللّٰهِ

"سویٰ" اور "سواء" کا اعراب

وَإِعْرَابُ (سِوَى) وَ(سَوَاءٍ) النَّصْبُ عَلَى الظَّرْفِيَّةِ عَلَى الْأَصَحِّ،

آخر میں مصنفؒ "سویٰ" اور "سواء" کے اعراب کے بارے میں اصح قول بیان فرمارہے ہیں کہ یہ مبنی ہیں اور ان کا نصب ظرفیت کی بناپر ہوتا ہے، یعنی یہ "مکان" کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں (بمعنی: جگہ)۔ لہٰذا یہ محلاً منصوب ہوتے ہیں۔

نواں منصوب کَانَ اور اس کے اَخَوَاتِ کی خبر

خبر كان وأخواتها: هو المسند بعد دخولها، مثل: (كان زيد قائماً). وأمره كأمر خبر المبتدأ، ويتقدّم على اسمها

معرفة.وقد يحذف عامله في مثل :(النّاس مجزيّون بأعمالهم، إن خيرا فخير، وإن شرّا فشرّ). ويجوز مثلها أربعة أوجه.
ويجب الحذف في مثل :(أمّا أنت منطلقا انطلقت)، أي لأن كنت.

ترجمہ :کان اور اس کے اخوات کی خبر :وہ (اسم) ہے جس کی اسناد ان کے داخل ہونے کے بعد کی جائے، جیسے :(کَانَ زَیْدٌ قَائِمًا) (زید کھڑا تھا)۔ اور اس کا حکم مبتدا کی خبر کے حکم کی طرح ہے، اور وہ اپنے اسم معرفہ پر مقدم ہو جاتی ہے۔ اور کبھی اس کا عامل حذف کر دیا جاتا ہے جیسے :(لوگ اپنے اعمال کی جزا پائیں گے، اگر خیر تو خیر، اور اگر شر تو شر)۔ اور اس جیسی چار صورتیں جائز ہیں، اور حذف واجب ہے جیسے :(أَمَّا أَنْتَ مُنْطَلِقًا انْطَلَقْتُ) (جہاں تک تیرا چلنے کا تعلق ہے تو میں چلا)، یعنی اس لیے کہ تو تھا۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں کان اور اس کے اخوات کی خبر کا بیان فرمارہے ہیں۔

قولہ :(خبر كان وأخواتها :هو المسند بعد دخولها)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ کان اور اس کے اخوات کی خبر وہ "مسند" ہے جو ان افعالِ ناقصہ کے جملہ اسمیہ پر داخل ہونے کے بعد آئے۔ یہ افعال جب مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں تو مبتدا ان کا اسم بن کر مرفوع رہتا ہے اور خبر ان کی خبر بن کر منصوب ہو جاتی ہے۔ پس خبرِ کان دراصل وہی خبرِ مبتدا ہے جس پر نصب، عاملِ "کان" کی وجہ سے آیا ہے۔ قولہ :(مثل :کان زید قائما) اس مثال میں "قَائِمًا" خبرِ کان ہے اور یہ منصوب ہے۔ دخولِ "کان" سے پہلے جملہ "زَیْدٌ قَائِمٌ" تھا، جہاں "قَائِمٌ" خبرِ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع تھا۔ جب "کان" داخل ہوا تو اس نے خبر کو نصب دیا۔

کان کی خبر کا حکم:

قولہ :(وأمره كأمر خبر المبتدأ)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس کی خبر کا حکم مبتدا کی خبر کی طرح ہے جس طرح مبتدا کی خبر مفرد ہوتی ہے اسی طرح "کَانَ" کی خبر بھی مفرد ہوتی ہے اور جس طرح مبتدا کی خبر نکرہ ہوتی ہے اسی طرح "کَانَ" کی خبر بھی نکرہ ہوتی ہے وغیرہ۔

ایک خاص حکم

قولہ :(ويتقدّم على اسمها معرفة)

یہاں مصنفؒ نے مبتدا اور کان کی خبر کے درمیان فرق کو بیان فرمایا ہے کہ مفرد نکرہ وغیرہ ہونے میں ایک ہی حکم ہے مگر جب مبتدا کی خبر بھی معرفہ ہو تو اس وقت مبتدا کی خبر کو مبتدا پر مقدم کرنا بغیر کسی قرینے کے جائز نہیں اس لیے کہ دونوں ہی مرفوع ہوتی ہیں اور التباس کا خوف ہوتا ہے تو مبتدا کو مقدم کیا جائے گا، لیکن کان کی خبر اگرچہ معرفہ ہو پھر بھی اس کو مقدم کرنا جائز ہے کیونکہ وہاں التباس کا خوف نہیں وجہ یہ ہے کہ "کَانَ" کا اسم مرفوع ہوتا ہے اور خبر منصوب فرق واضح ہے جیسے "کَانَ الْقَائِمَ زَیْدٌ" اب یہاں القائم کو زَیْدٌ پر مقدم کیا گیا ہے۔

حزف عامل اور اعرابی صورتیں؛

قد يحذف عامله في مثل :(النّاس مجزيّون بأعمالهم، إن خيرا فخير، وإن شرّا فشرّ). ويجوز مثلها أربعة أوجه.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ کبھی کان (جو کہ خبر کا عامل ہے) کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ یہ حذف سماع پر موقوف ہے اور کثرتِ استعمال کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا: قوله :(في مثل :النّاس مجزيّون بأعمالهم، إن خيرا فخير، وإن شرّا فشرّ) اس مثال میں "إِنْ خَيْرًا فَخَيْرٌ" اور "إِنْ شَرًّا فَشَرٌّ" محلِ استشہاد ہیں۔ یہاں "خَيْرًا" اور "شَرًّا" منصوب ہیں اور ان کا ناصب "كَانَ" محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی :"إِنْ كَانَ عَمَلُهُمْ خَيْرًا فَجَزَاؤُهُمْ خَيْرٌ، وَإِنْ كَانَ عَمَلُهُمْ شَرًّا فَجَزَاؤُهُمْ شَرٌّ"۔ یہاں "كَانَ" کو اس کے اسم سمیت حذف کر دیا گیا اور خبر (خیراً، شراً) کو باقی رکھا گیا جو اس حذف پر دلالت کر رہی ہے۔

قوله :(ويجوز مثلها أربعة أوجه) مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس جیسی ترکیب میں (یعنی جہاں شرط کے بعد اسم آئے) چار صورتیں جائز ہیں :

* "إن خيرٌ فخيرٌ" :دونوں مرفوع۔

پہلا "خيرٌ" فاعل ہے فعلِ محذوف "كان التامة" کا (إن وُجِدَ خيرٌ)، اور دوسرا "فخيرٌ" مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے (فجزاؤهم خيرٌ)۔

* "إن خيرًا فخيرٌ" :پہلا منصوب اور دوسرا مرفوع۔

یہ وہی صورت ہے جسے مصنف نے ذکر کیا ہے، جہاں پہلا اسم خبرِ کان محذوفہ ہے۔

* "إن خيرًا فخيرًا" :دونوں منصوب۔

پہلا خبرِ کان محذوفہ اور دوسرا مفعول بہ لفعل محذوف (فَيُجْزَوْنَ خيراً)۔

* "إن خيرٌ فخيرًا" :پہلا مرفوع اور دوسرا منصوب۔

پہلا فاعلِ کان تامہ محذوفہ اور دوسرا مفعول بہ لفعل محذوف۔

حزف وجوبی؛

ويجب الحذف في مثل :(أمّا أنت منطلقا انطلقت)، أي لأن كنت.

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ بعض مقامات پر "کان" کا حذف کرنا واجب ہوتا ہے، یعنی اسے ذکر کرنا جائز نہیں۔ اس کی مثال "أَمَّا أَنْتَ مُنْطَلِقًا انْطَلَقْتُ" ہے۔ یہاں "مُنْطَلِقًا" منصوب ہے اور اس کا ناصب "كَانَ" ہے جو "أَنْ" مصدریہ کے بعد وجوباً محذوف ہے۔ اس کی اصل تقدیر ہے :"لِأَنْ كُنْتَ مُنْطَلِقًا انْطَلَقْتُ" (میں اس لیے چلا کیونکہ تو چلنے والا تھا)۔ یہاں لامِ تعلیل اور "أَنْ" مصدریہ کی وجہ سے "کان" کا حذف واجب ہے۔

دسواں (۱۰) منصوب إنَّ اور اس کے أخوات کا اسم

اسم (إنّ) وأخواتها: هو المسند إليه بعد دخولها، مثل: (إنّ زيدا قائم).

ترجمہ: (إنَّ) اور اس کے اخوات کا اسم: وہ (اسم) ہے جس کی طرف ان کے داخل ہونے کے بعد اسناد کی جائے، جیسے: (إِنَّ زَيْدًا قَائِمٌ) (بے شک زید کھڑا ہے)۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں إنَّ اور اس کے اخوات کے اسم کا بیان فرما رہے ہیں۔

قولہ: (اسم إنّ وأخواتها: هو المسند إليه بعد دخولها)

مصنفؒ وضاحت فرماتے ہیں کہ "إنّ" اور اس کے اخوات کا اسم وہ "مسند الیہ" (وہ ذات جس کی طرف کوئی خبر منسوب ہو) ہے جو ان حروف کے جملہ اسمیہ پر داخل ہونے کے بعد واقع ہو۔ یاد رہے کہ مبتدا ہی دراصل مسند الیہ ہوتا ہے۔ جب یہ حروفِ مشبہ بالفعل جملے پر داخل ہوتے ہیں تو مبتدا کو نصب دیتے ہیں اور وہ ان کا "اسم" کہلاتا ہے، جبکہ خبر مرفوع رہتی ہے اور ان کی "خبر" کہلاتی ہے۔ تو اسمِ "إنّ" وہی مبتدا ہے جو اب "إنّ" کے عمل کی وجہ سے منصوب ہو گیا ہے۔

قولہ: (مثل: إنّ زيدا قائم) اس مثال میں "زَيْدًا" اسمِ "إنّ" ہے اور یہ منصوب ہے۔ اس حرف کے داخل ہونے سے پہلے جملہ "زَيْدٌ قَائِمٌ" تھا۔ "إنّ" نے داخل ہو کر مسند الیہ (زید) کو نصب دیا اور اسے اپنا اسم بنا لیا۔

گیارھواں (۱۱) منصوب

المنصوب بـ(لا) الّتي لنفي الجنس: هو المسند إليه بعد دخولها، يليها نكرة مضافا أو مشبّها به، مثل: (لا غلام رجل)، و (لا عشرين درهما لك). فإن كان مفردا فهو مبنيّ على ما ينصب به، وإن كان معرفة أو مفصولا بينه وبين (لا) وجب الرّفع والتّكرير. ومثل (قضيّة ولا أبا حسن لها) متأوّل،

ترجمہ: وہ اسم جو (لَا) کے ساتھ منصوب ہے جو نفی جنس کے لیے ہے: وہ (اسم) ہے جس کی طرف اس کے داخل ہونے کے بعد اسناد کی جائے، اس کے فوراً بعد نکرہ ہو جو مضاف یا مشبہ بہ مضاف ہو، جیسے: (لَا غُلَامَ رَجُلٍ) (کسی مرد کا کوئی غلام نہیں)، اور (لَا عِشْرِينَ دِرْهَمًا لَكَ) (تیرے لیے بیس درہم نہیں)۔ پس اگر وہ مفرد ہو تو وہ اس چیز پر مبنی ہے جس کے ساتھ وہ منصوب ہوتا ہے، اور اگر وہ معرفہ ہو یا اس کے اور (لَا) کے درمیان کوئی فاصلہ ہو تو رفع اور تکرار واجب ہے۔ اور (قَضِيَّةٌ وَلَا أَبَا حَسَنٍ لَهَا) کی مثال متأوّل ہے،

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں (لَا) نافیۂ جنس کے ذریعے منصوب ہونے والے اسم کا بیان فرما رہے ہیں۔

اَلْمَنْصُوْبُ بِلَا الَّتِيْ لِنَفْيِ الْجِنْسِ... اس عبارت میں صاحب کتاب نے باقی منصوبات کی طرح "اِسْمِ لَا" کہنے کے بجائے

فرمایا ''اَلْمَنْصُوْبِ لَا اَلَّتِيْ لِنَفْيِ الْجِنْسِ'' کہ لانفئ جنس کا منصوب۔
وجہ اس کی یہی ہے کہ لانفی جنس کا اسم کبھی مرفوع ہوتا ہے کبھی منصوب تو اگر اسم لا فرمایا جاتا تو مطلب یہ ہوتا کہ لانفئ جنس کا اسم لازما منصوب ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسم لا کبھی منصوب ہوگا کبھی مرفوع۔

لا کا اسم منصوب ہونے کے لیے تین شرائط

یليها نكرة مضافا أو مشبّها به، مثل: (لا غلام رجل)، و (لا عشرين درهما لك).

صاحب کتاب نے لا کا اسم منصوب ہونے کے لیے تین شرائط ذکر فرمائی ہیں۔
(۱)۔ يَلِيْهَا کہ ملا ہوا ہو یعنی، لا اور اس کے اسم کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔
(۲)۔ نَكِرَةً مُّضَافَةً کہ نکرہ مضاف ہو۔
(۳)۔ اَوْ مُشَابِهًا بِه کہ مضاف کے مشابہ ہو۔
جیسے: لَا غُلَامَ رَجُلٍ.
کہ یہاں لا اور غلام کے درمیان فاصلہ نہیں دونوں ملے ہوئے اور غلام نکرہ مضاف ہے۔
اور دوسری مثال جیسے: و (لا عشرين درهما لك).
کہ یہاں ''عِشْرِيْنَ دِرْهَمًا'' مشابہ مضاف ہے۔

لا کا اسم معرفہ یا نکرہ ہونے کے وقت اعراب:

فإن كان مفردا فهو مبنيّ على ما ينصب به، وإن كان معرفة أو مفصولا بينه وبين (لا) وجب الرّفع والتّكرير.

یہاں صاحب کتاب نے بیان فرمایا کہ ...اگر اسم مفرد ہو (نہ مضاف ہو نہ مشبہ بہ مضاف) تو وہ مبنی بر فتح ہوتا ہے جیسے (لَا رَجُلَ فِي الدَّارِ)۔ اگر مضاف ہو جیسے (لَا غُلَامَ رَجُلٍ) یا مشبہ بہ مضاف ہو جیسے (لَا طَالِعًا جَبَلًا) تو وہ منصوب ہوتا ہے۔
لا کا اسم جب معرفہ یا نکرہ ہو تو اس وقت...لا کا اسم مرفوع ہوگا اور دوسرے اسم کے ساتھ ...لا کا تکرار واجب ہے۔ جیسے: معرفہ کی مثال۔ (لَا زَيْدٌ فِي الدَّارِ وَلَا عَمْرٌو) اور نکرہ کی مثال جیسے (لَا فِي الدَّارِ رَجُلٌ وَلَا امْرَأَةٌ)۔

(قَضِيَّةٌ وَلَا أَبَا حَسَنٍ لَهَا) کی مثال؛

ومثل (قضيّة ولا أبا حسن لها) متأوّل،

یہ ایک مشہور عربی مقولہ ہے جس کا مطلب ہے "یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا کوئی حل کرنے والا نہیں" (حضرت علیؓ کی طرف اشارہ ہے)۔ یہاں "أَبَا حَسَنٍ" اسم "لا" ہے اور معرفہ ہونے کے باوجود منصوب ہے، لیکن اس سے پہلے بیان ہوا کہ لا کا اسم جب معرفہ ہو تو مرفوع ہوگا اور تکرار لا ہوگا تو بظاہر یہ قاعدے کے خلاف ہے۔
مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس کی تاویل کی جائے گی۔ نحویوں نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ یہاں یہ نکرہ کی تاویل میں ہے، گویا اصل میں "قَضِيَّةٌ ولا مثل أَبِي حَسَنٍ لَهَا" ہے۔

وفی مثل :(لا حول ولا قوّة إلاّ بالله) خمسة أوجه.فتحهما.ونصب الثّانی ورفعه.ورفعهما.ورفع الأوّل-علی ضعف-وفتح الثّانی.

ترجمہ؛ اور (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ) کی مثال میں پانچ صورتیں ہیں:دونوں کا فتحہ، اور دوسرے کا نصب اور رفع۔اور دونوں کا رفع۔اور پہلے کا رفع - ضعف پر-اور دوسرے کا فتحہ۔

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ کے اعراب کی پانچ صورتیں

وفی مثل :(لا حول ولا قوّة إلاّ بالله) خمسة أوجه

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب "لا" مکرر آئے اور دوسرے "لا" کے بعد بھی نکرہ مفرد ہو تو اس میں پانچ صورتین جائز ہیں :

پہلی صورت؛

*لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ :دونوں مبنی بر فتح (یہ سب سے فصیح ہے) اس مثال میں لا نفی جنس کی ہے۔

دوسری صورت؛

*لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةٌ :پہلا مبنی بر فتح، دوسرا مرفوع (دوسرے "لا" کو زائدہ مان کر "قوۃٌ" کا عطف "حول" کے محل پر کیا گیا جو کہ مبتدا ہے)۔

-

تیسری صورت؛

*لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةً :پہلا مبنی بر فتح، دوسرا منصوب اس مثال میں پہلی لا زائد ہے اور دوسری لا نفئ جنس کی ہے۔

چوتھی صورت؛

*لَا حَوْلٌ وَلَا قُوَّةٌ :دونوں مرفوع (دونوں جگہ "لا" کو غیر عامل مان کر)۔

پانچویں صورت؛

*لَا حَوْلٌ وَلَا قُوَّةَ :پہلا مرفوع، دوسرا مبنی بر فتح اس مثال میں پہلی لا مشابہ ہے لیس کے اور دوسری لا برائے نفئ جنس ہے۔ (یہ صورت ضعیف ہے)۔

وإذا دخلت الهمزة لم يتغيّر العمل،ومعناها الاستفهام والعرض والتّمنّی .ونعت المبنیّ الأوّل مفردا یلیه مبنیّ ومعرب،رفعا ونصبا نحو (لا رجل ظریف،وظریف،وظریفا)،وإلاّ فالإعراب.والعطف علی اللّفظ وعلی المحلّ جائز مثل ؛لا أب وابنا........

وابن،ومثل (لا أبا له) و(لا غلامی له) جائز؛تشبیها له بالمضاف،لمشارکته له فی أصل معناه،ومن ثمّ لم یجز (لا أبا فیها) ولیس بمضاف؛لفساد المعنی،خلافا لسیبویه .ویحذف فی مثل :(لا علیك) أی (لا بأس).

ترجمہ؛اور جب ہمزہ داخل ہو تو عمل نہیں بدلتا، اور اس کا معنی استفہام اور عرض اور تمنا ہے۔اور پہلے مبنی کا نعت مفرد ہو اس کے فوراً بعد مبنی اور معرب، رفعاً و نصباً جیسے (لَا رَجُلَ ظَرِيفٌ، وَظَرِيفَ، وَظَرِيفًا)، اور ورنہ اعراب، اور لفظ اور محل پر عطف جائز ہے جیسے :نہ کوئی باپ اور بیٹا۔ ۔ ۔اور بیٹا، اور جیسے (لَا أَبَا لَهُ) اور (لَا غُلَامَيْ لَهُ) جائز ہے؛اس کو مضاف پر قیاس کرتے ہوئے، اپنے اصلی معنی میں اس کے ساتھ شرکت کی وجہ سے، اور اسی لیے (لَا أَبَا فِيهَا) جائز نہیں اور وہ مضاف نہیں ہے؛ معنی کے فساد کی وجہ سے، سیبویہ کے برعکس۔اور وہ حذف کیا جاتا ہے جیسے :(لَا عَلَيْكَ) یعنی (کوئی حرج نہیں)۔

تشریح:

"لا" پر ہمزہ استفہام کا داخل ہونا

وَإِذَا دَخَلَتِ الْهَمْزَةُ لَمْ يَتَغَيَّرِ الْعَمَلُ، وَمَعْنَاهَا الِاسْتِفْهَامُ وَالْعَرْضُ وَالتَّمَنِّي

مصنفؒ بیان کرتے ہیں کہ اگر "لا نفی جنس" پر ہمزہ استفہام (أ) داخل ہو جائے تو اس کے عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، یعنی وہ بدستور اپنے اسم کو نصب دیتا رہے گا۔البتہ اس کے معنی میں تبدیلی آجاتی ہے۔اس صورت میں یہ تین معانی دیتا ہے:

استفہام :جیسے "أَلَا رَجُلَ قَائِمٌ؟" (کیا کوئی بھی مرد کھڑا نہیں ہے؟)

عرض :جیسے "أَلَا مَاءَ تَشْرَبُ؟" (کیا آپ پانی نہیں پئیں گے؟)۔یعنی میں آپ کو پانی پینے کی پیشکش کرتا ہوں۔

تمنی :جیسے "أَلَا مَالَ فَأَتَصَدَّقَ؟" (کاش! کوئی مال ہوتا تو میں صدقہ کرتا)۔

"لا" کی صفت (نعت) کا حکم

قولہ :(ونعت المبنيّ الأوّل۔۔۔) یہاں مصنفؒ اسمِ "لا" کی صفت (نعت) کا حکم بیان فرمار ہے ہیں۔

***پہلی حالت :**

اگر اسمِ "لا" مبنی ہو (یعنی مفرد ہو) اور اس کی نعت بھی مفرد ہو اور اس سے متصل ہو، تو اس نعت میں تین صورتیں جائز ہیں :

پہلی صورت؛

*الفتح (البناء) :"لَا رَجُلَ ظَرِيفَ"۔نعت کو بھی اسمِ "لا" کی طرح مبنی بر فتح پڑھا جائے، کیونکہ یہ دونوں مل کر ایک ہی چیز کو بیان کر رہے ہیں۔

دوسری صورت؛

*الرفع :"لَا رَجُلَ ظَرِيفٌ"۔نعت کو اسمِ "لا" کے محل پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا جائے، کیونکہ اسمِ "لا" مبنی ہونے سے پہلے محلِ رفع میں تھا (بطور مبتدا)۔

تیسری صورت؛

*النصب :"لَا رَجُلَ ظَرِيفًا"۔نعت کو اسمِ "لا" کے لفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے معرب منصوب پڑھا جائے، کیونکہ فتحہ نصب سے مشابہ ہے۔

؛(وإلاّ فالإعراب) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "وَإِلَّا" یعنی اگر مذکورہ بالا شرائط (صفت کا مفرد ہونا اور فاصلہ نہ ہونا) نہ پائی جائیں، تو پھر صفت کا مبنی ہونا جائز نہیں، "فَالْإِعْرَابُ" یعنی اسے صرف معرب پڑھا جائے گا (یا تو حالتِ رفع میں یا نصب میں)۔

مثال (جب صفت مضاف ہو) :

لَا رَجُلَ صَاحِبَ عِلْمٍ فِيهَا (نصب) یا لَا رَجُلَ صَاحِبُ عِلْمٍ فِيهَا (رفع)۔ یہاں صاحب علم مفرد نہ ہونے کی وجہ سے مبنی نہیں ہو سکتا۔

مثال (جب فاصلہ ہو) :

لَا رَجُلَ فِيهَا ظَرِيفٌ (رفع) یا لَا رَجُلَ فِيهَا ظَرِيفًا (نصب)۔ یہاں اسم اور صفت کے درمیان فیہا کا فاصلہ آگیا، اس لیے صفت کو مبنی پڑھنا جائز نہیں۔

اسم لا کا حذف؛

قوله :(ويحذف في مثل :لا عليك) اور کبھی لا کا اسم کسی قرینے کی وجہ سے حذف کیا جاتا ہے، جیسے ''لَا عَلَيْكَ'' اس کی تقدیری عبارت ''لَا بَأْسَ عَلَيْكَ'' ہے یہاں قرینہ موجود ہے وہ یہ کہ لا اور علٰی دونوں حرف ہیں اور حرف حرف پر داخل نہیں ہو سکتا تو ان دونوں کے درمیان ''بَأْسَ'' کا لفظ موجود ہے۔ یعنی ''لَا بَأْسَ عَلَيْكَ'' آپ پر کچھ گناہ، حرج نہیں۔

بارھواں (۱۲) منصوب "مَا وَلَا الْمُشَبَّهَتَيْنِ" بِلَيْسَ

خبر (ما) و (لا) المشبّهتين ب (ليس) :هو المسند بعد دخولهما .وهي لغة أهل الحجاز .وإذا زيدت (إن) مع (ما)، أو انتقض النّفي ب (إلاّ)، أو تقدّم الخبر، بطل العمل .وإذا عطف عليه بموجب فالرّفع.

ترجمہ؛ [ما اور لا مشبہ بلیس کی خبر] "ما" اور "لا" جو "لیس" کے مشابہ ہیں، ان کی خبر :وہ مسند ہے جو ان دونوں کے داخل ہونے کے بعد آئے۔ اور یہ (عمل) اہل حجاز کی لغت ہے۔ اور جب "ما" کے ساتھ "إن" زائدہ کر دیا جائے، یا نفی "إلا" کے ذریعے ٹوٹ جائے، یا خبر مقدم ہو جائے، تو عمل باطل ہو جاتا ہے۔ اور جب اس (خبر) پر کسی مثبت جملے کا عطف کیا جائے تو رفع دیا جائے گا۔

تشریح:

مصنفؒ یہاں سے منصوبات کی آخری قسم، یعنی "خبرِ ما و لا مشبہ بلیس" کا بیان شروع فرمارہے ہیں۔

ما و لا کی لیس کے ساتھ مشابہت؛

قوله :(خبر (ما) و (لا) المشبّهتين ب (ليس) :هو المسند بعد دخولهما)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "ما" اور "لا" جب نفی کے لیے آتے ہیں اور "لیس" کے معنی اور عمل میں مشابہت رکھتے ہیں، تو یہ بھی افعالِ ناقصہ کی طرح عمل کرتے ہیں :اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں۔ ان کی خبر بھی وہی مسند ہوتی ہے جو ان کے داخلے کے بعد آتی ہے۔

مثال :"مَا هَذَا بَشَرًا" (یہ بشر نہیں ہے)۔ یہاں "بَشَرًا" خبرِ "ما" ہے اور منصوب ہے۔

اہل حجاز اور بنو تمیم کا مسلک؛

قولہ :(وهي لغة أهل الحجاز) مصنفؒ وضاحت فرماتے ہیں کہ "ما" اور "لا" کا یہ عمل (یعنی خبر کو نصب دینا) تمام عرب قبائل کا متفقہ علیہ قاعدہ نہیں، بلکہ یہ خاص طور پر اہل حجاز (مکہ و مدینہ اور اطراف کے لوگ) کی لغت ہے۔ دیگر قبائل، جیسے بنو تمیم، انہیں عامل نہیں مانتے اور ان کے بعد مبتدا اور خبر کو اپنی حالت (رفع) پر باقی رکھتے ہیں (مَا زَيْدٌ قَائِمٌ)۔ قرآن کریم حجازی لغت کے مطابق نازل ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل صورتوں میں ما ولا کا عمل باطل ہوتا ہے؛

قولہ :(وإذا زيدت (إن) مع (ما)، أو انتقض النّفي ب(إلاّ)، أو تقدّم الخبر، بطل العمل)

یہاں مصنفؒ ان صورتوں کا ذکر فرما رہے ہیں جن میں "ما اور لا" کا عمل باطل ہو جاتا ہے :

پہلی صورت:

''زِيْدَتْ اِنْ بَعْدَ مَا'' کہ بڑھا دیا جائے، زیادہ کر دیا جائے ما کے بعد اِنْ کو تو اس صورت میں یاد رکھیں کہ اِنْ صرف ما کے بعد آسکتا ہے لا کے بعد نہیں آسکتا تو اس صورت میں بھی ما کا عمل باطل ہو جائے گا، جیسے :مَا اِنْ زَيْدٌ قَائِمٌ

دوسری صورت:

. أو انتقض النّفي ب (إلاّ) کہ اگر خبر الّا کے بعد واقع ہو تو ما اور لا کا عمل باطل ہو جائے گا کیونکہ ما اور لا نفی کے معنی دیتے ہیں اور جب الّا حرف استثناء آگیا تو نفی اثبات میں تبدیل ہو گئی للذا عمل باطل ہے۔ جیسے مَا زَيْدٌ اِلَّا قَائِمٌ لَا رَجُلٌ اِلَّا اَفْضَلَ مِنْکَ

تیسری صورت:

أو تقدّم الخبر، کہ اگر ما کی یا لا کی خبر کو اسم پر مقدم کیا جائے گا تو بھی ان دونوں کا عمل باطل ہو جائے گا وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عامل ضعیف ہیں اور اس کے معمول میں ترتیب شرط ہے جب ترتیب نہیں پائی گئی تو عمل باطل ہو جائے گا، جیسے :مَا قَائِمٌ زَيْدٌ لَا اَفْضَلَ مِنْکَ رَجُلٌ

عطف کی صورت؛

قولہ :(وإذا عطف عليه بموجب فالرّفع) مصنفؒ آخری شرط بیان کرتے ہیں کہ اگر "ما" کی خبر پر کسی ایسے کلمے کا عطف کیا جائے جو مثبت ہو (منفی نہ ہو)، تو معطوف کو مرفوع پڑھنا واجب ہے۔ جیسے :"مَا زَيْدٌ قَائِمًا بَلْ قَاعِدٌ"۔ یہاں "قَاعِدٌ" کو مرفوع پڑھیں گے کیونکہ "بل" کے بعد کلام مثبت ہو گیا ہے۔ اگر عطف بھی منفی حرف سے ہو تو معطوف بھی منصوب ہو سکتا ہے، جیسے :"مَا زَيْدٌ قَائِمًا وَلَا قَاعِدًا"۔

الحمد للہ رب العالمین

منصوبات کی بحث پایہ تکمیل تک پہنچ گئی

تیسرا مقصد مجرورات

المجرورات :ہو ما اشتمل علی علم المضاف إلیہ. والمضاف إلیہ :کلّ اسم نسب إلیہ شیء بواسطۃ حرف الجرّ لفظاً أو تقدیراً، مراداً. فالتّقدیر شرطہ أن یکون المضاف اسماً مجرّداً تنوینہ لأجلہا، وہی معنویّۃ، ولفظیّۃ. فالمعنویّۃ :أن یکون المضاف فیہا غیر صفۃ مضافۃ إلی معمولہا، وہی إمّا بمعنی اللاّم فیما عدا جنس المضاف وظرفہ، أو بمعنی (من) فی جنس المضاف، أو بمعنی (فی) فی ظرفہ وہو قلیل نحو :(غلام زید) و (خاتم فضّۃ) و (ضرب الیوم). وتفید تعریفاً مع المعرفۃ، وتخصیصاً مع النّکرۃ. وشرطہا تجرید المضاف من التّعریف. وما أجازہ الکوفیّون من (الثّلاثۃ الأثواب) وشبہہ من العدد ضعیف.

ترجمہ: مجرورات :وہ (اسم) ہے جو مضاف الیہ کی علامت پر مشتمل ہو۔ اور مضاف الیہ :وہ ہر اسم ہے جس کی طرف کوئی چیز حرف جر کے واسطے سے لفظاً یا تقدیراً نسبت دی جائے، مراداً۔ پس تقدیر کی شرط یہ ہے کہ مضاف ایسا اسم مجرد ہو جس پر تنوین اسی لیے آئی ہو، اور وہ معنویہ اور لفظیہ ہے۔ پس معنویہ :یہ ہے کہ مضاف اس میں صفت نہ ہو جو اپنے معمول کی طرف مضاف ہو، اور وہ یا تو لام کے معنی میں ہے مضاف کی جنس اور ظرف کے علاوہ میں، یا (مِنْ) کے معنی میں مضاف کی جنس میں، یا (فِی) کے معنی میں اس کے ظرف میں اور یہ قلیل ہے جیسے :(غلام زید) اور (خاتم فضّۃ) اور (ضرب الیوم)۔ اور وہ معرفہ کے ساتھ تعریف کا فائدہ دیتی ہے، اور نکرہ کے ساتھ تخصیص کا۔ اور اس کی شرط مضاف کا تعریف سے مجرد ہونا ہے۔ اور کوفیوں نے (الثلاثۃ الأثواب) اور اس جیسے عدد کے جواز کو ضعیف قرار دیا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں مجرورات کا بیان فرمارہے ہیں۔

"مجرورات" کی تعریف:

مصنف رحمہ اللہ تعالی "مجرورات" کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"المجرورات :ہو ما اشتمل علی علم المضاف إلیہ.

مجرورات وہ ہیں جو مضاف الیہ کے علامت پر مشتمل ہوں۔ یعنی فرماتے ہیں کہ علم المضاف الیہ سے مراد وہ تمام اسماء ہیں جو مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں آتے ہیں۔ نحویوں کے نزدیک اسم کے مجرور ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں :

*حرف جر کا داخل ہونا۔ *مضاف الیہ واقع ہونا۔

مصنف رحمہ اللہ نے یہاں مجرورات کا عنوان قائم کرکے اس کی سب سے اہم اور پہلی قسم "مضاف الیہ" کو بیان کیا ہے، کیونکہ اضافت عربی زبان میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے اور اس کے احکام میں تفصیل ہے۔

مضاف الیہ کی تعریف اور اس کی شرائط:

مصنف رحمہ اللہ تعالی مضاف الیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"والمضاف إليه :كلّ اسم نسب إليه شيء بواسطة حرف الجرّ لفظاً أو تقديراً، مراداً."

اور مضاف الیہ ہر وہ اسم ہے جس کی طرف کسی چیز کی نسبت کی جائے حرف جر کے واسطے سے، خواہ وہ حرف جر لفظوں میں موجود ہو، یا مقدر (پوشیدہ) ہو، اور اس کا ارادہ کیا گیا ہو۔

اس تعریف میں چند اہم نکات ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے :

* "كلّ اسم" :مضاف الیہ ہمیشہ اسم ہوتا ہے، فعل یا حرف مضاف الیہ نہیں بن سکتا۔ * "نسب إليه شيء" :یعنی مضاف کی نسبت مضاف الیہ کی طرف کی جاتی ہے۔ جیسے "غلامُ زيدٍ" (زید کا غلام) میں "غلام" کی نسبت "زید" کی طرف ہے۔ * "بواسطة حرف الجرّ" :یہ نسبت درحقیقت ایک حرف جر کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ * لفظاً :جب حرف جر ظاہر ہو، جیسے "مررتُ بزيدٍ" (میں زید کے پاس سے گزرا)۔ یہاں "زید" حرف جر "باء" کی وجہ سے مجرور ہے۔ * تقديراً :جب حرف جر محذوف ہو لیکن معنی میں موجود ہو۔ یہی اضافت کا مقام ہے۔ مثلاً "غلامُ زيدٍ" دراصل "غلامٌ لِزيدٍ" (غلام جو زید کے لیے ہے) کے معنی میں ہے۔ یہاں حرف جر "لام" مقدر ہے۔ * "مراداً" :یعنی اس مقدر حرف جر کا معنی اور ارادہ کلام میں موجود ہو۔ اگر حرف جر کا معنی مراد نہ ہو تو وہ اضافت شمار نہیں ہوگی۔

حرف جر کے مقدر ہونے کی شرط؛

مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حرف جر کے مقدر ہونے کی شرط یہ ہے:

"فالتّقدير شرطه أن يكون المضاف اسماً مجرّداً تنوينه لأجلها، وهي معنويّة، ولفظيّة.

پس حرف جر کے مقدر ہونے کی شرط یہ ہے کہ مضاف ایسا اسم ہو جس سے اضافت کی وجہ سے تنوین کو ہٹا دیا گیا ہو۔ اور یہ اضافت دو قسم کی ہے :معنویہ اور لفظیہ۔

اضافت کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ مضاف پر تنوین یا نونِ تثنیہ و جمع نہیں آتا۔ مثلاً "غلامٌ" سے "غلامُ زيدٍ" اور "طالبانِ" سے "طالبا العلمِ"۔ اس کے بعد مصنف رحمہ اللہ اضافت کی دو اقسام بیان فرماتے ہیں۔

اضافت کی اقسام؛

١. الإضافة المعنوية

مصنف رحمہ اللہ تعالی اضافتِ معنویہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فالمعنويّة :أن يكون المضاف فيها غير صفة مضافة إلى معمولها، وهي إمّا بمعنى اللاّم فيما عدا جنس المضاف وظرفه، أو بمعنى (من) في جنس المضاف، أو بمعنى (في) في ظرفه وهو قليل نحو :(غلام زيد) و(خاتم فضّة) و(ضرب اليوم).

پس اضافتِ معنویہ یہ ہے کہ اس میں مضاف ایسی صفت نہ ہو جو اپنے معمول کی طرف مضاف ہو، اور یہ اضافت یا تو "لام" کے معنی میں ہوتی ہے (مضاف کے جنس اور ظرف کے علاوہ)، یا "مِن" (سے/کا) کے معنی میں ہوتی ہے (مضاف کی جنس بیان کرنے کے لیے)، یا "فِي" (میں) کے معنی میں ہوتی ہے (مضاف کا ظرف بیان کرنے کے لیے) اور یہ (آخری قسم) کم ہے۔ جیسے :

"غلامُ زیدٍ" (زید کا غلام)، "خاتمُ فضّةٍ" (چاندی کی انگوٹھی)، اور "ضربُ الیومِ" (آج کے دن کی مار)۔

*** تعریف :**

اضافتِ معنویہ وہ ہے جس میں مضاف، صفت کا صیغہ (اسم فاعل، اسم مفعول، صفت مشبہ) ہو کر اپنے معمول (فاعل یا مفعول) کی طرف مضاف نہ ہو۔

***حروف جر مقدرہ :**

اس اضافت میں تین حروف جر مقدر ہوتے ہیں :

* اللام (لِ) : یہ ملکیت یا اختصاص کے لیے آتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مثال :"غلامُ زیدٍ" دراصل "غلامٌ لِزیدٍ" (غلام جو زید کا ہے) کے معنی میں ہے۔

*مِن : یہ جنس کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یعنی جب مضاف، مضاف الیہ کا حصہ یا اس کی جنس سے ہو۔ مثال :"خاتمُ فضّةٍ" دراصل "خاتمٌ مِنْ فضّةٍ" (انگوٹھی جو چاندی سے بنی ہے) کے معنی میں ہے۔

*فِي : یہ ظرفیت (وقت یا جگہ) کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ مثال :"ضربُ الیومِ" دراصل "ضربٌ فِي الیومِ" (مار جو آج کے دن میں واقع ہوئی) کے معنی میں ہے۔

اضافت معنویہ کا فائدہ؛

مصنف رحمہ اللہ اس اضافت کا فائدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وتفيد تعريفا مع المعرفة، وتخصيصا مع النّكرة. وشرطها تجريد المضاف من التّعريف.

اور یہ (اضافتِ معنویہ) مضاف الیہ کے معرفہ ہونے کی صورت میں مضاف کو "تعریف" (معرفہ بنانا) کا فائدہ دیتی ہے، اور مضاف الیہ کے نکرہ ہونے کی صورت میں " تخصیص" (خاص کرنا) کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اس کی شرط یہ ہے کہ مضاف کو "ال" تعریف سے خالی رکھا جائے۔

***تعریف (معرفہ بنانا) :**

اگر مضاف (نکرہ) کو معرفہ کی طرف مضاف کیا جائے تو وہ بھی معرفہ بن جاتا ہے۔ جیسے "غلام" نکرہ تھا، لیکن "غلامُ زیدٍ" میں "زید" (معرفہ) کی طرف اضافت کی وجہ سے "غلام" بھی معرفہ ہو گیا۔

*** تخصیص (خاص کرنا) :**

اگر مضاف (نکرہ) کو نکرہ کی طرف مضاف کیا جائے تو اس میں تخصیص پیدا ہو جاتی ہے، یعنی اس کا عموم کم ہو جاتا ہے۔ جیسے "غلام" کوئی بھی غلام ہو سکتا ہے، لیکن "غلامُ رجلٍ" (ایک آدمی کا غلام) کہنے سے یہ کچھ خاص ہو گیا۔

***شرط :**

اضافتِ معنویہ میں مضاف پر "ال" داخل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا "الغلامُ زیدٍ" کہنا جائز نہیں ہے۔

کوفیین کے قول کارد؛

مصنف رحمہ اللہ کوفیوں کے ایک ضعیف قول کا ذکر کرتے ہیں:

"وما أجازه الكوفيّون من (الثّلاثة الأثواب) وشبهه من العدد ضعيف.

اور جو کوفیوں نے "الثلاثةُ الأثوابِ" اور اس جیسی عددی تراکیب کو جائز قرار دیا ہے، وہ ضعیف ہے۔

بصری نحویوں کے نزدیک عدد اور معدود کی اضافت، اضافتِ معنویہ ہے، للذا عدد (مضاف) پر "ال" داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن کوفی نحوی اس کی اجازت دیتے ہیں، جسے جمہور نحویوں نے ضعیف قرار دیا ہے۔ صحیح ترکیب "ثلاثةُ الأثوابِ" ہے۔

اضافت لفظیہ

واللّفظيّة أن يكون صفة مضافة إلى معمولها، مثل (ضارب زيد) و (حسن الوجه)، ولا تفيد إلاّ تخفيفا في اللّفظ، ومن ثمّ جاز (مررت برجل حسن الوجه)، وامتنع (بزيد حسن الوجه)، وجاز (الضّاربا زيد)، و (الضّاربو زيد)، وامتنع (الضّارب زيد)، خلافا للفرّاء، وضعف:

الواهب المائة الهجان وعبدها ....

وإنّما جاز (الضّارب الرّجل) حملا على المختار في (الحسن الوجه) و (الضّاربك) وشبهه فيمن قال إنّه مضاف حملا على (ضاربك)، ولا يضاف موصوف إلى صفته، ولا صفة إلى موصوفها، ومثل: (مسجد الجامع)، و (جانب الغربيّ)، و (صلاة الأولى)، و (بقلة الحمقاء) متأوّل، ومثل: (جرد قطيفة)، و (أخلاق ثياب) متأوّل.

ترجمہ؛اور لفظیہ: یہ ہے کہ مضاف صفت ہو جو اپنے معمول کی طرف مضاف ہو، جیسے (ضارب زيد) اور (حسن الوجه)، اور وہ لفظ میں تخفیف کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیتی، اور اسی لیے (مررت برجل حسن الوجه) جائز ہے، اور (بزيد حسن الوجه) منع ہے، اور (الضاربا زيد) اور (الضاربو زيد) جائز ہے، اور (الضارب زيد) منع ہے، فراء کے برعکس، اور یہ شعر ضعیف ہے: الواهب المائة الهجان وعبدها .....) اور (الضارب الرجل) صرف اسی وجہ سے جائز ہوا کہ اس کو (الحسن الوجه) اور (الضاربك) اور اس جیسے میں مختار قول پر محمول کیا گیا ہے جس نے کہا کہ یہ مضاف ہے اس کو (ضاربك) پر محمول کرتے ہوئے۔اور موصوف اپنی صفت کی طرف مضاف نہیں ہوتا، اور نہ صفت اپنے موصوف کی طرف، اور جیسے: (مسجد الجامع)، اور (جانب الغربيّ)، اور (صلاة الأولى)، اور (بقلة الحمقاء) متاوّل ہیں۔اور جیسے: (جرد قطيفة)، اور (أخلاق ثياب) متاوّل ہیں۔

تشریح:

اضافتِ لفظیہ کی تعریف

مصنف رحمہ اللہ تعالی اضافتِ لفظیہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"واللّفظيّة أن يكون صفة مضافة إلى معمولها، مثل (ضارب زيد) و (حسن الوجه)، ولا تفيد إلاّ تخفيفا في اللّفظ.

اور (اضافتِ) لفظیہ یہ ہے کہ مضاف صفت (اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ) ہو اور اپنے معمول کی طرف مضاف ہو، جیسے "ضاربُ زیدٍ" (زید کو مارنے والا) اور "حسنُ الوجهِ" (خوبصورت چہرے والا)۔ اور یہ صرف لفظ میں تخفیف (ہلکا پن) کا فائدہ دیتی ہے۔

***تعریف :**

اس اضافت میں مضاف ہمیشہ صفت کا صیغہ ہوتا ہے (جیسے ضارب، مضروب، حسن) اور مضاف الیہ اسی صفت کا معمول (فاعل یا مفعول) ہوتا ہے۔ مثال :"ضاربُ زیدٍ" دراصل "ضاربٌ زیداً" (مارنے والا زید کو) تھا۔ یہاں "زید" دراصل "ضارب" کا مفعول بہ ہے۔

***اضافت لفظیہ کا فائدہ :**

اس کا فائدہ (تعریف یا تخصیص) نہیں ہوتا، بلکہ صرف لفظی تخفیف مقصود ہوتی ہے۔ یعنی تنوین یا نون کو حذف کرکے کلام میں آسانی پیدا کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے، چونکہ یہ تعریف یا تخصیص کا فائدہ نہیں دیتی،

اضافتِ لفظیہ کا اہم حکم اور اس کی دلیل

"ومن ثمّ جاز (مررت برجل حسن الوجه)، وامتنع (بزيد حسن الوجه)، وجاز (الضّاربا زيد)، و(الضّاربو زيد)، وامتنع (الضّارب زيد)، خلافاً للفرّاء.

. مصنفؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ اضافت صرف لفظی تخفیف کے لیے ہے، یہ مضاف میں تعریف (معرفہ ہونا) یا تخصیص کا فائدہ نہیں دیتی۔ یعنی اگر مضاف نکرہ ہو تو وہ اس اضافت کے بعد بھی نکرہ ہی رہتا ہے۔ اسی قاعدے کی بناپر :

مررتُ برجلٍ حسنِ الوجهِ کہنا جائز ہے :یہاں "رجلٍ" موصوف ہے جو کہ نکرہ ہے، اور اس کی صفت "حسنِ الوجهِ" ہے۔ چونکہ اضافتِ لفظیہ سے "حسن" معرفہ نہیں ہوا بلکہ نکرہ ہی رہا، اس لیے ایک نکرہ (حسن) دوسرے نکرہ (رجل) کی صفت بن سکتا ہے۔

مررتُ بزیدٍ حسنِ الوجهِ کہنا ناجائز (ممتنع) ہے :یہاں "زیدٍ" موصوف ہے جو کہ معرفہ (اسم علم) ہے۔ اس کی صفت "حسنِ الوجهِ" ہے۔ چونکہ اضافتِ لفظیہ نے "حسن" کو معرفہ نہیں بنایا، وہ نکرہ ہی رہا۔ اور نحو کا قاعدہ ہے کہ نکرہ، معرفہ کی صفت نہیں بن سکتا۔ للذا یہ ترکیب درست نہیں۔

صفت پر الف لام (ال) داخل ہونے کا مسئلہ :

مصنفؒ اس قاعدے کو مزید واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر صفت (اسم فاعل وغیرہ) پر "ال" داخل ہو تو اس کی اضافت کی چند صورتیں ہیں:

الضّاربا زیدٍ اور الضّاربو زیدٍ جائز ہے :تثنیہ اور جمع مذکر سالم) کی صورت میں "ال" والی صفت کی اضافت جائز ہے۔ یہاں اصل میں "الضاربانِ" اور "الضاربون" تھا، اضافت کی وجہ سے نون گر گیا۔

الضَّاربُ زیدٍ ناجائز (ممتنع) ہے :

جمہور نحویوں کے نزدیک مفرد صفت پر جب "ال" داخل ہو تو اس کی اضافت جائز نہیں، کیونکہ "ال" اور اضافت دونوں تعریف کے ذرائع ہیں اور ایک اسم پر دو معرف کرنے والی چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

خلافاً للفرّاء :

امام فرّاءؒ جو کوفہ کے ایک بڑے نحوی ہیں، وہ اس صورت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی دلیل میں ایک شعر پیش کیا ہے:

"الواهِبُ المائةَ الهِجانَ وعبدَها" وہ شخص جو سو سفید اونٹنیاں اور ان کا غلام عطا کرنے والا ہے"۔

اس شعر میں "الواهِبُ" مفرد صفت ہے جس پر "ال" داخل ہے اور اس کی اضافت "المائة" کی طرف کی گئی ہے۔

وضعف :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام فرّاء کا یہ استدلال کمزور (ضعیف) ہے کیونکہ یہ ایک شاذ مثال ہے جو فصیح عربی کے عام اصولوں کے خلاف ہے اور ممکن ہے کہ یہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے ہو۔

چند مستثنیٰ صورتیں

مصنف رحمہ اللہ کچھ جائز صورتوں کی توجیہ بیان کرتے ہیں:

"وإنّما جاز (الضّارب الرّجل) حملا على المختار في (الحسن الوجه) و (الضّاربك) وشبهه فيمن قال إنّه مضاف حملا على (ضاربك).

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ "الضّاربُ زیدٍ" ناجائز ہے، لیکن کچھ ملتی جلتی صورتیں جائز ہیں جن کی وجہ قیاس ہے:

الضّاربُ الرّجُلِ جائز ہے :یہ اس لیے جائز ہے کہ اسے **الحسنُ الوجهِ** پر قیاس کیا گیا ہے۔ جس طرح صفتِ مشبہ (الحسن) پر "ال" کے ساتھ اس کے معمول (الوجه) کی طرف اضافت بالاتفاق جائز ہے، اسی طرح اسم فاعل کو بھی اس پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیا گیا، بشرطیکہ مضاف الیہ (معمول) پر بھی "ال" ہو۔

الضّاربُكَ (تیرا مارنے والا) جائز ہے :جب اسم فاعل ضمیر کی طرف مضاف ہو تو اس پر "ال" کا آنا جائز ہے۔ اسے **ضاربُكَ** پر قیاس کیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح "ال" کے بغیر ضمیر کی طرف اضافت ہوتی ہے، اسی طرح "ال" کے ساتھ بھی جائز ہے۔

. موصوف اور صفت کی اضافت کا حکم؛

ولا يضاف موصوف إلى صفته، ولا صفة إلى موصوفها.

مصنفؒ ایک نیا اور اہم قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ موصوف اپنی صفت کی طرف مضاف نہیں ہو سکتا۔ صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف نہیں ہو سکتی۔

یہ اس لیے کہ اضافت میں مضاف اور مضاف الیہ دو الگ الگ ذاتیں ہوتی ہیں، جبکہ موصوف اور صفت ایک ہی ذات کے دو پہلو ہوتے ہیں۔

مثلاً "رجلٌ فاضلٌ" میں "رجل" کو "فاضل" کی طرف مضاف کر کے "رجلُ الفاضلِ" کہنا غلط ہے۔

ظاہری طور پر قاعدے کے خلاف مثالوں کی تاویل:

عرب کلام میں کچھ ایسی مثالیں ملتی ہیں جو بظاہر اوپر بیان کردہ قاعدے کے خلاف نظر آتی ہیں۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام مثالیں تاویل شدہ ہیں (یعنی ان کی اصل ترکیب کچھ اور ہے)۔

موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی مثالیں اور ان کی تاویل:

ومثل :(مسجدالجامع)،و(جانب الغربيّ)،و(صلاةالأولى)،و(بقلة الحمقاء)متأوّل.

مسجدُالجامعِ :بظاہر "مسجد" (موصوف) کو "الجامع" (صفت) کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ یہاں ایک موصوف محذوف ہے۔ اصل عبارت ہے :مسجدُالمکانِ الجامعِ (جمع کرنے والی جگہ کی مسجد)۔

جانبُ الغربِيِّ :اس کی تاویل ہے جانبُ المکانِ الغربِيِّ (مغربی جگہ کا کنارہ)۔

صلاةُالأولى :اس کی تاویل ہے صلاةُالساعةِالأولى (پہلی گھڑی کی نماز)۔

بقلةُالحمقاءِ :اس کی تاویل ہے بقلةُالنبتةِالحمقاءِ (احمق پودے کی سبزی)۔ ان تمام مثالوں میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان ایک موصوف کو محذوف مان کر قاعدے کو برقرار رکھا گیا ہے۔

صفت کی موصوف کی طرف اضافت کی مثالیں اور ان کی تاویل:

ومثل :(جرد قطيفة)،و(أخلاق ثياب)متأوّل.

جرْدُقطیفةٍ (گھسی ہوئی چادر) :بظاہر "جرْد" (صفت بمعنی بوسیدہ) کو "قطیفة" (موصوف بمعنی چادر) کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ یہ اضافت بیانیہ ہے، یعنی حرفِ جر "مِنْ" کے معنی میں ہے۔ اصل عبارت ہے :جَرْدٌمِن قطیفةٍ (ایک بوسیدہ چیز جو چادر میں سے ہے)۔

أخلاقُ ثیابٍ (پھٹے پرانے کپڑے) :اس کی بھی وہی تاویل ہے، یعنی أخلاقٌ مِن ثیابٍ (بوسیدہ چیزیں جو کپڑوں میں سے ہیں)۔

اضافت کی چند مزید شرائط

ولا يضاف اسم مماثل للمضاف إليه في العموم والخصوص،ك(ليث)و(أسد)،و(حبس)و(منع)،لعدم الفائدة،بخلاف (كلّ الدّراهم)و(عين الشّيء)،فإنّه يختصّ.وقولهم :(سعيد كرز)ونحوه متأوّل.وإذا أضيف الاسم الصّحيح،أو الملحق به إلى ياء المتكلّم كسر آخره،والياء مفتوحة أو ساكنة.فإن كان آخره ألفا تثبت،وهذيل تقلبها لغير التّثنية ياء.وإن كان ياء أدغمت.وإن كان واوا قلبت ياء وأدغمت وفتحت الياء للسّاكنين.

ترجمہ :اور کوئی ایسا اسم مضاف نہیں کیا جاتا جو عموم و خصوص میں مضاف الیہ کے مماثل (برابر) ہو، جیسے (لَیث) اور (أَسَد)، اور (حَبْس) اور (مَنْع)؛ کیونکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ بخلاف (كُلُّ الدَّرَاهِمِ) اور (عَيْنُ الشَّيْءِ) کے، کیونکہ اس

(اضافت) سے تخصیص پیدا ہوتی ہے۔اور عربوں کا قول (سَعِیدُ کُرْزٍ) اور اس جیسی مثالیں تاویل شدہ ہیں۔اور جب اسم صحیح یا اس کے ساتھ ملحق اسم کو یاء متکلم کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کے آخر کو کسرہ دیا جاتا ہے، اور یاء مفتوح یا ساکن ہوتی ہے۔ پس اگر اس (اسم) کے آخر میں الف ہو تو وہ باقی رہتا ہے، اور قبیلہ ہذیل تثنیہ کے علاوہ میں اسے یاء سے بدل دیتا ہے۔اور اگر وہ (اسم کا آخری حرف) یاء ہو تو اس کا ادغام کر دیا جاتا ہے۔اور اگر وہ واو ہو تو اسے یاء سے بدل کر ادغام کر دیا جاتا ہے اور دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے یاء کو فتحہ دیا جاتا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے اضافت کی چند مزید شرائط اور اسم کو یاء متکلم کی طرف مضاف کرنے کے قواعد بیان فرما رہے ہیں۔

·اضافت کی شرط :

مضاف اور مضاف الیہ کا تماثل (یکساں ہونا)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اضافت کے جائز ہونے کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ مضاف، عمومیت (نکرہ ہونا) اور خصوصیت (معرفہ ہونا) میں مضاف الیہ کے بالکل برابر نہ ہو، یعنی دونوں ہم معنی اور ہم رتبہ نہ ہوں۔

لِعَدَمِ الْفَائِدَةِ (فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے) :اس کی وجہ یہ ہے کہ اضافت کا بنیادی مقصد دو میں سے ایک ہوتا ہے:

تخصیص :

نکرہ کو معرفہ کی طرف مضاف کرکے اس میں کچھ خاص پن پیدا کرنا، جیسے "غلامُ زیدٍ"۔

تعیم (یا توضیح) :

معرفہ کو نکرہ کی طرف مضاف کرکے اس کی جنس بیان کرنا، جیسے "خاتمُ فضة "۔جب مضاف اور مضاف الیہ ہم معنی ہوں گے تو ان میں سے کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔مثالیں:لیثُ أُسدٍ کہنا جائز نہیں :کیونکہ "لیث" اور "اسد" دونوں شیر کے مترادف نام ہیں اور دونوں عمومیت میں برابر (نکرہ) ہیں۔اس اضافت سے کلام میں کوئی نیا معنی پیدا نہیں ہوا۔

حبسُ مُنعٍ کہنا جائز نہیں :کیونکہ "حبس" (قید کرنا) اور "منع" (روکنا) تقریباً ہم معنی ہیں اور دونوں مصدر ہونے میں برابر ہیں۔

بخلاف… (اس کے برعکس) :مصنفؒ کچھ ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جو بظاہر اس قاعدے کے خلاف لگتی ہیں لیکن در حقیقت ان میں فائدہ موجود ہے۔

كُلُّ الدَّرَاهِمِ کہنا جائز ہے :اگرچہ "کل" (سب) ایک عام لفظ ہے، لیکن جب اسے "الدراھم" کی طرف مضاف کیا جاتا ہے تو یہ احاطہ اور شمول کا فائدہ دیتا ہے، یعنی تمام دراہم کو ایک ایک کرکے شامل کرنا۔یہ وہ فائدہ ہے جو صرف "الدراھم" کہنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

عَيْنُ الشَّيْءِ کہنا جائز ہے: یہاں "عین" کا لفظ مجاز کے احتمال کو ختم کرنے کا فائدہ دیتا ہے۔ "جاءَ زیدٌ" کہنے سے ہو سکتا ہے کہ زید کا قاصد یا اس کی خبر آئی ہو، لیکن "جاءَ زیدٌ عینُهٗ" کہنے سے یہ شک دور ہو جاتا ہے کہ زید خود آیا ہے۔

وقولہم (سعید کرز) متأوّل :

عربوں کے ہاں "سعیدُ کرزٍ" ایک نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بظاہر "سعید" بھی معرفہ (علم) ہے اور "کرز" بھی معرفہ (علم) ہے۔ تو یہ دو مماثل چیزوں کی اضافت لگتی ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس میں تاویل کی جائے گی۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ یہاں پہلے اسم (مضاف) سے مراد "ذات" یا "شخص" ہے اور دوسرے اسم (مضاف الیہ) سے مراد اس کا "نام" ہے۔ تو عبارت کا مطلب ہوگا: "وہ شخص جس کا نام سعید ہے، جو کرز کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

" (المسمّی بسعیدٍ کرزٍ)۔ یہ اضافت تخصیص اور وضاحت کے لیے ہے تاکہ اس سعید کو دوسرے سعید نامی افراد سے ممتاز کیا جاسکے۔

اسم کا یاءِ متکلم کی طرف مضاف ہونا؛

مصنفؒ یہاں سے یہ بیان فرما رہے ہیں کہ جب کسی اسم کو یاءِ متکلم (میرا/میری) کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کی آخری حرکت میں کیا تبدیلی آتی ہے۔

اس کی چار صورتیں ہیں:

پہلی صورت؛

وإذا أضيف الاسم الصّحيح، أو الملحق به إلى ياء المتكلّم كسر آخره، والياء مفتوحة أو ساكنة.

اسم صحیح الآخر یا اس کے حکم میں ہو: اسم صحیح: وہ اسم جس کے آخر میں حرف علت (ا، و، ی) نہ ہو، جیسے "کتاب"، "غلام"۔

الملحق بہ: وہ اسم جو صحیح کے حکم میں ہو، یعنی جس کا آخری حرف واو یا یاء ہو اور ما قبل ساکن ہو، جیسے "دَلْوٌ"، "ظَبْيٌ"۔ قاعدہ: اس اسم کے آخری حرف کو یاء کی مناسبت سے کسرہ (زیر) دیا جائے گا، اور یاءِ متکلم کو ساکن (یْ) یا مفتوح (یَ) دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

مثال :

"غُلَامِيْ یا غُلَامِيَ اور دَلْوِيْ یا دَلْوِيَ اور ظَبْيِيْ یا ظَبْيِيَ"۔

دوسری صورت؛

فإن كان آخره ألفا تثبت، وهذيل تقلبها لغير التّثنية ياء.

اسم مقصور ہو (آخر میں الف ہو): اسم مقصور: وہ اسم جس کے آخر میں الف لازمہ ہو، جیسے "عصاً"، "فتی"۔

قاعدہ (جمہور) :

الف اپنی حالت پر باقی رہے گا (تثبت) اور یاءِ متکلم پر ہمیشہ فتحہ (زبر) آئے گا تاکہ دو ساکن (الف اور یاء) جمع نہ ہو جائیں۔ مثال: "عصا + ي" سے "عَصَايَ" (میری لاٹھی)۔ "فتى + ي" سے "فَتَايَ" (میرا نوجوان)۔

قبیلہ ہذیل کا لہجہ :

قبیلہ ہذیل (تثنیہ کے علاوہ) اس الف کو یاء سے بدل کر پچھلی یاء میں مدغم کر دیتا ہے۔ مثال: "عصا" سے "عَصَيَّ"۔

تیسری صورت؛

وإن كان ياء أدغمت.

اسم منقوص ہو (آخر میں یاء ہو): اسم منقوص: وہ اسم معرب جس کے آخر میں یاء لازمہ ہو اور اس کا ماقبل مکسور ہو، جیسے "القَاضِي"۔

قاعدہ :

اسم کی اصلی یاء کو یاءِ متکلم میں ادغام کر دیا جائے گا اور یاءِ مشدد پر فتحہ آئے گا۔ مثال: "قَاضِي + ي" سے "قَاضِيَّ"

چوتھی صورت؛

وإن كان واوا قلبت ياء وأدغمت وفتحت الياء للسّاكنين.

اسم کے آخر میں واو ہو: یہ صورت عام طور پر جمع مذکر سالم کی حالتِ رفعی میں پیش آتی ہے جب اس کا نون اضافت کی وجہ سے گر جائے۔ جیسے "مسلمون"۔

قاعدہ:

اس واو کو یاء سے بدلا (قلبت) جائے گا تاکہ یاءِ متکلم سے ہم آہنگی ہو جائے۔ واو سے پہلے والے ضمہ (پیش) کو کسرہ (زیر) سے بدلا جائے گا۔ پھر اس بدلی ہوئی یاء کو یاءِ متکلم میں ادغام (اُدغمت) کر دیا جائے گا۔ آخر میں دو ساکن جمع ہونے سے بچنے کے لیے مشدد یاء کو فتحہ (فتحت الیاء) دیا جائے گا۔

مثال

: "مسلمون + ي" مراحل: "مُسْلِمُوْنَ" -> "مُسْلِمُوْيَ" (نون گرا) -> "مُسْلِمِيْيَ" (واو کو یاء سے اور ضمہ کو کسرہ سے بدلا) -> مُسْلِمِيَّ (دو یاء کا ادغام کر دیا گیا)۔ مطلب: "میرے مسلمان"۔

اسمائے ستہ کی یائے متکلم کی طرف اضافت؛

وأمّا الأسماء السّتّة ف(أخي) و(أبي)، وأجاز المبرّد (أخيّ) و(أبيّ). وتقول: (حميّ وهنيّ)، ويقال (فيّ) في الأكثر، و(فمي). وإذا قطعت قيل: (أخ) و(أب) و(حم)، و(هن) و(فم)، وفتح الفاء أفصح منهما. وجاء (حم) مثل (يد) و(خبء) و(دلو) و(عصا) مطلقا. وجاء (هن) مثل (يد) مطلقا. و(ذو) لا يضاف إلى مضمر، ولا يقطع عن الإضافة.

ترجمہ: اور رہے اسماء ستہ تو (ان میں سے) "أَخِي" اور "أَبِي" (بھی ہیں)، اور مبرد نے "أَخِيّ" اور "أَبِيّ" کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

اور تو کہتا ہے: "حمِيّ" اور "هنِيّ"۔ اور اکثر طور پر "فِيّ" کہا جاتا ہے، اور "فمِي" (بھی کہا جاتا ہے)۔ اور جب یہ (اسماء) اضافت سے منقطع ہوں تو "أخٌ"، "أبٌ"، "حمٌ"، "هنٌ" اور "فمٌ" کہا جاتا ہے، اور (فمٌ میں) فاء کا فتحہ (فَمٌ) ان دونوں (ضمہ اور کسرہ) سے زیادہ فصیح ہے۔ اور "حمٌ" مطلقاً "یدٌ"، "خبءٌ"، "دلوٌ" اور "عصًا" کی طرح (معرب بالحرکات) آیا ہے۔ اور "هنٌ" مطلقاً "یدٌ" کی طرح (معرب بالحرکات) آیا ہے۔ اور "ذو" نہ تو اسم ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور نہ ہی اضافت سے منقطع ہوتا ہے۔

تشریح:

وأمّا الأسماء السّتّة ف(أخي) و(أبي)، وأجاز المبرّد (أخيّ) و(أبيّ). وتقول: (حميّ وهنيّ)، ويقال (فيّ) في الأكثر، و(فمي).

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے اسماء ستہ مکبّرہ کے ان احوال کو بیان فرمارہے ہیں جو ان کے معرب بالحروف ہونے کی شرائط میں سے کسی شرط کے فوت ہونے کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ گزشتہ مباحث میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اسماء ستہ کا اعراب بالحروف (حالت رفعی میں واؤ، نصبی میں الف اور جری میں یاء کے ساتھ) کچھ شرائط کے ساتھ خاص ہے، جن میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ یاء متکلم کے علاوہ کسی اور اسم کی طرف مضاف ہوں۔

اب مصنفؒ اس صورت کو بیان فرمارہے ہیں جب یہ اسماء یاء متکلم کی طرف مضاف ہوں یا اضافت سے ہی منقطع ہوجائیں۔

(أخيّ) و(أبيّ) کا اعراب:

قوله: وأمّا الأسماء السّتّة ف(أخي) و(أبي)، وأجاز المبرّد (أخيّ) و(أبيّ).

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب اسماء ستہ میں سے "أب" اور "أخ" کو یاء متکلم کی طرف مضاف کیا جائے تو فصیح لغت کے مطابق ان کو "أبِي" اور "أخِي" پڑھا جائے گا، یعنی یاء کو ساکن رکھا جائے گا۔ اس صورت میں ان کا اعراب تقدیری ہوگا، یعنی رفع، نصب اور جر تینوں حالتوں میں ضمہ، فتحہ اور کسرہ مقدر مانا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یاء متکلم اپنے ماقبل کسرہ چاہتی ہے تاکہ اس کا تلفظ آسان ہو، اور اس کسرہ کی وجہ سے اعراب کی ظاہری حرکات (ضمہ، فتحہ) ظاہر نہیں ہوسکتیں۔

پھر مصنفؒ نے امام مبرّد کا قول نقل فرمایا کہ انہوں نے "أب" اور "أخ" کو یاء متکلم کی طرف مضاف کرتے وقت یاء پر تشدید کے ساتھ "أبِيّ" اور "أخِيّ" پڑھنے کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس کی اصل یوں ہے کہ "أبوٌ" اور "أخوٌ" میں واؤ کو یاء سے بدلا گیا، پھر اس یاء کا یاء متکلم میں ادغام کردیا گیا جس سے "أبِيّ" اور "أخِيّ" حاصل ہوا۔ اس صورت میں بھی اعراب تقدیری ہی ہوگا۔

(حميّ وهنيّ)، (فيّ) اور (فمي) کا اعراب:

قوله: وتقول: (حميّ وهنيّ)، ويقال (فيّ) في الأكثر، و(فمي).

اس عبارت میں مصنفؒ باقی اسماء ("حم"، "هن" اور "فم") کے یاء متکلم کی طرف مضاف ہونے کا حکم بیان فرمارہے ہیں۔

"حمِيّ" "هنِيّ" "حم" (سسرالی) اور "هن" (کنایہ عن الشیء) کو جب یاء متکلم کی طرف مضاف کیا جائے تو ان میں یاء کا ادغام واجب ہے، یعنی انہیں "حمِيّ" اور "هنِيّ" ہی کہا جائے گا۔ ان کو بغیر ادغام کے "حَمِيي" یا "هَنِيي" کہنا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ ان اسماء کا آخری حرف واؤ تھا ("حَمَوٌ"، "هَنَوٌ")، جو یاء میں تبدیل ہو کر یاء متکلم میں مدغم ہو گیا۔

فِيَّ و فمي :"فم" (منہ) کے بارے میں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب اسے یاء متکلم کی طرف مضاف کیا جائے تو اکثر اہل لغت اس کی میم کو حذف کر کے "فُو" کو باقی رکھتے ہیں اور پھر اس واؤ کو یاء سے بدل کر یاء متکلم میں ادغام کر دیتے ہیں، جس سے "فِيَّ" بنتا ہے، یہ فصیح اور اکثری استعمال ہے۔ تاہم، بعض قبائل میم کو حذف نہیں کرتے اور اسے "فمي" پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں اعراب تقدیری ہوگا جیسا کہ "غلامی" میں ہوتا ہے۔

جب یہ اسمائے ستہ اضافت سے کاٹے جائیں

قوله :وإذا قطعت قيل :(أخ)و(أب)و(حم)،و(هن)و(فم)،وفتح الفاء أفصح منهما .

یہاں سے مصنفؒ اس صورت کا حکم بیان فرما رہے ہیں جب یہ اسماء اضافت سے منقطع ہو جائیں، یعنی ان کے بعد کوئی مضاف الیہ نہ ہو۔ یہ بھی ان کے معرب بالحروف ہونے کی شرط کے خلاف ہے۔ جب یہ اسماء مضاف نہ ہوں تو یہ عام اسماء کی طرح معرب بالحرکات ہوں گے، یعنی ان پر رفع، نصب اور جر کی حرکات (ضمہ، فتحہ، کسرہ) ظاہر ہوں گی۔ چنانچہ کہا جائے گا :"هذا أَبٌ"، "رأيتُ أبًا"، "مررتُ بأَبٍ"۔ اسی طرح "أَخٌ"، "حمٌ" اور "هنٌ" کا معاملہ ہے۔

فم" کے بارے میں ایک لغوی بحث

البتہ "فم" کے بارے میں ایک لغوی بحث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب یہ اضافت سے منقطع ہو تو اس کی فاء پر تینوں حرکات (فتحہ، ضمہ، کسرہ) منقول ہیں :"فَمٌ"، "فُمٌ"، "فِمٌ"۔ لیکن ان میں سے فاء کا فتحہ یعنی "فَمٌ" پڑھنا باقی دو صورتوں (ضمہ اور کسرہ) سے زیادہ فصیح اور مشہور ہے۔

قوله :وجاء(حم)مثل(يد)و(خبء)و(دلو)و(عصا)مطلقا .

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اسم "حمٌ" جب اضافت سے منقطع ہو (یعنی مفرد استعمال ہو) تو اس میں نقص، یعنی اس کے آخری حرف (واؤ) کو حذف کر کے اسے معرب بالحرکات پڑھنا "مطلقًا" جائز ہے۔ "مطلقًا" سے مراد یہ ہے کہ چاہے یہ مکبّر ہو یا مصغر، دونوں صورتوں میں اس کا اعراب حرکات کے ساتھ ہوگا۔

مثالیں

مصنفؒ نے اس کی مثالیں دی ہیں :مثل يدٍ :یعنی "حمٌ" دو حرفی اسم "يدٌ" کی طرح ہو جاتا ہے جس کا آخری حرف حذف شدہ ہے۔ مثل خبءٍ :یہ صحیح الآخر اسم کی مثال ہے، یعنی "حمٌ" پر اعراب اسی طرح ظاہر ہوگا جیسے "خبءٌ" پر ہوتا ہے۔ مثل دلوٍ :یہ معتل اللام بالواو کی مثال ہے جو معرب بالحرکات ہوتا ہے۔ مثل عصًا :یہ اسم مقصور کی مثال ہے جس کا اعراب تقدیری ہوتا ہے۔

ان مثالوں کا مقصد یہ بتانا ہے کہ "حمٌ" جب غیر مضاف ہو تو وہ اسماء ستہ کے خصوصی اعراب (بالحروف) سے نکل کر عام اسماء کی طرح معرب بالحرکات ہو جاتا ہے۔

قولہ :وجاء(ھن)مثل(ید)مطلقا.

اسی طرح اسم "ھنٌ" جب اضافت سے منقطع ہو تو وہ بھی "مطلقا" (خواہ مکبّر ہو یا مصغر) "یدٌ" کی طرح ناقص ہو کر معرب بالحرکات استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کا آخری حرف محذوف مانا جاتا ہے اور اسے "ھنٌ" پڑھا جاتا ہے۔

"ذو" کا خاص حکم

قولہ :و(ذو)لا یضاف إلی مضمر،ولا یقطع عن الإضافة.

آخر میں مصنفؒ اسم "ذو" کا خاص حکم بیان فرمار ہے ہیں۔ "ذو" باقی اسماء خمسہ (أب، أخ، حم، ھن، فم) سے دو باتوں میں مختلف ہے:

لا یضاف إلی مضمر :

"ذو" کبھی بھی اسم ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا۔ آپ "ذوك" یا "ذوہ" نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہمیشہ اسم جنس ظاہر کی طرف ہی مضاف ہوتا ہے، جیسے "ذو مالٍ" (مال والا) یا "ذو علمٍ" (علم والا)۔

ولا یقطع عن الاضافۃ :

"ذو" کو کبھی بھی اضافت سے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی یہ ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے۔ آپ صرف "جاء ذو" نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس کے بعد مضاف الیہ نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ذو" کا معنی ہی "صاحب" کا ہے اور صاحب کا تصور کسی نہ کسی مملوک یا متعلق شے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے لیے مضاف الیہ کا ہونا لغوی اور معنوی طور پر لازم ہے۔

الحمد للہ

مقاصد ثلاثہ مکمل ہوئے

توابع کا بیان

"التّوابع :کلّ ثان بإعراب سابقه من جهة واحدة.

"ترجمہ :توابع :ہر وہ دوسرا (لفظ) ہے جو اپنے ماقبل کے اعراب میں ایک ہی جہت سے شریک ہو۔

تشریح:

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نحو کی ایک اہم بحث، یعنی "توابع" کا آغاز فرمار ہے ہیں۔

مصنفؒ جب مقاصد ثلاثہ کے بیان سے فارغ ہوئے جو مرفوعات منصوبات اور مجرورات پر مشتمل تھا جس پر اعراب بالاصالۃ ہوتا ہے یعنی عامل رافع عامل ناصب اور عامل جار لفظوں میں موجود ہوتا ہے۔اب اس بیان سے فارغ ہو کر ایسے اسم کو بیان فرمار ہے ہیں کہ اس کا اعراب بالاصالت نہیں ہوتا بلکہ اپنے ماقبل کے تابع ہوتا ہے۔ماقبل کی تبعیت کی وجہ سے اعراب آتا ہے۔ جیسا اعراب پہلے والے اسم کا ہوا ب دوسرے اسم کا بھی ہوگا۔اس کو تابع کہتے ہیں۔

تابع کی تعریف:

''کلّ ثان بإعراب سابقه من جهة واحدة. '' کہ تابع ہر وہ دوسرا اس معرب ہے جس کا اعراب ایک ہی جہت سے پہلے اسم کے اعراب کے تابع ہو۔ یعنی اگر پہلا اسم فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے تو دوسرا بھی فاعلیت کی بنا پر مرفوع ہے اور اگر پہلا اسم مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے تو دوسرا بھی مفعولیت کی وجہ سے منصوب ہے اور اگر پہلا اسم مضاف الیہ ہونے کے سبب مجرور ہے تو دوسرا بھی مضاف الیہ ہونے کے سبب مجرور ہوگا یہ ''جِهَةٍ وَاحِدَةٍ'' یعنی ایک ہی جہت سے ہو۔

فوائد و قیود:

تعریف میں مصنف نے "کُلُّ ثَانٍ" فرمایا اس میں افعال ناقصہ کی خبر، حروف مشبہ بالفعل کی خبر اور لائے نفی جنس کی خبر داخل تھے کیونکہ یہ بھی دوسرے ہوتے ہیں۔آگے فرمایا "بِـإِعْرَابِ سَابِقِهٖ'' یہ کہہ کر ان تینوں کی خبر کو نکال دیا کیونکہ وہ سابق کے اعراب کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ لیکن مبتدا کی خبر پھر بھی داخل تھی ''مِنْ جِهَةٍ وَاحِدَةٍ'' یہ تعریف کا سب سے اہم جزء ہے۔ "ایک ہی جہت سے "کا مطلب یہ ہے کہ تابع کا اعراب کسی مستقل عامل کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ محض اپنے متبوع کی پیروی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، "جاء رجلٌ عالمٌ" میں "عالمٌ" کا اعراب (رفع) اس لیے نہیں ہے کہ وہ فاعل ہے، بلکہ صرف اس لیے ہے کہ اس کا متبوع "رجلٌ" فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یہ قید اس لیے لگائی گئی تاکہ مبتدا اور خبر جیسی صورتیں تعریف سے خارج ہو جائیں، کیونکہ "زیدٌ قائمٌ" میں "قائمٌ" بھی "زیدٌ" کی طرح مرفوع ہے، لیکن اس کا رفع مبتدا کی پیروی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اپنے عامل (مبتدا کا خبر ہونا) کی وجہ سے ہے۔ پس توابع کا اعراب ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہوتا ہے۔

فائدہ:

کہ توابع کی پانچ قسمیں ہیں وجہ حصریہ ہے؛ تابع خالی نہیں اس بات سے کہ وہ حکم کو واضح کرنے والا ہوگا یا نہیں اگر حکم کو واضح

کرنے والا ہوگا تو وہ تاکید ہے اور اگر حکم کو واضح کرنے والا نہیں تو اس کی دو قسمیں ہیں یا تو وہ مشتق ہوگا یا نہیں اگر وہ مشتق ہے تو وہ **صفت و نعت** ہے اور اگر وہ مشتق نہیں ہے تو وہ **عطف بیان** ہے اور اگر حکم کو واضح کرنے والا ہے تو دیکھا جائے گا کہ حرف کے واسطے سے ہے یا نہیں اگر حرف کے واسطے سے ہے تو وہ **عطف بالحرف** ہے اور اگر حرف کے واسطے سے نہیں تو وہ بدل ہے۔

تابع کی پانچ قسمیں ہیں: (۱)۔ تاکید (۲)۔ عطف بیان (۳)۔ صفت (۴) عطف بالحرف (۵)۔ بدل۔

"وجہ حصر" ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دی۔

نعت(صفت)کابیان

"النّعت :تابع يدلّ على معنى في متبوعه مطلقا. وفائدته تخصيص أو توضيح. وقد يكون لمجرّد الثّناء، أو الذّمّ، أو التّأكيد مثل :{نَفْخَةٌ واحِدَةٌ}. ولا فصل بين أن يكون مشتقًا أو غيره إذا كان وضعه لغرض المعنى عموما مثل :(تميميّ)، و(ذي مال)، أو خصوصا مثل :(مررت برجل أيّ رجل)، و(مررت بهذا الرّجل) و(بزيد هذا). وتوصف النّكرة بالجملة الخبريّة ويلزم الضّمير. ويوصف بحال الموصوف، وبحال متعلّقه نحو (مررت برجل حسن غلامه). فالأوّل يتبعه في الإعراب، والتّعريف والتّنكير، والإفراد والتّثنية والجمع، والتّذكير والتّأنيث. والثّاني يتبعه في الخمس الأول، وفي البواقي كالفعل، ومن ثمّ حسن (قام رجل قاعد غلمانه)، وضعف (قاعدون غلمانه)، ويجوز (قعود غلمانه). والمضمر لا يوصف ولا يوصف به، والموصوف أخصّ أو مساو، ومن ثمّ لم يوصف ذو اللاّم إلاّ بمثله، أو بالمضاف إلى مثله، وإنّما التزم وصف باب (هذا) بذي اللاّم للإبهام، ومن ثمّ ضعف (مررت بهذا الأبيض) وحسن (مررت بهذا العالم).

"ترجمہ: نعت: وہ تابع ہے جو اپنے متبوع میں کسی معنی پر دلالت کرے، مطلقاً۔ اور اس کا فائدہ تخصیص یا توضیح ہے۔ اور کبھی یہ محض تعریف، یا مذمت، یا تاکید کے لیے ہوتا ہے، جیسے: {نَفْخَةٌ واحِدَةٌ}۔ اور اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ وہ (نعت) مشتق ہو یا غیر مشتق، جب اس کی وضع معنی کے ارادے کے لیے ہو، عموماً جیسے: (تميميّ) اور (ذي مال)، یا خصوصاً جیسے: (مررت برجل أيّ رجل) اور (مررت بهذا الرّجل) اور (بزيد هذا)۔ اور نکرہ کی صفت جملہ خبریہ کے ساتھ لائی جاتی ہے اور ضمیر کا ہونا لازم ہے۔ اور (نعت) موصوف کے حال کے ساتھ اور اس کے متعلق کے حال کے ساتھ لائی جاتی ہے، جیسے (مررت برجل حسن غلامه)۔ پس پہلی قسم (نعت حقیقی) اپنے متبوع کی اعراب، تعریف و تنکیر، افراد و تثنیہ و جمع، اور تذکیر و تانیث میں پیروی کرتی ہے۔ اور دوسری قسم (نعت سببی) پہلے پانچ (اعراب، تعریف و تنکیر) میں متبوع کی پیروی کرتی ہے، اور باقی امور (تذکیر و تانیث و عدد) میں فعل کی طرح ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے (قام رجل قاعد غلمانه) کہنا اچھا ہے، اور (قاعدون غلمانه) ضعیف ہے، اور (قعود غلمانه) جائز ہے۔ اور ضمیر نہ موصوف بنتی ہے اور نہ صفت۔ اور موصوف (صفت سے) زیادہ خاص یا اس کے برابر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ذو اللام (المعرف باللام) کی صفت صرف اسی جیسے (معرف باللام) یا اس جیسے کی طرف مضاف سے لائی جاتی ہے۔ اور اسم اشارہ (باب ہذا) کی صفت کا ذو اللام ہونا اس کے ابہام کی وجہ سے

لازم ہے۔ اسی وجہ سے (مررت بھذا الأبیض) ضعیف ہے اور (مررت بھذا العالم) اچھا ہے۔

تشریح:

توابع کی پہلی قسم "نعت" (صفت) کی تعریف

قولہ :النّعت :تابع یدلّ علی معنی فی متبوعہ مطلقا

مصنفؒ یہاں توابع کی پہلی قسم "نعت" (صفت) کی تعریف فرمارہے ہیں۔ نعت وہ تابع ہے جو اپنے متبوع (موصوف) میں موجود کسی معنی یا کیفیت کو بیان کرے۔ قید "مطلقا" اس لیے لگائی گئی تاکہ بدل اور تاکید سے فرق واضح ہو، کیونکہ وہ بھی بعض اوقات متبوع کی وضاحت کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد محض صفت بیان کرنا نہیں ہوتا۔

نعت کا بنیادی فائدہ

قولہ :وفائدتہ تخصیص أو توضیح؛

نعت کا بنیادی فائدہ دو چیزیں ہیں:

تخصیص :

اگر موصوف نکرہ (عام اسم) ہو تو صفت اس کے عموم میں کمی کرتی ہے، جیسے "رأیت رجلًا عالمًا" (میں نے ایک عالم آدمی کو دیکھا)۔ یہاں "عالمًا" نے "رجلًا" کی تخصیص کردی کہ وہ کوئی بھی آدمی نہیں بلکہ عالم ہے۔

توضیح :

اگر موصوف معرفہ (خاص اسم) ہو تو صفت اس کی مزید وضاحت کرتی ہے، جیسے "رأیت زیدًا العالمَ" (میں نے عالم زید کو دیکھا)۔

قولہ :وقد یکون لمجرّد الثّناء، أو الذّمّ، أو التّأکید،

کبھی نعت ان بنیادی فوائد کے علاوہ محض تعریف کے لیے آتی ہے، جیسے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" میں "الرحمن الرحیم"۔ یا مذمت کے لیے، جیسے "أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" میں "الرجیم"۔ یا تاکید کے لیے، جیسے قرآنی مثال {نَفْخَةٌ واحِدَةٌ} میں "واحدةٌ"، کیونکہ "نفخة" خود ہی ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے، "واحدةٌ" نے صرف تاکید کا کام کیا۔

نعت کے لئے مشتق ہونا ضروری نہیں؛

قولہ :ولا فصل بین أن یکون مشتقًّا أو غیرہ،

نعت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اسم فاعل یا اسم مفعول جیسا کوئی مشتق لفظ ہی ہو، بلکہ کوئی بھی ایسا اسم جو صفت کا معنی دے، نعت بن سکتا ہے، جیسے :تمیميّ :یہ اسم منسوب ہے جو صفت کا کام کرتا ہے۔ ذي مال :"ذو" بمعنی "والا" بھی صفت بنتا ہے۔ مررت برجل أيّ رجل :یہاں "أيّ رجل" کمال صفت پر دلالت کررہا ہے، یعنی "کیا ہی مرد ہے"۔ مررت بھذا

الرّجل اور بزید هذا: ان مثالوں میں اسم اشارہ "هذا" نعت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

قاعدہ؛

قوله :وتوصف النّكرة بالجملة الخبريّة ويلزم الضّمير؛

یہاں مصنفؒ ایک اہم قاعدہ بیان فرمار ہے ہیں کہ نکرہ کے بعد اگر کوئی جملہ آئے تو وہ اس کی صفت بنتا ہے، بشر طیکہ اس جملے میں ایک ضمیر ہو جو موصوف کی طرف لوٹے۔ جیسے "جاءني رجلٌ أبوه قائمٌ" (میرے پاس ایک ایسا آدمی آیا جس کا باپ کھڑا ہے)۔ یہاں "أبوه قائمٌ" پورا جملہ "رجلٌ" کی صفت ہے اور "ہ" ضمیر "رجلٌ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

صفت کی دو اقسام؛

قوله :ويوصف بحال الموصوف، وبحال متعلّقه

یہاں نعت کی دو اقسام کا بیان ہے:

(۱) صفت بحال موصوف۔ (۲) صفت بحال متعلق موصوف۔

(صفت بحال الموصوف)

اس کو کہتے جو ایسے معنی پر دلالت کرے جو اس کے متبوع میں ہو جیسے :جَآءَنِیْ رَجُلٌ عَالِمٌ۔

صفت کی پہلی قسم موصوف کے، متبوع کے تابع ہوتی ہے۔ دس (۱۰) چیزوں میں۔

(۱)۔ رفع (۲)۔ نصب (۳)۔ جر (۴)۔ معرفہ (۵)۔ نکرہ (۶)۔ افراد (۷)۔ تثنیہ (۸)۔ جمع (۹)۔ تذکیر (۱۰)۔ تانیث۔

صفت کی پہلی قسم کا حکم یہ ہے کہ بیک وقت چار (۴) چیزوں میں مطابقت ضروری ہے۔ جیسے:

''جَآءَنِیْ رَجُلٌ عَالِمٌ'' یہاں ''رَجُلٌ'' متبوع ہے ''عَالِمٌ'' تابع ہے۔ (۱) رفع نصب جر میں دونوں اسم مرفوع ہیں۔ (۲) تعریف تنکیر میں دونوں اسم نکرہ ہیں۔ (۳) افراد تثنیہ جمع ہونے میں دونوں اسم مفرد ہیں۔ (۴) تذکیر تانیث میں دونوں اسم مذکر ہیں۔

''جَآءَنِیْ رَجُلٌ عَالِمٌ وَ رَجُلَانِ عَالِمَانِ'' کہ یہاں ''رَجُلَانِ'' متبوع ہے اور ''عَالِمَانِ'' تابع ہے۔ (۱) رفع نصب جر میں دونوں اسم مرفوع ہیں۔ (۲) تعریف تنکیر میں دونوں اسم نکرہ ہیں۔ (۳) افراد تثنیہ جمع میں دونوں اسم تثنیہ ہیں (۴) تذکیر تانیث میں دوں اسم مذکر ہیں۔

''جَآءَنِیْ رِجَالٌ عَالِمُوْنَ'' کہ یہاں ''رِجَالٌ'' متبوع ہے ''عَالِمُوْنَ'' تابع ہے اعراب یعنی رفع نصب جر میں دونوں اسم مرفوع ہیں۔ (۲) تعریف تنکیر میں دونوں اسم نکرہ ہیں اور افراد تثنیہ جمع ہونے میں دونوں اسم جمع ہیں اور تذکیر تانیث میں دونوں اسم مذکر ہیں۔

''جَآءَنِیْ زَیْدُ نِ الْعَالِمُ'' یہاں بھی تمام چیزیں وہی ہیں بس ایک فرق ہے کہ معرفہ ہیں دونوں اسم۔

''جَآءَنِیْ اِمْرَأَةٌ عَالِمَةٌ'' یہاں بھی دنوں اسم مرفوع ہیں۔ مفرد ہیں مؤنث ہیں اور نکرہ ہیں۔

صفت بحال متعلق موصوف :

وبحال متعلّقه نحو (مررت برجل حسن غلامه).

جب نعت موصوف کے کسی متعلق (اس سے تعلق رکھنے والے) کی حالت بیان کرے، جیسے "مررت برجلٍ حسنٍ غلامُه" (میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جس کا غلام خوبصورت ہے)۔ یہاں "حسن" ہونا آدمی کی نہیں بلکہ اس کے غلام کی صفت ہے۔

اس کا حکم یہ ہے: یہ اپنے متبوع کے صرف اعراب اور تعریف و تنکیر میں پیروی کرتی ہے۔ عدد میں یہ ہمیشہ واحد رہتی ہے اور جنس میں اپنے بعد والے اسم (غلامُه) کے مطابق ہوتی ہے، بالکل فعل کی طرح۔ اسی لیے "قام رجلٌ قاعدٌ غلمانُه" فصیح ہے (جیسے "قعد غلمانُه")، جبکہ "قاعدون غلمانُه" ضعیف ہے کیونکہ صفت یہاں جمع نہیں آئے گی۔ البتہ "قعودٌ غلمانُه" جائز ہے کیونکہ "قعود" جمع مکسر ہے اور اسے واحد مؤنث کے حکم میں لے کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ضمیر نہ موصوف بن سکتی ہے اور نہ صفت؛

قوله :والمضمر لا يوصف ولا يوصف به

ضمیر (مثلاً أنا، ہو، ک) چونکہ معرفہ کی بلند ترین قسم ہے، اسے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی، للذا وہ موصوف نہیں بن سکتی۔ اور چونکہ ضمیر جامد ہوتی ہے، وہ صفت بھی نہیں بن سکتی۔

ایک عقلی قاعدہ

والموصوف أخصّ أو مساو، ومن ثمّ لم يوصف ذو اللاّم إلاّ بمثله، أو بالمضاف إلى مثله.

یہ ایک عقلی قاعدہ ہے کہ موصوف یا تو صفت سے زیادہ خاص ہوگا یا اس کے برابر ہوگا۔ ایک عام چیز خاص چیز کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ اسی اصول کی بنا پر معرف باللام اسم کی صفت بھی معرف باللام ہی آتی ہے (جیسے الرجلُ العالمُ) یا ایسے اسم سے جو معرف باللام کی طرف مضاف ہو (جیسے الرجلُ حسنُ الوجهِ)۔

قوله :وإنّما التزم وصف باب (هذا) بذي اللاّم للإبهام؛

اسم اشارہ "هذا" میں چونکہ ابہام پایا جاتا ہے (یہ کسی بھی چیز کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے)، اس لیے اس ابہام کو دور کرنے کے لیے اس کی صفت عموماً معرف باللام لائی جاتی ہے، جیسے "هذا الرجلُ"۔ اسی وجہ سے "مررت بهذا الأبيضِ" کو کمزور سمجھا جاتا ہے کیونکہ "الأبيض" ایک عام صفت ہے، جبکہ "مررت بهذا العالمِ" فصیح اور بہتر ہے کیونکہ "العالم" ذات کی وضاحت میں زیادہ قوی ہے۔

عطف بالحرف کا بیان

"العطف :تابع مقصود بالنّسبة مع متبوعه، يتوسّط بينه وبين متبوعه أحد الحروف العشرة-وسيأتي-مثل (قام زيد وعمرو)، وإذا عطف على الضّمير المرفوع المتّصل أكّد بمنفصل، مثل (ضربت أنا وزيد)، إلاّ أن يقع فصل فيجوز تركه نحو

(ضربت الیوم وزید). وإذا عطف علی الضّمیر المجرور أعید الخافض، نحو (مررت بك وبزید). والمعطوف فی حکم المعطوف علیه، ومن ثمّ لم یجز فی (ما زید بقائم أو قائما، ولا ذاهب عمرو) إلاّ الرّفع، وإنّما جاز (الّذی یطیر فیغضب زید الذّباب) لأنّها فاء السّببیّة. وإذا عطف علی عاملین مختلفین لم یجز، خلافا للفرّاء ،إلاّ فی نحو (فی الدّار زید والحجرة عمرو)، خلافا لسیبویه.

"ترجمہ: عطف: وہ تابع ہے جو اپنے متبوع کے ساتھ نسبت میں مقصود ہو، اس کے اور اس کے متبوع کے درمیان دس حروف میں سے کوئی ایک حرف واسطہ بنتا ہے۔ اور وہ آگے آئیں گے۔ جیسے (قام زید وعمرو)۔ اور جب ضمیر مرفوع متصل پر عطف کیا جائے تو ضمیر منفصل سے اس کی تاکید لائی جائے گی، جیسے (ضربت أنا وزید)۔ مگر یہ کہ کوئی فاصلہ آجائے تو اسے چھوڑنا جائز ہے، جیسے (ضربت الیوم وزید)۔ اور جب ضمیر مجرور پر عطف کیا جائے تو جارّ کو دوبارہ لایا جائے گا، جیسے (مررت بك وبزید)۔ اور معطوف، معطوف علیہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے (ما زید بقائم أو قائما، ولا ذاهب عمرو) میں سوائے رفع کے کچھ جائز نہیں ہے۔ اور (الّذي یطیر فیغضب زید الذّباب) اس لیے جائز ہے کہ یہاں فاء سببیہ ہے۔ اور جب دو مختلف عاملوں پر عطف کیا جائے تو جائز نہیں، خلافاً فرّاء کے، سوائے اس جیسی صورت کے (في الدّار زید والحجرة عمرو)، خلافاً سیبویہ کے۔

تشریح:

العطف: تابع مقصود بالنّسبة مع متبوعه، یتوسّط بینه وبین متبوعه أحد الحروف العشرة-وسیأتی-مثل (قام زید وعمرو).

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، توابع کی پانچ قسموں میں سے دوسری قسم "عطف بالحروف" کا بیان فرمارہے ہیں۔

عطف کی تعریف وحکم:

لغت میں عطف کہتے ہیں مائل کرنے کو

اصطلاح میں عطف کی تعریف یہ ہے۔

تابع مقصود بالنّسبة مع متبوعه، یتوسّط بینه وبین متبوعه أحد الحروف العشرة۔

:وہ تابع ہے جو اپنے متبوع کے ساتھ نسبت میں مقصود ہو، اس کے اور اس کے متبوع کے درمیان دس حروف میں سے کوئی ایک حرف واسطہ بنتا ہے اور اس کو عطف نسق بھی کہا جاتا ہے یعنی جو حکم متبوع کا ہے وہی حکم تابع کا بھی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ حروف عطف میں سے کوئی ایک حرف پایا جائے دونوں اسموں کے درمیان۔ جیسے: قَامَ زَيْدٌ وَ عَمْرٌو۔

اس مثال میں بواسطۂ حرف عطف قیام کے حکم میں زید اور عمرو دونوں شامل ہیں۔ یعنی کھڑے ہونے سے دونوں مقصود ہیں۔ زَيْدٌ معطوف علیہ ہے واو حرف عطف ہے اور عمرٌو معطوف ہے۔

فوائد و قیود؛

مصنف نے تعریف میں فرمایا "تَابِعٌ" تو اس میں تمام توابع شامل تھے آگے فرمایا تابع مقصود بالنّسبة مع متبوعه' اس قید کے ذریعے عطف بالحروف کے علاوہ تمام توابع خارج ہو گئے کیونکہ وہ نسبت سے دونوں مراد نہیں ہوتے بلکہ کبھی صرف تابع مقصود ہوتا ہے جیسے بدل میں اور کبھی صرف متبوع مقصود ہوتا ہے جیسے صفت میں۔

أحد الحروف العشرة الخ:

اس عبارت میں صاحب کتاب نے فرمایا کہ تابع اور متبوع کے درمیان حروف عطف میں سے کسی حرف کا ہونا ضروری ہے،

حروف عطف دس (١٠) ہیں:

(١) واؤ	(٢) ثُمَّ	(٣) اِمَّا	(٤) لَا	(٥) اَوْ
(٦) ف	(٧) حَتّٰی	(٨) اَمْ	(٩) بَلْ	(١٠) لٰكِنْ

ان کی تفصیل آگے حروف کی بحث میں آرہی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ان حروف میں سے کسی ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔ جیسے مثال گذر چکی۔

ضمیر مرفوع متصل پر عطف کی صورت

وإذا عطف على الضّمير المرفوع المتّصل أكّد بمنفصل، مثل (ضربت أنا وزيد)، الخ"

اس عبارت سے مصنف بیان فرمار ہے ہیں کہ اب تک تو اسم ظاہر کے عطف کی بات ہو رہی تھی لیکن اب یہاں سے وہ صورت بیان کی جارہی ہے کہ جہاں ضمیر مرفوع متصل پر عطف ڈالا جارہا ہو تو واجب ہے ضمیر مرفوع متصل کی تاکید لانا ضمیر مرفوع منفصل کے ساتھ جیسے :ضَرَبْتُ اَنَا وَزَيْدٌ۔

اس مثال میں "ضَرَبْتُ" کی تُ ضمیر موکد ہے اور اَنَا اس کی تاکید ہے موکد تاکید مل کر معطوف علیہ و حرف عطف زَيْدٌ معطوف۔ معطوف معطوف علیہ مل کر فاعل "ضَرَبْتُ" فعل کا۔

استثنائی صورت:

"إلاّ أن يقع فصل فيجوز تركه نحو (ضربت اليوم وزيد).

' یہاں سے مصنفؒ نے استثنائی صورت بیان فرمائی ہے کہ جب ضمیر مرفوع متصل پر عطف ڈالا جائے تو اگر فاصلہ ہو تو ضمیر مرفوع منفصل کے ساتھ تاکید لائے بغیر بھی جائز ہے جیسے :"ضَرَبْتَ الْيَوْمَ وَزَيْدٌ" کہ یہاں معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان الیوم کا فاصلہ ہے اس لیے ضمیر متصل پر عطف جائز ہے۔

ضمیر مجرور پر عطف کی صورت؛

"وإذا عطف على الضّمير المجرور أعيد الخافض، نحو (مررت بك وبزيد)۔۔الخ"

یہاں صاحب کتاب ایک قاعدہ بیان فرمار ہے ہیں کہ جب ضمیر مجرور پر عطف ڈالا جائے تو حرف جر کا اعادہ واجب ہے جیسے

''مَرَرْتُ بِکَ وَبِزَیْدٍ'' کہ یہاں صرف ''مَرَرْتُ بِکَ وَزَیْدٍ'' کہنا درست نہیں ہے کیونکہ حرف جر جز ہے اور کل کا جز پر عطف جائز نہیں ہے، للذا با قاعدہ علیحدہ حرف جر کا اعادہ واجب ہے۔ جیسے :مَرَرْتُ بِکَ وَبِزَیْدٍ۔

معطوف معطوف علیہ کا حکم

"والمعطوف فی حکم المعطوف علیه، ومن ثمّ لم یجز فی (ما زید بقائم أو قائما، ولا ذاهب عمرو) إلاّ الرّفع، وإنّما جاز (الّذی یطیر فیغضب زید الذّباب) لأنّها فاء السّببیّة. الخ"

اس عبارت میں صاحب کتاب معطوف معطوف علیہ کا حکم بیان فرمایا ہے کہ معطوف ہر لحاظ سے معطوف علیہ کے حکم میں ہوتا ہے۔

مذکورہ قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ "معطوف" پر وہی "حکم" لاگو ہوتا ہے جو "معطوف علیہ" پر لاگو ہوتا ہے۔ یہاں "حکم" سے مراد بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں:

اعراب؛

معطوف کا اعراب (رفع، نصب، جر) وہی ہوگا جو معطوف علیہ کا ہے۔

عامل

:معطوف پر وہی عامل اثر انداز ہوتا ہے جو معطوف علیہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یعنی جس لفظ نے معطوف علیہ کو رفع، نصب یا جر دیا ہے، وہی لفظ معطوف کو بھی رفع، نصب یا جر دے گا۔ یہی اصول نیچے دی گئی مثالوں کی بنیاد ہے۔

پہلی مثال کی وضاحت :

عامل کا اثر منتقل نہ ہونا مثال:

"لم یجز فی (ما زید بقائم أو قائما، ولا ذاهب عمرو) إلاّ الرّفع"

اس مثال کو سمجھنے کے لیے پہلے جملے کے پہلے حصے کا تجزیہ کرنا ضروری ہے:ما زیدٌ بقائمٍ (زید کھڑا نہیں ہے)۔ یہاں "ما" حرفِ نفی ہے جو "لیس" کی طرح عمل کرتا ہے۔ اسے "ما الحجازیۃ" کہتے ہیں۔ یہ اپنے اسم کو رفع (پیش) اور خبر کو نصب (زبر) دیتا ہے۔ اس کا اسم ہے، اس لیے وہ مرفوع ہے۔بقائمٍ اس کی خبر ہے۔ یہاں خبر پر حرفِ جر "باء" داخل ہوا ہے، جو زائدہ (اضافی) ہے اور نفی میں تاکید پیدا کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس "باء" کی وجہ سے لفظِ قائم لفظاً مجرور (یعنی ظاہری طور پر زیر والا) ہے، لیکن چونکہ یہ "ما" کی خبر ہے، اس لیے یہ محلاً منصوب (یعنی اپنی اصل جگہ کے اعتبار سے نصب میں) ہے۔

اب جملے کے دوسرے حصے کو دیکھیں... :ولا ذاهبٌ عمروٌ قاعدے کے مطابق ذاهب کا عطف قائم پر ہے۔ للذا ذاهب کا اعراب بھی قائم جیسا ہونا چاہیے۔ لیکن قائم کے دو اعراب ہیں :لفظی طور پر مجرور اور محلّی طور پر منصوب۔ تو کیا ذاهب کو مجرور (ذاهبٍ) یا منصوب (ذاهباً) ہونا چاہیے؟

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہاں صرف رفع (ذاهبٌ) جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "معطوف علیہ" (قائم) پر جو عامل اثر کر رہا

ہے وہ ایک خاص اور کمزور عامل ہے (یعنی باء زائدہ)۔ باء زائدہ کا یہ اثر صرف اسی لفظ تک محدود رہتا ہے جس پر وہ براہِ راست داخل ہو۔ اس کا اثر حرفِ عطف (و) کو عبور کر کے معطوف (ذاهب) تک منتقل نہیں ہو سکتا۔ للذا ذاهب کو مجرور نہیں پڑھ سکتے کیونکہ "باء" کا اثر وہاں تک نہیں پہنچا۔

اسی اصول کی بناپر "**ما زيدٌ بقائمٍ ولا ذاهبٌ عمروٌ**" کی مثال میں "**ذاهبٌ**" کو مرفوع پڑھنا ہی جائز ہے۔ اسے "**قائمٍ**" کی جر کے تابع نہیں کیا جا سکتا کیونکہ "**قائمٍ**" کی جر حرف "**باء**" زائدہ کی وجہ سے ہے جبکہ اصل میں وہ خبر ہونے کی بنا پر محلاً مرفوع ہے۔ چونکہ "**ذاهبٌ**" پر باء زائدہ داخل نہیں ہے، للذا وہ اصل محل یعنی رفع کی پیروی کرے گا۔

دوسری مثال کی وضاحت :

فاءالسببية کا کردار مثال :

"**وإنّما جاز (الّذي يطير فيغضب زيد الذّباب) لأنّها فاء السّببيّة**

" جملے کا مفہوم :"وہ جو اڑتی ہے، پس اس کی وجہ سے زید کو غصہ آتا ہے، وہ مکھی ہے۔"

(اصل ترتیب :

الذباب هو الذي يطير فيغضب زيد): یہ مثال عطف کے ایک اور گہرے اصول کو واضح کرتی ہے۔ بظاہر اس جملے میں **يغضب** (غصہ ہوتا ہے) کا عطف **يطير** (اڑتی ہے) پر کیا گیا ہے۔ اگر یہ عام عطف ہوتا تو اس جملے میں ایک نحوی خرابی لازم آتی۔

مسئلہ کیا ہے؟

فعل **يطير** (اڑتی ہے) کا فاعل (کام کرنے والا) ایک ضمیر "**هو**" ہے جو **الذي** کی طرف لوٹ رہی ہے (یعنی مکھی)۔ جبکہ فعل **يغضب** (غصہ ہوتا ہے) کا فاعل **زيد** ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک فعل کا دوسرے فعل پر عطف کیا جائے تو بہتر ہے کہ دونوں کا فاعل ایک ہی ہو، خاص طور پر جب فاعل ایک ضمیر اور دوسرا اسم ظاہر ہو۔ یہاں دونوں کا فاعل الگ الگ ہے۔ اگر یہ عام "فاء عاطفہ" ہوتی تو جملے کی ساخت کمزور ہو جاتی۔

حل اور قاعدہ:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ بالکل درست ہے اور اس کے درست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں استعمال ہونے والی "فاء" عام عاطفہ نہیں بلکہ "فاء السببیۃ" ہے۔ فاء السببیۃ کیا ہے؟ یہ وہ "فاء" ہے جو دو جملوں کو اس طرح جوڑتی ہے کہ پہلا جملہ دوسرے جملے کا سبب بن جاتا ہے اور دوسرا جملہ پہلے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس مثال میں :سبب :مکھی کا اڑنا (**يطير**) نتیجہ :زید کا غصہ ہونا (**فيغضب زيد**) جب "فاء" سببیہ کے معنی میں آتی ہے تو وہ دو الگ الگ اور مکمل جملوں کو جوڑتی ہے۔ وہ معطوف کو معطوف علیہ کے تابع نہیں کرتی، بلکہ ایک نیا جملہ شروع کرتی ہے۔ چونکہ **فيغضب زيد** ایک نیا اور مستقل جملہ ہے جو پہلے جملے کا نتیجہ بتا رہا ہے، اس لیے اس کا اپنا فاعل (**زيد**) ہو سکتا ہے جو پہلے جملے کے فاعل سے مختلف ہو۔

دو عاملوں کے معمولوں پر عطف کی صورت؛

وإذا عطف علی عاملین مختلفین لم یجز، خلافا للفرّاء، إلاّ فی نحو (فی الدّار زید والحجرة عمرو)، خلافا لسیبویه الخ:

اب تک صاحب کتاب نے ایک معمول کے عطف کے قواعد بیان فرمائے ہیں اب یہاں اس عبارت میں دو عاملوں کے معمولوں پر عطف کے قاعدے کو بیان فرماتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ دو مختلف عاملوں کے دو مختلف معمولوں پر ایک حرف عطف کے ساتھ عطف کرنا جائز ہے لیکن اس کے لیے جمہور نحویین کے نزدیک ایک شرط ہے وہ شرط یہ ہے کہ معطوف علیہ مجرور ہو اور مقدم ہو مرفوع یا منصوب سے اور معطوف بہ مجرور ہو اور مقدم ہو مرفوع یا منصوب سے تو تب عطف جائز ہے جیسے "فِي الدَّارِ زَيْدٌ وَالْحُجْرَةِ عَمْرٌو" اس مثال میں الحجرۃ کا عطف الدار پر ہے اور اس میں الدار میں عامل فی ہے اور عمرو کا عطف زید پر ہے اور زید میں عامل ابتداء ہے

تو اب دیکھیں اس مثال میں جو پہلا عامل ہے فی ہے اور اس کا معمول الدار ہے تو عامل بھی مختلف معمول بھی مختلف۔ اور اس پر الحجرۃ کا عطف ہے اور دوسرا عامل ابتدا ہے اور اس کا معمول زید ہے اور اس پر عمرو کا عطف ہے تو دو عامل ہیں دونوں مختلف ان دونوں کے معمول ہے وہ بھی مختلف ہیں اور ان پر عطف ہوا ہے اور فی الدار جار مجرور ہے مقدم ہے مرفوع پر الحجرۃ یہ معطوف مجرور ہے تو شرط پائی جا رہی ہے تو جمہور نحویین کے نزدیک ایک ہی حرف عطف کے ساتھ یہ جائز ہے جیسے :''اِنَّ فِي الدَّارِ زَيْدًا وَالْحُجْرَةِ عَمْرًا''

خلافا للفرّاء، و خلافا لسیبویه الخ:

صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں دو مذاہب اور بھی ہیں یہ تو آپ کو جمہور کا مذہب بتایا ہے دو مذہب اور بھی ہیں۔

ایک مذہب امام فراء کا ہے۔ امام فراء فرماتے ہیں کہ دو مختلف عاملوں پر عطف کرنا مطلقا جائز ہے بغیر کسی قید و شرط کے۔ لہذا ان کے نزدیک یہ قیاس ہوگا ایک عامل کے معمول پر عطف کرنے پر، جیسے وہ جائز ہے یہ بھی جائز ہے۔

دوسرا مذہب امام سیبویہ کا ہے۔ وہ فرماتے کہ دو مختلف عاملوں پر عطف کرنا جائز ہی نہیں ہے بلکہ وہ کہتے ہیں ایسی کوئی ترکیب ہی نہیں ہے بلکہ جملے کا عطف جملے پر ہوگا۔

ثمرہ اخلاف:

اس مثال سے سمجھ میں آئے گا جیسے ''زَيْدٌ فِي الدَّارِ وَعَمْرٌو فِي الْحُجْرَةِ''

جمہور اور امام سیبویہ کے نزدیک عطف جائز نہیں ہے جمہور کے نزدیک تو اس لئے جائز نہیں ہے کہ یہاں تقدیم کی شرط نہیں پائی جا رہی تفصیل گذر گئی تشریح میں۔

اور سیبویہ کے نزدیک اس لئے جائز نہیں کہ وہ یہاں پر حرف جر کو مقدر مانتے ہیں۔ "فِي الدَّارِ زَيْدٌ وَفِي الْحُجْرَةِ عَمْرٌو" اور "زَيْدٌ فِي الدَّارِ وَعَمْرٌو فِي الْحُجْرَةِ'' میں فی کو مکرر لاتے ہیں اور جملے کا عطف جملے پر مانتے ہیں دو مختلف عاملوں کے

عطف کو وہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ شرح جامی میں آجائے گی اور امام فراء کے نزدیک یہ عطف مطلقاً جائز ہے کہتے ہیں کہ جس طرح ایک عامل کا عطف جائز ہے اس طرح دو مختلف عاملوں کا عطف بھی جائز ہے چاہے وہ مقدم ہو یا مؤخر ہو۔ واللہ اعلم۔

تاکید کا بیان

"التّأكيد :تابع يقرّر أمر المتبوع في النّسبة أو الشّمول، وهو لفظيّ ومعنويّ :فاللّفظيّ :تكرير اللّفظ الأوّل، مثل (جاءني زيد زيد)، ويجري في الألفاظ كلّها. والمعنويّ بألفاظ محصورة، وهي :نفسه، وعينه، وكلاهما، وكلّه، وأجمع، وأكتع، وأبتع، وأبصع. فالأوّلان يعمّان باختلاف صيغتهما وضميرهما، تقول :(نفسه)، (نفسها)، (أنفسهما)، (أنفسهم)، (أنفسهنّ). والثّاني للمثنّى :(كلاهما)، و(كلتاهما)، والباقي لغير المثنّى باختلاف الضمير في :(كلّه)، و(كلّها)، و(كلّهم)، و(كلّهنّ). والصيغ في البواقي، تقول :(أجمع) و(جمعاء) و(أجمعون) و(جمع). ولا يؤكّد ب(كلّ) و(أجمع) إلاّ ذو أجزاء يصح افتراقها حسّا أو حكما، نحو (أكرمت القوم كلّهم)، و(اشتريت العبد كلّه)، بخلاف (جاءني زيد كلّه). وإذا أكّد المضمر المرفوع المتّصل بالنّفس والعين أكّد بمنفصل، مثل :(ضربت أنت نفسك). و(أكتع) وأخواه أتباع ل(أجمع)، فلا تتقدّم عليه، وذكرها دونه ضعيف.

"ترجمہ: تاکید :وہ تابع ہے جو متبوع کے امر کو نسبت یا شمول میں پختہ کرتا ہے۔ اور یہ لفظی اور معنوی ہوتی ہے :پس لفظی : پہلے لفظ کو دہرانا ہے، جیسے (جاءني زيد زيد)، اور یہ تمام الفاظ میں جاری ہوتی ہے۔ اور معنوی چند مخصوص الفاظ سے ہوتی ہے، اور وہ ہیں :نفسه، عينه، كلاهما، كلّه، أجمع، أكتع، أبتع، أبصع۔ پس پہلے دو (نفس، عین) اپنی صیغوں اور ضمیروں کے اختلاف کے ساتھ عام ہیں، تو کہتا ہے :(نفسه)، (نفسها)، (أنفسهما)، (أنفسهم)، (أنفسهنّ)۔ اور دوسرا (کلا) تثنیہ کے لیے ہے :(كلاهما) اور (كلتاهما)۔ اور باقی غیر تثنیہ کے لیے ہیں ضمیر کے اختلاف کے ساتھ :(كلّه)، (كلّها)، (كلّهم)، (كلّهنّ)۔ اور باقیوں میں صیغے ہیں، تو کہتا ہے :(أجمع) و (جمعاء) و (أجمعون) و (جمع)۔ اور (كلّ) اور (أجمع) سے صرف اسی کی تاکید لائی جاتی ہے جس کے اجزاء کا جدا ہونا حسی طور پر یا حکمی طور پر صحیح ہو، جیسے (أكرمت القوم كلّهم) اور (اشتريت العبد كلّه)، بخلاف (جاءني زيد كلّه) کے۔ اور جب ضمیر مرفوع متصل کی تاکید نفس اور عین سے لائی جائے تو ضمیر منفصل سے تاکید لائی جائے گی، جیسے :(ضربت أنت نفسك)۔ اور (أكتع) اور اس کے دونوں بھائی (أبتع، أبصع) (أجمع) کے تابع ہیں، پس اس پر مقدم نہیں ہو سکتے، اور ان کا ذکر اس (اجمع) کے بغیر ضعیف ہے۔

تشریح:

:قوله :التّأكيد :تابع يقرّر أمر المتبوع في النّسبة أو الشّمول؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، توابع کی تیسری قسم "تاکید" کو بیان فرمارہے ہیں۔

تاکید کی تعریف:

لغت میں ''تاکیدٌ'' کہا جاتا ہے پختہ کرنے کو۔

نحویین کی اصطلاح میں تاکید کی تعریف یہ ہے۔

التّأكيد :تابع يقرّر أمر المتبوع في النّسبة أو الشّمول، وهو لفظيّ ومعنويّ:

" یعنی تاکید ایسا تابع ہے جو دلالت کرے متبوع کے پختہ ہونے پر اس چیز میں جس کی نسبت کی گئی ہے متبوع کی طرف جیسے ''جَآءَنِیْ زَیْدٌ نَفْسُهٗ'' یا دلالت کرے متبوع کے حکم میں شامل ہونے پر جیسے :''سَجَدَ الْمَلٰئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ''۔

فوائد و قیود:

تاکید کی تعریف میں جب صاحب کتاب نے فرمایا' **تابع يقرّر أمر المتبوع** تو اس سے عطف بالحرف اور بدل دونوں خارج ہو گئے کیونکہ عطف بالحرف اور بدل متبوع کے پختہ ہونے پر دلالت نہیں کرتے جب فرمایا' **في النّسبة أو الشّمولِ**" تو اس سے صفت اور عطف بیان خارج ہو گئے کیونکہ وہ منسوب الیہ میں متبوع کے پختہ ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔

تاکید کی دو (۲) قسمیں ہیں

وهو لفظيّ ومعنويّ:

صاحب کتاب فرماتے ہیں تاکید کی دو (۲) قسمیں ہیں۔ (ا) لفظی۔ (۲) معنوی۔

پہلی قسم تاکید لفظی کی تعریف:

فاللّفظيّ :تكرير اللّفظ الأوّل، مثل (جاءني زيد زيد)، ويجري في الألفاظ كلّها.

تاکید لفظی اس تاکید کو کہتے ہیں جس میں لفظ کے ذریعے سے تاکید لائی جائے یعنی الفاظ مکرر ہوں اور اس کی تین صورتیں ہیں۔

(ا)۔اسم مکرر ہو جیسے ''جَآءَنِیْ زَیْدٌ زَیْدٌ''۔

(۲)۔ فعل مکرر ہو جیسے ''جَآءَ جَآءَ زَیْدٌ''۔

(۳)۔حرف مکرر ہو جیسے ''اِنَّ اِنَّ زَیْدًا قَآئِمٌ''۔

دوسری قسم:تاکید معنوی

والمعنويّ بألفاظ محصورة، وهي :نفسه، وعينه، وكلاهما، وكلّه، وأجمع، وأكتع، وأبتع، وأبصع.

تاکید کی دوسری قسم تاکید معنوی اس کو کہتے ہیں۔ جس کے لفظوں میں تکرار نہ ہو یعنی الفاظ کے ذریعے سے تاکید نہ ہو بلکہ معنی کے ذریعے سے تاکید ہو اور یہ تاکید معنوی چند الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے :

نفسه، وعينه، وكلاهما، وكلّه، وأجمع، وأكتع، وأبتع، وأبصع.

''نَفْسٌ اور عَیْنٌ'' سے واحد تثنیہ جمع تینوں کی تاکید کے لیے آتے ہیں

فالأوّلان يعمّان باختلاف صيغتهما وضميرهما، تقول :(نفسه)، (نفسها)، (أنفسهما)، (أنفسهم)، (أنفسهنّ).

''نَفْسٌ اور عَیْنٌ '' سے واحد تثنیہ جمع تینوں کی تاکید کے لیے آتے ہیں صیغے کے اختلاف کے ساتھ یعنی مفرد کے لیے الگ صیغہ ہوگا الگ ضمیر ہوگی تثنیہ کے لیے الگ جمع کے لئے الگ،

مذکر کی مثال؛

جیسے:مفرد کی مثال جیسے ''جَآءَنِیْ زَیْدٌ نَفْسُهٗ'' آیا زید بذات خود۔

تثنیہ کی مثال جیسے :''جَآءَنِیْ الزَّیْدَانِ اَنْفُسُهُمَا یا نَفْسَا هُمَا''۔

جمع کی مثال جیسے :''جَآءَنِیْ الزَّیْدُوْنَ اَنْفُسُهُمْ''۔

اور اسی طرح ''عَیْنٌ'' ہے۔

مفرد کی مثال جیسے :''جَآءَنِیْ زَیْدٌ عَیْنُهٗ''

تثنیہ کی مثال جیسے :'' جَآءَنِیْ الزَّیْدَانِ عَیْنُهُمَا''

جمع کی مثال جیسے :''جَآءَنِیْ الزیدون اَعْیُنُهُمْ ''

مؤنث کی مثال:

مفرد کی مثال جیسے :''جَآءَتْنِیْ هِنْدٌ نَفْسَهَا''

تثنیہ کی مثال جیسے :''جَآءَتْنِیْ الْهِنْدَانِ نَفْسَاهُمَا''

جمع کی مثال جیسے :''جَآءَتْنِیْ هِنْدَاتُ اَنْفُسَهُنَّ''

کلا اور کلتا یہ دونوں خاص ہیں تثنیہ کے ساتھ۔

والثّانی للمثنّی :(کلاهما)،و(کلتاهما)،

مذکر کے لیے کلا۔ اور مؤنث کے لیے کلتا

جیسے حالت رفعی۔

''قَامَ الرَّجُلَانِ کِلَاهُمَا'' ''قَامَتِ الْمَرْءَتَانِ کِلْتَاهُمَا''

اور حالت نصبی میں

''قَامَ الرَّجُلَانِ کلیهما'' اور ''قَامَتِ الْمَرْءَتَانِ کِلْتَیْهِمَا''

اور حالت جری میں

''مَرَرْتُ بکلا الرجلین'' اور ''مَرَرْتُ بکلتی اِمْرأتین ''

تثنیہ کے علاوہ تاکید

والباقی لغیر المثنّی باختلاف الضمیر فی:(کلّه)،و(کلّها)،و(کلّهم)،و(کلّهنّ).والصیغ فی البواقی،تقول :(أجمع)و(جمعاء) و(أجمعون)و(جمع).

اور باقی جو الفاظ ہیں یعنی ''کُلُّ ،اَجۡمَعُ ،اَکۡتَعُ ،اَبۡتَعُ ، اَبۡصَعُ'' یہ تثنیہ کے علاوہ تاکید کے لئے آتے ہیں۔ ''کُلُّ'' کے اندر ضمیر کی تبدیلی ہوتی ہے اور باقی کے اندر صیغے کی تبدیلی ہوتی ہے جیسے مذکر کی مثال ''جَآءَنِی القوم کلھم'' ضمیر تبدیل ہوگی اور باقی میں صیغہ تبدیل ہوگا جمع کے لیے جمع آئے گا اور مذکر کے لیے مذکر مؤنث کے لئے مؤنث

مذکر کی مثال :

''جَآءَنِي الۡقَوۡمِ کُلُّھُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ اَکۡتَعُوۡنَ اَبۡتَعُوۡنَ اَبۡصَعُوۡنَ'' آئی میرے پاس پوری قوم۔ ''اَکۡتَعُ ،اَبۡتَعُ ، اَبۡصَعُ'' ان سب کا معنی ایک ہے یعنی سب کے سب۔

اور مؤنث کی مثال :

''قَامَتِ النِّسَآءِ کُلُّھُنَّ جُمَعُ کُتَعُ بُتَعُ ، بُصَعُ''۔

''کُلُّ'' اور ''اَجۡمَعُ'' کی تاکید کی شرط؛

ولا یؤكّد ب(كلّ) و (أجمع) إلّا ذو أجزاء يصح افتراقها حسّاً أو حكماً, نحو (أكرمت القوم كلّهم), و (اشتريت العبد كلّه), بخلاف (جاءني زيد كلّه).

یہاں سے صاحب کتاب یہ بیان فرمارہے ہیں کہ ''کُلُّ'' اور ''اَجۡمَعُ'' کی تاکید نہیں لائی جائے گی لیکن وہاں پر جہاں کسی چیز کے اجزاء اور حصے ہوں اور اس کا جدا جدا ہونا صحیح اور ممکن ہو چاہے یہ جدا ہونا ''حِسًّا'' ہو جیسے ''أكرمت القوم كلّهم'' تو کُلُّھُمۡ یہی قوم کی تاکید ہے اور قوم ایسے افراد ہیں کہ ان کا الگ الگ ہونا بالکل صحیح ہے اور ''حِسًّا'' ہے سب کو پتہ ہے کہ قوم افراد سے مل کر بنتی ہے مثلاً زید، عمر، بکر وغیرہ۔

یا ''حُکۡمًا'' ہو یعنی حکمی طور پر اس کے اجزاء ہوں جیسے ''اِشۡتَرَیۡتُ الۡعَبۡدَ کُلَّہٗ'' تو یہاں العبد غلام کے تو حصے نہیں ہو سکتے لیکن حکمی طور پر ممکن ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان آدھا غلام خرید لیتا ہے اور آدھا بعد میں خرید لیتا ہے اب یہ ''الۡعَبۡدَ'' غلام ''حِسًّا'' جدا نہیں ہو سکتا بلکہ ''حُکۡمًا'' جدا ہونا ممکن ہے۔ للذا ''اِشۡتَرَیۡتُ الۡعَبۡدَ کُلَّہٗ'' کہنا صحیح ہے۔

)، بخلاف (جاء ني زيد كلّه) ۔اور جہاں ایسا نہ ہو سکے یعنی ''حِسًّا'' یا ''حُکۡمًا'' اس چیز کا الگ الگ کرنا صحیح نہ ہو تو وہاں ''کل'' اور ''اجمع'' کے ساتھ تاکید لانا صحیح نہیں ہے للذا یہ کہنا جائز نہیں ہے۔'جاء ني زيد كلّه)'' کیونکہ اس مثال میں زید کا آنا پورا پورا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ آدھا زید آیا ہو اور آدھا نہ آیا ہو۔

ضمیر مرفوع المتصل کی تاکید ''نَفۡسٌ'' اور ''عَیۡنٌ'' کے ساتھ

وإذا أكّد المضمر المرفوع المتّصل بالنّفس والعين أكّد بمنفصل، مثل :(ضربت أنت نفسك).

یہاں سے صاحب کتاب بیان فرمارہے ہیں کہ جب تم تاکید لاؤ گے ضمیر مرفوع المتصل کی ''نَفۡسٌ'' اور ''عَیۡنٌ'' کے ساتھ تو واجب ہے پہلے اس کی تاکید لانا ضمیر مرفوع منفصل کے ساتھ اور ضمیر مرفوع منفصل کے ساتھ تاکید لانا اس لئے ضروری ہے کہ ''نَفۡسٌ'' اور ''عَیۡنٌ'' اکثر ترکیب میں فاعل واقع ہوتے ہیں جیسے ''زَیۡدٌ ضَرَبَ نَفۡسُہٗ'' اور ''بَشَرٌ جَآءَ عَیۡنُہٗ'' تو

یہاں ''نَفْسٌ'' اور ''عَیْنٌ'' دونوں فاعل ہیں اب اگر ہم ان کو ضمیر مرفوع متصل کی تاکید ضمیر مرفوع منفصل کے بغیر بنالیتے ہیں، تو تاکید کا التباس لازم آئے گا فاعل کے ساتھ اور التباس ایسے ہوگا کہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ یہ ''نَفْسٌ'' کا فاعل ہے یا ضمیر کی تاکید ہے۔ اس لئے پہلے ضمیر منفصل کے ساتھ اس کی تاکید لانا ضروری ہے جیسے :ضَرَبْتَ اَنْتَ نَفْسَکَ۔

صاحب کتاب نے شرط لگائی متصل کی وجہ یہ ہے کہ ضمیر مرفوع منفصل کی ''نَفْسٌ'' اور ''عَیْنٌ'' کے ساتھ تاکید لانا جائز ہے بغیر اس کے کہ اس کی تاکید لائی جائے منفصل کے ساتھ جیسے ''اَنْتَ نَفْسُکَ قَائِمٌ'' کیونکہ اس میں التباس کا خوف نہیں ہے۔

قاعدہ

و(أكتع)وأخواه أتباع ل(أجمع)،فلا تتقدّم عليه،وذكرها دونه ضعيف.

یہاں سے صاحب کتاب ایک قاعدہ بیان فرمارہے ہیں کہ ''اَکْتَعَ وَ اَبْتَعَ وَ اَبْصَعَ'' یہ ''اَجْمَعٌ'' کے تابع ہیں توان کا حکم یہ ہے کہ نہ تو یہ **اجمع** پر مقدم ہو سکتے ہیں اور نہ **اجمع** کے بغیر استعمال ہو سکتے ہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ''اجمع'' متبوع ہے اور اکتع، ابتع، اور ابصع اور باقی تمام اجمع کے تابع ہیں۔ **اجمع** اصل ہے باقی تمام فرع ہیں، اور فرع اصل کے بغیر استعمال نہیں ہو سکتا۔

بالفاظ دیگر **اجمع** بمنزلہ روح کے ہے اور یہ تمام تابع بمنزلہ جسم کے ہیں تو روح کے بغیر جسم کا وجود ممکن نہیں اور یہ تمام بھی نہ اپنا معنی بتا سکتے ہیں نہ اجمع کے بغیر استعمال ہو سکتے ہیں۔

بدل کا بیان

البدل :تابع مقصود بما نسب إلى المتبوع دونه. وهو بدل الكلّ،والبعض،والاشتمال،والغلط. فالأوّل :مدلوله مدلول الأوّل. والثّاني :جزؤه. والثّالث :بينه وبين الأوّل ملابسة بغيرهما. والرّابع :أن تقصد إليه بعد أن غلطت بغيره،ويكونان معرفتين،ونكرتين،ومختلفين. وإذا كان نكرة من معرفة فالنّعت،مثل :{بِالنَّاصِيَةِ * نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ}. ويكونان ظاهرين،ومضمرين،ومختلفين. ولا يبدل ظاهر من مضمر بدل الكلّ إلاّ من الغائب،نحو :(ضربته زيدا).

"ترجمہ :بدل :وہ تابع ہے جو اس نسبت میں مقصود ہو جو متبوع کی طرف کی گئی، نہ کہ خود متبوع۔ اور وہ بدل کل، بعض، اشتمال اور غلط ہے۔ پس پہلا (بدل کل) :اس کا مدلول پہلے کا مدلول ہوتا ہے۔ دوسرا (بدل بعض) :اس کا جزء ہوتا ہے۔ تیسرا (بدل اشتمال) :اس کے اور پہلے کے درمیان ان دونوں (کل اور بعض) کے علاوہ کوئی تعلق ہوتا ہے۔ چوتھا (بدل غلط) :یہ کہ تو اس (بدل) کا ارادہ کرے بعد اس کے کہ تو نے اس کے غیر میں غلطی کی ہو۔ اور وہ دونوں (بدل و مبدل منہ) معرفہ، نکرہ، اور مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور جب وہ (بدل) نکرہ ہو معرفہ سے، تو صفت لانا ضروری ہے، جیسے :{بِالنَّاصِيَةِ * نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ}۔ اور وہ دونوں ظاہر، مضمر اور مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور ظاہر کو مضمر سے بدل کل نہیں بنایا جاتا سوائے غائب کی ضمیر کے، جیسے : (ضربته زیدا)۔

تشریح:

قوله :البدل :تابع مقصود بما نسب إلى المتبوع دونه؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے توابع کی چوتھی قسم بدل کو بیان فرماتے ہیں

بدل کی تعریف:

البدل :تابع مقصود بما نسب إلى المتبوع دونه.

یعنی بدل اس تابع کو کہتے ہیں جس کی طرف نسبت کی گئی ہو اس چیز کی جس کی نسبت کی گئی ہے اس کے متبوع کی طرف لیکن مقصود نسبت سے تابع ہو متبوع نہ ہو۔

فوائد و قیود:

تعریف میں تَابِعٌ یہ جنس کے مرتبے میں ہے اس میں تمام توابع داخل ہو گئے آگے جب فرمایا :بما نسب إلى المتبوع دونه. اس قید کے ذریعے سے عطف بالحرف اور باقی توابع خارج ہو گئے۔ کیونکہ وہ تابع کے ساتھ خود بھی مقصود ہوتا ہے۔

یاد رکھیں کہ بدل میں تابع کو بدل اور متبوع کو مبدل منہ کہتے ہیں اور ترکیب اس کی اس طرح ہوتی ہے۔ جیسے جَاءَ زَيْدٌ اَخُوْكَ زَيْدٌ مبدل منہ اور اخوک بدل ہے۔

بدل کی چار قسمیں ہیں:

وهو بدل الكل، والبعض، والاشتمال، والغلط.

یہاں سے صاحب کتاب بدل کی تقسیم بیان فرمار ہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ بدل کی چار قسمیں ہیں:

(۱)...بَدَلُ الْكُلِّ مِنَ الْكُلِّ (۲)...بَدَلُ الْبَعْضِ مِنَ الْكُلِّ

(۳)...بَدَلُ الْاِشْتِمَالِ (۴)...بَدَلُ الْغَلَطِ

پہلی قسم بَدَلُ الْكُلِّ مِنَ الْكُلِّ:

فالأوّل :مدلوله مدلول الأوّل:... بدل الکل اس بدل کو کہتے ہیں جس میں بدل کا مدلول اور مبدل منہ کا مدلول ایک ہی چیز ہو۔ جیسے: جَاءَنِيْ زَيْدٌ اَخُوْكَ

آپ دیکھیں یہاں اَخُوْكَ بدل الکل ہے زَيْدٌ سے کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں کہ میرے پاس زید آیا تیرا بھائی۔

دوسری قسم بَدَلُ الْبَعْضِ مِنَ الْكُلِّ:

والثّاني :جزؤه. بدل البعض اس کو کہتے ہیں جس میں بدل کا مدلول اور مبدل منہ کے مدلول کا جز ہو۔ جیسے :ضَرَبْتُ زَيْدًا رَأْسَهٗ۔

اس مثال میں رَأْسَه زید کا جز ہے۔ میں نے زید کو مارا اس کے سر پہ اب یہاں رَأْسَهٗ یہ بدل البعض ہے زید سے۔

تیسری قسم بَدَلُ الاِشتِمَالِ:

والثّالث :بينه وبين الأوّل ملابسة بغير هما. :بدل الاشتمال وہ ہے کہ بدل کا مدلول مبدل منہ کا متعلق ہو نہ کل ہو نہ جز ہو جیسے :سُلِبَ زَيْدٌ ثَوْبُهٗ۔

چھینا گیا زید یعنی اس کا کپڑا تو ثَوْبٌ یہ بدل الاشتمال ہے زید سے۔

چوتھی قسم بَدَلُ الغَلَطِ:

والرّابع :أن تقصد إليه بعد أن غلطت بغيره. بدل الغلط اس کو کہتے ہیں جو غلطی ہو جانے کے بعد دوبارہ اس غلطی کو درست کرنے کے لیے لایا جائے جیسے :

جَاءَنِيْ زَيْدٌ جَعْفَرٌ رَاَيْتُ رَجُلًا حِمَارًا

پہلی مثال میں جعفر اور دوسری مثال میں حمار۔ یہ بدل الغلط ہے۔

قاعدہ:

ويكونان معرفتين، ونكرتين، ومختلفين. وإذا كان نكرة من معرفة فالنّعت، مثل :﴿بِالنَّاصِيَةِ(15) نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ﴾ ويكونان ظاهرين، ومضمرين، ومختلفين.

یہاں سے صاحب کتاب بدل سے متعلق ایک قاعدہ بیان فرما رہے ہیں۔

اس قاعدے کی چار صورتیں ہیں:

(۱)... پہلی قسم مبدل منہ اور بدل دونوں معرفہ ہوں: جیسے جَاءَنِيْ زَيْدٌ اَخُوْكَ اس کی بھی صفت لانا ضروری نہیں ہے اس لیے کہ دونوں معرفہ ہیں۔

(۲)... دوسری قسم مبدل منہ اور بدل دونوں نکرہ ہوں: جیسے جَاءَنِيْ رَجُلٌ غُلَامٌ لَّكَ

(۳)... تیسری قسم مبدل منہ نکرہ ہو بدل معرفہ ہوں: تو صفت لانا واجب نہیں ہے جیسے جَاءَنِيْ رَجُلٌ اَخُوْكَ تو اَخُوْكَ یہ اضافت کی وجہ سے معرفہ بن گیا رَجُلًا یہ نکرہ ہے مبدل منہ ہے۔ لیکن یہاں پر ان دونوں میں برابری ہونا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ بدل میں تابع مقصود ہوتا ہے اور وہ معرفہ ہے۔

(۴)... چوتھی قسم بدل نکرہ ہو مبدل منہ معرفہ ہو :اسی کو فرمایا **وإذا كان نكرة من معرفة فالنّعت**، بدل نکرہ ہو مبدل منہ معرفہ ہو تو بدل کی صفت لانا واجب ہے کیونکہ صفت کی وجہ سے نکرہ کے اندر تخصیص پیدا ہو جاتی ہے تو گویا بدل کے اندر جب تخصیص آجائے گی تو وہ معرفہ کے قریب ہو جائے گا تو بدل اور مبدل منہ کے مرتبے میں برابری ہو جائے گی جیسے بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ (سورۂ علق) الناصیہ یہ مبدل منہ واقع ہے لیکن آگے جو ناصیہ ہے یہ نکرہ ہے اور بدل ہے تو اس کی صفت لائیں گے، كَاذِبَةٍ کے ساتھ۔

تو اب یہاں پر پہلی تین صورتیں جو ہیں ان تینوں میں صفت لانا ضروری نہیں ہے اور آخری جو صورت ہے وہاں صفت لانا

ضروری ہے وجہ یہ ہے کہ ان تینوں صورتوں میں بدل ناقص نہیں ہے تو اس کی صفت سے تخصیص لانا بھی ضروری نہیں ہے اور آخری صورت میں بدل مبدل منہ سے ناقص یعنی کم درجے کا ہے۔لہٰذا صفت کے ذریعے سے اس کی تخصیص لانا ضروری ہے تاکہ نکرہ مخصصہ ہو کر معرفہ کے قریب ہو جائے کیونکہ ان دونوں میں جو مقصود ہوتا ہے تابع ہوتا ہے تو جب وہ ہی مقصود ہو اور مرتبے میں بھی کم ہو تو یہ درست نہیں ہے اس لیے اس کی صفت لائیں گے تاکہ وہ مخصوص ہونے کی بناء پر معرفہ کے قریب ہو جائے۔

بدل اور مبدل منہ کے اسم ظاہر اور ضمیر ہونے کے اعتبار سے احکام

ویکونان ظاهرین، ومضمرین، ومختلفین. ولا یبدل ظاهر من مضمر بدل الکلّ إلاّ من الغائب، نحو :(ضربته زیدا).

(وَيَكُونَانِ ظَاهِرَيْنِ، وَمُضْمَرَيْنِ، وَمُخْتَلِفَيْنِ) :مصنفؒ اب بدل اور مبدل منہ کے اسم ظاہر اور ضمیر ہونے کے اعتبار سے احکام بیان فرما رہے ہیں کہ یہ دونوں اسم ظاہر بھی ہو سکتے ہیں (جیسے جاءَ زیدٌ أخوك)، دونوں ضمیر بھی (جیسے أكرمتُكَ إيّاكَ)، اور ایک ظاہر اور دوسرا ضمیر بھی۔

قولُهُ (وَلَا يُبْدَلُ ظَاهِرٌ مِنْ مُضْمَرٍ بَدَلَ الْكُلِّ إِلَّا مِنَ الْغَائِبِ...) :مصنفؒ یہاں ایک دقیق اور اہم ترین قاعدہ بیان فرما رہے ہیں کہ اسم ظاہر کو ضمیر سے "بدل الکل" بنا کر لانے کی ایک شرط ہے۔فرماتے ہیں کہ اسم ظاہر کو ضمیر سے بدل الکل نہیں بنایا جاسکتا، مگر صرف ضمیرِ غائب سے۔ ضمیرِ متکلم (میں، ہم) اور ضمیرِ مخاطب (تو، تم) سے اسم ظاہر کو بدل الکل نہیں بنایا جاسکتا۔

* ضمیر غائب سے مثال :

"ضَرَبْتُهُ زَيْداً" (میں نے اس کو یعنی زید کو مارا)۔ یہاں "زیداً" اسم ظاہر ہے اور "هُ" ضمیرِ غائب سے بدل الکل ہے۔ یہ جائز اور فصیح ہے۔

* ضمیر متکلم و مخاطب سے ممانعت کی وجہ :

وجہ یہ ہے کہ ضمیرِ متکلم اور ضمیرِ مخاطب اپنے معنی پر دلالت کرنے میں سب سے زیادہ واضح اور روشن ہوتی ہیں (یہ اعرف المعارف ہیں)۔ ان کے بعد جب اسم ظاہر کو بدل الکل کے طور پر لایا جائے گا تو یہ وضاحت میں اضافے کے بجائے غیر ضروری طوالت کا باعث بنے گا، جو فصاحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا آپ "رَأَيْتُكَ زَيْداً" (میں نے تجھے یعنی زید کو دیکھا) اس طور پر نہیں کہہ سکتے کہ زید بدل الکل ہو۔البتہ یہ ممانعت صرف بدل الکل میں ہے۔ اگر بدل، بدل البعض یا بدل الاشتمال ہو تو اسم ظاہر کو ضمیر متکلم اور مخاطب سے بھی بدلا جاسکتا ہے۔

*مثال (بدل البعض) :

"رَأَيْتُكَ وَجْهَكَ" (میں نے تجھے یعنی تیرے چہرے کو دیکھا)۔

*مثال (بدل الاشتمال) :

"أَعْجَبَتْنِيْ ثِيَابُكَ" (تو نے مجھے خوش کیا یعنی تیرے کپڑوں نے)

عَطْفُ الْبَيَانِ کا بیان

عطف البيان :تابع غير صفة يوضّح متبوعه.مثل أقسم بالله أبو حفص عمر وفصله من البدل لفظا في مثل،

أَنَا ابْنُ التَّارِكِ الْبِكْرِيِّ بِشْرٍ عَلَيْهِ الطَّيْرُ تَرْقُبُهُ وُقُوعًا......

ترجمہ عطف البیان :وہ تابع ہے جو صفت نہ ہو اور اپنے متبوع کی وضاحت کرے۔ جیسے :"أَقْسَمَ بِاللهِ أَبُو حَفْصٍ عُمَرُ" (اللہ کی قسم کھائی ابو حفص یعنی عمر نے)۔ اور یہ (عطف بیان) بدل سے لفظاً (ترکیب کے اعتبار سے) اس جیسی مثال میں جدا ہوتا ہے:"أَنَا ابْنُ التَّارِكِ الْبِكْرِيِّ بِشْرٍ عَلَيْهِ الطَّيْرُ تَرْقُبُهُ وُقُوعًا (میں اُس (شخص) کا بیٹا ہوں جو بکر قبیلے کے "بِشر" نامی شخص کو (میدانِ جنگ میں اس حال میں) چھوڑ آیا تھا کہ پرندے اس پر منڈلا رہے تھے تاکہ اس (کے مردہ جسم) پر آگریں۔)

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے توابع کی پانچویں اور آخری قسم "عطف البیان" کی بحث کا آغاز فرما رہے ہیں۔

عطف بیان کی تعریف

"عَطْفُ الْبَيَانِ :تَابِعٌ غَيْرُ صِفَةٍ يُوَضِّحُ مَتْبُوعَهُ"

قولُهُ (عَطْفُ الْبَيَانِ...) :مصنفؒ عطف بیان کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسا تابع ہے جس میں دو بنیادی باتیں پائی جاتی ہیں :

* "غَيْرُ صِفَةٍ" (وہ صفت نہیں ہے) :یہ قیدِ احترازی ہے جو صفت (نعت) کو اس تعریف سے خارج کرتی ہے۔ اگرچہ صفت بھی اپنے متبوع (موصوف) کی وضاحت کرتی ہے، لیکن صفت کی وضاحت متبوع کی ذات میں موجود کسی معنی (جیسے علم، فضیلت، خوبصورتی) کو ظاہر کر کے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، عطف بیان متبوع کی کسی صفت کو نہیں بلکہ خود اس کی ذات کو ہی ایک دوسرے معروف نام سے واضح کرتا ہے۔ اسی لیے عطف بیان ہمیشہ اسمِ جامد ہوتا ہے، جبکہ صفت عموماً اسمِ مشتق یا اس کے حکم میں ہوتی ہے۔

* "يُوَضِّحُ مَتْبُوعَهُ" (وہ اپنے متبوع کی وضاحت کرتا ہے) :یہ عطف بیان کا مقصد اور اس کی حقیقت ہے۔ اگر متبوع معرفہ ہو تو عطف بیان اس کی توضیح کرتا ہے (یعنی ابہام کو دور کر کے اسے مزید واضح کرتا ہے) اور اگر متبوع نکرہ ہو تو اس کی تخصیص کرتا ہے (یعنی اس کے عموم میں کمی کرتا ہے)۔

مثال

قولُهُ (مِثْلُ أَقْسَمَ بِاللهِ أَبُو حَفْصٍ عُمَرُ) :مصنفؒ اپنی تعریف کو واضح کرنے کے لیے مثال پیش فرماتے ہیں :"اللہ کی قسم کھائی ابو حفص یعنی عمر نے"۔ اس مثال میں "عُمَرُ" عطف بیان ہے اور اس کا متبوع "أَبُو حَفْصٍ" ہے۔ یہاں لفظ "عُمَرُ"

نے آکر "أَبُو حَفْصٍ" کی کنیت کی وضاحت کر دی اور بتا دیا کہ اس سے مراد کون سی شخصیت ہے۔ یہاں "عمر" کوئی صفت نہیں بلکہ خود متبوع کی ذات کا دوسرا نام (اسمِ علم) ہے اور اس کی وضاحت کے لیے لایا گیا ہے، لہٰذا یہ عطف بیان کی تعریف پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

عطف بیان اور بدل کے درمیان فرق:

قولُهُ (وَفَصَلَهُ مِنَ البَدَلِ لَفظاً فِيْ مِثْلِ...): مصنفؒ یہاں ایک انتہائی اہم اور دقیق مسئلہ بیان فرما رہے ہیں جو عطف بیان اور بدل کے درمیان فرق کو واضح کرتا ہے۔ عام طور پر ہر وہ ترکیب جو عطف بیان بن سکتی ہے، وہ بدل الکل من الکل بھی بن سکتی ہے، اور اکثر نحوی حضرات ان دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ تاہم، مصنفؒ فرماتے ہیں کہ بعض صورتیں ایسی ہیں جہاں ایک ترکیب کو عطف بیان تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اسے بدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں میں "لفظاً" یعنی ترکیبی اور معنوی اعتبار سے فرق موجود ہے، وہ اس طرح کہ بدل کے اندر بدل خود مقصود ہوتا ہے مبدل منہ مقصود نہیں ہوتا اور عطف بیان کے اندر اصل مقصود متبوع ہوتا ہے تابع تو صرف اس کی وضاحت کے لیے ہوتا ہے تو اس لیے صاحب کتاب نے معنوی فرق کو بیان نہیں کیا صرف لفظی فرق کو بیان کیا اور لفظی فرق کے لیے صاحب کتاب نے شاعر المراری الاسدی کا یہ شعر ذکر کیا ہے کہ:

أَنَا ابْنُ التَّارِكِ البِكْرِيِّ بِشْرٍ عَلَيْهِ الطَّيْرُ تَرْقُبُهُ وُقُوعًا

میں بیٹا ہوں اس شخص کو جو چھوڑنے والا ہے بکری بشر جیسے بہادر کو اس حال میں کہ پرندے اس پر منڈلا رہے ہیں "اُڑ رہے ہیں" اس کی موت کا انتظار کرتے ہوئے یہ صرف شعر کے اندر خاص نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ ترکیب ہے جس میں عطف بیان کا متبوع معرف باللام ہو اور جو صفت ہے معرف باللام کی وہ مضاف الیہ ہو۔ تو ایسی ترکیب میں قباحت اور خرابی نہیں ہے

تشریح شعر اور وجہِ امتیاز :

*اس شعر میں "بِشْرٍ"، "البِكْرِيِّ" کا عطف بیان ہے۔ "البِكْرِيِّ" (قبیلۂ بکر کا آدمی) کہنے سے ایک ابہام تھا کہ کون سا بکری مراد ہے۔ "بِشْرٍ" نے آکر اس کی وضاحت اور تعین کر دیا۔

***سوال :**

اس مثال میں "بِشْرٍ" کو "البِكْرِيِّ" سے "بدل" کیوں نہیں قرار دیا جا سکتا؟

***جواب :**

مصنفؒ کے مطابق اس کی وجہ ایک اہم نحوی قاعدہ ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس مضاف پر الف لام (ال) داخل ہو (جیسے یہاں "التَّارِكِ")، اس کے مضاف الیہ (یہاں "البِكْرِيِّ") سے جب بدل لایا جائے تو اس بدل پر بھی مضاف کا عامل (یعنی "ال") دوبارہ لانا ضروری ہے۔ اس قاعدے کے مطابق اگر "بِشْرٍ" کو بدل بنانا مقصود ہوتا تو عبارت یوں ہونی چاہیے تھی "...التَّارِكِ البِكْرِيِّ البِشْرِ"۔ چونکہ یہاں "بِشْرٍ" پر الف لام نہیں لایا گیا، اس لیے جمہور نحویوں کے نزدیک اسے بدل قرار دینا

درست نہیں۔

*اس قاعدے کی مزید وضاحت :بدل کا اصول یہ ہے کہ وہ مبدل منہ کی جگہ لے سکتا ہے، یعنی مبدل منہ کو حذف کر کے صرف بدل کو باقی رکھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اس شعر میں مبدل منہ ("البِكْرِيِّ") کو حذف کر دیں تو عبارت بنے گی :"... التَّارِكِ بِشْرٍ"۔ یہ ترکیب نحوی اعتبار سے غلط ہے، کیونکہ اسم فاعل "التارك" پر جو "ال" ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اس کا معمول (مفعول بہ یعنی "بِشْرٍ") بھی یا تو "ال" والا ہو یا ایسے اسم کی طرف مضاف ہو جس پر "ال" ہو۔ چونکہ "بِشْرٍ" ان دونوں صورتوں سے خالی ہے، لہٰذا یہ ترکیب جائز نہیں۔ پس جب مبدل منہ کو ہٹا کر بدل کو اس کی جگہ رکھنا ہی جائز نہیں، تو اسے سرے سے بدل قرار دینا بھی جائز نہ ہوا۔

ترکیب:

أَنَا ابْنُ التَّارِكِ الْبِكْرِيِّ بِشْرٍ عَلَيْهِ الطَّيْرُ تَرْقُبُهُ وُقُوْعًا

انا مبتدا ابن مضاف التارک مضاف الیہ البکری مبین یا معطوف علیہ بول دو بشر عطف بیان مبین اور عطف بیان ملک کر ذوالحال اول عَلَیْهِ جار مجرور مل کر متعلق ہوا ثابتۃ کے ثابتۃ اسم ہیَ ضمیر اس کا فاعل اسم فاعل اپنے فاعل اور متعلق سے مل کر شبہ جملہ ہو کر ذوالحال ثانی ترقب فعل با فاعل ہٗ ضمیر مفعول بہ ۔ فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر حال ہوا۔ ذوالحال ثانی کا حال ذوالحال مل کر الطیر مبتداء موٗخر کے لیے خبر مبتداء موٗخر اور خبر مقدم مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہو کر ذوالحال اوّل کے لیے حال ۔حال ذوالحال مل کر التارک کا مضاف الیہ۔ مضاف مضاف الیہ مل کر ابن کا مضاف الیہ مضاف مضاف الیہ مل کر خبر۔ انا مبتدا کی۔ مبتدا خبر مل کر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

مبنی کا بیان

"المبنيّ :ما ناسب مبنيّ الأصل، أو وقع غير مركّب. وحكمه أن لا يختلف آخره باختلاف العوامل. وألقابه :ضمّ، وفتح، و كسر، ووقف. وهي: المضمرات، وأسماء الإشارة، والموصولات، وأسماء الأفعال، والأصوات، والمركّبات، والكنايات، وبعض الظّروف.

"ترجمہ: مبنی :وہ (اسم) ہے جو مبنی الاصل کے مشابہ ہو، یا غیر مرکب واقع ہو۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا آخر عوامل کے بدلنے سے نہیں بدلتا۔ اور اس کے القاب ہیں :ضم، فتح، کسر اور وقف۔ اور وہ یہ ہیں :مضمرات، اسماء اشارہ، موصولات، اسماء افعال، اصوات، مرکبات، کنایات اور بعض ظروف۔

تشریح:

قوله :المبنيّ :ما ناسب مبنيّ الأصل، أو وقع غير مركّب

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، معرب کی بحث کے بعد اسم کی دوسری قسم یعنی "مبنی" کا بیان شروع فرما رہے ہیں۔

مبنی کی تعریف؛

المبنی :ما ناسب مبنیّ الأصل أو وقع غیر مرکّب

یعنی وہ اسم جو "مبنی الاصل" کے مشابہ ہو اور وہ اسم جو ترکیب کلامی میں واقع نہ ہو۔

مبنی ہونے کی دو بنیادی وجوہات

مصنفؒ نے مبنی ہونے کی دو بنیادی وجوہات بیان فرمائی ہیں:

ما ناسب مبنيّ الأصل :یعنی وہ اسم جو "مبنی الاصل" کے مشابہ ہو۔ مبنی الاصل سے مراد حروف اور فعل ماضی ہیں۔ چونکہ یہ اصلاً مبنی ہیں، لہٰذا جو اسم ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی مشابہت رکھے گا (مثلاً مشابہتِ وضعی جیسے اسم اشارہ میں، یا مشابہتِ معنوی جیسے اسماء استفہام میں، یا مشابہتِ استعمالی جیسے اسماء افعال میں)، وہ بھی مبنی ہو جائے گا۔

أو وقع غیر مرکّب :یعنی وہ اسم جو ترکیب کلامی میں واقع نہ ہو، جیسے حروف تہجی (الف، با، تا) جب ان کو الگ الگ بولا جائے۔ چونکہ ان پر کوئی عامل داخل نہیں ہوتا، اس لیے ان میں اعراب کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا یہ مبنی ہوتے ہیں۔

مبنی کا حکم

قوله :وحکمه أن لا یختلف آخره باختلاف العوامل

یہاں مبنی کا حکم اور اس کا عملی نتیجہ بیان فرمایا کہ مبنی اسم پر جب مختلف عوامل (مثلاً رفع دینے والے، نصب دینے والے، یا جر دینے والے) داخل ہوں تو بھی اس کی آخری حرکت یا حالت تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ مثلاً "جاء هؤلاءِ"، "رأیت هؤلاءِ"، "مررت بهؤلاءِ" میں "هؤلاء" تینوں حالتوں میں کسرہ پر مبنی ہے۔

اعراب کی طرح بناء کے بھی القاب ہیں

قوله :وألقابه :ضمّ،وفتح،و کسر،ووقف

اعراب کی طرح بناء کے بھی القاب ہیں۔ جس طرح معرب کے آخر کو رفع، نصب، جر کہتے ہیں، اسی طرح مبنی کے آخر کی حالت کو ضم (جیسے "حیثُ")، فتح (جیسے "أینَ")، کسر (جیسے "أمسِ") اور وقف یا سکون (جیسے "کمْ") کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاحات نحویوں کے نزدیک بناء کے لیے خاص ہیں۔

قوله :وهي یہاں سے مصنفؒ مبنی اسماء کی اقسام گنوا رہے ہیں، جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہ ہیں:

ضمیریں، اسماء اشارہ، اسماء موصولہ، اسماء افعال، اصوات، مرکب اسماء (جیسے أحد عشر)، کنایات (جیسے کم، کذا) اور بعض ظروف (جیسے إذ، حیث)۔

ضمائر کا بیان

"المضمر :ما وضع لمتکلّم، أو مخاطب، أو غائب تقدّم ذکره لفظا أو معنی أو حکما. وهو متّصل ومنفصل. فالمنفصل:

المستقلّ بنفسہ. والمتّصل :غیر المستقلّ بنفسہ. وھو مرفوع، ومنصوب، ومجرور. فالأوّلان متّصل ومنفصل، والثّالث متّصل، فذلك خمسة أنواع. الأوّل :ضربت وضربت، إلی ضربن، وضربن. والثّانی :(أنا) إلی (ھنّ). والثّالث: ضربنی إلی ضربھنّ، وإنّنی إلی إنّھنّ. الرّابع :إیّای إلی إیّاھنّ. والخامس :غلامی، ولی، إلی غلامھنّ، ولھنّ.

ترجمہ :المضمر (ضمیر) :وہ اسم ہے جو متکلم، یا مخاطب، یا ایسے غائب کے لیے وضع کیا گیا ہو جس کا ذکر لفظاً، یا معنیً، یا حکماً پہلے گزر چکا ہو۔اور وہ متصل بھی ہوتی ہے اور منفصل بھی۔پس منفصل وہ ہے جو بذات خود مستقل ہو۔اور متصل وہ ہے جو بذات خود مستقل نہ ہو۔اور وہ مرفوع، منصوب، اور مجرور ہوتی ہے۔پس پہلی دو قسمیں (مرفوع اور منصوب) متصل اور منفصل دونوں طرح آتی ہیں، اور تیسری قسم (مجرور) صرف متصل آتی ہے، پس یہ پانچ قسمیں ہوئیں۔* پہلی (مرفوع متصل) :ضَرَبْتُ، ضَرَبْتَ... سے ضَرَبْنَ، ضَرَبْنَ تک۔* دوسری (مرفوع منفصل) :أَنَا... سے هُنَّ تک۔* تیسری (منصوب متصل) : ضَرَبَنِي... سے ضَرَبَهُنَّ تک، اور إِنَّنِي... سے إِنَّهُنَّ تک۔* چوتھی (منصوب منفصل) :إِيَّايَ... سے إِيَّاهُنَّ تک۔* پانچویں (مجرور متصل) :غُلَامِي، لِي... سے غُلَامُهُنَّ، لَهُنَّ تک۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، مبنیات کی پہلی اور سب سے اہم قسم "ضمیر" کی تعریف فرمارہے ہیں۔

ضمیر کی تعریف:

"المضمر :ما وضع لمتکلّم، أو مخاطب، أو غائب تقدّم ذکرہ لفظاً أو معنی أو حکماً.

ضمیر وہ اسم معرفہ ہے جو متکلم (بات کرنے والے، جیسے میں، ہم)، مخاطب (جس سے بات کی جائے، جیسے تو، تم) یا ایسے غائب (جس کا ذکر ہو رہا ہو) کے لیے وضع کیا گیا ہو جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہو۔

غائب کا ذکر تین طرح سے ہو سکتا ہے:

لفظاً :جیسے "جاء زیدٌ فأکرمتُه" (اس میں "ہ" ضمیر کا مرجع "زید" لفظوں میں موجود ہے)۔معنیً :جیسے "اعدلوا ھو أقرب للتقوی" (یہاں "ھو" کا مرجع "عدل" ہے جو "اعدلوا" کے معنی میں موجود ہے)۔حکماً :جیسے "ضرب غلامه زید، یہاں زید حکما مقدم مانا جاتا ہے۔

ضمیر کی دو بنیادی قسمیں

قولہ :وھو متّصل ومنفصل

ضمیر کی دو بنیادی قسمیں ہیں :متصل :وہ ضمیر جو اپنے عامل (فعل یا اسم یا حرف) کے ساتھ مل کر آتی ہے اور الگ سے اس کا وجود نہیں ہوتا، جیسے "ضربتُ" میں "تُ"۔منفصل :وہ ضمیر جو خود مختار ہوتی ہے اور اپنے عامل سے جدا لکھی اور بولی جاتی ہے، جیسے "أنا"، "إیاك"۔

ضمیروں کی پانچ قسمیں

قولہ :فذلك خمسة أنواع

پھر اعرابی حالت (مرفوع، منصوب، مجرور) اور اتصال و انفصال کے اعتبار سے ضمیروں کی پانچ قسمیں بنتی ہیں: مرفوع متصل : جیسے "ضربْتُ" سے لے کر "ضربْنَ" تک۔ مرفوع منفصل :جیسے "أنا" سے لے کر "هنّ" تک۔ منصوب متصل :جیسے "ضربَنِي" سے لے کر "ضربهنّ" تک۔ منصوب منفصل :جیسے "إيّايَ" سے لے کر "إيّاهنّ" تک۔ مجرور متصل :جیسے "لِي"، "غلامِي"۔ ضمیر مجرور ہمیشہ متصل ہی ہوتی ہے، منفصل نہیں ہوتی۔

تفصیل مندرجہ ذیل ہے؛

(پہلی قسم ضمیر مرفوع متصل کی مثال)

جیسے ضَرَبْتُ معروف اور ضُرِبْتُ مجہول پورا ضَرَبْنَ تک یا ضُرِبْنَ تک تمام گردان اس طرح ہو گی۔

ضمیر مرفوع متصل معروف و مجہول

ضَرَبْتُ	ضَرَبْنَا	ضَرَبْتَ	ضَرَبْتُمَا	ضَرَبْتُمْ
ضَرَبْتِ	ضَرَبْتُمَا	ضَرَبْتُنَّ	ضَرَبَ	ضَرَبَا
ضَرَبُوْا	ضَرَبَتْ	ضَرَبَتَا	ضَرَبْنَ	

(دوسری قسم ضمیر منصوب متصل)

ضمیر منصوب متصل دو طرح کی ہے:

نمبر (۱) متصل با فعل۔ نمبر (۲) متصل با حرف۔

ضمیر منصوب متصل با فعل

ضَرَبَنِيْ	ضَرَبَنَا	ضَرَبَكَ	ضَرَبَكُمَا	ضَرَبَكُمْ
ضَرَبَكِ	ضَرَبَكُمَا	ضَرَبَكُنَّ	ضَرَبَهٗ	ضَرَبَهُمَا
ضَرَبَهُمْ	ضَرَبَهَا	ضَرَبَهُمَا	ضَرَبَهُنَّ	

ضمیر منصوب متصل با حرف

اِنَّنِيْ	اِنَّنَا	اِنَّكَ	اِنَّكُمَا	اِنَّكُمْ
اِنَّكِ	اِنَّكُمَا	اِنَّكُنَّ	اِنَّهٗ	اِنَّهُمَا
اِنَّهُمْ	اِنَّهَا	اِنَّهُمَا	اِنَّهُنَّ	

تیسری قسم ضمیر مجرور متصل

ضمیر مجرور متصل کی دو قسمیں:

(۱) مجرور متصل با اسم۔ (۲) مجرور متصل با حرف۔

ضمیر مجرور متصل بااسم

غُلَامِيْ	غُلَامَنَا	غُلَامَكَ	غُلَامَكُمَا	غُلَامَكُمْ
غُلَامَكِ	غلامكما	غُلَامكنَّ	غلامه	غُلَامَهما
غلامهم	غلامها	غلامهما	غلامهنَّ	

ضمیر مجرور متصل باحرف

لی	لنا	لك	لكما	لكم
لكِ	لكما	لكنَّ	له	لهما
لهم	لها	لهما	لَهُنَّ	

ضمیر مرفوع منفصل

اَنَا	نَحْنُ	اَنْت	اَنْتُمَا	اَنْتُمْ
اَنْتِ	اَنْتُمَا	اَنْتُمْن	هُوَ	هُمَا
هُمْ	هِيَ	هُمَا	هُنَّ	

ضمیر منصوب منفصل

اِيَّایَ	اِيَّانَا	اِيَّاكَ	اِيَّاكُمَا	اِيَّاكُمْ
اِيَّاكِ	اِيَّاكُمَا	اِيَّاكُنَّ	اِيَّاهُ	اِيَّاهُمَا
اِيَّاهُمْ	اِيَّاهَا	اِيَّاهُمَا	اِيَّاهُنَّ	

مرفوع متصل کی تفصیل

فالمرفوع المتّصل خاصّة يستتر في الماضي للغائب والغائبة، وفي المضارع للمتكلّم مطلقا، والمخاطب والغائب والغائبة، وفي الصّفة مطلقا. ولا يسوغ المنفصل إلا لتعذّر المتّصل، وذلك بالتّقديم على عامله، أو بالفصل لغرض، أو بالحذف، أو بكون العامل معنويّا، أو حرفا والضّمير مرفوع، أو بكونه مسندا إليه صفة جرت على غير من هي له مثل: (إيّاك ضربت) و(ما ضربك إلاّ أنا)، و(إيّاك والشّرّ) و(أنا زيد) و(ما أنت قائما)، و(هند زيد ضاربته هي)."

ترجمہ: پس مرفوع متصل خاص طور پر ماضی میں غائب اور غائبہ (کے صیغوں) میں، اور مضارع میں متکلم مطلقاً (واحد و جمع)، مخاطبِ (واحد مذکر)، غائب (واحد مذکر) اور غائبہ (واحد مونث) میں، اور صفت (اسم فاعل/مفعول) میں مطلقاً مستتر (پوشیدہ) ہوتی ہے۔ اور ضمیر منفصل لانا جائز نہیں مگر جب متصل لانا متعذر (ناممکن) ہو، اور یہ اس کے عامل پر مقدم ہونے کی وجہ سے،

یا کسی غرض سے فاصلہ آنے کی وجہ سے، یا حذف کی وجہ سے، یا عامل کے معنوی ہونے کی وجہ سے، یا عامل کے حرف ہونے اور ضمیر کے مرفوع ہونے کی وجہ سے، یا اس کے ایسی صفت کا مسند الیہ ہونے کی وجہ سے جو اپنے غیر کے لیے جاری ہو، ہوتا ہے۔ جیسے: (إِيَّاكَ ضَرَبْتُ)، (مَا ضَرَبَكَ إِلَّا أَنَا)، (إِيَّاكَ وَالشَّرَّ)، (أَنَا زَيْدٌ)، (مَا أَنْتَ قَائِمًا)، اور (هِنْدٌ زَيْدٌ ضَارِبَتُهُ هِيَ)۔

تشریح:

قوله :فالمرفوع المتّصل خاصّة يستتر

ضمیر مرفوع متصل کا استعمال

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، اس بات کو بیان فرمارہے ہیں کہ ضمیر مرفوع متصل کتنے صیغوں میں مستتر "پوشیدہ" ہوگی۔

تو اس کے سمجھنے سے پہلے ضمیر کی قسمیں سمجھ لیں۔

یاد رکھیں ضمیر کی (۲) دو قسمیں ہیں:

(۱) ضمیر بارز (۲) ضمیر مستتر۔

ضمیر بارز کی تعریف:

ضمیر بارز اس کو کہتے ہیں جس کا تلفظ ہو سکے یعنی جو لفظوں میں ظاہر ہو۔

ضمیر مستتر کی تعریف:

ضمیر مستتر اس کو کہتے ہیں جو پوشیدہ ہو یعنی لفظوں میں ظاہر نہ ہو۔

اب سمجھیں کہ ماضی کے ۲ دو صیغوں میں ضمیر مرفوع مستتر ہوگی:

۱)...واحد مذکر غائب جیسے ضَرَبَ میں هُوَ ضمیر۔

۲)... واحد مؤنث غائب جیسے ضَرَبَتْ میں هِيَ ضمیر۔

اور مضارع کے (۵) پانچ صیغوں میں ضمیر مرفوع مستتر ہوگی۔

۱)...واحد متکلم جیسے أَضْرِبُ میں أَنَا ضمیر۔

۲)...واحد متکلم جیسے نَضْرِبُ میں نَحْنُ ضمیر۔

۳)...واحد مذکر غائب جیسے يَضْرِبُ میں هُوَ ضمیر۔

۴)... واحد مؤنث غائب جیسے تَضْرِبُ میں هِيَ ضمیر۔

۵)... واحد مذکر حاضر جیسے تَضْرِبُ میں أَنْتَ ضمیر۔

اسی طرح صفت کے صیغوں میں بھی ضمیر مستتر ہوگی۔ یعنی اسم فاعل اسم مفعول اسم تفضیل صفت مشبہ وغیرہ ہیں۔ کیونکہ ان

صیغوں میں ضمیر پر دلالت کرنے والا قرینہ موجود ہوتا ہے اور وہ قرینہ ہے علامتِ تثنیہ اور علامتِ جمع جیسے ضَارِبٌ میں ھُوَ ضمیر اور ضَارِبَانِ میں ھُمَا ضمیر اور ضَارِبُوْنَ میں ھُمْ ضمیر ضَارِبَۃٌ میں ھِیَ ضمیر ضَارِبَتَانِ میں ھُمَا ضمیر ضَارِبَاتٌ میں ھُنَّ ضمیر۔

ضمیر منفصل کا استعمال

قولہ :ولا یسوغ المنفصل إلا لتعذّر المتّصلیہ

یہاں سے صاحبِ کتاب ضمیر منفصل کے استعمال کے لیے ایک ضابطہ بیان فرمارہے ہیں۔

ضابطہ:

فرماتے ہیں کہ جب تک ضمیر متصل کا استعمال کرنا کسی وجہ سے منع نہ ہو تو ضمیر منفصل کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے لیکن جہاں ضمیر متصل کا استعمال ممنوع ہو تو مجبوری کی وجہ سے ضمیر منفصل کو ستعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کی چند صورتیں ہیں:

تقدیم علی عاملہ :جب ضمیر کو اس کے عامل پر مقدم کرنا ہو، جیسے "إیّاکَ ضربت" (یہاں "إیاك" کو اس کے فعل "ضربت" پر مقدم کیا گیا ہے)۔

فصل لغرض :جب ضمیر اور عامل کے درمیان فاصلہ لانا مقصود ہو، جیسے حصر کے لیے "ما ضربَكَ إلا أنا" (یہاں إلا کے فاصلے کی وجہ سے "أنا" منفصل لائی گئی)۔

حذف العامل :جب عامل محذوف ہو، جیسے تحذیر میں "إیاكَ والشرَّ" (اصل میں "احذر إیاك" تھا)۔

عامل معنوی :جب عامل لفظی نہ ہو بلکہ معنوی ہو، جیسے مبتدا کی ضمیر "أنا زیدٌ"۔

عامل حرفی و ضمیر مرفوع :جب عامل حرف ہو اور ضمیر مرفوع ہو، جیسے "ما أنتَ قائمًا" میں "أنت"۔

صفت کا معمول :جہاں ایک صفت (اسم فاعل/مفعول) کا فاعل ایک ایسی ضمیر ہوتی ہے جو اس کے موصوف کے بجائے کسی اور ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ اس ابہام سے بچنے کے لیے ضمیر منفصل لانا واجب ہو جاتا ہے۔

مثال :هِنْدٌ زَیْدٌ ضَارِبَتُهُ هِيَ۔ اس جملے کا لفظی ترجمہ ہے :"ہند، زید وہ شخص ہے جس کو مارنے والی وہ (ہند) ہے"۔

:هِنْدٌ مبتدا اول ہے۔ زَیْدٌ مبتدا ثانی ہے۔ ضَارِبَتُهُ هِيَ پورا جملہ مبتدا ثانی کی خبر ہے۔ اس خبر کے اندر ضَارِبَۃٌ اسم فاعل ہے اور ہُ اس کا مفعول بہ ہے جو زیدٌ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اب ضَارِبَۃٌ کے فاعل کو واضح کرنا ہے کہ مارنے والا کون ہے۔ اگر ہم صرف ضَارِبَتُهُ کہیں تو یہ واضح نہیں کہ مارنے والا زید ہے یا کوئی اور۔ اس فاعل کو واضح کرنے کے لیے جو ہِنْدٌ کی طرف لوٹ رہا ہے، ضمیر منفصل هِيَ لانا واجب ہوگیا۔

دو ضمیروں کا اجتماع

وإذا اجتمع ضمیران ولیس أحدهما مرفوعا، فإن کان أحدهما أعرف وقدّمته فلك الخیار فی الثّانی، مثل (أعطیتکه) و (أعطیتك إیّاه)، و (ضربیك) و (ضربي إیّاك)، وإلاّ فهو منفصل، مثل :(أعطیته إیّاك وإیّاه). والمختار فی باب خبر (کان)

الانفصال.والأكثر (لولا أنت) إلى آخرها.و(عسيت) إلى آخرها.وجاء (لولاك) و(عساك) إلى آخرها.

ترجمہ:اور جب دو ضمیریں اکٹھی ہوں اور ان میں سے ایک مرفوع نہ ہو، پس اگر ان میں سے ایک زیادہ معرفہ ہو اور آپ اسے مقدم کریں تو آپ کو دوسری میں اختیار ہے، جیسے :(أَعْطَيْتُكَهُ) اور (أَعْطَيْتُكَ إِيَّاهُ)، اور (ضَرْبِيكَ) اور (ضَرْبِي إِيَّاكَ)۔ ورنہ وہ منفصل ہوگی، جیسے :(أَعْطَيْتُهُ إِيَّاكَ وَإِيَّاهُ)۔اور بابِ "کان" کی خبر میں انفصال (ضمیر منفصل لانا) مختار ہے۔اور اکثر (لَوْلَا أَنْتَ) آخر تک، اور (عَسَيْتَ) آخر تک آیا ہے۔اور (لَوْلَاكَ) اور (عَسَاكَ) آخر تک بھی آیا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے اُس قاعدے کو بیان فرما رہے ہیں جب ایک کلمہ میں دو ضمیریں اکٹھی ہو جائیں اور دونوں ضمیریں یا تو منصوب ہوں یا ایک منصوب اور دوسری مجرور ہو۔

پہلا قاعدہ :دو ضمیروں کا اجتماع:

"وإذا اجتمع ضميران وليس أحدهما مرفوعا.فإن كان أحدهما أعرف وقدّمته فلك الخيار في الثّاني.مثل (أعطيتكه) و (أعطيتك إيّاه)، و(ضربيك) و (ضربي إيّاك)، وإلاّ فهو منفصل.مثل :(أعطيته إيّاك وإيّاه)."

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی کلمے میں دو ضمیریں اس طرح جمع ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی ضمیرِ مرفوع (یعنی فاعل یا نائب فاعل کی ضمیر) نہ ہو، تو اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت :

ایک ضمیر دوسری سے "أعرف" ہو مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان دو ضمیروں میں سے ایک، معرفہ ہونے میں دوسری سے زیادہ قوی (أعرف) ہو اور اس أعرف ضمیر کو مقدم بھی رکھا گیا ہو، تو دوسری ضمیر کو متصل لانا بھی جائز ہے اور منفصل لانا بھی جائز ہے۔یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ ضمیروں میں معرفہ ہونے کا درجہ کیا ہے۔اس کی ترتیب یہ ہے :

* ضمیرِ متکلم (میں، ہم) سب سے زیادہ معرفہ (أعرف) ہے۔* ضمیرِ مخاطب (تُو، تم) کا درجہ اس کے بعد ہے۔* ضمیرِ غائب (وہ) کا درجہ سب سے کم ہے۔

مثالوں کی وضاحت :* (أَعْطَيْتُكَهُ) اور (أَعْطَيْتُكَ إِيَّاهُ) *ترجمہ :میں نے وہ (چیز) تمہیں دی۔* تجزیہ :اس مثال میں فعل "أعطی" کے دو مفعول ہیں۔پہلا مفعول "كَ" (تمہیں) ہے اور دوسرا "هُ" (وہ) ہے۔یہاں فاعل "تُ" ضمیرِ مرفوع ہے، اس لیے اس کا شمار ان دو ضمیروں میں نہیں ہوگا۔دو ضمیریں جو اکٹھی ہوئی ہیں وہ "كَ" (مخاطب) اور "هُ" (غائب) ہیں، اور دونوں منصوب ہیں۔

* قاعدے کا اطلاق :چونکہ ضمیرِ مخاطب ("كَ") ضمیرِ غائب ("هُ") سے زیادہ معرفہ (أعرف) ہے اور اسے مقدم بھی لایا گیا ہے، اس لیے مصنفؒ کے قاعدے کے مطابق دوسری ضمیر ("هُ") کو متصل لانا بھی جائز ہے، جیسا کہ "أَعْطَيْتُكَهُ" میں ہے، اور اسے منفصل لانا بھی جائز ہے، جیسا کہ "أَعْطَيْتُكَ إِيَّاهُ" میں ہے۔

* (ضَرْبِيْكَ) اور (ضَرْبِيْ إِيَّاكَ) *ترجمہ :میرا تمہیں مارنا۔ * تجزیہ :اس مثال میں مصدر "ضرب" اپنی "یاء" متکلم کی طرف مضاف ہے، جس کی وجہ سے "یاء" ضمیرِ مجرور ہے۔ اس کا مفعول "کَ" (تمہیں) ضمیرِ منصوب ہے۔ یہاں دو ضمیریں "یاء" (متکلم) اور "کَ" (مخاطب) جمع ہوئی ہیں۔

* قاعدے کا اطلاق :چونکہ ضمیرِ متکلم ("یاء") ضمیرِ مخاطب ("کَ") سے أعرف ہے اور مقدم بھی ہے، للذا دوسری ضمیر یعنی "کَ" کو متصل لانا "ضَرْبِيْكَ" کی صورت میں اور منفصل لانا "ضَرْبِيْ إِيَّاكَ" کی صورت میں، دونوں جائز ہیں۔

دوسری صورت :

اگر پہلی شرط نہ پائی جائے مصنفؒ فرماتے ہیں :

"**وإلاّ فهو منفصل**" یعنی اگر مذکورہ بالا شرط نہ پائی جائے تو دوسری ضمیر کو منفصل لانا واجب ہے۔ شرط نہ پائے جانے کی دو صورتیں ہیں :

*دونوں ضمیریں معرفہ ہونے میں برابر ہوں (مثلاً دونوں غائب ہوں)۔

***فإن كان أحدهما أعرف وقدّمته** ضمیر کو زیادہ معرفہ (الأعرف) ضمیر پر مقدم کر دیا جائے۔

مثالوں کی وضاحت :* (أَعْطَيْتُهُ إِيَّاكَ) *ترجمہ :میں نے تمہیں اس کے حوالے کیا۔ * تجزیہ :یہاں پہلا مفعول "هُ" (غائب) ہے اور دوسرا مفعول "کَ" (مخاطب) ہے۔

* قاعدے کا اطلاق :یہاں کم معرفہ (غائب) کو زیادہ معرفہ (مخاطب) پر مقدم کیا گیا ہے، للذا شرط نہیں پائی گئی، اس لیے دوسری ضمیر "إيّاک" کو منفصل لانا واجب ہے۔ یہاں "أعطيتُه كَ" کہنا جائز نہیں ہے۔

* (أَعْطَيْتُهُ إِيَّاهُ) *ترجمہ :میں نے وہ (چیز) اسے دی۔ * تجزیہ :یہاں پہلا مفعول "هُ" اور دوسرا مفعول بھی غائب کی ضمیر ہے جو "إيّاهُ" کی شکل میں آئی ہے۔

* قاعدے کا اطلاق :یہاں دونوں ضمیریں معرفہ ہونے میں برابر ہیں (دونوں غائب ہیں)۔ اس لیے شرط نہیں پائی گئی، للذا دوسری ضمیر کو منفصل لانا واجب ہے۔

دوسرا قاعدہ :خبرِ کان کا مسئلہ

"والمختار في باب خبر (كان) الانفصال."

مصنفؒ ایک خاص مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر "کان" یا اس کے اخوات میں سے کسی کی خبر ضمیر ہو، تو اس ضمیر کو منفصل لانا مختار (پسندیدہ اور بہتر) ہے، اگرچہ متصل لانا بھی جائز ہے۔

*مثال :کوئی کہے "الصديقُ كُنْتَهُ" (دوست تو ہی تھا)۔ یہاں "الصدیق" خبرِ "کان" مقدم ہے اور "تَ" اس کا اسم ہے، اور "هُ" وہ ضمیر ہے جو "الصدیق" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ صورت جائز ہے۔

*مختار صورت :لیکن مختار اور فصیح تر یہ ہے کہ کہا جائے :"الصديقُ كُنْتَ إِيَّاهُ"۔ یہاں ضمیر "إيّاهُ" کو منفصل لایا گیا ہے اور

یہی بہتر ہے۔

تیسرا قاعدہ :لولا اور عسیٰ کا استعمال

"والأكثر (لولا أنت) إلى آخرها، و(عسيت) إلى آخرها، وجاء (لولاك) و(عساك) إلى آخرها ."

آخر میں مصنفؒ دو مشہور کلمات کے ساتھ ضمیروں کے استعمال کے بارے میں لغتِ عرب کے دو مختلف اسالیب کو بیان فرمارہے ہیں :

*لَوْلَا : *الأکثر (زیادہ فصیح اور عام استعمال) :"لولا" کے بعد ضمیرِ مرفوع منفصل آتی ہے، کیونکہ "لولا" حرفِ شرط ہے اور اس کے بعد مبتدا آتا ہے جس کی خبر محذوف ہوتی ہے۔ جیسے :"لَوْلَا أَنْتَ لَهَلَكْتُ" (اگر تو نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا)۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے "لَوْلَا أَنَا"، "لَوْلَا هُوَ" وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔

* لیکن عربوں کے کلام میں "لولا" کے ساتھ ضمیرِ مجرور متصل کا استعمال بھی ملتا ہے، جیسے "لَوْلَاكَ"، "لَوْلَايَ"، "لَوْلَاهُ"۔ یہ بھی جائز ہے لیکن پہلے استعمال کے مقابلے میں کم ہے۔

* عَسَى : *الأکثر (زیادہ فصیح اور عام استعمال) :"عسی" جو افعالِ مقاربہ میں سے ہے، اس کے ساتھ ضمیرِ مرفوع متصل اس کے اسم کے طور پر آتی ہے۔ جیسے :"عَسَيْتُ أَنْ أَفْعَلَ" (امید ہے کہ میں کروں گا)، "عَسَيْتَ"، "عَسَيْتُمْ" وغیرہ۔

* :لیکن "عسی" کے ساتھ ضمیرِ منصوب متصل کا استعمال بھی وارد ہوا ہے۔ جیسے :"عَسَاكَ"، "عَسَانِي"۔ اس صورت میں "عسی" فعل کے بجائے حرفِ ترجی (امید کا معنی دینے والا حرف) کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

ونون الوقاية

"ونون الوقاية مع الياء لازمة في الماضي، وفي المضارع عريا عن نون الإعراب. وأنت مع النون فيه و(لدن) و(إنّ) وأخواتها مخيّر. ويختار في (ليت) و(من) و(عن) و(قد) و(قط)، وعكسها (لعلّ).

"ترجمہ :اور نون وقایہ یاء (متکلم) کے ساتھ فعل ماضی میں لازم ہے، اور اس فعل مضارع میں جو نون اعرابی سے خالی ہو۔ اور تو نون کے ساتھ اس (مضارع) میں اور (لدن) اور (إنّ) اور اس کے اخوات میں مختار ہے۔ اور (لیت)، (من)، (عن)، (قد) اور (قط) میں (نون لانا) پسندیدہ ہے، اور (لعلّ) میں اس کا الٹ ہے۔

تشریح:

"ونون الوقاية مع الياء لازمة في الماضي، وفي المضارع عريا عن نون الإعراب.

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں نون وقایہ کا حکم بیان فرمارہے ہیں۔

"وقایۃ" کا معنی ہے "بچانا"۔ یہ نون فعل یا بعض حروف کے آخر میں یاء متکلم سے پہلے اس لیے لایا جاتا ہے تاکہ فعل یا حرف کے آخری حرف کو کسرہ سے بچایا جاسکے جو یاء متکلم اپنے ماقبل چاہتی ہے۔

وجوبی صورت :

فعل ماضی (جیسے ضَرَبَنِي) اور امر (اِضْرِبْنِي) اور وہ فعل مضارع جس کے آخر میں نون اعرابی نہ ہو (جیسے يُكْرِمُنِي)، ان کے ساتھ نون وقایہ لانا واجب ہے۔

تخییر کی صورت :

وہ فعل مضارع جس کے آخر میں نون اعرابی ہو (جیسے يَضْرِبَانِ)، اسم "لدن" اور "إنّ" اور اس کے اخوات کے ساتھ نون لانے اور نہ لانے میں اختیار ہے (جیسے إنِّي اور إنَّنِي)۔

اولویت کی صورت :

"لیت"، حروف جار "مِن" اور "عَن"، اور "قد" و "قط" کے ساتھ نون لانا (مِنِّي، عَنِّي، لَيْتَنِي) زیادہ بہتر اور فصیح ہے۔

عکس کی صورت :

"لعلّ" میں اس کے برعکس ہے، یعنی نون کو حذف کرنا (لعلِّي) اس کو لگانے (لعلَّنِي) سے زیادہ فصیح ہے۔

"ضمیر فصل"

"ويتوسّط بين المبتدأ والخبر قبل العوامل وبعدها صيغة مرفوع منفصل مطابق للمبتدأ يسمّى فصلا، ليفصل بين كونه نعتا وخبرا. وشرطه أن يكون الخبر معرفة، أو (أفعل من كذا)، مثل: (كان زيد هو أفضل من عمرو). ولا موضع له عند الخليل، وبعض العرب يجعله مبتدأ وما بعده خبره.

"ترجمہ: اور مبتدا اور خبر کے درمیان، عوامل سے پہلے اور بعد میں، ایک مرفوع منفصل صیغہ واسطہ بنتا ہے جو مبتدا کے مطابق ہوتا ہے، اسے "فصل" کہتے ہیں؛ تاکہ وہ (بعد والے اسم کے) نعت ہونے اور خبر ہونے کے درمیان فرق کرے۔ اور اس کی شرط یہ ہے کہ خبر معرفہ ہو، یا (أفعل من كذا) ہو۔ جیسے: (كان زيد هو أفضل من عمرو)۔ اور خلیل کے نزدیک اس کا کوئی اعرابی محل نہیں، اور بعض عرب اسے مبتدا اور اس کے بعد والے کو اس کی خبر بناتے ہیں۔

تشریح:

"ويتوسّط بين المبتدأ والخبر قبل العوامل وبعدها صيغة مرفوع منفصل

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں ضمیر فصل کا بیان کر رہے ہیں۔ اسے "فصل" (جدائی کرنے والا) اس لیے کہتے ہیں کہ یہ خبر اور صفت کے درمیان فرق پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کہیں "زيدٌ القائمُ"، تو اس میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ "القائم" شاید "زید" کی صفت ہے اور خبر ابھی آنی ہے۔ لیکن اگر آپ "زيدٌ هو القائمُ" کہیں تو "هو" ضمیر اس بات کو یقینی بنا دیتی ہے کہ "القائم" صفت نہیں بلکہ خبر ہے۔

شرط :

ضمیر فصل لانے کی شرط یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والی خبر یا تو معرفہ ہو (جیسے زيدٌ هو العالمُ) یا پھر اسم تفضیل ہو جو "مِن" کے ساتھ آئے (جیسے كان زيدٌ هو أفضلَ من عمرٍو)۔

اعراب :

امام خلیل بن احمد اور جمہور نحویوں کے نزدیک ضمیر فصل کا اپنا کوئی اعرابی محل نہیں ہوتا، یہ محض فصل کے لیے آتی ہے۔ جبکہ بعض عرب قبائل (مثلاً بنو تمیم) اسے دوسرا مبتدا اور اس کے بعد والے اسم کو اس کی خبر مانتے ہیں۔

ضمیر شان وقصہ

ویتقدّم قبل الجملة ضمير غائب يسمّى ضمير الشّأن والقصّة يفسّر بالجملة بعده. ويكون منفصلا ومتصلا مستترا أو بارزا، على حسب العوامل نحو (هو زيد قائم)، و (كان زيد قائم) و (إنّه زيد قائم). وحذفه منصوبا ضعيف، إلّا مع (أن) إذا خفّفت فإنّه لازم.

ترجمہ: اور جملے سے پہلے ایک ضمیرِ غائب آتی ہے جسے "ضمیرِ شان" اور "ضمیرِ قصّہ" کہا جاتا ہے، جس کی تفسیر اس کے بعد والا جملہ کرتا ہے۔ اور یہ (ضمیر) عوامل کے اعتبار سے منفصل اور متصل، مستتر (پوشیدہ) یا بارز (ظاہر) ہوتی ہے، جیسے (**هُوَ زَيْدٌ قَائِمٌ**)، اور (**كَانَ زَيْدٌ قَائِمٌ**) اور (**إِنَّهُ زَيْدٌ قَائِمٌ**)۔ اور اس (ضمیر) کا حالتِ نصب میں حذف کرنا ضعیف ہے، سوائے "**أَنَّ**" کے ساتھ جب اسے مخفف (ہلکا) کر دیا جائے تو اس صورت میں اس (ضمیر) کا حذف کرنا لازم ہے۔

تشریح:

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، ایک خاص قسم کی ضمیر کا بیان فرما رہے ہیں جو کلامِ عرب میں بلاغت اور کلام کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

قوله :ویتقدّم قبل الجملة ضمير غائب يسمّى ضمير الشّأن والقصّة

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ کبھی کلام میں ایک پورا جملہ بیان کرنے سے پہلے ایک ضمیرِ غائب لائی جاتی ہے۔ اس ضمیر کو "ضمیرِ شأن" یا "ضمیرِ قصّہ" کہتے ہیں۔

"شأن" اور "قصّہ" کا معنی ہے:

اگر اس کے بعد والے جملے کا مضمون مذکر ہو تو اسے "ضمیرِ شأن" کہتے ہیں، اور اگر مضمون مؤنث ہو تو اسے "ضمیرِ قصّہ" کہتے ہیں، لیکن عموماً تغلیباً "ضمیرِ شأن" ہی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس ضمیر کا فائدہ کلام کی تعظیم اور سامع کے دل میں اس کی اہمیت پیدا کرنا ہے۔ متکلم پہلے ایک مبہم ضمیر "هُوَ" (وہ) یا "هِيَ" (وہ) کہہ کر سامع کو متوجہ کرتا ہے کہ کوئی اہم معاملہ یا قصہ بیان ہونے والا ہے۔

قوله :يفسّر بالجملة بعده

اس ضمیر کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کا کوئی خارجی مرجع (جس کی طرف یہ لوٹے) نہیں ہوتا، بلکہ اس کے فوراً بعد آنے والا پورا جملہ ہی اس کی تفسیر اور وضاحت کرتا ہے۔ گویا وہ ضمیر اس پورے جملے کے مضمون کا عنوان ہوتی ہے۔ نحوی اعتبار سے وہ بعد والا جملہ اس ضمیر سے خبر واقع ہوتا ہے۔

قولہ :ویکون منفصلا ومتصلا مستترا أو بارزا، علی حسب العوامل

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضمیرِ شأن شروع میں آنے والے عامل کے مطابق مختلف شکلوں میں آتی ہے:

منفصل :

جب اس پر کوئی لفظی عامل داخل نہ ہو تو یہ ضمیرِ منفصل کی صورت میں آتی ہے اور مبتدا ہوتی ہے۔ مثال :هُوَ زَيْدٌ قَائِمٌ۔ (ترجمہ :معاملہ یہ ہے کہ زید کھڑا ہے)۔ یہاں هُوَ ضمیرِ شأن، مبتدا اول ہے۔ اور زَيْدٌ قَائِمٌ پورا جملہ اسمیہ اس کی خبر ہے۔

متصل بارز :

جب اس پر کوئی ایسا عامل داخل ہو جو ضمیرِ متصل چاہے، جیسے "إِنَّ" اور اس کے اخوات۔ مثال :إِنَّهُ زَيْدٌ قَائِمٌ۔ (ترجمہ :بے شک معاملہ یہ ہے کہ زید کھڑا ہے)۔ یہاں "إِنَّ" کی ضمیر "هُ" ضمیرِ شأن ہے اور "إِنَّ" کا اسم ہے۔ اور زَيْدٌ قَائِمٌ پورا جملہ اسمیہ "إِنَّ" کی خبر ہے۔

متصل مستتر :

جب اس پر کوئی ایسا عامل داخل ہو جس میں ضمیر پوشیدہ ہو سکتی ہو، جیسے "كَانَ"۔ مثال :كَانَ زَيْدٌ قَائِمٌ۔ اس کی اصل تقدیر یہ ہے :كَانَ (هُوَ) زَيْدٌ قَائِمٌ۔ (ترجمہ :معاملہ یہ تھا کہ زید کھڑا تھا)۔ یہاں "كَانَ" میں پوشیدہ ضمیر "هُوَ" ضمیرِ شأن ہے جو "كَانَ" کا اسم ہے، اور زَيْدٌ قَائِمٌ پورا جملہ اسمیہ "كَانَ" کی خبر ہے۔

قولہ :وحذفہ منصوبا ضعیف

یہاں مصنفؒ اس ضمیر کو حذف کرنے کا حکم بیان فرما رہے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ اس ضمیر کو حذف نہیں کیا جاتا۔ بالخصوص جب وہ حالتِ نصب میں ہو (مثلاً "إِنَّ" کا اسم ہونے کی وجہ سے)، تو اس کا حذف کرنا لغتِ عرب میں "ضعیف" یعنی غیر فصیح اور شاذ سمجھا جاتا ہے۔

قولہ :إلاّ مع (أن) إذا خفّفت فإنّہ لازم

پچھلے قاعدے سے ایک اہم صورت مستثنیٰ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب "أَنَّ" (تشدید کے ساتھ) کو مخفف کر کے "أَنْ" (سکون کے ساتھ) پڑھا جائے، تو اس صورت میں ضمیرِ شأن کو حذف کرنا نہ صرف جائز بلکہ "لازم" اور "واجب" ہے۔ یعنی اس صورت میں ضمیر کو ذکر کرنا غلط ہوگا۔ مثال :قرآن کریم میں ہے :وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (ترجمہ :اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے)۔ اس کی اصل أَنَّهُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ تھی۔ جب "أَنَّ" کو مخفف کر کے "أَنْ" کیا گیا تو ضمیرِ شأن "هُ" کو وجوبی طور پر حذف کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ "أَنْ" مخففہ کے بعد اکثر ایک پورا جملہ اسمیہ آتا ہے۔

اسمائے اشارہ کا بیان

"أسماء الإشارة :ما وضع لمشار إلیہ، وھی خمسة :للمذکّر، ولمثنّاہ (ذان) و (ذین)، وللمؤنّث :(تا) و (تی)، و (ذی)، و (تہ)، و

(ذہ)،و(تھی)،و(ذھی). ولمثنّاہ :(تان)و(تین). ولجمعھما :(أولاء)مدّا وقصرا. ویلحقھا حرف التّنبیہ،ویتّصل بھا حرف الخطاب... ویقال :(ذا)للقریب،و(ذلك)للبعید،و(ذاك)للمتوسط...

"ترجمہ:اسماء اشارہ :وہ اسم ہے جو کسی اشارہ کی گئی چیز کے لیے وضع کیا گیا ہو۔اور وہ پانچ ہیں :مذکر کے لیے،اس کے تثنیہ کے لیے (ذان) اور (ذین)،اور مؤنث کے لیے :(تا)، (تي)، (ذي)، (تہ)، (ذہ)، (تھي)،اور (ذھي)۔اور اس کے تثنیہ کے لیے: (تان) اور (تین)۔اور ان دونوں کی جمع کے لیے :(أولاء) مد اور قصر کے ساتھ۔اور ان کے ساتھ حرف تنبیہ (ھا) لگتا ہے،اور ان سے حرف خطاب (ک) متصل ہوتا ہے...اور کہا جاتا ہے :(ذا) قریب کے لیے، (ذلك) بعید کے لیے،اور (ذاك) متوسط کے لیے.

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ،امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے مبنیات میں سے دوسری قسم اسمآئے اشارہ کو بیان کیا ہے۔

اسمآئے اشارہ کی تعریف:

"أسماء الإشارة :ما وضع لمشار إلیہ.

اسم اشارہ اس اسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے کسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے جیسے ھٰذا القلم تو ھٰذَا اسم اشارہ ہے اس کے ذریعے سے اَلْقَلَمَ کی طرف کیا گیا ہے اور القلم مشار الیہ ہے۔

وھی خمسۃ الخ

للمذکّر،ولمثنّاہ(ذان)و(ذین)،وللمؤنّث :(تا)و(تی)،و(ذی)،و(تہ)،و(ذہ)،و(تھی)،و(ذھی). ولمثنّاہ :(تان)و(تین). ولجمعھما :(أولاء)مدّا وقصرا.

اور یہ پانچ[5] الفاظ ہیں چھ[6] معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مشار الیہ یا تو مذکر ہوگا یا مؤنث اگر مذکر ہو تو اس کی تین[3] صورتیں ہیں:

(۱) مفرد (۲) تثنیہ (۳) جمع

اور اگر مؤنث ہے تو اس کی بھی تین صورتیں ہیں:

(۲)(۱) مفرد (۲) تثنیہ (۳) جمع

مفرد مذکر کے لیے ذَا تثنیہ مذکر کے لیے حالت رفعی میں ذَانِ اور حالتِ نصبی اور جری میں ذَیْنِ۔

مفرد مؤنث کے لیے تَا، تِیْ، ذِیْ، تہ ذہ، تھی، ذِھی اور تثنیہ مؤنث کے لیے حالت رفعی میں تَانِ اور حالتِ نصبی وجری میں تَیْنِ جمع مذکر اور جمع مؤنث کے لیے أُولاءِ مد کے ساتھ اور أُولی الف مقصورہ کے ساتھ۔

ویلحقھا حرف التّنبیہ،ویتّصل بھا حرف الخطاب.

صاحبِ کتابؒ یہاں سے ایک فائدہ بیان فرمارہے ہیں۔

فائدہ:... فرماتے ہیں کہ اسم اشارہ کے شروع میں ھا، تنبیہ اور آخر میں حرف خطاب لگایا جاتا ہے۔

حرف التنبیہ لگانے کا فائدہ:

یہ ہے کہ مخاطب کو آگاہ کیا جاتا ہے حرف تنبیہ کے ذریعے جیسے ھٰذَا وَھٰذَانِ وَھٰؤُلَاءِ وغیرہ۔

حرف خطاب لگانے کا فائدہ:

اسم اشارہ کے آخر میں حرف خطاب لگانے کا فائدہ یہ ہے کہ مخاطب کی حالت پر دلالت کرے مفرد تثنیہ جمع اور مذکر اور مؤنث ہونے میں۔

وهي خمسة في خمسة، فتكون خمسة وعشرين، وهي: (ذاكَ) إلى (ذاكنّ)، و(ذانكَ) إلى (ذانكنّ)، وكذلك البواقي.

یاد رکھیں حروف خطاب بھی پانچ ہیں۔ کَ، کُمَا، کُمْ، کِ، کُنَّ، ویسے چھ ۶ ہونے چاہیے لیکن پانچ اس لیے شمار کرتے ہیں کہ تثنیہ مذکر اور تثنیہ مؤنث کے لیے ایک کُمَا ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ تو ان پانچ کو پانچ اسمائے اشارہ کے ساتھ ضرب دیں گے تو پچیس ۲۵ ہو جائیں گے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذَا اسم اشارہ کو ملاؤ کَ حرف خطاب کے ساتھ جیسے ذَاکَ اور باقیوں کو بھی اسی طرح ملاؤ تو وہی پچیس ہو جائیں گے۔

تفصیلی گردان یہ ہے

واحد مذکر

(۱) ذَاکَ	(۶) ذَانِکَ	(۱۱) تَاکَ	(۱۶) تَانِکَ	(۲۱) أُولٰئِکَ

تثنیہ مذکر مونث

(۲) ذَاکُمَا	(۷) ذَانِکُمَا	(۱۲) تَاکُمَا	(۱۷) تَانِکُمَا	(۲۲) أُولٰئِکُمَا

جمع مذکر

(۳) ذَاکُمْ	(۸) ذَانِکُمْ	(۱۳) تَاکُمْ	(۱۸) تَانِکُمْ	(۲۳) أُولَاءِکُمْ

واحد مؤنث

(۴) ذَاکِ	(۹) ذَانِکَ	(۱۴) تَاکِ	(۱۹) تَانِکِ	(۲۴) أُولٰئِکِ

جمع مؤنث

(۵) ذَاکُنَّ	(۱۰) ذَانِکُنَّ	(۱۵) تَاکُنَّ	(۲۰) تَانِکُنَّ	(۲۵) أُولٰئِکُنَّ

ويقال: (ذا) للقريب، و(ذلك) للبعيد، و(ذاك) للمتوسط، و(تلك) و(ذانّك) و(تانّك) مشدّدتين، و(أولالك) مثل

(ذلك).

ترجمہ:اور کہا جاتا ہے :"ذا" قریب کے لیے، اور "ذلك" بعید کے لیے، اور "ذاك" متوسط (درمیانے فاصلے) کے لیے۔ اور (اسی طرح) "تلك" (مؤنث بعید کے لیے ہے)، اور "ذانِّكَ" اور "تانِّكَ" (دونوں نون پر) تشدید کے ساتھ (بھی آتے ہیں)۔ اور "أولالك" کا معاملہ "ذلك" جیسا ہے۔

تشریح:

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، اسماء اشارہ کے مراتب کا بیان فرما رہے ہیں۔ یعنی اس بات کا بیان کہ اسم اشارہ جس چیز (مشارٌ الیہ) کی طرف اشارہ کر رہا ہے، وہ متکلم سے فاصلے کے اعتبار سے کس درجے پر ہے۔ اس کے تین مراتب ہیں :

قریب، بعید اور متوسط۔

قوله :ويقال :(ذا)للقريب

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اسم اشارہ "ذا" (مفرد مذکر کے لیے) اس وقت استعمال ہوتا ہے جب مشارٌ الیہ قریب ہو۔ یہ اسم اشارہ کی اصل اور بنیاد ہے، جس میں کوئی زائد حرف فاصلے پر دلالت کرنے کے لیے نہیں لایا گیا۔ اکثر اس کے شروع میں حرف تنبیہ "ھاَ" لگا دیا جاتا ہے، جس سے یہ "ھذا" بن جاتا ہے۔

قوله :و(ذاك)للمتوسط

جب مشارٌ الیہ درمیانے فاصلے پر ہو تو "ذا" کے آخر میں "کافِ خطاب" کا اضافہ کیا جاتا ہے، جس سے یہ "ذاكَ" بن جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ یہ "کاف" ضمیر نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک حرف ہے جو مخاطب پر دلالت کرتا ہے اور اس کا کوئی اعرابی محل نہیں ہوتا۔ یہ مخاطب کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے، چنانچہ مذکر کے لیے "ذاكَ"، مؤنث کے لیے "ذاكِ"، تثنیہ کے لیے "ذاکُمَا"، جمع مذکر کے لیے "ذاکُمْ" اور جمع مؤنث کے لیے "ذاکُنَّ" کہا جاتا ہے۔

قوله :و(ذلك)للبعيد

اور جب مشارٌ الیہ بہت دور ہو تو اس کے لیے وہ اسم اشارہ لایا جاتا ہے جس میں دوری پر دلالت کرنے والے دو حرف جمع ہوں : ایک "لامِ بُعد" (دوری کا لام) اور دوسرا "کافِ خطاب"۔ چنانچہ "ذا" پر یہ دونوں داخل ہو کر "ذلكَ" بن جاتا ہے۔ یہ اشارے کا سب سے بلند مرتبہ ہے۔

قوله :و(تلك)

جس طرح مذکر بعید کے لیے "ذلكَ" ہے، اسی طرح مؤنث بعید کے لیے "تلکَ" استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل مؤنث کا صیغہ "تِی" ہے جس پر لامِ بُعد اور کافِ خطاب داخل ہوئے تو یہ "تلكَ" بن گیا۔

قوله :و(ذانِّكَ)و(تانِّكَ)مشدّدتين

مصنفؒ یہاں تثنیہ کے صیغوں کی ایک لغت بیان فرمارہے ہیں۔ تثنیہ مذکر کے لیے "ذانِكَ" اور تثنیہ مؤنث کے لیے "تانِكَ" آتا ہے۔ لیکن بعض عرب قبائل ان کے نون پر تشدید پڑھتے ہیں، یعنی "ذانِّكَ" اور "تانِّكَ"۔ یہ تشدید تاکید یا محض ایک لغوی اختلاف کی بنا پر ہے۔

مصنف کا "مشدّدتین" فرمانا اس بات کی صراحت ہے کہ یہاں یہی لغت مراد ہے۔

قوله :و (أولالك) مثل (ذلك)

آخر میں مصنفؒ نے جمع کے صیغے کا حکم بیان فرمایا۔ جمع کے لیے اسم اشارہ "أولاء" آتا ہے۔ جب اس سے بعید کی طرف اشارہ کرنا ہو تو اس پر بھی کافِ خطاب لگایا جاتا ہے۔ اس کی صورت "أولئِكَ" بنتی ہے جو قرآن مجید میں بھی مستعمل ہے۔ مصنف کا یہ فرمانا کہ "أولئِكَ" کا معاملہ "ذلك" جیسا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مفرد میں لام اور کاف لگا کر بعید کا معنی پیدا کیا گیا، اسی طرح جمع میں بھی کیا جاتا ہے۔

اسم موصول

الموصول :مالا يتم جزءا إلاّ بصلة وعائد، وصلته جملة خبريّة، والعائد ضمير له. وصلة الألف واللاّم اسم فاعل أو مفعول. وهي :(الّذي)، و (الّتي)، و (اللّذان) و (اللّتان) بالألف والياء. و (الأولى)، و (الّذين)، و (اللائي)، و (اللاء)، و (اللاتي)، و (اللواتي)، و (من)، و (ما)، و (أي)، و (أية)، و (ذو) الطّائيّة، و (ذا) بعد (ما) للاستفهام، والألف واللاّم والعائد المفعول يجوز حذفه.

ترجمہ؛ موصول :وہ (اسم) ہے جو صلہ اور عائد کے بغیر کلام کا جزء نہیں بنتا۔ اور اس کا صلہ جملہ خبریہ ہوتا ہے، اور عائد ایک ضمیر ہوتی ہے جو اس کی طرف لوٹتی ہے۔ اور الف لام کا صلہ اسم فاعل یا اسم مفعول ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں :(الّذی)، (الّتی)، (اللّذان) اور (اللّتان) الف اور یاء کے ساتھ۔ اور (الأولى)، (الّذين)، (اللائي)، (اللاء)، (اللاتي)، (اللواتي)، (من)، (ما)، (أي)، (أية)، (ذو) قبیلہ طیّ کی لغت میں، اور (ذا) جو (ما) استفہامیہ کے بعد آتا ہے، اور الف لام۔ اور وہ عائد جو مفعول ہو اس کا حذف کرنا جائز ہے۔

تشریح:

اس عبارت میں مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے مبنیات میں سے تیسری قسم موصول کو بیان کیا ہے۔

اسمائے موصولہ کی تعریف

قوله :الموصول :مالا يتم جزءا إلاّ بصلة وعاء

مصنفؒ اسم موصول کی تعریف فرمارہے ہیں کہ یہ ایک ایسا مبہم اسم ہے جو خود سے کلام کا مکمل حصہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا جب تک کہ اس کے ساتھ دو چیزیں نہ مل جائیں :ایک "صلہ" اور دوسرا "عائد"۔ صلہ :وہ جملہ یا شبہ جملہ ہوتا ہے جو اسم

موصول کے بعد آکر اس کے ابہام کو دور کرتا ہے اور اس کا معنی واضح کرتا ہے۔

موصول کے صلہ کے لیے تین شرائط ہیں:

پہلی شرط:

وہ جملہ ہو کیونکہ موصول جو ہوتا ہے وہ مبہم ہوتا ہے تو جملے کے ذریعے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

دوسری شرط:

یہ ہے کہ جملہ خبریہ ہو جملہ انشائیہ نہ ہو کیونکہ جملہ خبریہ کا جملہ انشائیہ کے ساتھ ربط ہوتا ہے جملہ انشائیہ کا نہیں ہوتا۔

تیسری شرط:

یہ ہے کہ اس جملے "یعنی صلے" میں ایک ایسی ضمیر ہونی چاہیے جو موصول کی طرف لوٹے وجہ یہ ہے کہ جملہ مستقل بنفسا ہوتا ہے تو ماقبل سے ربط پیدا کرنے کے لیے ایک عائد ہونا چاہیے تاکہ وہ دونوں کو جوڑ دے۔

جملہ اسمیہ کی مثال :جَاءَ الَّذِیْ اَبُوْہُ قَائِمٌ

جملہ فعلیہ کی مثال :جَاءَ الَّذِیْ قَائِمٌ اَبُوْہُ ۔

قولہ :وصلة الألف واللاّم اسم فاعل أو مفعول

اس عبارت میں صاحبِ کتاب اسمآئے موصولہ میں سے الف لام بمعنی الذی کو بیان فرماتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اسمائے موصولہ میں سے وہ الف لام بھی ہے جو الذی کے معنی میں ہوتے ہیں اور ان کا صلہ ہمیشہ اسم فاعل اور اسم مفعول آتا ہے جو فعل کے معنی میں ہو یعنی وہ اسم فاعل اور اسم مفعول فعل کے معنی میں ہو جیسے جاءَنی الضارب زیدًا تقدیری عبارت ہے الذی یضربُ زیدًا تو الضارب کا الف لام الذی کے معنی میں ہے اور ضَارب اسم فاعل یضرب کے معنی میں ہے ۔

اسم مفعول کی مثال جاءَنی المضروبُ غُلَامُہٗ ای الذی یُضْرَبُ غُلَامہٗ ۔

وھی :(الّذی)،و(الّتی)،و(اللّذان)و(اللّتان)بالألف والیاء،و(الأولی)،و(الّذین)،و(اللائی)،و(اللاء)،و(اللاتی)،و (اللواتی)،

اس عبارت میں مصنفؒ نے مشہور اسماء موصولہ گنوائے ہیں

یاد رکھیں کہ اسمائے موصولہ کے لیے جو الفاظ آتے ہیں وہ چھ ۶ معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

۱)...الذی مفرد مذکر کے تینوں حالتوں میں۔

۲)...التی واحد مؤنث کے لیے تینوں حالتوں میں۔

۳)...الذان حالتِ رفعی میں الذَین حالت نصبی وجری میں تثنیہ مذکر کے لیے۔

۴)...الذِین اور اولا ٔ جمع مذکر کے لیے۔ تینوں حالتوں میں۔
۵)...اللَّتَانِ تثنیہ مؤنث حالت رفعی میں اللتَیْن تثنیہ مؤنث حالت نصبی وجری میں۔
۶)... اللَّاتِیْ، اللَّوَاتِیْ، اللَّاءِ، اللَّائِیْ جمع مؤنث کے لیے تینوں حالتوں میں۔

و (من)، و (ما)، و (أی)، و (أیة)، و (ذو) الطائیة، و (ذا) بعد (ما) للاستفهام

مَا اور مَنْ۔ اس میں جو ما ہے یہ اکثر غیر ذوالعقول کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے ما ھٰذا "یہ کیا ہے"؟
مَنْ اکثر ذوی العقول کے لیے آتا ہے جیسے مَنْ ھٰذا یہ کون ہے۔ انسان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
لیکن کبھی کبھی یہ دونوں ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔
ایٌ اور ایَّۃٌ یہ ایک حالت میں مبنی ہیں اور باقی حالتوں میں معرب ہیں۔
(ذو الطّائیّة،) اور ذُو بمعنی الذی لغت بنی طے ہے۔
یاد رکھیں کہ ذو کے اندر تھوڑی سی تفصیل ہے۔
تفصیل یہ ہے کہ ذو دو۲ معنی کے لیے آتا ہے۔

(۱)...ذو بمعنی صاحب جیسے ذُومَالٍ صاحب مال ذُوعِلْمٍ صاحب علم جیسے اسمائے ستہ میں گزر چکا۔ اس صورت میں یہ معرب ہے۔
(۲)...ذو بمعنی الذی لغت بنی طے میں خاص طور پر اور یہی یہاں پر مراد ہے تو اس صورت میں یہ مبنی ہے اور یہ کسی حالت میں تبدل نہیں ہوگا جیسے جَاءَنِیْ ذُوْ قَامَ حالت رفعی میں اور رأیت ذو قام حالتِ نصبی میں اور مررت بذو قام حالت جری میں اس میں مذکر مؤنث واحد تثنیہ جمع غائب حاضر سب برابر ہیں۔
و (ذا) بعد (ما) للاستفهام، یعنی ماذا استفہام کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے؛ماذا اراد الله؟
الالف واللام: جیسے الضارب المضروب

قوله :والعائد المفعول یجوز حذفه

پیچھے آپ کو بتایا تھا کہ صلہ جُملہ ہوتا ہے اور اس میں ایک عائد ہونا چاہیے جو موصول کی طرف لوٹے۔
اب یہاں سے اس بات کو بیان فرماتے ہیں کہ کبھی اس عائد کو حذف کردیا جاتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ مفعول بہ ہو اور اس کے حذف سے کوئی مانع موجود نہ ہو تو مفعول بہ کو حذف کر سکتے ہیں جیسے قام الذی ضربت کھڑا ہوا وہ شخص جس کو میں نے مارا یہ اصل میں تھا قام الذی ضربتُہٗ تو یہ ہٗ ضمیر مفعول بہ ہے اس کو حذف کرنے سے کوئی خرابی بھی نہیں آتی کیونکہ المنصوبُ فَضلۃٌ یعنی منصوب ایک اضافی چیز ہوتی ہے جملہ تو فعل اور فاعل سے پورا ہو جاتا ہے۔

الإخبار بالذی"

وإذا أخبرت ب(الّذی) صدّرتها، وجعلت موضع المخبر عنه ضميرا لها، وأخرّته خبرا، فإذا أخبرت عن (زید) من (ضربت زیدا) قلت: (الّذی ضربته زید)، و كذلك الألف واللاّم فی الجملة الفعليّة خاصّة، ليصحّ بناء اسمی الفاعل والمفعول،

فإن تعذّر أمر منها تعذّر الإخبار، ومن ثمّ امتنع في ضمير الشّأن والموصوف والصّفة، والمصدر العامل، والحال، والضّمير المستحقّ لغيرها، والاسم المشتمل عليه. و(ما) الاسميّة: موصولة، واستفهاميّة، وشرطيّة، وموصوفة، وتامّة بمعنى (شيء) و(صفة). و(من) كذلك، إلّا في التّمام والصّفة. و(أيّ) و(أيّة) ك(من)، وهي معربة وحدها، إلّا إذا حذف صدر صلتها. وفي (ماذا صنعت؟) وجهان: أحدهما: ما الّذي، وجوابه رفع، والآخر: أيّ شيء، وجوابه نصب.

ترجمہ: اور جب تو (الّذي) کے ذریعے خبر دے تو اسے شروع میں لائے گا، اور جس کے بارے میں خبر دی جارہی ہے اس کی جگہ اس (الذی) کے لیے ایک ضمیر لگائے گا، اور اسے (مخبر عنہ کو) خبر بنا کر مؤخر کر دے گا۔ پس جب تو (ضربت زیدا) میں (زید) کے بارے میں خبر دے تو کہے گا: (الّذي ضربته زيد)۔ اور اسی طرح الف لام کے ساتھ (خبر دینا) خاص طور پر جملہ فعلیہ میں ہوتا ہے؛ تاکہ اسم فاعل اور اسم مفعول کا بنانا صحیح ہوسکے۔ پس اگر ان میں سے کوئی امر متعذر ہو تو خبر دینا بھی متعذر ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ضمیر شان، موصوف، صفت، مصدر عامل، حال، وہ ضمیر جو کسی دوسرے کا حق ہو، اور وہ اسم جو اس (غیر) پر مشتمل ہو، ان میں (الذی کے ذریعے خبر دینا) ممنوع ہے۔ اور (ما) اسمیہ: موصولہ، استفہامیہ، شرطیہ، موصوفہ، اور تامہ بمعنی (شيء) اور (صفة) ہوتا ہے۔ اور (من) بھی اسی طرح ہے، سوائے تام اور صفت ہونے کے۔ اور (أيّ) اور (أيّة) (من) کی طرح ہیں، اور صرف یہی (اسم موصول) معرب ہے، مگر جب اس کے صلہ کا ابتدائی حصہ حذف کر دیا جائے۔ اور (ماذا صنعت؟) میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ یہ (ما الّذي) کے معنی میں ہو، اور اس کا جواب رفع میں ہوگا، اور دوسری یہ کہ یہ (أيّ شيء) کے معنی میں ہو، اور اس کا جواب نصب میں ہوگا۔

تشریح:

وإذا أخبرت ب(الّذي) صدّرتها، وجعلت موضع المخبر عنه ضميرا لها، وأخّرته خبرا، فإذا أخبرت عن (زيد) من (ضربت زيدا) قلت: (الّذي ضربته زيد)، وكذلك الألف واللّام في الجملة الفعليّة خاصّة، ليصحّ بناء اسمي الفاعل والمفعول،

یہاں سے مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ،

ایک نہایت دقیق اور اہم نحوی قاعدہ "الإخبار بالذي" (الذی کے ذریعے خبر دینا) بیان فرمارہے ہیں۔ اس کا مقصد جملے کے کسی اسم کو نمایاں کرنا، اس پر زور دینا یا اس کے بارے میں سوال کرنا ہوتا ہے۔ مصنفؒ نے اس کا طریقہ یوں بیان فرمایا: جس اسم (مُخبر عنہ) کو نمایاں کرنا ہو، اسے جملے سے نکال کر آخر میں لے جائیں اور اسے خبر بنا کر مرفوع کر دیں۔ جملے کے شروع میں اسم موصول الذي (یا اس کا مناسب صیغہ) لائیں۔ جملے میں مخبر عنہ کی خالی ہونے والی جگہ پر ایک ضمیر (عائد) لے آئیں جو موصول کی طرف لوٹے۔

مثال: جملہ ہے ضربتُ زیدًا۔ ہم زیدًا کے بارے میں خبر دینا چاہتے ہیں۔

مرحلہ ۱: زیدًا کو آخر میں لے جا کر زیدٌ (خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع) بنادیں۔ مرحلہ ۲: شروع میں الذي لگائیں۔ مرحلہ ۳: زیدًا کی جگہ ضمیرہ (عائد) لگادیں۔ نتیجہ: الذي ضربتُه زیدٌ۔ (ترجمہ: وہ ذات جسے میں نے مارا، زید ہے)۔

قوله :و من ثمّ امتنع في… پھر مصنفؒ نے ان صورتوں کا ذکر کیا ہے جن میں یہ قاعدہ استعمال نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان میں سے اسم کو نکال کر خبر بنانا ممکن نہیں ہوتا، جیسے :ضمیرِ شان، موصوف (کیونکہ صفت اس سے جدا نہیں ہو سکتی)، حال، مصدرِ عامل وغیرہ۔

قوله :و (ما) الاسميّة… و (من) كذلك… و (أيّ) یہاں ما، من اور ای کے مختلف استعمالات بیان کیے جا رہے ہیں:

ما :یہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے:موصولہ :یعجبني ما صنعتَ (جو تو نے کیا وہ مجھے پسند آیا)۔استفہامیہ :ما اسمك؟ (تیرا نام کیا ہے؟)۔شرطیہ :ما تفعل من خير تجده (جو بھی بھلائی تو کرے گا، اسے پائے گا)۔موصوفہ :یہ نکرہ موصوفہ کے معنی میں ہوتا ہے۔مررتُ بما معجبٍ لك یعنی بشيءٍ معجبٍ۔تامہ :بمعنی "شے"۔نِعمّا یعنی نِعمَ شيئًا۔

من :یہ بھی ما کی طرح موصولہ، استفہامیہ اور شرطیہ ہوتا ہے لیکن یہ ذوی العقول کے لیے خاص ہے۔

أيّ وَأية :یہ بھی مذکورہ تینوں معنوں میں آتا ہے۔اس کی خاص بات یہ ہے کہ تمام اسماء موصولہ مبنی ہیں سوائے ایّ کے، یہ معرب ہے۔البتہ ایک صورت میں یہ بھی مبنی ہو جاتا ہے، اور وہ تب ہے جب اس کے صلہ کا صدر (ابتدائی حصہ) محذوف ہو۔ جیسے :سأكرم أيُّهم أفضلُ۔

فائدہ:

ای اور ایۃ کی چار حالتیں ہیں معرب اور مبنی ہونے کے اعتبار سے۔ایک حالت میں مبنی ہیں تین حالتوں میں معرب ہے۔

۱)...ای اور ایۃ مضاف ہوں اور ان کا صدر صلہ مذکور ہو جیسے ایهم قائمٌ

۲)...ای اور ایۃ مضاف نہ ہوں اور صدر صلہ بھی مذکور نہ ہو جیسے ایٌّ قائمٌ۔

۳)...ایٌّ اور ایۃ مضاف نہ ہوں اور صدر صلہ مذکور ہو جیسے ایٌّ هُوَ قائمٌ۔

ان تینوں حالتوں میں ایٌّ اور ایۃ معرب ہیں۔

۴)...ایٌّ اور ایۃ مضاف ہوں اور صدر صلہ محذوف منوی ہو جیسے أَيُّهُمْ قَائِمٌ۔یہ حالت مبنی ہے۔

قوله :وفي (ماذا صنعت؟) وجهان

آخر میں مصنفؒ ایک مشہور نحوی ترکیب ماذا کا ذکر فرما رہے ہیں۔اس کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:ماذا کو دو کلمے سمجھا جائے : ما اسم استفہام، مبتدا۔اور ذا اسم موصول بمعنی الذی، خبر۔اس صورت میں صنعت صلہ ہوگا اور جواب مرفوع ہوگا، جیسے خیرٌ۔ (ترجمہ :وہ کیا ہے جو تو نے کیا؟ جواب :بھلائی ہے)۔ماذا کو ایک ہی کلمہ سمجھا جائے :اس صورت میں ماذا پورا کا پورا اسم استفہام ہوگا بمعنی أيَّ شيءٍ (کون سی چیز؟)۔اور یہ صنعتَ فعل کے لیے مفعول بہ مقدم ہوگا۔اس صورت میں جواب منصوب ہوگا، جیسے خیرًا۔(ترجمہ :تو نے کون سی چیز کی؟ جواب :میں نے بھلائی کی)۔

اسمائے افعال

أسماء الأفعال :ما كان بمعنى الأمر أو الماضي، مثل :(رويد زيدا)، أي :أمهله، و (هيهات ذالك)، أي :بعد، وفعال بمعنى

الأمر من الثّلاثي قياس، ك(نزال) بمعنى انزل، وفعال مصدرا معرفة (فجار)، وصفة مثل :(يافساق) مبنيٌ، لمشابهته له عدلا وزنة، وعلما للأعيان مؤنّثا ك(قطام) و (غلاب) مبنيٌ في الحجاز، ومعرب في بني تميم، إلاّ ما في آخره راء، نحو (حضار).

ترجمہ :اسماء افعال :وہ (اسم) ہے جو امر یا ماضی کے معنی میں ہو، جیسے :(رويدَ زيداً)، یعنی :اسے مہلت دو، اور (هيهاتَ ذالك)، یعنی :وہ دور ہو گیا۔ اور سہ حرفی (فعل) سے امر کے معنی میں "فَعَالِ" کا وزن قیاسی ہے، جیسے (نزالِ) بمعنی "انزِل"۔ اور "فَعَالِ" کا وزن جب مصدر ہو اور معرفہ ہو (جیسے فجارِ)، اور جب صفت ہو جیسے (یا فساقِ)، تو یہ مبنی ہوتا ہے؛ اس (اسم فعل) کے ساتھ "عدلاً" اور "وزناً" مشابہت کی وجہ سے۔ اور جب یہ مؤنث شخصیات کا علم (نام) ہو جیسے (قطامِ) اور (غلابِ)، تو یہ حجاز والوں کے نزدیک مبنی ہوتا ہے، اور بنو تمیم کے نزدیک معرب ہوتا ہے، سوائے اس کے جس کے آخر میں "راء" ہو، جیسے (حضارِ)۔

تشریح

یہاں سے مصنفِ کتاب کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، مبنیات کی ایک اور قسم "اسماء الافعال" اور ان سے ملحقہ مباحث کو بیان فرمارہے ہیں۔

قوله :أسماء الأفعال :ما كان بمعنى الأمر أو الماضي

مصنفؒ اسم فعل کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ کلمہ ہے جو ہوتا تو اسم ہے لیکن معنی اور عمل فعل کا دیتا ہے۔ یعنی وہ اپنے فاعل کو رفع اور مفعول کو نصب دیتا ہے، لیکن فعل کی علامات (جیسے قد، سوف کا داخل ہونا) قبول نہیں کرتا۔

اسم فعل کی تین قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم :ما كان بمعنى الأمر مثل :(رويد زيدا)، أي :أمهله، بمعنی امر حاضر جیسے رُوَيْدَ بمعنی اَمْهِلْ تو مہلت دے، حَيَّهَلْ بمعنی اِئْتِ تو آ، هَلُمَّ بمعنی خُذْ تو پکڑ، بَلْهَ بمعنی دَعْ، تو چھوڑ دے، عَلَيْكَ بمعنی اَلْزِمْ لازم پکڑ۔

(۲) دوسری قسم :أو الماضي، و (هيهات ذالك)، أي :بعد.، یعنی وہ اسم فعل جو ماضی کے معنی میں ہو جیسے هيهاتَ ذالك بمعنی بَعُدَ دور ہوا۔ شَتَّانَ بمعنی اِفْتَرَقَ جدا ہوا۔ سَرْعَانَ بمعنی سَرَعَ "ماضی" جلدی کی اس نے۔

(۳) تیسری قسم :وفعال بمعنى الأمر من الثّلاثي قياس، ك (نزال) بمعنى انزل تیسری قسم وہ اسم فعل جو فَعَالِ کے وزن پر ہو اور امر حاضر کے معنی میں ہو اور یہ ثلاثی مجرد سے قیاس کے مطابق آتا ہے جیسے نَزَالِ بمعنی اَنْزِلْ تو اتر تَرَاكِ بمعنی اُتْرُكْ تو چھوڑ اور ضَرَابِ بمعنی اِضْرِبْ تو مار اور کتاب بمعنی اُكْتُبْ تو لکھ۔

وفعال مصدرا معرفة (فجار)، وصفة مثل :(يافساق) مبنيٌ، لمشابهته له عدلا وزنة، وعلما للأعيان مؤنّثا ك(قطام) و (غلاب) مبنيٌ في الحجاز، ومعرب في بني تميم، إلاّ ما في آخره راء، نحو (حضار).

یہاں سے مصنفؒ کچھ ایسے اسماء کا ذکر کر رہے ہیں جو در حقیقت اسم فعل نہیں ہیں لیکن فَعَالِ کے وزن پر ہونے کی وجہ سے اسم فعل کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اور اسی مشابہت کی وجہ سے وہ بھی مبنی علی الکسر ہوتے ہیں۔

مشابہت دو طرح کی ہے :عدلاً :یعنی وہ اسم اپنی اصلی شکل سے اس وزن کی طرف مائل ہوا ہو (عدل کیا ہو)۔

وزناً :یعنی اس کا وزن فَعَالِ ہو۔ایسے اسماء کی چند صورتیں یہ ہیں:
مصدر جب علم ہو :جیسے **فَجَارِ** ۔یہ ایک مشہور میلے کا نام تھا جو دور جاہلیت میں لگتا تھا۔یہ **فَجرۃ** سے معدول ہے۔
صفت جب منادیٰ ہو :جیسے **یا فَسَاقِ**۔یہ **یا فاسقۃ** (اے فاسقہ عورت!) سے معدول ہے۔اور **یا لَکَاعِ** جو **یا لکعاء** (اے کمینی!) سے معدول ہے۔

قوله :وعلما للأعيان مؤنّثاك(قطام)و(غلاب)مبنيّ في الحجاز،ومعرب في بني تميم

فَعَالِ کے وزن پر آنے والے مؤنث ناموں (اعلام) کے بارے میں اہل عرب کے دو مشہور قبیلوں کا اختلاف ہے:
اہل حجاز :ان کے نزدیک **فَعَالِ** کے وزن پر مؤنث کے جتنے بھی نام ہیں، وہ ہمیشہ کسرہ پر مبنی ہوتے ہیں، جیسے **قَطَامِ** (ایک عورت کا نام)۔وہ کہیں گے :**جاءتْ قطامِ، رأيتُ قطامِ، مررتُ بقطامِ**۔
بنو تمیم :ان کے نزدیک یہ نام مبنی نہیں بلکہ معرب اور غیر منصرف ہوتے ہیں۔وہ کہیں گے :**جاءتْ قطامُ، رأيتُ قطامَ، مررتُ بقطامَ**۔ان کے نزدیک اس کی وجہ علمیت اور تانیث ہے۔

قوله :إلّا ما في آخره راء، نحو(حضار)

آخر میں مصنفؒ نے بنو تمیم کے قاعدے سے ایک صورت کو مستثنیٰ کیا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ اگر **فَعَالِ** کے وزن پر آنے والے مؤنث نام کے آخر میں حرف "راء" ہو، تو اس پر بنو تمیم بھی اہل حجاز کی طرح اسے مبنی علی الکسر ہی مانتے ہیں۔مثال :**حَضَارِ** (ایک ستارے کا نام) یا **سَفَارِ** (ایک کنویں کا نام)۔ان اسماء کو تمام عرب مبنی علی الکسر ہی پڑھتے ہیں۔

اسمائے اصوات

الأصوات :كلّ لفظ حكي به صوت،أو صوّت به للبهائم.فالأوّل :ك(غاق)،والثّاني :ك(نخ).

ترجمہ: "الاصوات :ہر وہ لفظ جس کے ذریعے کسی آواز کی حکایت کی جائے، یا اس کے ذریعے چوپایوں کو آواز دی جائے۔پس پہلی قسم کی مثال 'غاق' (کوے کی آواز) ہے، اور دوسری قسم کی مثال 'نخ' (اونٹ کو بٹھانے کی آواز) ہے۔

"تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے یہاں سے مبنی کی پانچویں قسم اسمائے اصوات کو بیان کیا ہے۔
اسم صوت وہ اسم ہے جو دو میں سے ایک مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہو:
صوت کی حکایت (کسی آواز کی نقل) :
اس سے مراد ہر وہ لفظ ہے جو کسی جاندار یا بے جان چیز کی حقیقی آواز کو نقل کرنے کے لیے بولا جائے۔یہ آواز انسان کے منہ سے نکلنے والی اختیاری آواز نہ ہو، جیسے ہنسنا یا رونا، بلکہ غیر اختیاری یا دیگر اشیاء کی آواز ہو۔مصنفؒ نے اس کی مثال (غاق) سے دی ہے، جو کوے کی آواز "کائیں کائیں" کو نقل کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح گھوڑے کی آواز کے لیے "**صَهِيل**" اور گدھے کی آواز کے لیے "**نَهِيق**" کے بجائے اگر خود ان آوازوں کو الفاظ میں ڈھالا جائے تو وہ اسمائے اصوات کہلائیں گے۔
چوپایوں کو مخاطب کرنا (ان کو بلانا یا ہانکنا) :
اس سے مراد وہ الفاظ ہیں جو حیوانات کو کسی کام کا حکم دینے یا کسی کام سے روکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، گویا یہ الفاظ

حیوانات کے لیے بمنزلہ فعلِ امر یا نہی کے ہوتے ہیں۔ مصنفؒ نے اس کی مثال (نخ) سے دی ہے۔ یہ لفظ اونٹ کو بٹھانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں "نخ نخ"، تو گویا آپ اونٹ کو کہہ رہے ہیں "اُبرُک" (بیٹھ جا)۔ اسی طرح گھوڑے کو پانی پینے کے لیے بلانے کی آواز "ہلاَ" اور بھیڑ بکریوں کو ڈانٹنے کی آواز "عَیدَس" بھی اسی قبیل سے ہیں۔

نکتہ :

تمام اسمائے اصوات مبنی ہوتے ہیں کیونکہ یہ مبنی الاصل (حرف اور فعل امر) سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جس طرح حروف اور فعل امر عامل کے بدلنے سے نہیں بدلتے، اسی طرح یہ اسماء بھی ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتے ہیں، مثلاً "غاقِ" ہمیشہ کسرہ پر مبنی ہے اور "نخِّ" بھی۔

مرکب

المركّبات :كلّ اسم مركّب من كلمتين ليس بينهما نسبة.فإن تضمّن الثّاني حرفا بنيا.ك(خمسة عشر)و(حادي عشر) وأخواتها.إلاّ اثني عشر. وإلاّ أعرب الثّاني ك(بعلبك)وبني الأوّل في الأفصح.

ترجمہ: "المرکبات :ہر وہ اسم جو دو کلموں سے مل کر بنا ہو جن کے درمیان کوئی (اسنادی یا اضافی) نسبت نہ ہو۔ پس اگر دوسرا جزء کسی حرف (حرفِ عطف) کو متضمن ہو تو دونوں اجزاء مبنی ہوں گے، جیسے 'خمسة عشر' اور 'حادي عشر' اور ان کی مثل دیگر اعداد۔ سوائے 'اثني عشر' کے۔ اور اگر (دوسرا جزء حرف کو متضمن) نہ ہو تو دوسرے جزء کو معرب پڑھا جائے گا جیسے 'بعلبكّ'، اور پہلا جزء افصح قول کے مطابق مبنی ہوگا۔

"تشریح :

اس عبارت میں مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے مبنیات کی چھٹی قسم مرکب کو بیان کیا ہے۔

مرکب کی تعریف :

مصنفؒ کے نزدیک یہاں مرکب سے مراد "مرکب بِنائی" ہے، یعنی ہر وہ اسم جو دو کلموں سے مل کر بنا ہو اور ان دونوں کلموں کے درمیان کوئی نسبتِ اسادیہ (جملے والی نسبت جیسے زيدٌ قائمٌ) یا نسبتِ اضافیہ (جیسے غلامُ زيدٍ) یا نسبتِ توصیفیہ (جیسے رجلٌ عالمٌ) نہ پائی جائے۔ گویا دو الگ الگ الفاظ کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہو۔

پھر مصنفؒ اس کی دو قسمیں بیان فرماتے ہیں:

وہ مرکب جس کا دوسرا جزء حرفِ عطف "واو" کو متضمن ہو :یعنی در حقیقت ان دو الفاظ کے درمیان ایک "واو" مقدر مانا گیا ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں اجزاء فتحہ پر مبنی ہوں گے (مبنی علی فتح الجزئین)۔ مثال :مصنفؒ نے (خمسة عشر) اور (حادي عشر) کی مثالیں دی ہیں۔ اصل میں یہ "خمسةٌ و عشرٌ" اور "حادٍ و عشرٌ" تھے۔ واوِ عاطفہ اور پہلے اسم کی تنوین کو حذف کرکے دونوں کو ملا کر ایک اسم بنا دیا گیا اور آسانی کے لیے دونوں اجزاء کو فتحہ پر مبنی کر دیا گیا۔ گیارہ سے لے کر انیس تک کی گنتی (سوائے بارہ کے) اسی قاعدے کے تحت آتی ہے،

جیسے "ثلاثةَ عشرَ"، "أربعةَ عشرَ" وغیرہ۔

استثناء :

مصنفؒ نے (إلاّ اثني عشر) فرما کر اس قاعدے سے "اثنا عشر" (مذکر) اور "اثنتا عشرة" (مؤنث) کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اس میں پہلا جزء یعنی "اثنا/اثنی" معرب ہوتا ہے اور اسے تثنیہ کا اعراب (حالتِ رفعی میں الف کے ساتھ اور حالتِ نصبی وجری میں یاء کے ساتھ) دیا جاتا ہے، جبکہ دوسرا جزء "عشرَ/عشرةَ" فتحہ پر مبنی رہتا ہے۔

وہ مرکب جس کا دوسرا جزء حرفِ عطف کو متضمن نہ ہو : یعنی دونوں اسماء کو بغیر کسی مقدر حرف کے ملا دیا گیا ہو۔ اسے "مرکب مزجی" بھی کہتے ہیں۔

حکم : اس کا حکم یہ ہے کہ دوسرا جزء معرب ہوگا اور غیر منصرف ہونے کی وجہ سے اس پر اعراب (رفع، نصب، جر) آئے گا لیکن تنوین اور کسرہ قبول نہیں کرے گا۔ جبکہ پہلا جزء افصح لغت کے مطابق فتحہ پر مبنی رہے گا۔

مثال : مصنفؒ نے (بعلبك) کی مثال دی ہے جو کہ اصل میں دو نام "بعل" اور "بك" تھے۔ اب اس کا پہلا جزء "بعلَ" ہمیشہ فتحہ پر مبنی رہے گا، جبکہ دوسرا جزء "بكُّ" عامل کے مطابق تبدیل ہوگا : "هذا بعلبكُّ" (حالتِ رفعی)، "رأيتُ بعلبكَّ" (حالتِ نصبی)، "مررتُ ببعلبكَّ" (حالتِ جری، فتحہ کے ساتھ کیونکہ غیر منصرف ہے)۔

اسمائے کنایة

الکنایات :(کم) و (کذا) للعدد، و (کیت) و (ذیت) للحدیث. ف (کم) الاستفهامیّة ممیّزها منصوب مفرد. والخبریّة مجرور مفرد ومجموع. وتدخل (من) فیهما، ولهما صدر الکلام. وکلاهما یقع مرفوعا ومنصوبا ومجرورا، فکلّ ما بعده فعل غیر مشتغل عنه بضمیره کان منصوبا معمولا علی حسبه، وکلّ ما قبله حرف جرّ أو مضاف فمجرور، وإلاّ فهو مرفوع مبتدأ إن لم یکن ظرفا، وخبرا إن کان ظرفا. وکذلك أسماء الاستفهام والشّرط. وفی مثل تمییز:

کم عمّة لك یا جریر وخالة .....

ثلاثة أوجه. وقد یحذف فی مثل :(کم مالك؟) و (کم ضربت؟).

ترجمہ: "الکنایات : (کَم) اور (کَذَا) عدد کے لیے، اور (کَیتَ) اور (ذَیتَ) بات کے لیے آتے ہیں۔ پس 'کَمْ' استفہامیہ کی تمییز مفرد اور منصوب ہوتی ہے۔ اور 'کَمْ' خبریہ کی تمییز مفرد یا مجموع اور مجرور ہوتی ہے۔ اور 'مِنْ' ان دونوں (کی تمییز) پر داخل ہو سکتا ہے، اور ان دونوں (کَم استفہامیہ و خبریہ) کے لیے کلام میں صدرِ کلام (شروع میں آنا) لازم ہے۔ اور یہ دونوں (کَم) مرفوع، منصوب اور مجرور واقع ہوتے ہیں۔ پس ہر وہ 'کم' جس کے بعد ایسا فعل ہو جو اس ('کم') سے اس کی ضمیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، تو وہ 'کم' اپنے مطابق معمول بن کر منصوب ہوگا۔ اور ہر وہ 'کم' جس سے پہلے حرفِ جر یا مضاف ہو تو وہ مجرور ہوگا۔ اور اگر ان میں سے کوئی صورت نہ ہو تو وہ مبتدأ بن کر مرفوع ہوگا اگر وہ ظرف نہ ہو، اور خبر (مقدم) ہوگا اگر وہ ظرف ہو۔ اور اسی طرح اسماءِ استفہام اور اسماءِ شرط کا بھی یہی حکم ہے۔ اور اس شعر کی تمییز میں : "اے جریر! تیری کتنی پھوپھیاں

اور خالائیں ہیں۔۔۔' تین وجوہات جائز ہیں۔اور کبھی تمیز کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے، جیسے :'کم مالک؟' (تمہارا مال کتنا ہے؟) اور 'کم ضربت؟' (تم نے کتنا مارا؟)۔

"تشریح:

یہاں سے مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے مبنیات کی ساتویں قسم "کنایات" کو بیان کیا ہے۔

اسمائے کنایہ تعریف:

کنایہ وہ اسم ہے جس کے ذریعے کسی غیر معین عدد یا بات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

مصنفؒ نے چار کنایات ذکر کیے ہیں: (کم) اور (کذا) :یہ دونوں غیر معین عدد سے کنایہ کے لیے آتے ہیں۔ مثلاً "عندي كذا درهماً" (میرے پاس اتنے درہم ہیں)۔

(کیت) اور (ذیت) :یہ دونوں غیر معین بات یا قصے سے کنایہ کے لیے آتے ہیں۔ مثلاً "قال زيدٌ كيتَ و كيتَ" (زید نے یوں یوں کہا)۔

پھر مصنفؒ تفصیل سے "کم" کی اقسام اور احکام بیان فرماتے ہیں:

کَمْ استفہامیہ

قولہ :(ف(کم)الاستفهاميّة مميّزها منصوب مفرد)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "کَمْ استفہامیہ"، جس کے ذریعے کسی عدد کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے (یعنی "کتنے؟")، اس کی تمیز (ممیّز) ہمیشہ مفرد اور منصوب ہوتی ہے۔ تمیز وہ اسم ہے جو "کَمْ" کی ابہام کو دور کرتا ہے۔ مثال :"كَمْ رَجُلاً عِنْدَكَ؟" (تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں؟)۔ یہاں "رَجُلًا" تمیز ہے جو کہ واحد ہے اور حالتِ نصب میں ہے۔ جمع "كَمْ رِجَالاً" یا مجرور "كَمْ رَجُلٍ" کہنا درست نہیں۔

کَمْ خبریہ

قولہ :(والخبریّۃ مجرور مفرد و مجموع)

اور "کَمْ خبریہ"، جو کسی عدد کی کثرت بیان کرنے کے لیے آتا ہے (یعنی "کتنے ہی!" یا "بہت سے!")، اس کی تمیز مجرور ہوتی ہے، خواہ وہ مفرد ہو یا جمع۔ مفرد کی مثال :قرآن پاک میں ہے، "كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً" (کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آئیں)۔ یہاں "فِئَةٍ" تمیز ہے جو مفرد اور مجرور ہے۔ جمع کی مثال :"كَمْ رِجَالٍ لَقِيتُهُمْ" (کتنے ہی آدمیوں سے میں ملا)۔ یہاں "رِجَالٍ" تمیز ہے جو کہ جمع اور مجرور ہے۔

کَمْ کے مشترکہ احکام

قولہ :(وتدخل(من)فیهما,ولهما صدر الکلام)

مصنفؒ دو ایسے احکام بیان فرما رہے ہیں جو "کَمْ" کی دونوں قسموں میں مشترک ہیں:

مِنْ کا دخول :

حرفِ جر "مِنْ" ان دونوں کی تمیز پر داخل ہو سکتا ہے۔ جب یہ داخل ہوتا ہے تو تمیز کو مجرور کر دیتا ہے۔
"کَمْ خبریہ" کی تمیز پر اس کا داخل ہونا عام ہے (جیسے اوپر آیت کی مثال گزری)۔
"کَمْ استفہامیہ" کی تمیز پر اس کا آنا شاذ ہے، لیکن جائز ہے۔

صدرِ کلام :

دونوں قسم کے "کَمْ" کا یہ حق ہے کہ وہ جملے کے شروع میں آئیں (لہما صدارۃ الکلام)۔ انہیں جملے کے درمیان یا آخر میں نہیں لایا جا سکتا، کیونکہ استفہام اور کثرت پر دلالت کرنے والے کلمات کا یہی خاصہ ہے۔

کَمْ کا اعراب

قولہ :(وکلاھما یقع مرفوعاً ومنصوباً ومجروراً ...)

مصنفؒ اب "کَمْ" (استفہامیہ یا خبریہ) کے اپنے اعراب کو بیان فرما رہے ہیں کہ وہ خود کب مرفوع، منصوب یا مجرور ہوتا ہے۔ اس کا اعراب اس کے بعد آنے والے عامل پر منحصر ہے۔

نصب (حالتِ نصب):

فکلّ ما بعدہ فعل غیر مشتغل عنہ بضمیرہ کان منصوباً

"کَمْ" منصوب تب ہوگا جب اس کے بعد کوئی ایسا فعل آئے جو اس سے کسی ضمیر کے ذریعے "مشغول" نہ ہو۔ یعنی فعل کا عمل براہِ راست "کَمْ" پر ہو رہا ہو۔ مثال :"کَمْ غُلَامًا ضَرَبْتَ؟" (تو نے کتنے لڑکوں کو مارا؟)۔ یہاں فعل "ضَرَبْتَ" کا مفعول بہ خود "کَمْ" ہے، لہٰذا "کَمْ" محلًا منصوب ہے۔ مشغول کی مثال :اگر کہا جائے "کَمْ غُلَامًا ضَرَبْتَهُ؟" (کتنے لڑکے ہیں جن کو تو نے مارا؟)، تو یہاں فعل "ضَرَبْتَ" کے ساتھ "ہ" کی ضمیر لگ گئی ہے جو اس کا مفعول بہ ہے۔ لہٰذا فعل "کَمْ" سے مشغول نہیں رہا بلکہ اپنی ضمیر سے مشغول ہے۔ اس صورت میں "کَمْ" منصوب نہیں ہوگا بلکہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔ مصنف نے یہاں صرف منصوب ہونے کی شرط بیان کی ہے۔

جر (حالتِ جر):

وکلّ ما قبلہ حرف جرّ أو مضاف فمجرور

"کَمْ" مجرور تب ہوگا جب اس سے پہلے کوئی حرفِ جر آ جائے یا وہ مضاف الیہ بن رہا ہو۔ حرفِ جر کی مثال :"بِکَمْ دِرْهَمًا اشْتَرَيْتَ؟" (تو نے کتنے درہم میں خریدا؟)۔ یہاں "باء" حرفِ جر کی وجہ سے "کَمْ" محلًا مجرور ہے۔ مضاف کی مثال :"مَالَ کَمْ رَجُلٍ سَلَبْتَ؟" (تو نے کتنے آدمیوں کا مال چھینا؟)۔ یہاں "مَال" مضاف ہے اور "کَمْ" مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محلًا مجرور ہے۔

رفع (حالتِ رفع):

والاّ فھو مرفوع مبتدأ إن لم یکن ظرفا، وخبرا إن کان ظرفا

اور اگر نصب اور جر کی مذکورہ صورتیں نہ پائی جائیں تو "کَمْ" مرفوع ہوگا۔ مبتدا : یہ مبتدا بنے گا اگر یہ ظرف (زمان یا مکان) نہ ہو۔ مثال : "كَمْ رَجُلاً فِي الدَّارِ؟" (گھر میں کتنے آدمی ہیں؟)۔ یہاں نہ تو اس سے پہلے کوئی عامل جر ہے اور نہ بعد میں کوئی فعل ہے جو اسے نصب دے، لہٰذا "کَمْ" مبتدا ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے۔ خبر : اور اگر "کَمْ" ظرف کے معنی میں ہو (یعنی وقت یا مدت پوچھے)، تو یہ خبر مقدم بن کر مرفوع ہوگا۔ مثال : "كَمْ يَوْمًا سَفَرُكَ؟" (تمہارا سفر کتنے دن کا ہے؟)۔ یہاں "کَمْ" (جو کہ "یومًا" کی وجہ سے ظرف ہے) خبر مقدم ہے اور "سَفَرُكَ" مبتدا مؤخر ہے۔

عمومی قاعدہ

قولہ :(و کذلك أسماء الاستفهام والشرط)

پھر مصنفؒ ایک عمومی قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ اعراب کے یہی اصول دیگر اسمائے استفہام (جیسے مَنْ، مَا، أَيْنَ) اور اسمائے شرط (جیسے مَنْ، مَا، مَتَى) پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔

خاص مسائل قولہ :

(وفی مثل تمییز :کم عمّة لك یا جریر وخالة..... ثلاثة أوجه)

مصنفؒ جریر کے مشہور شعر کا ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں:

كَمْ عَمَّةٍ لَكَ يَا جَرِيرُ وَخَالَةٍ... فَدْعَاءَ قَدْ حَلَبَتْ عَلَيَّ عِشَارِي

(اے جریر! تیری کتنی ہی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں ... جو کاہن اونٹنیوں کو میرے لیے دوہتی رہی ہیں) یہاں "کَمْ" خبریہ ہے اور اس کی تمیز "عَمَّةٍ" مجرور ہے۔ لیکن اس پر عطف شدہ لفظ "خَالَة" کو تینوں طرح (رفع، نصب، جر) پڑھنا جائز ہے:

خَالَةٍ (جر) :

"خَالَةٍ" کو "عَمَّةٍ" پر عطف کرتے ہوئے اسے بھی مجرور پڑھا جائے۔ یہ سب سے واضح اور منطقی صورت ہے۔

خَالَةً (نصب) :

"خَالَةً" کو منصوب پڑھا جائے، اس بنا پر کہ اس کا عطف "كَمْ عَمَّةٍ" کے محل پر ہے۔ چونکہ "کَمْ خبریہ" کی تمیز اصل میں مفعول بہ ہوتی ہے، اس لیے اس کا محل نصب کا ہوتا ہے۔

خَالَةٌ (رفع) :

"خَالَةٌ" کو مرفوع پڑھا جائے، اس صورت میں یہ ایک الگ جملے کا حصہ مانا جائے گا، یعنی "وَخَالَةٌ كَذَلِكَ" (اور ایک خالہ بھی ایسی ہی ہے)۔ یہاں "خَالَةٌ" مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔

کَمْ" کی تمیز کو حذف کرنا

قولہ :(وقد یحذف فی مثل :(کم مالك؟) و (کم ضربت؟))

آخر میں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کلام میں کوئی قرینہ موجود ہو تو 'کم' کی تمییز کو حذف کیا جا سکتا ہے۔ مثال :"کم مالُكَ؟" (تمہارا مال کتنا ہے؟)۔ یہاں قرینہ "مالُكَ" ہے، اس لیے تمییز (مثلاً دیناراً یا درھماً) محذوف ہے۔ اصل میں تھا :"کم دیناراً مالُكَ؟"۔ مثال :"کم ضربتَ؟" (تم نے کتنا مارا؟)۔ یہاں قرینہ فعل "ضربتَ" ہے، اس لیے تمییز "ضربةً" محذوف ہے۔ اصل میں تھا :"کم ضربةً ضربتَ؟"۔

[الظروف]:

الظّروف :منها ما قطع عن الإضافة ك(قبل) و(بعد)، وأجري مجراه (لا غير) و(ليس غير) و(حسب)، ومنها (حيث)، ولا يضاف إلاّ إلى جملة في الأكثر. ومنها (إذا)، وهي للمستقبل، وفيها معنى الشّرط، فلذلك اختير بعدها الفعل، وقد تكون للمفاجأة فيلزم المبتدأ بعدها. ومنها (إذ) للماضي، وتقع بعدها الجملتان. ومنها (أين) و(أنّى) للمكان استفهاما وشرطا. و(متى) للزّمان فيهما. و(أيّان) للزّمان استفهاما. و(كيف) للحال استفهاما.

ترجمہ؛ظروف :ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اضافت سے منقطع ہو جاتے ہیں جیسے (قَبْلُ) اور (بَعْدُ)، اور انہی کے حکم میں (لَا غَيْرُ)، (لَيْسَ غَيْرُ) اور (حَسْبُ) ہیں۔ اور ان میں سے ایک (حَيْثُ) ہے، اور یہ اکثر جملے کی طرف ہی مضاف ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ایک (إِذَا) ہے، اور یہ مستقبل کے لیے آتا ہے، اور اس میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، اسی لیے اس کے بعد فعل کو ترجیح دی جاتی ہے، اور کبھی یہ مفاجات (اچانک کسی چیز کے واقع ہونے) کے لیے بھی آتا ہے تو اس صورت میں اس کے بعد مبتدا لازم ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ایک (إِذْ) ہے جو ماضی کے لیے آتا ہے، اور اس کے بعد دونوں قسم کے جملے (اسمیہ اور فعلیہ) واقع ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے (أَيْنَ) اور (أَنَّى) مکان کے لیے آتے ہیں، استفہام اور شرط دونوں صورتوں میں۔ اور (مَتَى) زمان کے لیے ان دونوں (استفہام و شرط) صورتوں میں آتا ہے۔ اور (أَيَّانَ) زمان کے لیے صرف استفہام کے طور پر آتا ہے۔ اور (كَيْفَ) حال (کیفیت) کے لیے استفہام کے طور پر آتا ہے۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، نے اس عبارت میں مبنیات میں سے ظروف کو بیان فرمایا ہے فرمایا الظروف،

یاد رکھئے کہ بعض ظروف معرب بھی ہوتے ہیں لیکن یہاں ہم جن ظروف کو بیان کریں گے وہ ظروف مبنیہ ہیں۔ ظروف، ظرف کی جمع ہے۔

ظروف کی تعریف:

ظرف اس کو کہتے ہیں جو کسی کام کے وقت یا جگہ پر دلالت کرے۔

ظروف مبنیہ کی چند قسمیں ہیں:

مصنفؒ ان کی مختلف اقسام اور ان کے مخصوص قواعد کو بیان فرماتے ہیں۔

پہلی قسم:

قولہ :الظّروف :منہا ما قطع عن الإضافۃ ک(قبل) و (بعد)، وأجری مجراہ (لا غیر) و (لیس غیر) و (حسب)

مصنفؒ یہاں سے ظروف کی پہلی قسم کا ذکر فرما رہے ہیں۔ یہ وہ ظروف ہیں جن کا مضاف الیہ حذف کر دیا جائے اور وہ معنی میں ملحوظ ہو (یعنی بولنے اور سننے والے کے ذہن میں موجود ہو)۔ ایسے ظروف کو "مقطوع عن الإضافة لفظاً لا معنیً" کہتے ہیں۔

قَبْلُ و بَعْدُ : یہ اصل میں قَبْلِ شَیْءٍ اور بَعْدِ شَیْءٍ تھے۔ جب ان کا مضاف الیہ حذف کر دیا گیا اور اس کا معنی نیت میں باقی رہا تو عربوں نے انہیں ضمہ (پیش) پر مبنی کر دیا۔ جیسے قرآن مجید میں ہے :لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ (اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی)۔ یہاں مِنْ قَبْلِ ذٰلِكَ وَمِنْ بَعْدِهٖ مراد ہے۔ چونکہ مضاف الیہ کے حذف ہونے سے ان میں ایک گونہ کمزوری پیدا ہو گئی، اس لیے انہیں مبنی بنا کر حرکتِ لازم (ضمہ) دے دی گئی۔

فائدہ

قبل، بعد وغیر استعمال کے اعتبار سے ان کی تین صورتیں ہیں۔ان کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

(۱) پہلی قسم:

یہ مضاف ہوں اور ان کا مضاف الیہ محذوف منوی ہو اور محذوف منوی کا آپ کو بتایا جا چکا کہ لفظوں میں موجود نہ ہو لیکن متکلم کی نیت میں یا متکلم کے دل میں موجود ہو تو اس صورت میں یہ ظروف مبنی بر ضمہ ہوں گے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ یعنی اللہ ہی کے لیے ہے حکم ہر چیز سے پہلے اور ہر چیز کے بعد یعنی اللہ ہی کا حکم چلتا ہے ہر چیز سے پہلے اور ہر چیز کے بعد اللہ ہی کی حکومت ہے تو اس مثال میں آپ دیکھیں قَبْلُ اور بَعْدُ دونوں پر ضمہ ہے کیونکہ ان کا مضاف الیہ جو ہے کل شیَ وہ محذوف منوی ہے تقدیری عبارت یہ ہے۔

مِنْ قَبْلِ كُلِّ شَيْءٍ وَمِنْۢ بَعْدِ كُلِّ شَيْءٍ

(۲) دوسری قسم:

یہ مضاف ہوں اور ان کا مضاف الیہ محذوف ہو اور محذوف نسیاً منسیا ہو یعنی نہ لفظوں میں موجود اور نہ متکلم کی نیت میں مراد ہو اور نسیا منسیا محذوف ہو تو اس صورت میں یہ مبنی ہوں گے جیسے :لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلٍ وَمِنْۢ بَعْدٍ۔

(۳) تیسری قسم:

یہ مضاف ہوں اور ان کا مضاف الیہ موجود ہو اس صورت میں یہ معرب ہوں گے جیسے:

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ تحقیق گزر چکے ہیں محمد ﷺ سے پہلے بہت سے رسول۔

اس مثال میں قبل معرب ہے اس لیے کہ یہ مضاف ہے اور اس کا مضاف الیہ ہ ضمیر لفظوں میں موجود ہے۔

تو معلوم ہوا کہ قبل اور بعد وغیرہ یہ ایک صورت میں مبنی بر ضمہ ہوتے ہیں اور وہ صورت یہ ہے کہ یہ حروف مضاف ہوں اور

ان کا مضاف الیہ محذوف منوی ہو اور دو صورتوں میں یہ معرب ہوتے ہیں (ا) کہ وہ مضاف ہو اور اس کا مضاف الیہ نسیا منسیا ہو نہ لفظوں میں نہ نیت میں۔ (۲) اور دوسرا یہ کہ ان کا مضاف الیہ لفظوں میں موجود ہو اور یہ تمام حروف اس وجہ سے مبنی ہیں کہ ان کی مشابہت حرف کے ساتھ ہے جو کہ مبنی الاصل ہے کیونکہ حرف بھی دوسرے کلمے کے ملائے بغیر اپنا معنی نہیں بتا سکتا اسی طرح یہ الفاظ بھی مضاف الیہ کے بغیر اپنا معنی نہیں بتا سکتے۔

لا غَيْرُ/ليس غَيْرُ/حَسْبُ :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "لا غیرُ" (اس کے سوا نہیں)، "لیس غیرُ" (اس کے علاوہ نہیں) اور "حسبُ" (کافی ہے) بھی اسی حکم میں ہیں۔ ان کا مضاف الیہ بھی محذوف ہوتا ہے اور یہ ضمہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی کہے **جَاءَنِي زَيْدٌ لَا غَيْرُ** (میرے پاس صرف زید آیا)، یہاں مراد ہے **لَا غَيْرُهُ جَاءَنِي** (اس کے علاوہ کوئی نہیں آیا)۔ اسی طرح **عِنْدِي خَمْسَةٌ حَسْبُ** (میرے پاس پانچ ہیں، بس)، یہاں مراد ہے **حَسْبُكَ یا حَسْبِي** (یعنی تمہارے لیے/میرے لیے کافی)۔

دوسری قسم:

قوله :ومنها (حيث)، ولا يضاف إلاّ إلى جملة في الأكثر

مصنفؒ یہاں ظرفِ مکان "حیثُ" کا حکم بیان فرمارہے ہیں۔ یہ ہمیشہ ضمہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بالعموم مفرد کی طرف مضاف نہیں ہوتا بلکہ پورے جملے (خواہ اسمیہ ہو یا فعلیہ) کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ جیسے :**اِجْلِسْ حَيْثُ يَجْلِسُ زَيْدٌ** (وہاں بیٹھو جہاں زید بیٹھتا ہے) اور **اِجْلِسْ حَيْثُ زَيْدٌ جَالِسٌ** (وہاں بیٹھو جہاں زید بیٹھا ہے)۔ ان مثالوں میں **حَيْثُ** جملہ فعلیہ **يَجْلِسُ زَيْدٌ** اور جملہ اسمیہ **زَيْدٌ جَالِسٌ** کی طرف مضاف ہے۔ چونکہ یہ ہمیشہ اضافت کو لازم پکڑتا ہے اور اس کا مضاف الیہ جملہ ہوتا ہے جو کہ مبنی الاصل ہے، اس لیے مناسبت کی وجہ سے اس کو بھی مبنی بنایا گیا ہے۔

فائدہ:

حیث کبھی کبھی مفرد کی طرف بھی مضاف ہو جاتا ہے۔ جب حیث مفرد کی طرف مضاف ہوگا تو پھر یہ معرب ہوگا یا مبنی اس میں اختلاف ہے۔

(ا) اکثر نحویین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں یہ معرب ہوگا۔

اس لیے کہ "حیث" کے مبنی ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی اضافت جملے کی طرف ہو جب مفرد کی طرف اضافت ہو گی تو شرط نہیں پائی جائے گی **اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ** جب شرط نہیں پائی گئی تو مشروط بھی مفقود ہوگا۔ للذا یہ معرب ہوگا۔

(۲) بعض نحویین کے نزدیک حَيْثُ کی اضافت جب مفرد کی طرف ہو گی تب بھی حَيْثُ مبنی ہوگا اور مفرد کی طرف اضافت بہت ہی شاذ اور نادر ہے اور **اَلشَّاذُ كَالْمَعْدُوْمِ** اس پر قاعدہ کلیہ کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

تیسری قسم:

قوله :ومنها (إذا)، وهي للمستقبل، وفيها معنى الشرط، فلذلك اختير بعدها الفعل، وقد تكون للمفاجأة فيلزم المبتدأ

بعدھا

ظروف مبنی کی تیسری قسم اِذَا ہے۔

اِذَا مستقبل کا معنی دیتا ہے اگرچہ یہ ماضی پر داخل ہو تب بھی یہ مستقبل کا معنی دیتا ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (سورۃ النصر آیت:۱)

تو یہاں پر جَاءَ بمعنی یَجِیْءُ ہے کیونکہ اس پر اِذَا داخل ہو گیا تو ماضی مستقبل کے معنی میں ہو گیا اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ ۔(سورۃ کھف آیت:۹۶)

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ ۔(سورۃ کھف آیت:۸۶)

تنبیہ :

یاد رکھیں کہ صاحب کتاب کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اذا تین۳ معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) پہلا معنی:

بمعنی شرط جیسے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۔

(۲) دوسرا معنی:

کبھی اِذَا صرف ظرف کے لیے آتا ہے اور جائز ہے کہ اس کے بعد جملہ فعلیہ آئے یا جملہ اسمیہ۔ لیکن جملہ فعلیہ کا اس کے بعد آنا زیادہ بہتر ہے۔

جملہ اسمیہ کی مثال:... جیسے اٰتِيْكَ اِذَا الشَّمْسُ طَالِعَةٌ ۔

جملہ فعلیہ کی مثال:... جیسے اٰتِيْكَ اِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ ۔

(۳) وقد تکون لِلْمُفَاجَاۃِ : تیسرا معنی:

کبھی کبھی اِذَا مفاجاۃ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے یعنی اچانک کسی کام کے ہونے کے لیے اور اس کے بعد مبتدا کا آنا زیادہ بہتر ہے جیسے خَرَجْتُ فَاِذَا السَّبُعُ وَاقِفٌ میں نکلا پس اچانک درندہ کھڑا ہونے والا تھا اور اِذَا کے مبنی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اضافت جملے کی طرف ہوتی ہے یعنی یہ جملے کا محتاج ہوتا ہے اس وجہ سے "مضاف کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے یہ مبنی ہوتا ہے۔

چوتھی قسم:

قولہ :ومنھا (اذ) للماضی، وتقع بعدھا الجملتان

ظروف مبنیہ سے ایک اِذْ ہے اور وہ زمانہ ماضی کے لیے آتا ہے اگرچہ مستقبل پر داخل ہو جائے جیسے اَتَيْتُ اِذْ يَقُوْمُ زَيْدٌ یہاں يَقُوْمُ بمعنی قَامَ ہے کیونکہ اس پر اِذْ داخل ہو گیا یہ ہے تو مستقبل لیکن یہ ماضی کا معنی دے گا۔ اور اِذْ کے اندر معنی شرط

نہیں پایا جاتا اسی لیے اس کے بعد دونوں قسم کے جملے یعنی جملہ اسمیہ اور جملیہ فعلیہ دونوں کا آنا جائز ہے۔تو یہ فرق ہو گیا اِذْ اور اِذَا میں کیونکہ اِذَا میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے وہاں پر آپ کو بتایا تھا کہ جملہ فعلیہ کا آنا زیادہ بہتر ہے تو جملہ فعلیہ کی مثال جیسے: جِئْتُكَ إِذْطَلَعَتِ الشَّمْسُ اور جملہ اسمیہ کی مثال جیسے :جِئْتُكَ إِذَالشَّمْسُ طَالِعَةٌ اور اِذْ کے بھی مبنی ہونے کی وجہ وہی ہے کہ یہ جملے کی طرف مضاف ہوتا ہے۔

پانچویں قسم:

قوله :ومنها (أين) و (أنّى) للمكان استفهاما وشرطا...

یہاں سے مصنفؒ وہ ظروف بیان کر رہے ہیں جو استفہام (سوال) اور شرط کے لیے استعمال ہوتے ہیں :أَيْنَ (کہاں) اور أَنَّى (کہاں/کدھر سے) :یہ دونوں ظرفِ مکان ہیں۔ یہ سوال کے لیے بھی آتے ہیں جیسے أَيْنَ تَذْهَبُ؟ (تم کہاں جاتے ہو؟) اور شرط کے لیے بھی، جیسے أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ (تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تمہیں آپکڑے گی)۔مَتَى (کب) :یہ ظرفِ زمان ہے اور استفہام و شرط دونوں کے لیے آتا ہے۔ استفہام :مَتَى نَصْرُ اللَّهِ؟ (اللہ کی مدد کب آئے گی؟)۔ شرط :مَتَى تَأْتِنِي أُكْرِمْكَ (تم جب بھی میرے پاس آؤگے میں تمہاری عزت کروں گا)۔أَيَّانَ (کب) :یہ بھی ظرفِ زمان ہے لیکن مصنفؒ کے مطابق یہ صرف استفہام کے لیے آتا ہے، شرط کے لیے نہیں۔ جیسے :يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا (وہ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی)۔ كَيْفَ (کیسے) :یہ کیفیت اور حال دریافت کرنے کے لیے آتا ہے اور یہ صرف استفہام کے لیے استعمال ہوتا ہے، شرط کے لیے نہیں۔ جیسے :كَيْفَ حَالُكَ؟ (تمہارا کیا حال ہے؟)۔

دو مشہور ظروف مُذْ اور مُنْذُ کے استعمالات

ومنها (مذ) و (منذ) بمعنى أوّل المدّة، فيليهما المفرد المعرفة، وبمعنى (جميع)، فيليهما المقصود بالعدد. وقد يقع المصدر أو الفعل أو (أن)، فيقدّر زمان مضاف، وهو مبتدأ وخبره ما بعده، خلافا للزّجّاج. ومنها (لدى) و (لدن)، وقد جاء (لدن) و (لدن) و (لدن) و (لد) و (لد) و (قط) للماضي المنفيّ. و (عوض) للمستقبل المنفيّ. والظّرف المضاف إلى الجملة و (إذ) يجوز بناؤه على الفتح، وكذلك (مثل) و (غير) مع (ما)، و (أن) و (أنّ)

ترجمہ:اور ان میں سے (مُذْ) اور (مُنْذُ) ہیں جو مدت کے آغاز کے معنی میں آتے ہیں، تو ان کے بعد مفرد معرفہ آتا ہے، اور (تمام) مدت کے معنی میں آتے ہیں، تو ان کے بعد وہ اسم آتا ہے جس سے عدد مراد ہو۔ اور کبھی ان کے بعد مصدر، فعل یا (أَنْ) واقع ہوتا ہے، تو اس صورت میں ایک محذوف مضاف "زمان" کو مبتدا مانا جاتا ہے اور اس کے بعد والا اس کی خبر ہوتا ہے، اور یہ امام زجّاج کے موقف کے خلاف ہے۔اور ان میں سے (لَدَى) اور (لَدُنْ) ہیں، اور (لَدُنْ) کی مختلف شکلیں (لَدْنْ)، (لَدْنُ)، (لَدْنِ)، (لُدْ)، اور (لَدِ) بھی آئی ہیں۔اور (قَطُّ) ماضی منفی کے لیے آتا ہے۔ اور (عَوْضُ) مستقبل منفی کے لیے آتا ہے۔اور وہ ظرف جو جملے کی طرف مضاف ہو اور (إِذْ) کو فتح پر مبنی پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح (مِثْل) اور (غَيْر) جب (مَا) اور (اَن) اور (اَنَّ) کے ساتھ ہو۔

چھٹی قسم:

قوله :ومنها (مذ) و (منذ) بمعنى أوّل المدّة.

مصنفؒ یہاں دو مشہور ظروف مذ اور منذ کے استعمالات اور ان کی نحوی حیثیت کو بیان فرما رہے ہیں۔ ان کے بنیادی طور پر تین استعمال ہیں:

بمعنی ابتداءِ مدت (مدت کے آغاز کے معنی میں) :جب یہ دونوں کسی کام کے شروع ہونے کا وقت بتائیں تو ان کے بعد آنے والا اسم معرفہ مفرد ہوتا ہے۔ مثال :مَا رَأَيْتُهُ مُنْذُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ (میں نے اسے جمعہ کے دن سے نہیں دیکھا)۔ یہاں منذ کا معنی "سے" ہے۔

بمعنی تمام مدت (پوری مدت کے معنی میں) :جب یہ کسی کام کے نہ ہونے کی کل مدت بیان کریں تو یہ اسم ظرف ہوتے ہیں اور ان کے بعد آنے والا اسم (جو عدد پر دلالت کرتا ہے) مرفوع (رفع کی حالت میں) ہوتا ہے۔ اس صورت میں مذ/منذ مبتدا محذوف کی خبر ہوتے ہیں یا خود مبتدا ہوتے ہیں اور بعد والا اسم خبر ہوتا ہے۔ مثال :مَا رَأَيْتُهُ مُنْذُ يَوْمَانِ (میں نے اسے دو دن سے نہیں دیکھا)۔ اس کی نحوی ترکیب یہ ہے کہ یومانِ مبتدا ہے اور منذ اس کی خبرِ مقدم ہے، یا منذ مبتدا ہے اور یومانِ اس کی خبر ہے۔ تقدیرِ عبارت یوں ہوگی :أَمَدُ انْقِطَاعِ رُؤْيَتِي يَوْمَانِ (میری عدمِ رویت کی مدت دو دن ہے)۔

وقد يقع المصدر أو الفعل أو (أنّ)، فيقدّر زمان مضاف، وهو مبتدأ وخبره ما بعده، خلافاً للزّجاج.

جب ان کے بعد جملہ ہو :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ کبھی ان کے بعد مصدر، فعل یا أنّ آتا ہے۔ اس صورت میں جمہور نحویوں (بصریوں) کا مذہب یہ ہے کہ ایک مضاف (زمانٌ یا وقتٌ) محذوف مانا جائے گا جو کہ مبتدا ہوگا اور مذ/منذ اپنے بعد والے جملے کے ساتھ مل کر اس کی خبر بنیں گے۔

مصدر کی مثال :ما فرحت منذ او منذ ذهابك

فعل کی مثال؛ ما فرحت منذ او منذ ذهبت

انّ (مثقلہ) کی مثال؛ ما فرحت منذ او منذ آنك ذاهب

خلافاً للزجاج :امام زجاجؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی صورت میں مذ/منذ کو مفعول فیہ (ظرف) ماننا چاہیے اور کچھ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں۔

ساتویں قسم:

قوله :ومنها (لدى) و (لدن)... و (قط) و (عوض)

لدی اور لدن :

ظروف مبنیہ میں لدی لام کے فتحہ اور الف مقصورہ کے ساتھ اور لدُن لام کا فتحہ اور دال کا ضمہ یہ دونوں عِندَ کے معنی میں ہیں۔

تنبیہ:

یاد رکھیں کہ اور عِنْدَ اور لَدَی اور لَدُنْ میں فرق یہ ہے کہ عِنْدَ میں چیز کے حاضر ہونے کی شرط نہیں لگائی جاتی یعنی اس کا جو مدخول مطلوب ہے اس کا مخاطب کے پاس حاضر ہونا ضروری نہیں ہے اسی وجہ سے جب اَلْمَالُ عِنْدَكَ کہا جاتا ہے تو اگر مال مخاطب کے پاس موجود ہو تب بھی صحیح ہے اور اگر اس کے پاس موجود نہ ہو تب بھی صحیح ہے لیکن لدی اور لدن اس میں حضور کی شرط ہے لہٰذا جب کہا جائے گا اَلْمَالُ لَدَيْكَ یہ اس وقت صحیح ہو گا جب مال مخاطب کے پاس موجود ہو اور اگر مال اس کے پاس موجود نہ ہو تو اَلْمَالُ لَدَيْكَ کہنا صحیح نہیں ہے۔

وقد جاء الخ

کہ اس میں اور بھی بہت ساری لغات آئی ہیں یعنی لدی میں اگرچہ ایک لغت ہے لیکن لدن میں چھ ٦ لغات اور بھی ہیں:

(لَدِنِ) و (لَدِنِ) و (لُدِنِ) و (لَد) و (لُد) (ولَدُ)۔

اور ان کے مبنی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض تو قلّتِ بناء کی وجہ سے حرف کے مشابہ ہیں اور بعض ان پر محمول ہیں

قَطُّ: اور ظروف مبنیہ میں سے ایک قَطُّ ہے قاف کا فتحہ اور طاء کے شد کے مشدد کے ساتھ یہ زیادہ مشہور لغت ہے اور اس کے علاوہ اس کو قُطُّ بھی پڑھا جاتا ہے اور ایک لغت اس میں قَطْ بھی ہے۔ تو قط یہ ماضی منفی کے لیے آتا ہے جیسے: مَا ضَرَبْتُهُ قَطُّ اس کا معنی ہو گا میں نے اس کو کبھی نہیں مارا۔ اور اس کے مبنی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قلّتِ بنا کی وجہ سے یہ مبنی ہے۔

عَوْضُ: اور ان ظروف مبنی میں سے ایک عوض بھی ہے عین کے فتحہ کے ساتھ عَوْضُ اور عُوْضُ بھی منقول ہے اور یہ مستقبل منفی کے لیے آتا ہے جیسے لَا اَضْرِبُهُ عَوْضُ اس کا معنی ہے میں اس کو کبھی نہیں ماروں گا یعنی زمانہ مستقبل میں کبھی نہیں ماروں گا

-

اور عَوْضُ کا مضاف الیہ محذوف منوی ہوتا ہے اس لیے یہ قَبْلُ وَبَعْدُ کی طرح مبنی ہے

ظروف کی دوسری قسم وہ ظروف جو جملے کی طرف مضاف ہو؛

قولہ: والظّروف المضافة إلى الجملة و (إذ) يجوز بناؤه على الفتح..

اس عبارت میں صاحب کتاب نے ظروف کی دوسری قسم کو بیان فرمایا ہے اور یہ وہ قسم ہے جو معرب ہوتی ہے لیکن اگر اس کی اضافت کی جائے جملے کی طرف یا حرف اِذْ کی طرف تو وہ ظروف بھی مبنی بر فتحہ ہوتے ہیں اور یہ جوازًا ہے اور مبنی ہونے کی وجہ پھر یہ ہے کہ ان کا مبنی ہونا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اگرچہ واسطے کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ پیچھے آپ کو بتایا تھا "اِذْ" میں۔ تو یہ جب جملے کی طرف مضاف ہوں یا اِذْ کی طرف مضاف ہوں تو پھر مبنی بر فتحہ ہوں گے جیسے:

هٰذَا يَوْمَ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ

اور اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ تو ان دونوں مثالوں میں یوم کی اضافت جملے کی طرف ہے اور یہ مبنی بر فتحہ ہے اور اس طرح يَوْمَئِذٍ

اور حِیۡنَئِذٍ یہاں پر یوم کی اضافت اِذۡ کی طرف ہے اور حِیۡنَ کی اضافت بھی اِذۡ کی طرف ہے تو یہ دونوں بھی مبنی بر فتحہ ہیں اور ان دونوں کی تقدیری عبارت یہ ہے:

یَوۡمَئِذٍ کی تقدیری عبارت ہے یَوۡمَ اِذۡ کان کذا

حِیۡنَئِذٍ کی تقدیری عبارت ہے حِیۡنَ اِذۡ کان کذا

صاحب کتاب نے فرمایا:

یجوز بناؤہ علی الفتح۔اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا مبنی ہونا جائز ہے یعنی یہ معرب اور مبنی دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

و کذلك (مثل) و (غیر) مع (ما)، و (أن) و (أنّ)

یعنی ظروف مذکورہ کی طرح لفظِ مثل اور لفظ غیر بھی جب کہ مَا یا اَنَّ یا اَنۡ یعنی مثقلہ، مشددہ یا مخفف جب ان کے بعد مَا، اَنۡ یا اَنَّ آجائے تو ان کا بھی معرب اور مبنی دونوں طرح پڑھنا جائز ہے کیونکہ وہ جملے کی طرف مضاف ہونے میں ظرف کے مشابہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کا مبنی بر فتحہ ہونا جائز ہے اور معرب پڑھنا بھی جائز ہے۔ جیسے (۱) ضَرَبۡتُهٗ مِثۡلَ مَا ضَرَبَ زَیۡدٌ (۲) اور ضَرَبۡتُهٗ مِثۡلَ اَنۡ ضَرَبَ زَیۡدٌ اور (۳) ضَرَبۡتُهٗ مِثۡلَ اَنَّ ضَرَبَ زَیۡدٌ اور اسی طرح (۴) ضَرَبۡتُهٗ غَیۡرَ مَا ضَرَبَ زَیۡدٌ اور (۵) ضَرَبۡتُهٗ غَیۡرَ اَنۡ ضَرَبَ زَیۡدٌ اور (۶) ضَرَبۡتُهٗ غَیۡرَ اَنَّ ضَرَبَ زَیۡدٌ

ان تمام امثلہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ پہلی مثال: میں نے اس کو مارا زید کے مارنے کی مانند۔ دوسری اور تیسری مثال بھی اسی طرح ہیں۔ چوتھی مثال میں نے اس کو مارا سوائے اس کے کہ مارا زید نے۔

[المعرفة والنكرة]:

المعرفة: ما وضع لشيء بعينه، وهي: المضمرات، والأعلام، والمبهمات، وما عرّف باللام، وبالنداء، والمضاف إلى أحدها معنى. العلم: ما وضع لشيء بعينه غير متناول غيره بوضع واحد. وأعرفها المضمر المتكلّم، ثم المخاطب. والنّكرة: ما وضع لشيء لا بعينه.

ترجمہ؛ معرفہ: وہ اسم ہے جو کسی معین چیز کے لیے وضع کیا گیا ہو (بنایا گیا ہو)، اور وہ یہ ہیں: مضمرات (ضمائر)، اعلام (خاص نام)، مبہمات (اسمائے اشارہ و موصولہ)، وہ اسم جسے لامِ تعریف کے ذریعے معرفہ بنایا گیا ہو، وہ جسے ندا کے ذریعے معرفہ بنایا گیا ہو، اور وہ جو ان میں سے کسی ایک کی طرف معنًی مضاف ہو۔ عَلَم: وہ اسم ہے جو کسی معین چیز کے لیے وضع کیا گیا ہو اس طور پر کہ ایک ہی وضع کے ساتھ اپنے غیر کو شامل نہ ہو۔ اور ان (معارف) میں سب سے زیادہ معرفہ ضمیرِ متکلم ہے، پھر ضمیرِ مخاطب۔ نکرہ: وہ اسم ہے جو کسی غیر معین چیز کے لیے وضع کیا گیا ہو۔

تشریح؛

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، فرماتے ہیں؛

عموم اور خصوص کے اعتبار سے اسم کی دو قسمیں ہیں معرفہ اور نکرہ صاحب کتاب نے معرفہ کو نکرہ پر مقدم کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ معرفہ مقصود اصلی ہے اور کثیر الاستعمال ہے اس لیے صاحب کتاب نے معرفہ کو مقدم کیا۔

معرفہ کی تعریف:

المعرفة :ما وضع لشيء بعينه، یعنی معرفہ وہ اسم ہے جس کو وضع کیا گیا ہو کسی معین چیز کے لیے جیسے **زيدٌ عَمرٌو بَكرٌ** وغیرہ۔

وهي:المضمرات،والأعلام،والمبهمات،وما عرّف باللاّم،وبالنّداء،والمضاف إلى أحدها

صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ معرفہ کی (۶) چھ قسمیں ہیں:

یاد رکھیں نحو کی بقیہ جتنی بھی کتابیں ہیں ان سب میں معرفہ کی (۷) سات اقسام ہیں تو صاحب کتاب نے چھ اقسام کیوں بیان فرمائیں۔

تو یاد رکھیں کہ ما قبل میں بھی آپ کو بتایا گیا تھا کہ اسم اشارہ مشار الیہ اور اسم موصول صلہ کے بغیر مبہم شمار ہوتے ہیں تو ان دونوں کو صاحب کتاب نے ایک ہی قسم شمار کی ہے تو اس طرح یہ چھ قسمیں بن گئیں۔ چھ (۶) اقسام یہ ہیں:

(۱) پہلی قسم اَلْمُضْمَرَاتُ:

جیسے ضمیر ہوتی ہے **هُوَ، هُمَا، هُم، هِيَ، هُمَا، هُنَّ، اَنْتِ، اَنْتُمَا، اَنْتُمْ، اَنْتُنَّ** وغیرہ۔

(۲) دوسری قسم

وَالْمُبْهَمَاتُ اَعْنِيْ اَسْمَآءَ الْإِشَارَاتِ وَالْمَوْصُوْلَاتِ:

جیسے ھٰذَا اسم اشارہ اور اَلَّذِیْ اسم موصول۔

(۳) تیسری قسم

اَلْاَعْلَامُ : جیسے عمرو بکر وغیرہ۔

(۴) چوتھی قسم

مُضَافٌ اِلٰی اَحَدِهَا :

یعنی ان میں سے کسی ایک کی طرف مضاف ہو، اضافت معنویہ کے ساتھ **غلامها** مضاف ہے ضمیر کی طرف **غلام الّذی عندی** مضاف ہے، اسم موصول کی طرف اور **غُلَامُ زَيْدٍ** مضاف ہے عَلَم کی طرف اور **غُلَامُ الْمَرْءَةِ** م مضاف ہے معرف بالف لام کی طرف۔ وغیرہ ذلک

(۵) پانچویں قسم

معرفہ بانداء :

جیسے **يَا رَجُلُ**۔

(۶) چھٹی قسم معرف بالف لام: جیسے اَلرَّجُلُ۔

(۱) مضمرات، (۲) مبہات (۳) معرفہ بنداء (۴) معرفہ بالف لام (۵) مضاف الی احدھا کے متعلق آپ ما قبل میں تفصیلاً پڑھ چکے ہیں تو اسلیے آگے ان اقسام میں سے صاحب کتاب صرف عَلَم کی تفصیل بیان فرمائیں گے:

العلم :ما وضع لشیء بعینہ غیر متناول غیرہ بوضع واحد۔

اس عبارت میں صاحبِ کتاب نے معرفہ کی اقسام میں سے عَلَم کو بیان کیا ہے۔

علم کی تعریف:

العلم :ما وضع لشیء بعینہ غیر متناول غیرہ بوضع واحد۔

علم اس معرفہ کو کہتے ہیں جس کو وضع کیا گیا ہو کسی معین چیز کے لیے اس حیثیت سے کہ وہ ایک ہی وضع کے ساتھ اس کے غیر کو شامل نہ ہو۔

فوائد وقیود:

صاحبِ کتاب نے فرمایا اَلْعَلَمُ تو اس میں تمام علم داخل ہو گئے جب آگے فرمایا مَا وُضِعَ لِشَيْءٍ بِعَيْنِهِ تو اس کے ذریعے سے نکرہ نکل گیا اور لَا يَتَنَاوَلُ غَيْرَهُ سے معرفہ کی باقی قسمیں خارج ہو گئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسم مشترک بھی نکل گیا اور جو اگلی قید ہے بِوَضْعٍ وَاحِدٍ اس قید کے ساتھ پھر اسم مشترک آگیا۔ کیونکہ اسم مشترک دیکھیں جیسے زید تین چار پانچ بندوں کا نام ہے تو یہ اگرچہ غیر کو شامل ہے لیکن ایک ہی وضع کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ ہر ایک کے لیے زید الگ الگ وضع کیا گیا تو اس قید لَایَتَنَاوَلُ غَیْرَہ سے اسم مشترک خارج ہو گیا لیکن بِوَضْعٍ وَاحِدٍ کی قید سے پھر اسم مشترک داخل ہو گیا کیونکہ اسم مشترک اگرچہ بہت سارے افراد میں مشترک ہے لیکن ہر ایک کے لیے الگ الگ وضع کیا گیا ہے۔

وأعرفها المضمر المتكلّم،ثم المخاطب.

اس عبارت میں صاحبِ کتاب معرفہ کے اعتبار سے ترتیب کو بیان فرما رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ معرفہ میں کامل معرفہ "مضمرات" ضمیر متکلم ہے جیسے اَنَا نَحْنُ پھر ضمیر مخاطب ہے جیسے اَنْتَ پھر ضمیر غائب ہے جیسے ھُوَ پھر علم ہے جیسے زید، عمرو، بکر، نثار وغیرہ۔

والنّكرة :ما وضع لشيء لا بعينه.

یہاں سے صاحبِ کتاب نے اسم کی دوسری قسم عموم اور خصوص کے اعتبار سے نکرہ کو بیان کیا ہے۔

نکرہ کی تعریف:

والنكرة :ما وضع لشيء لا بعينه۔ نکرہ اس اسم کو کہتے ہیں جس کو غیر معین چیز کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ جب تعریف میں فرمایا مَا وُضِعَ لِشَيْءٍ تو اس کے اندر تمام اسماء داخل ہو گئے۔ معرفہ نکرہ سب لیکن جب آگے فرمایا غَیْرَ مُعَیَّنٍ تو اس سے معرفہ خارج ہو گیا۔ مثال جیسے رَجُلٌ کوئی مرد۔ فَرَسٌ کوئی گھوڑا۔ تو یہ نکرہ کی مثال ہے۔

[العدد]:

أسماء العدد :ما وضع لكمّيّة آحاد الأشياء. أصولها اثنتا عشرة كلمة. واحد إلى عشرة، ومائة، وألف. تقول :واحد، اثنان، واحدة، اثنتان أو ثنتان، وثلاثة إلى عشرة، وثلاث إلى عشر، أحد عشر، اثنا عشر، إحدى عشرة، اثنتا عشرة، ثلاثة عشر إلى تسعة عشر، وثلاث عشرة إلى تسع عشرة. وتميم تكسر الشّين في المؤنّث. وعشرون وأخواتها فيهما. أحد وعشرون، إحدى وعشرون، ثمّ بالعطف بلفظ ما تقدّم إلى تسعة وتسعين. ومئة وألف، مئتان وألفان فيهما، ثمّ بالعطف على ما تقدّم. وفي ثماني عشرة فتح الياء، وجاء إسكانها، وشذّ حذفها بفتح النّون. ومميّز الثّلاثة إلى العشرة مخفوض مجموع لفظا أو معنى، إلاّ في ثلاثمائة إلى تسعمائة، وكان قياسها مئات، أو مئين. ومميّز (أحد عشر) إلى تسعة وتسعين منصوب مفرد. ومميّز مئة وألف وتثنيتهما وجمعه مخفوض مفرد. وإذا كان المعدود مؤنّثا واللّفظ مذكّرا، أو بالعكس فوجهان.

ترجمہ؛ عدد کے اسماء: وہ اسماء ہیں جو چیزوں کی اکائیوں کی مقدار کو بیان کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ان کی اصل بارہ کلمات ہیں: ایک سے لے کر دس تک، سو، اور ہزار۔ آپ (اس طرح) کہتے ہیں: واحد، اثنان (مذکر کے لیے ایک، دو) واحدة، اثنتان یا ثنتان (مؤنث کے لیے ایک، دو) ثلاثة سے عشرة تک (جب معدود مذکر ہو) ثلاث سے عشر تک (جب معدود مؤنث ہو) أحد عشر، اثنا عشر (مذکر کے لیے گیارہ، بارہ) إحدى عشرة، اثنتا عشرة (مؤنث کے لیے گیارہ، بارہ) ثلاثة عشر سے تسعة عشر تک (جب معدود مذکر ہو) ثلاث عشرة سے تسع عشرة تک (جب معدود مؤنث ہو) اور (قبیلہ) بنو تمیم مؤنث (کے صیغے "عشرة") میں شین کو کسرہ (زیر) دیتے ہیں۔ اور عشرون (بیس) اور اس کے اخوات (تیس، چالیس ... نوے) دونوں (مذکر و مؤنث) کے لیے یکساں ہیں۔ (آپ کہتے ہیں) أحد وعشرون (اکیس مذکر)، إحدى وعشرون (اکیس مؤنث)، پھر اسی گزشتہ طریقے پر عطف کے ساتھ ننانوے تک گنتی جاری رہتی ہے۔ اور مئة (سو) اور الف (ہزار)، اور ان کے تثنیہ مئتان (دو سو) اور الفان (دو ہزار) بھی دونوں (مذکر و مؤنث) کے لیے یکساں ہیں، پھر گزشتہ طریقے پر عطف کے ساتھ (گنتی آگے بڑھتی ہے)۔ اور "ثماني عشرة" (اٹھارہ مؤنث) میں یاء پر فتحہ (زبر) ہے، اور اسے ساکن پڑھنا بھی آیا ہے، اور نون کو فتحہ دے کر یاء کو حذف کر دینا شاذ (خلافِ قیاس) ہے۔ تین سے دس تک کا ممیز (معدود) مجرور اور جمع ہوتا ہے، خواہ وہ جمع لفظی ہو یا معنوی، سوائے ثلاثمائة (تین سو) سے تسعمائة (نو سو) تک کے، ورنہ قیاس کا تقاضا تھا کہ (اسے ثلاث مئات یا ثلاث مئین) کہا جاتا۔ گیارہ سے ننانوے تک کا ممیز منصوب اور مفرد ہوتا ہے۔ سو، ہزار، ان کے تثنیہ اور ان کی جمع کا ممیز مجرور اور مفرد ہوتا ہے۔ اور جب معدود (گنی جانے والی چیز) معنوی طور پر مؤنث ہو لیکن اس کا لفظ مذکر ہو، یا اس کے برعکس ہو، تو (عدد کے استعمال میں) دو صورتیں جائز ہیں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے اسمائے عدد کو بیان کیا ہے۔

اسمائے عدد کی تعریف:

ما وضع لکمّیّة آحاد الأشیاء. اسم عدد اس اسم کو کہتے ہیں جو دلالت کرے اشیاء کی مقدار پر افراد کے اعتبار سے عدد سے مراد فرد ہے اور معدود سے مراد وہ چیز ہے جس کی تعداد بیان کی جائے جیسے عِنْدِیْ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ اس مثال میں ثَلَاثَةَ عدد ہے اور دراھم معدود ہے۔

أصولها اثنتا عشرة کلمة. واحد إلی عشرة، ومائة، وألف. تقول: واحد، اثنان، واحدة، اثنتان أو ثنتان، وثلاثة إلی عشرة، وثلاث إلی عشر،

یہاں سے صاحبِ کتاب اس بات کو بیان فرماتے ہیں کہ تمام اعداد کی اصل (۱۲) کلمے ہیں اور وہ یہ ہیں (۱)وَاحِد/وَاحِدَةٌ (۲)اِثْنَانِ/اِثْنَتَانِ (۳)ثَلٰث/ثَلٰثَةُ (۴) اَرْبَع/اَرْبَعَةٌ (۵)خَمْس/خَمْسَةٌ (۶)ست/ستةٌ (۷) سَبْع/سَبْعَةٌ (۸) ثَمَانِ/ثَمَانِيَةٌ (۹)تِسع/تِسْعَةٌ (۱۰)عشر/عَشَرَةٌ (۱۱)مِائَةٌ (۱۲)اَلْفٌ. یہ اعداد اصل کی حیثیت رکھتے ہیں یہ بارہ اعداد اور طریقہ استعمال یہ ہے۔ ایک سے لے کر دو تک یعنی واحد اثنان یہ قیاس کے مطابق استعمال ہوں گے لہٰذا مؤنث کے لیے تا کے ساتھ اور مذکر کے لیے بغیر تا کے تو رَجُلٌ کے لیے واحد اور رَجُلَانِ کے لیے اِثنان اور اِمْرَأَۃٌ کے لیے وَاحِدَةٌ اور اِمْرَأتَانِ کے لیے اِثْنَتَانِ اور ثِنْتَان اور ثَلَاثَةٌ سے عَشَرَةٌ تک خلاف قیاس آتی ہے یعنی مذکر کے لیے تا کے ساتھ اور مؤنث کے لیے تا کے بغیر جیسے ثَلَاثَةُ رِجَالٍ اور اَرْبَعَةُ رِجَالٍ سے لے کر عَشَرَةُ رِجَالٍ تک اور مؤنث کے لیے بغیر تا کے جیسے ثَلٰثُ نِسْوَةٍ اَرْبَعُ نِسْوَةٍ، خَمْسُ نِسْوَةٍ سے عَشَرَ نِسْوَةٍ تک۔

أحد عشر، اثنا عشر، إحدی عشرة، اثنتا عشرة، ثلاثة عشر إلی تسعة عشر، وثلاث عشرة إلی تسع عشرة.

اور دس (۱۰) کے بعد یعنی اَحَدَ عَشَرَ سے تِسْعَ عَشَرَ تک تو اَحَدَ عَشَرَ اور اِثْنَا عَشَرَ گیارہ اور بارہ قیاس کے مطابق استعمال ہوں گے اور بارہ کے بعد یعنی تیرہ سے اس کا جو پہلا جزء ہے وہ قیاس کے خلاف استعمال ہو گا اور جو دوسرا جز ہے وہ قیاس کے مطابق یعنی مذکر کے لیے مذکر اور مؤنث کے لیے مؤنث استعمال ہو گا مثلاً اَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا گیارہ ہے قیاس کے مطابق ہے اور اِثْنَا عَشَرَ رَجُلًا آگے جو تیرہ سے لے کر انیس تک ہے وہ اس طرح ہو گا، ثَلَاثَةَ عَشَرَ رَجُلًا، اَرْبَعَةَ عَشَرَ رَجُلًا سے تِسْعَةَ عَشَرَ رَجُلًا اور مؤنث کے لیے اِحْدٰی عَشَرَةَ اِمْرَأَةً اور اِثْنَتَا عَشَرَةَ اِمْرَأَةً قیاس کے مطابق اور ثَلٰثَ عَشَرَةَ اِمْرَأَةً سے لے کر تِسْعَ عَشَرَةَ اِمْرَأَةً پہلا جز خلاف قیاس اور دوسرا جز قیاس کے مطابق۔

وتمیم تکسر الشّین فی المؤنّث.

تمیم کا قاعدہ: مصنفؒ نے قبیلہ تمیم کے خاص قاعدہ کا ذکر کیا کہ وہ مؤنث میں شین کو کسرہ دیتے ہیں۔ جیسے خمسَ عشرِۃ۔ یہ ان کی مخصوص لغت ہے جو عربی زبان میں موجود ہے۔

وعشرون وأخواتها فیهما. أحد وعشرون، إحدی وعشرون، ثمّ بالعطف بلفظ ما تقدّم إلی تسعة وتسعین.

اور اس کے بعد باری آتی ہے دہائیوں کی۔ یعنی (۲۰) بیس، (۳۰) تیس، (۴۰) چالیس، (۵۰) پچاس، (۶۰) ساٹھ۔ سب دہائیاں تو دہائیاں مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتی ہیں بغیر فرق کے جیسے عِشْرُوْنَ رَجُلًا، عَشْرُوْنَ اِمْرَأَةً سے لے کر

تِسۡعِيۡنَ رَجُلًا تِسۡعِيۡنَ اِمۡرَأَةً نوے تک۔ اور دہائیوں کے بعد جو اکائیاں ہیں وہ قیاس کے مطابق استعمال ہوں گی اور اس کے بعد خلاف قیاس استعمال ہوں گی جیسے مذکر کی مثال اَحَدٌ وَّ عِشۡرُوۡنَ رَجُلًا اور اِثۡنَانِ وَ عِشۡرُوۡنَ رَجُلًا اور مؤنث کی مثال اَحۡدٰی وَعِشۡرُوۡنَ اِمۡرَأَةً اور اِثۡنَتَانِ عِشۡرُوۡنَ اِمۡرَأَةً اور اس کے بعد یعنی (۲۳) تیئس (۲۴) چوبیس (۳۳) تینتیس (۳۴) چونتیس اور (۴۳) تنتالیس (۴۴) چوالیس وغیرہ یہ سب (۲۹) انتیس۔ (۳۹) انتالیس (۴۹) انچاس وغیرہ تک یہ سب خلاف قیاس استعمال ہوں گے جیسے ثَلٰثَةٌ وَعِشۡرُوۡنَ رَجُلًا اور مؤنث کے لیے ثَلٰثٌ وَعِشۡرُوۡنَ اِمۡرَأَةً سے لے کر آخر تک۔

ومئة وألف، مئتان وألفان فيهما،

سو (۱۰۰) اور ہزار (۱۰۰۰) آگے ان کی باری آتی ہے تو یہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے ایک جیسے استعمال ہوتے ہیں جیسے مِائَةُ رَجُلٍ اور مِائَةُ اِمۡرَأَةٍ اور اَلۡفُ رَجُلٍ، اَلۡفُ اِمۡرَأَةٍ۔

ثمّ بالعطف علی ما تقدّم.

اور جب بات جائے گی ایک (۱۰۰) سو سے اوپر یا ایک ہزار سے اوپر تو پھر قیاس کے مطابق استعمال ہوں گے جیسے ایک سو ایک (۱۰۱) اور ایک سو دو (۱۰۲) اور ایک ہزار ایک (۱۰۰۱) اور ایک ہزار دو (۱۰۰۲) جیسے مِائَةٌ وَّ وَاحِدٌ رَجُلٍ اور اثنان وَاحِدٌ رَجُلٍ اور مؤنث کی مثال مِائَةٌ وَّاِحۡدٰی اِمۡرَأَةٍ اور مِائَةٌ اثۡنَتَانِ اِمۡرَأَةٍ اور اسی طرح اَلۡفٌ وَّ وَاحِدٌ رَجُلٍ وغیرہ یہاں تک تو قیاس کے مطابق استعمال ہوں گے، آگے ایک سو تین (۱۰۳) اور ایک ہزار تین (۱۰۰۳) سے خلاف قیاس استعمال ہوں گے جیسے مذکر کی مثال مِائَةٌ وَ ثَلَاثَةُ رِجَالٍ اور مؤنث کی مثال مِائَةٌ وَّ ثَلَاثُ نِسۡوَةٍ اور اَلۡفٌ وَّثَلَاثَةُ رِجَالٍ اور اَلۡفٌ وَثَلٰثُ نِسۡوَةٍ اِلٰی اٰخِرِہٖ۔

وفي ثماني عشرة فتح الياء، وجاء إسكانها، وشذّ حذفها بفتح النّون.

ثمانی عشرۃ میں یاء کا حکم :

مصنفؒ نے ثمانی عشرۃ کے تین مختلف تلفظ بیان کیے ہیں۔ یاء کو فتحہ دینا (ثَمَانِيَ) اصل ہے، اس کو ساکن کرنا (ثَمَانِيْ) بھی جائز ہے، اور شاذ طور پر یاء کو حذف کرکے نون پر فتحہ (ثَمَانَ) بھی آیا ہے۔ یہ اس لفظ کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔

ومميّز الثّلاثة إلى العشرة مخفوض مجموع لفظاً أو معنى، إلاّ في ثلاثمائة إلى تسعمائة، وكان قياسها مئات، أو مئين.

یہاں سے صاحب کتاب اسمائے عدد کی تمیز کے احکام کو بیان فرمارہے ہیں۔

اور ایک اور دو کے علاوہ جتنے بھی عدد ان سب کے لیے تمیز کا ہونا ضروری۔ اب ان کی تمیز کیا آئے گی اس کے لیے قاعدہ سمجھیں۔

قاعدہ:...ومميّز الثّلاثة إلى العشرة مخفوض مجموع لفظاً أو معنى،

یہ ہے کہ تین سے دس کی تمیز جمع مجرور آتی ہے جیسے ثَلٰثَةُ رِجَالٍ، وَثَلٰثُ نِسۡوَةٍ سے لے کر عَشَرَةُ رِجَالٍ اور عَشۡرُ نِسۡوَةٍ اور نِسۡوَةٍ تمیز ہے ثَلٰث اور ثَلٰثَة ممیّز ہے۔

إلاّ في ثلاثمائة إلى تسعمائة، وكان قياسها مئات، أو مئين.

لیکن اگر تین سے دس تک کی تمیز مائۃ ہو تو اس صورت میں خلاف قیاس جو تمیز ہو گی وہ مفرد مجرور ہو گی جیسے ثَلٰثُ مِائَةٍ اور تِسْعُ مِائَةٍ حالانکہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ تمیز جمع مجرور ہونی چاہیے جیسے ثَلٰثُ مِاٰتٍ اَوْ مِائِيْنَ۔

ومميّز (أحد عشر) إلى تسعة وتسعين منصوب مفرد.

گیارہ سے ننانوے تک کی تمیز کا قاعدہ یہ ہے کہ اس عدد کی تمیز مفرد منصوب ہو گی جیسے اَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا تو رَجُلًا تمیز ہے مفرد منصوب ہے اور اِحْدٰى عَشَرَةَ اِمْرَأَةً اور تِسْعَةٌ وَّتِسْعُوْنَ رَجُلًا اور تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ اِمْرَأَةً۔

ومميّز مئة وألف وتثنيتهما وجمعه مخفوض مفرد.

اور ممیز اگر مائۃ اور الف ہو یا مائتان اور الفان ہو تو ان کی تمیز مفرد مجرور ہو گی جیسے مِائَةُ رَجُلٍ، مِائَةُ اِمْرَأَةٍ اور اَلْفُ رَجُلٍ اور اَلْفُ اِمْرَأَةٍ اور مِائَتَا رَجُلٍ اور وَمِائَتَا اِمْرَأَةٍ۔ وَاَلْفَا رَجُلٍ اور وَاَلْفَا اِمْرَأَةٍ اور وَثَلٰثَةُ الَافِ رَجُلٍ اور وَثَلٰثُ الَافِ اِمْرَأَةٍ باقیوں کو بھی اسی پر قیاس کر لیں۔

وإذا كان المعدود مؤنّثا واللّفظ مذكّرا، أو بالعكس فوجهان.

ایک دقیق مسئلہ

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی معدود کا معنی تو مؤنث ہو لیکن اس کا لفظ مذکر ہو (جیسے "حَائِض" بمعنی حائضہ عورت)، یا اس کے برعکس اس کا معنی مذکر ہو لیکن لفظ مؤنث ہو (جیسے "طَلْحَة"، جو مرد کا نام ہے لیکن آخر میں تاءِ تانیث ہے)، تو اس کے عدد میں دو صورتیں جائز ہیں: لفظ کا اعتبار کیا جائے: یعنی لفظ کو دیکھ کر عدد کا قاعدہ لاگو کیا جائے۔ معنی کا اعتبار کیا جائے: یعنی معنی کو دیکھ کر عدد کا قاعدہ لاگو کیا جائے۔ مثال: لفظ دِرْع (زِرَہ) عربی میں مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔ اگر اسے مذکر مانیں تو کہیں گے ثَلَاثَةُ أَدْرُعٍ، اور اگر مؤنث مانیں تو کہیں گے ثَلَاثُ دُرُوعٍ۔ دونوں صورتیں جائز ہیں۔

واحد اور اثنان کی تمیز کا حکم

ولا يميّز (واحد) و(اثنان)؛ استغناء بلفظ التّمييز عنهما، مثل: (رجل) و(رجلان)، لإفادته النّصّ المقصود بالعدد. وتقول في المفرد من المتعدّد باعتبار تصييره: الثّاني والثّانية، إلى العاشر والعاشرة لا غير. وباعتبار حاله: الأوّل والثّاني، والأولى والثّانية، إلى العاشر والعاشرة، والحادي عشر والحادية عشرة، والثّاني عشر، والثّانية عشرة إلى التّاسع عشر، والتّاسعة عشرة، ومن ثمّ قيل في الأوّل: ثالث اثنين، أي مصيّرهما، من ثلثهما وفي الثّاني: ثالث ثلاثة، أي أحدها. وتقول: حادي عشر، أحد عشر على الثّاني خاصّة، وإن شئت قلت: حادي أحد عشر، إلى تاسع تسعة عشر، فتعرب الجزء الأوّل.

ترجمہ: "اور 'واحد' (ایک) اور 'اثنان' (دو) کی تمیز نہیں لائی جاتی؛ کیونکہ خود تمیز (معدود) کا لفظ ہی ان (اعداد) سے بے نیاز کر دیتا ہے، جیسے: 'رجل' اور 'رجلان'، اس لیے کہ یہ لفظ خود ہی اس صریح معنی کو ادا کر دیتا ہے جو عدد سے مقصود ہے،

اور آپ متعدد میں سے ایک کے بارے میں، اس کو (عدد کا) مکمل کرنے والا شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں :الثّانی، الثّانیة (دوسرا، دوسری) سے لے کر العاشر، العاشرۃ (دسواں، دسویں) تک، اس کے علاوہ نہیں۔اور اس کی حالت (اور مرتبے) کا اعتبار کرتے ہوئے کہتے ہیں :الأوّل، الثّانی (پہلا، دوسرا) اور الأولی، الثّانیة (پہلی، دوسری) سے لے کر العاشر، العاشرۃ (دسواں، دسویں) تک، اور الحادی عشر، الحادیة عشرۃ (گیارہواں، گیارہویں)، اور الثّانی عشر، الثّانیة عشرۃ (بارہواں، بارہویں) سے لے کر التّاسع عشر، التّاسعة عشرۃ (انیسواں، انیسویں) تک۔اسی وجہ سے پہلی قسم کے بارے میں کہا جاتا ہے :'ثالث اثنین' (دو کو تین کرنے والا)، یعنی ان دونوں کو تین بنانے والا۔اور دوسری قسم کے بارے میں کہا جاتا ہے :'ثالث ثلاثة' (تین میں سے تیسرا)، یعنی ان میں سے ایک،اور آپ کہتے ہیں :'حادی عشر' (گیارہواں) اور 'أحد عشر' (گیارہواں) خاص طور پر دوسرے معنی (یعنی مرتبہ بتانے) کے اعتبار سے۔اور اگر آپ چاہیں تو کہیں :'حادیُ أحدَ عشرَ' سے لے کر 'تاسعُ تسعةَ عشرَ' تک، (اس صورت میں) آپ پہلے جزء کو معرب پڑھیں گے۔

۔"تشریح:

قوله :(ولا يميّز واحد واثنان)

واحد اور اثنان کی تمیز کا حکم

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، گزشتہ بحث کے بعد اب یہ بیان فرمارہے ہیں کہ کون سے اعداد کے لیے تمیز (معدود) کی ضرورت نہیں ہوتی۔آپؒ فرماتے ہیں کہ 1 اور 2 کے لیے الگ سے تمیز ذکر نہیں کی جاتی۔

قوله :(استغناء بلفظ التّمييز عنهما)

اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہے کیونکہ جس اسم کو تمیز بننا تھا (یعنی معدود)، اس کے اپنے صیغے (واحد اور تثنیہ) میں ہی عدد کا معنی موجود ہوتا ہے، جس کی وجہ سے الگ سے عدد ذکر کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔مثلاً جب آپ "رَجُلٌ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہی "ایک مرد" ہے اور جب "رَجُلَانِ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہی "دو مرد" ہے۔لہٰذا "وَاحِدٌ رَجُلٌ" کہنا کلام میں حشو (غیر ضروری اضافہ) اور تطویلِ بلاطائل ہے۔

قوله :(لإفادته النّصّ المقصود بالعدد)

مصنفؒ نے مزید وضاحت فرمائی کہ لفظِ تمیز (جیسے رجل، رجلان) خود ہی اس صریح اور واضح معنی کو ادا کر رہا ہے جو عدد لانے کا مقصد تھا۔عدد کا مقصد تعداد بتانا ہے اور یہ مقصد اسم کے صیغہ واحد اور تثنیہ سے پہلے ہی حاصل ہو رہا ہے، اس لیے ان کے لیے تمیز کی ضرورت نہیں۔

وتقول في المفرد من المتعدّد باعتبار تصييره :الثّاني والثّانية إلى العاشر والعاشرة لا غير.

اعداد کی دوسری قسم

مصنفؒ یہاں سے اعداد کی دوسری قسم بیان فرمارہے ہیں جنہیں اسمائے عدد وصفی کہا جاتا ہے (جیسے دوسرا، تیسرا، چوتھا وغیرہ)۔

یہ عموماً "فاعِل" کے وزن پر آتے ہیں۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان کے استعمال اور معنی کے دو اعتبار ہیں

.1: پہلا اعتبار : باعتبار التصییر (عدد کو مکمل کرنے والا)

قوله :(باعتبار تصییره :الثّانی ...إلی العاشر لا غیر)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس عددِ وصفی کا ایک معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سابقہ عدد کو مکمل کرکے اگلا عدد "بنانے والا" ہے۔ الثانی کا مطلب ہوگا :"وہ جو ایک کو دو بنادے" (جاعل الواحد اثنین)۔ الثالث کا مطلب ہوگا :"وہ جو دو کو تین بنادے" (جاعل الاثنین ثلاثۃ)۔ العاشر کا مطلب ہوگا :"وہ جو نو کو دس بنادے" (جاعل التسعۃ عشرۃ)۔ مصنفؒ نے "لا غیر" کی قید لگائی، جس کا مطلب ہے کہ یہ معنی صرف 2 سے 10 تک کے اعداد میں پایا جاتا ہے، اس سے آگے نہیں۔

.2 دوسرا اعتبار : باعتبار الحال (مرتبہ اور حالت بتانے والا)

قوله :(وباعتبار حاله :الأوّل والثّانی ...إلی التاسع عشر)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ عددِ وصفی کا دوسرا اور زیادہ مشہور معنی کسی چیز کا محض مرتبہ یا ترتیب بیان کرنا ہے۔ الثانی کا مطلب ہوگا: "وہ جو ترتیب میں دوسرے نمبر پر واقع ہو"۔ الثالث کا مطلب ہوگا :"وہ جو ترتیب میں تیسرے نمبر پر ہو"۔ یہ معنی پہلے عدد سے لے کر انیسویں تک اور اس کے بعد بھی تمام اعداد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مذکر کے لیے الاول اور مؤنث کے لیے الاولی استعمال ہوتا ہے۔

دونوں معانی کا فرق اور مثالیں

قوله :(ومن ثمّ قیل فی الأوّل :ثالث اثنین ...وفی الثّانی :ثالث ثلاثة)

مصنفؒ ان دونوں اعتبارات کے فرق کو واضح کرنے کے لیے دو مشہور مثالیں پیش کرتے ہیں: پہلی قسم کی مثال :ثَالِثُ اثْنَيْنِ۔ اس کا مطلب ہے "دو کو تین کرنے والا" (باعتبار التصییر)۔ جیسے کہا جائے :"هُوَ ثَالِثُ اثْنَيْنِ" یعنی وہ اکیلا آیا اور دو پہلے سے موجود لوگوں کو تین بنادیا۔ قرآن پاک میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے آیا ہے :"ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ" (دو میں کا دوسرا، جب وہ دونوں غار میں تھے)، یہاں بھی مفسرین نے یہ معنی کیا ہے کہ آپ ﷺ ایک تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے آکر ان کو دو کردیا۔ دوسری قسم کی مثال :ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ۔ اس کا مطلب ہے "تین میں سے ایک" یا "تین میں سے تیسرا" (باعتبار الحال)۔ یہ کسی مجموعے کا حصہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں نصاریٰ کے غلط عقیدے کا رد کرتے ہوئے فرمایا گیا :"لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ" (بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے)۔ یہاں "تین بنانے والا" مراد نہیں بلکہ "تین میں سے ایک" مراد ہے۔

وتقول :حادی عشر ,أحد عشر علی الثّانی خاصّة، وإن شئت قلت :حادی أحد عشر ,إلی تاسع تسعة عشر ,فتعرب الجزء الأوّل.

مرکب اعداد کی وصفی صورت بنانے کے مختلف طریقے

مصنفؒ یہاں 11 سے 19 تک کے مرکب اعداد کی وصفی صورت بنانے کے مختلف طریقے بیان فرمارہے ہیں۔ یہ تمام طریقے صرف دوسرے معنی (باعتبار الحال) کے لیے ہیں۔ قولہ: (وتقول: حادی عشر، أحد عشر علی الثّانی خاصّۃ) آپ فرماتے ہیں کہ گیارہویں کے لیے دو طریقے ہیں: حَادِیَ عَشَرَ: یہاں پہلے جزء کو "فاعل" کے وزن پر لایا گیا ہے (واحد سے حادی بنا ہے)۔ یہ عدد مرکب مبنی بر فتح ہوتا ہے، یعنی دونوں اجزاء پر ہمیشہ زبر آئے گی۔ أَحَدَ عَشَرَ: یہاں اصل عدد کو ہی وصفی معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔ یعنی "أحد عشر" کا مطلب "گیارہ" بھی ہے اور "گیارہواں" بھی ہو سکتا ہے۔

قولہ: (وإن شئت قلت: حادي أحد عشر ... فتعرب الجزء الأوّل)

مصنفؒ ایک تیسرا طریقہ بیان کرتے ہیں جو ترکیبِ اضافی (مضاف اور مضاف الیہ) کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس میں عددِ وصفی کا پہلا جزء مضاف بنتا ہے اور پورا مرکب عدد مضاف الیہ بنتا ہے۔ مثال: حَادِیُ أَحَدَ عَشَرَ (گیارہ کا گیارہواں)۔ اس ترکیب کا سب سے اہم حکم یہ ہے کہ پہلا جزء (حادی، ثانی، ثالث وغیرہ) معرب ہو جاتا ہے، یعنی اس پر رفع، نصب اور جر تینوں اعراب آ سکتے ہیں، جبکہ "حادی عشر" والی صورت میں وہ ہمیشہ مبنی بر فتح رہتا ہے۔ مثال (حالتِ رفع): جَاءَ حَادِیُ أَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا۔ مثال (حالتِ نصب): رَأَیْتُ حَادِیَ أَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا۔ مثال (حالتِ جر): مَرَرْتُ بِحَادِی أَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا۔ یہ قاعدہ گیارہویں سے لے کر انیسویں تک سب پر لاگو ہوتا ہے، جیسے: ثَالِثُ ثَلَاثَةَ عَشَرَ إلى تاسع تسعة عشرَ۔

[المذکّر والمؤنّث]:

المؤنّث: ما فيه علامة التّأنيث لفظًا أو تقديرًا. والمذكّر: بخلافه. وعلامة التّأنيث: التّاء، والألف مقصورة أو ممدودة. وهو حقيقيّ ولفظيّ. فالحقيقيّ: ما بإزائه ذكر من الحيوان، ك‍(امرأة) و(ناقة). واللّفظيّ بخلافه، ك‍(ظلمة) و(عين). وإذا أسند الفعل إليه فبالتّاء. وأنت في ظاهر غير الحقيقيّ بالخيار، وحكم ظاهر الجمع غير المذكّر السّالم مطلقًا حكم ظاهر غير الحقيقيّ، وضمير العاقلين غير المذكّر السالم: (فعلت) و(فعلوا)، والنّساء والأيّام (فعلت) و(فعلن).

ترجمہ: "[مذکر اور مؤنث کی بحث]: مؤنث: وہ اسم ہے جس میں تانیث کی علامت لفظی طور پر یا تقدیری طور پر موجود ہو۔ اور مذکر: اس کے برعکس ہے۔ اور تانیث کی علامتیں یہ ہیں: تاء، الفِ مقصورہ یا الفِ ممدودہ، اور وہ (مؤنث) حقیقی اور لفظی ہوتا ہے۔ پس حقیقی وہ ہے جس کے مقابلے میں کوئی نر جاندار ہو، جیسے 'اِمْرَأَةٌ' (عورت) اور 'نَاقَةٌ' (اونٹنی)۔ اور لفظی اس کے برعکس ہے، جیسے 'ظُلْمَةٌ' (اندھیرا) اور 'عَیْنٌ' (آنکھ)، اور جب فعل کو اس (مؤنث) کی طرف منسوب کیا جائے تو تاء کے ساتھ لایا جاتا ہے۔ اور آپ کو غیر حقیقی مؤنث اگر اسم ظاہر ہو تو اختیار ہے۔ اور جمع مذکر سالم کے علاوہ دیگر جمع ظاہر کا حکم مطلقاً وہی ہے جو غیر حقیقی مؤنث ظاہر کا ہے۔ اور جمع مذکر سالم کے علاوہ دیگر عاقل جمعوں کی ضمیر کے لیے (فعل) 'فَعَلَتْ' (واحد مؤنث) اور 'فَعَلُوْا' (جمع مذکر) کے صیغے آتے ہیں، اور 'النِّسَاء' اور 'الأَیَّام' کے لیے 'فَعَلَتْ' اور 'فَعَلْنَ' کے صیغے آتے ہیں'

"تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، اسمائے عدد کی بحث کے بعد اب اسم کو باعتبارِ جنس، یعنی مذکر و مؤنث میں

تقسیم فرما رہے ہیں۔

مذکر اور مؤنث کی تعریف اور علامات

قوله :(المؤنّث :ما فيه علامة التّأنيث لفظا أو تقديرا)

مصنفؒ مؤنث کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مؤنث وہ اسم ہے جس میں تانیث کی کوئی نہ کوئی علامت پائی جائے۔ یہ علامت یا تو لفظاً (ظاہری طور پر لکھی اور پڑھی جانے والی) ہوگی یا تقدیراً (پوشیدہ طور پر مانی ہوئی) ہوگی۔

لفظاً : جیسے "فَاطِمَۃُ" میں تاء (ۃ) تانیث کی علامت لفظوں میں موجود ہے۔

تقدیراً : یہ خاص ہے تاء کے ساتھ یعنی تقدیراً صرف تا ہوگی باقی علامات کا لفظوں میں موجود ہونا ضروری ہے جیسے أَرْضٌ اور دَارٌ یہ دونوں مؤنث ہیں اور اس میں جو تاء تانیث ہے وہ مقدر ہے کیونکہ ارض کی تصغیر اُرَیْضَۃٌ ہے اور دَارٌ کی تصغیر دُوَیْرَۃٌ ہے کیونکہ تصغیر سے کلمے کی اصل معلوم ہو جاتی ہے تو اصل میں اَرْضٌ اور دَارٌ میں تاء تانیث موجود تھی بعد اس کو مقدر کر دیا گیا۔

قوله :(والمذكّر :بخلافه) پھر آپؒ مذکر کی تعریف نہایت اختصار سے فرماتے ہیں کہ مذکر وہ ہے جو مؤنث کے برعکس ہو، یعنی وہ اسم جس میں تانیث کی علامت لفظاً یا تقدیراً نہ پائی جائے۔ جیسے "رَجُلٌ"، "قَلَمٌ"۔

قوله :(وعلامة التّأنيث :التّاء، والألف مقصورة أو ممدودة)

مصنفؒ اب مؤنث کی لفظی اور قیاسی علامتیں بیان فرما رہے ہیں، جو کہ تین ہیں:

التاء المربوطة (ۃ) : یعنی گول تاء۔ یہ تانیث کی سب سے عام علامت ہے۔ جیسے :عَائِشَۃُ، طَلْحَۃُ، سَیَّارَۃٌ۔

الألف المقصورة (ى) : وہ الف جو یاء (ی) کی صورت میں لکھا جائے۔ جیسے :سَلْمٰی، لَیْلٰی، حُبْلٰی۔

الألف الممدودة (اء) : وہ الف جس کے بعد ہمزہ آئے۔ جیسے :صَحْرَاءُ، حَمْرَاءُ، زَکَرِیَّاءُ۔

وهو حقيقيّ ولفظيّ. فالحقيقيّ :ما بإزائه ذكر من الحيوان، ك(امرأة) و(ناقة). واللّفظيّ بخلافه، ك(ظلمة) و(عين).

مؤنث کی اقسام : حقیقی اور لفظی

مصنفؒ اب مؤنث کو معنوی اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم فرما رہے ہیں:

قوله :(فالحقيقيّ :ما بإزائه ذكر من الحيوان) مؤنث حقیقی :وہ مؤنث ہے جس کے مقابلے میں اسی جنس کا کوئی مذکر (نر) جانداروں میں پایا جائے۔ مصنف کی قید "من الحیوان" (جانداروں میں سے) بہت اہم ہے۔ مثال :"اِمْرَأَۃٌ" (عورت) مؤنث حقیقی ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں "رَجُلٌ" (مرد) ہے۔ "نَاقَۃٌ" (اونٹنی) مؤنث حقیقی ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں "جَمَلٌ" (اونٹ) ہے۔

قوله :(واللّفظيّ بخلافه) مؤنث لفظی :وہ مؤنث ہے جو حقیقی نہ ہو، یعنی جس کے مقابلے میں کوئی نر جاندار نہ ہو۔

مثال :"ظُلْمَۃٌ" (اندھیرا) میں علامتِ تانیث (ۃ) تو ہے لیکن یہ حقیقی مؤنث نہیں کیونکہ اس کا کوئی مذکر نہیں۔ اسی طرح "عَیْنٌ" (آنکھ) مؤنث سماعی ہے اور لفظی بھی ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں کوئی نر جاندار نہیں۔

وإذا أسند الفعل إليه فبالتاء. وأنت في ظاهر غير الحقيقيّ بالخيار،

مؤنث کے ساتھ فعل لانے کے قواعد

یہاں سے مصنفؒ مؤنث فاعل کے ساتھ فعل کے استعمال کے اہم اور دقیق قواعد بیان فرمارہے ہیں۔

.1 **عمومی قاعدہ:** قولہ :(وإذا أسند الفعل إليه فبالتاء) اصل قاعدہ یہ ہے کہ جب بھی فاعل مؤنث ہو تو فعل پر تاء التانیث داخل کی جائے گی۔ فعل ماضی میں یہ تاء ساکنہ فعل کے آخر میں آتی ہے (جیسے :قَالَتْ) اور فعل مضارع میں یہ تاء متحرکہ فعل کے شروع میں آتی ہے (جیسے :تَقُوْلُ).مثال :جَاءَتْ فَاطِمَةُ۔ (فاطمہ آئی)۔

.2 **مؤنث غیر حقیقی کا حکم:** قولہ :(وأنت في ظاهر غير الحقيقيّ بالخيار) مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر فاعل مؤنث غیر حقیقی ہو اور اسم ظاہر ہو (ضمیر نہ ہو)، تو آپ کو اختیار ہے کہ فعل کو تاء کے ساتھ لائیں یا بغیر تاء کے۔ مثال :سورج طلوع ہوا۔ "الشّمس" مؤنث غیر حقیقی ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں :طَلَعَتِ الشَّمْسُ۔ (تاء کے ساتھ، اور یہی فصیح ہے) طَلَعَ الشَّمْسُ۔ (بغیر تاء کے، اور یہ بھی جائز ہے)

.3 **جمع کا حکم:** قولہ :(وحكم ظاهر الجمع غير المذكّر السّالم مطلقا حكم ظاهر غير الحقيقيّ) یہاں مصنفؒ اس اختیار کو مزید وسعت دے رہے ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ جمع مذکر سالم کے علاوہ باقی تمام جمع اگر اسم ظاہر ہوں تو ان کا حکم بھی وہی ہے جو مؤنث غیر حقیقی کا ہے، یعنی فعل کو مذکر یا مؤنث لانے میں اختیار ہے۔

"مطلقا" کا مطلب ہے خواہ وہ جمع عاقل کی ہو یا غیر عاقل کی، مذکر کی ہو یا مؤنث کی۔اس میں دو قسم کی جمع شامل ہیں :

جمع مکسر :جیسے "الرِّجَال"۔آپ کہہ سکتے ہیں :قَامَ الرِّجَالُ یا قَامَتِ الرِّجَالُ۔

جمع مؤنث سالم :جیسے "الْمُؤْمِنَاتُ"۔آپ کہہ سکتے ہیں :جَاءَتِ الْمُؤْمِنَاتُ یا جَاءَ الْمُؤْمِنَاتُ۔

.4 **ضمیر کا حکم:** قولہ :(وضمير العاقلين غير المذكّر السالم :فعلت وفعلوا) اب مصنفؒ اس صورت کا بیان کر رہے ہیں جب فاعل ضمیر ہو جو کسی جمع کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اگر وہ جمع عاقل کی ہو (اور جمع مذکر سالم نہ ہو)، تو اس کی طرف لوٹنے والے فعل کے دو صیغے جائز ہیں:

واحد مؤنث (فَعَلَتْ) :جماعت کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے۔ جیسے :النِّسَاءُ قَامَتْ۔ (عورتیں کھڑی ہوئیں)۔

جمع مذکر (فَعَلُوا) :ان افراد کے عاقل ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے، کیونکہ جمع مذکر کا صیغہ عقلاء کے لیے اصل ہے۔ جیسے : النِّسَاءُ قَامُوْا۔

.5 **مزید تخصیص اور مثالیں:** قولہ :(والنّساء والأيّام فعلت وفعلن) آخر میں مصنفؒ دو مثالوں سے مزید وضاحت کرتے ہیں:

النِّسَاء (عورتیں) :یہ عاقل کی جمع ہے۔ اس کی طرف لوٹنے والا فعل فَعَلَتْ (واحد مؤنث) بھی آسکتا ہے اور فَعَلْنَ (جمع مؤنث) بھی آسکتا ہے۔ پچھلے قاعدے کے مطابق فَعَلُوْا بھی آسکتا ہے۔ تو "النساء" کے لیے تینوں صورتیں ممکن ہوئیں : النِّسَاءُ قَامَتْ، النِّسَاءُ قُمْنَ، النِّسَاءُ قَامُوْا۔

اَلْاَیَّام(ون) :یہ غیر عاقل کی جمع ہے۔ اس کی طرف لوٹنے والا فعل فَعَلَتْ (واحد مونث) آسکتا ہے (جیسے :اَلْاَیَّامُ مَضَتْ) یا فَعَلْنَ (جمع مونث) آسکتا ہے (جیسے :الْاَیَّامُ مَضَیْنَ)۔ اس کے لیے "فعلوا" کا صیغہ نہیں آئے گا کیونکہ یہ غیر عاقل ہے۔

[المثنّٰی]:

المثنّٰی :ما لحق آخره ألف، أو یاء مفتوح ما قبلها، ونون مكسورة، لیدلّ علی أنّ معه مثله من جنسه. فالمقصور إن كانت ألفه عن واو وهو ثلاثيّ قلبت واوا، وإلاّ فبالیاء. والممدود إن كانت همزته أصلیّة تثبت، وإن كانت للتّأنیث قلبت واوا، وإلاّ فالوجهان. ویحذف نونه بالإضافة. وحذفت تاء التّأنیث في (خصیان) و (ألیان).

ترجمہ: "مثنیٰ (تثنیہ) :وہ (اسم) ہے جس کے آخر میں الف، یا ایسی یاء جس کا ما قبل مفتوح ہو، اور ایک نونِ مکسور کا اضافہ کیا جائے؛ تاکہ وہ اس بات پر دلالت کرے کہ اس کے ساتھ اسی کی جنس میں سے اس جیسا ایک اور بھی ہے، پس اسمِ مقصور، اگر اس کا الف واو سے بدلا ہوا ہو اور وہ (اسم) تین حرفی ہو تو الف کو واو سے بدل دیا جائے گا، ورنہ یاء سے بدلا جائے گا۔ اور اسم ممدود، اگر اس کا ہمزہ اصلی ہو تو باقی رہے گا، اور اگر تانیث کے لیے ہو تو واو سے بدل دیا جائے گا، ورنہ (اگر وہ کسی حرف سے بدلا ہوا ہو تو) دونوں صورتیں جائز ہیں، اور اضافت کی وجہ سے اس کا نون حذف کر دیا جاتا ہے، اور (خصیان) اور (ألیان) میں تاء التانیث کو حذف کر دیا گیا ہے۔

"تشریح:

اسمِ مثنیٰ (تثنیہ) کی تعریف

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ یہاں سے اسمِ مثنیٰ یعنی تثنیہ کی تعریف اور اس کے احکام بیان فرما رہے ہیں۔

قولہ :(المثنّٰی :ما لحق آخره ألف، أو یاء مفتوح ما قبلها، ونون مكسورة)

مصنفؒ تثنیہ کی لفظی بناوٹ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ اسم معرب ہے جس کے آخر میں کچھ حروف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ اضافہ دو حالتوں میں ہوتا ہے:

حالتِ رفع میں :اسم کے آخر میں الف (ا) اور نونِ مکسور (نِ) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے "رَجُلٌ" سے "رَجُلَانِ"۔

حالتِ نصب وجر میں :اسم کے آخر میں یاء ساکن ما قبل مفتوح (یْ) اور نونِ مکسور (نِ) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے "رَجُلٌ" سے "رَجُلَیْنِ"۔ مصنفؒ کا "یاء مفتوح ما قبلها" کہنا اسی بات کی وضاحت کرتا ہے کہ تثنیہ کی یاء سے پہلے والے حرف پر ہمیشہ زبر (فتحہ) ہوتی ہے۔

قولہ :(لیدلّ علی أنّ معه مثله من جنسه)

یہاں مصنفؒ تثنیہ کا معنوی مقصد بیان فرما رہے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ یہ اضافہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ یہ لفظ اس بات پر دلالت کرے کہ اس اسم کے ساتھ اسی کی جنس کا ایک اور فرد شریک ہے، یعنی کل دو افراد مراد ہیں۔ مثلاً "رجلان" کا مطلب صرف "دو مرد" نہیں، بلکہ "ایک مرد اور اس جیسا ایک اور مرد" ہے۔ یہ قید اس لیے اہم ہے کہ اگر دو مختلف جنس کی چیزیں

ہوں، جیسے ایک مرد اور ایک عورت، تو ان پر لفظ "رجلان" کا اطلاق نہیں ہوگا۔

اسمِ مقصور اور اسمِ ممدود کا تثنیہ

مصنفؒ اب ان اسماء کا تثنیہ بنانے کا قاعدہ بیان فرمارہے ہیں جن کے آخر میں حرفِ علت ہو۔

.1 اسمِ مقصور کا تثنیہ: قولہ: (فالمقصور إن کانت ألفہ عن واو وھو ثلاثیٌ قلبت واوا، وإلّا فبالیاء) اسمِ مقصور وہ اسم ہے جس کے آخر میں الف لازمہ (الف مقصورہ 'ی' یا الف ممدودہ 'ا') ہو۔ مصنفؒ اس کا تثنیہ بنانے کے لیے دو اصول بیان کرتے ہیں:

پہلا اصول: اگر اسمِ مقصور تین حرفی (ثلاثی) ہو اور اس کا الف اصل میں واو تھا، تو تثنیہ بناتے وقت اس الف کو اس کی اصل یعنی واو کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ مثال: "عَصًا" (لاٹھی)۔ یہ ثلاثی ہے اور اس کا الف اصل میں واو ہے۔ لہٰذا اس کا تثنیہ "عَصَوَانِ" ہوگا۔ اسی طرح "قفًا" (گدی) سے "قفَوَانِ"۔

دوسرا اصول (وإلّا...): اگر مذکورہ بالا شرط نہ پائی جائے، یعنی اسم تین حرفی سے زیادہ ہو، یا تین حرفی تو ہو لیکن اس کا الف اصل میں یاء ہو (یا اس کی اصل معلوم نہ ہو)، تو ہر صورت میں اس الف کو یاء سے بدلا جائے گا۔ مثال (ثلاثی اور اصل یاء): "فَتًی" (نوجوان) سے "فَتَيَانِ"۔ مثال (غیر ثلاثی): "مُصْطَفًى" سے "مُصْطَفَيَانِ" اور "مُسْتَشْفًى" سے "مُسْتَشْفَيَانِ"۔

.2 اسمِ ممدود کا تثنیہ: قولہ: (والممدود إن کانت ہمزتہ أصلیۃ تثبت...) اسمِ ممدود وہ اسم ہے جس کے آخر میں الفِ زائدہ کے بعد ہمزہ (اء) ہو۔ اس کے ہمزہ کی تین قسمیں ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ ہے:

پہلا حکم (ہمزہ اصلی ہو): اگر ہمزہ کلمہ کے اصلی حروف (فاء، عین، لام) میں سے ہو، تو وہ تثنیہ میں اپنی حالت پر باقی رہے گا (تثبت)۔ مثال: "قُرَّاءٌ" (قاری) بروزن "فُعَّالٌ" اس کا مادہ "ق-ر-أ" ہے۔ ہمزہ اصلی ہے۔ اس کا تثنیہ "قُرَّاءَانِ" ہوگا۔ اسی طرح "اِبْتِدَاءٌ" سے "اِبْتِدَاءَانِ"۔

دوسرا حکم (ہمزہ تانیث کے لیے ہو): اگر ہمزہ صرف مؤنث کی علامت کے طور پر لایا گیا ہو، تو تثنیہ بناتے وقت اسے واو سے بدلنا واجب ہے۔ مثال: "صَحْرَاءُ" (ریگستان)، "حَمْرَاءُ" (سرخ مؤنث)۔ ان کا تثنیہ "صَحْرَاوَانِ" اور "حَمْرَاوَانِ" ہوگا۔

تیسرا حکم (ہمزہ منقلبہ ہو): اگر ہمزہ نہ اصلی ہو اور نہ تانیث کے لیے، بلکہ کسی حرف (واو یا یاء) سے بدلا ہوا ہو، تو اس میں دونوں صورتیں (الوجہان) جائز ہیں

: **(1)** ہمزہ کو باقی رکھا جائے، **(2)** ہمزہ کو واو سے بدل دیا جائے۔ مثال: "سَمَاءٌ" (آسمان)۔ اس کا مادہ "س-م-و" ہے۔ ہمزہ اصل میں واو تھا۔ اس کا تثنیہ "سَمَاءَانِ" (ہمزہ کو باقی رکھتے ہوئے) اور "سَمَاوَانِ" (ہمزہ کو واو سے بدلتے ہوئے) دونوں درست ہیں۔ اسی طرح "كِسَاءٌ" (چادر) جو "ک-س-و" سے ہے، اس کا تثنیہ "كِسَاءَانِ" اور "كِسَاوَانِ" دونوں جائز ہے۔

تثنیہ کے متفرق احکام

قولہ: (ویحذف نونہ بالإضافۃ)

مصنفؒ ایک اہم قاعدہ بیان فرمارہے ہیں کہ جب بھی اسمِ تثنیہ مضاف بن کر آئے گا تو اس کے آخر سے نونِ تثنیہ کو حذف کر دیا جائے گا۔ مثال :"کِتَابَانِ" کا معنی ہے "دو کتابیں"۔ اگر کہنا ہو "زید کی دو کتابیں"، تو ترکیبِ اضافی میں یہ "کِتَابَا زَیْدٍ" (حالتِ رفع میں) اور "کِتَابَیْ زَیْدٍ" (حالتِ نصب و جر میں) ہو جائے گا۔ نون کو حذف کر دیا گیا۔

قولہ :(وحذفت تاء التّأنیث فی خصیان وألیان)

آخر میں مصنفؒ دو ایسے اسماء کا ذکر فرمارہے ہیں جن کا تثنیہ خلافِ قیاس (شاذ) طریقے سے بنتا ہے۔ الفاظ ہیں "خُصْیَةٌ" اور "أَلْیَةٌ"۔ یہ دونوں مؤنث ہیں اور ان کے آخر میں تاءِ تانیث موجود ہے۔ قاعدے (قیاس) کا تقاضا یہ تھا کہ ان کا تثنیہ تاء کو باقی رکھتے ہوئے "خُصْیَتَانِ" اور "أَلْیَتَانِ" بنایا جاتا۔ لیکن اہلِ عرب کے استعمال (سماع) میں تاء کو حذف کر کے "خُصْیَانِ" اور "أَلْیَانِ" آیا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ خُصْیَانِ اور أَلْیَانِ یہ لازم اور ملزوم ہوتے ہیں تو اس لیے علامت تانیث کو حذف کر دیا جائے گا کیونکہ یہ دونوں شی واحد کے حکم میں ہوتے ہیں گویا کہ ایک ہے تو دوسرا بھی موجود ہے قاعدہ کلیہ یہی ہے اس کا، مصنفؒ اسی خلافِ قیاس استعمال کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں۔

فائدہ:

جب تثنیہ کی اضافت ہو تثنیہ کی طرف تو پہلے والے تثنیہ کو تعبیر کیا جائے گا لفظ جمع سے کیونکہ دو (۲) تثنیوں کا جمع ہونا ایسے مقام پر جہاں دو تثنیوں میں لفظاً اور معناً شدت اتصال ہو تو یہ کلام عرب میں بُرا سمجھا جاتا ہے اور اس کی تائید قرآن پاک کی آیات سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (سورۂ تحریم آیت :۴) تحقیق تم دونوں کے دل مائل ہو گئے اور اسی طرح دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا (سورۂ مائدہ آیت :۳۸) کاٹ دو ان دونوں کے ہاتھ۔ تو اب دیکھیں یہاں پر یہ قُلُوْبُكُمَا اصل قَلْبَا كُمَا تھا تثنیہ تھا تم دونوں کے دل اَيْدِيَهُمَا یہ اصل میں تھا يَدَيْهُمَا تھا۔ جب دو تثنیہ جمع ہو گئے اور دونوں کا آپس میں لفظاً اور معناً شدتِ اتصال ہے لفظاً تو اس وجہ سے کہ یہ مضاف اور مضاف الیہ ہے قَلْبَا كُمَا مضاف مضاف الیہ ہے اور اَيْدِيَهُمَا بھی مضاف مضاف الیہ ہے اور معناً اس لیے ہے کہ پہلا والا دوسرے کا جزء ہے لہٰذا پہلے والے تثنیہ کو جمع سے تعبیر کیا جائے گا تاکہ یہ خرابی لازم نہ آئے۔ واللہ اعلم

[المجموع]

المجموع :ما دلّ علی آحاد مقصودة بحروف مفردة بتغیّر ما. فنحو (تمر) و (رکب) لیس بجمع علی الأصحّ، ونحو (فلک) جمع. وهو صحیح ومکسّر. فالصّحیح لمذکّر ولمؤنّث.

ترجمہ: "جمع :وہ (اسم) ہے جو اپنے مفرد کے حروف کے ساتھ، کسی نہ کسی تبدیلی کے ذریعے، مقصود اکائیوں پر دلالت کرے۔ پس (تمر) اور (رکب) جیسی مثالیں صحیح تر قول کے مطابق جمع نہیں ہیں، اور (فلک) جیسی مثال جمع ہے۔ اور وہ (جمع) صحیح اور مکسر ہوتی ہے، پس صحیح (جمع) مذکر کے لیے بھی ہوتی ہے اور مؤنث کے لیے بھی۔

"تشریح:

جمع کی تعریف اور اس کی قیودات

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ اسمِ مثنیٰ (تثنیہ) کی بحث کے بعد اب اسمِ مجموع یعنی جمع کی تعریف اور اس کی اقسام بیان فرمارہے ہیں۔

قولہ :(المجموع :ما دلّ علی آحاد مقصودۃ بحروف مفردہ بتغیّر ما) مصنفؒ نے جمع کی ایک نہایت جامع اور مانع تعریف بیان کی ہے، جس کا ہر لفظ ایک خاص قید پر مشتمل ہے: ما دلّ علی آحاد (جو اکائیوں پر دلالت کرے) : یہ پہلی قید ہے جو جمع کو مفرد اور تثنیہ سے الگ کرتی ہے، کیونکہ جمع دو سے زیادہ افراد پر دلالت کرتی ہے۔ مقصودۃ (مقصود ہوں) : اس قید کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کے صیغے سے ہی ان اکائیوں کا ارادہ کیا گیا ہو، یعنی لفظ کا وزن اور بناوٹ ہی جمع کے لیے بنائی گئی ہو۔ یہ قید "اسمِ جمع" (جیسے رَکْبٌ) کو تعریف سے خارج کرتی ہے، کیونکہ اگرچہ وہ معنیً جمع پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کا صیغہ واحد کا ہے۔ بحروف مفردہ (اپنے مفرد کے حروف کے ساتھ) : یہ قید اس بات کو واضح کرتی ہے کہ جمع کا تعلق اس کے مفرد کے حروف سے ہوتا ہے۔ یہ قید بھی "اسمِ جمع" کو خارج کرتی ہے کیونکہ "رَکْبٌ" (سواروں کا گروہ) کے تمام حروف اس کے مفرد "رَاکِبٌ" میں موجود نہیں ہیں۔ بتغیّر ما (کسی نہ کسی تبدیلی کے ساتھ) : یہ تعریف کا سب سے اہم جزء ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جمع کے صیغے میں اس کے مفرد کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی یا تو لفظی (ظاہری) ہوتی ہے جیسے "رَجُلٌ" سے "رِجَالٌ"، یا تقدیری (پوشیدہ) ہوتی ہے جیسے "فُلْكٌ" (واحد کشتی) سے "فُلْكٌ" (جمع کشتیاں)۔ اسی قید کی بناپر "اسمِ جنس جمعی" تعریف سے خارج ہو جاتا ہے۔ جو جمع نہیں ہیں

(اسمِ جنس جمعی اور اسمِ جمع)

قولہ :(فنحو (تمر) و (رکب) لیس بجمع علی الأصحّ)

مصنفؒ اپنی تعریف کو مزید واضح کرنے کے لیے دو ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جو جمع کا معنی تو دیتی ہیں لیکن مذکورہ بالا تعریف کے مطابق حقیقی جمع نہیں ہیں۔ تمر (کھجوریں) : یہ "اسمِ جنس جمعی" ہے۔ یہ وہ اسم ہوتا ہے جو اپنی جنس کے بہت سے افراد پر دلالت کرتا ہے اور اس کے واحد اور جمع میں فرق صرف تاء (ۃ) کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جیسے "تَمْرٌ" (بہت سی کھجوریں) اور "تَمْرَۃٌ" (ایک کھجور)۔ یہ حقیقی جمع اس لیے نہیں کیونکہ اس میں "مفرد سے جمع" نہیں بنائی گئی، بلکہ "جمع سے مفرد" بنایا گیا ہے۔ اس میں "بتغیر ما" والی شرط نہیں پائی جاتی۔

رَکْبٌ (سواروں کا قافلہ) : یہ "اسمِ جمع" ہے۔ یہ وہ اسم ہوتا ہے جس کا کوئی واحد اس کے اپنے لفظ سے نہیں ہوتا۔ "رَکْبٌ" کا واحد "رَاکِبٌ" ہے، جو کہ لفظی طور پر بالکل مختلف ہے۔ اس لیے یہ جمع کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ مصنفؒ کا "علی الاَصحّ" (صحیح تر قول کے مطابق) کہنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض نحوی ان کو جمع شمار کرتے ہیں، لیکن راجح اور صحیح تر موقف یہی ہے کہ یہ حقیقی جمع نہیں ہیں۔

تقدیری تبدیلی کی مثال

قولہ :(ونحو (فلك) جمع) مصنفؒ ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جو ان کی تعریف کی جامعیت کو ثابت کرتی ہے۔ لفظ "فُلْك"

واحد (کشتی) اور جمع (کشتیاں) دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی، لیکن حقیقت میں اس میں تقدیری تبدیلی موجود ہے۔ اس کا واحد "فُعْلٌ" کے وزن پر ہے (جیسے قُفْلٌ)۔ اس کی جمع "فُعُلٌ" کے وزن پر ہے (جیسے أُسُدٌ، جو أَسَدٌ کی جمع ہے)۔ اگرچہ بولنے میں دونوں "فُلْك" ہیں لیکن نحویوں کے نزدیک ان کے اصل وزن میں فرق ہے، اور یہی وہ "تغیرِ تقدیری" ہے جس کی وجہ سے یہ لفظ جمع کی تعریف میں داخل ہو جاتا ہے۔

جمع کی اقسام

قولہ :(وهو صحيح ومكسّر، فالصّحيح لمذكّر ولمؤنّث) آخر میں مصنفؒ جمع کی بنیادی تقسیم بیان فرمارہے ہیں۔ جمع کی دو بڑی قسمیں ہیں: جمع صحیح (یا جمع سالم) :وہ جمع جس میں اس کا واحد کا صیغہ (بناوٹ) سلامت رہے اور اس کے آخر میں کچھ حروف کا اضافہ کر دیا جائے۔

جمع مکسر (ٹوٹی ہوئی جمع) :وہ جمع جس میں اس کے واحد کا صیغہ سلامت نہ رہے، بلکہ اس میں کوئی لفظی تبدیلی (حروف کی کمی، زیادتی یا حرکات کی تبدیلی) واقع ہو۔

پھر مصنفؒ جمع صحیح کی مزید دو قسمیں بیان کرتے ہیں: جمع مذکر سالم :جو مذکر کے لیے ہو، جیسے "مُسْلِمٌ" سے "مُسْلِمُوْنَ"۔

جمع مؤنث سالم :جو مؤنث کے لیے ہو، جیسے "مُسْلِمَةٌ" سے "مُسْلِمَاتٌ"۔ ان کی تفصیل مصنفؒ آگے بیان فرمائیں گے۔

[جمع المذكر السالم]:

المذكّر :ما لحق آخره واو مضموم ما قبلها، أو ياء مكسور ما قبلها، ونون مفتوحة؛ ليدلّ على أنّ معه أكثر منه. فإن كان آخره ياء قبلها كسرة حذفت، مثل :(قاضون). وإن كان آخره مقصورا حذفت الألف وبقي ما قبلها مفتوحا، مثل: (مصطفون) و(مصطفين). وشرطه إن كان اسما فمذكّر علم يعقل. وإن كان صفة فمذكّر يعقل، وأن لا يكون أفعل فعلاء، مثل (أحمر) (حمراء)، ولا فعلان فعلى مثل (سكران) (سكرى)، ولا مستويا فيه مع المؤنّث مثل (جريح) و(صبور)، ولا بتاء التّأنيث مثل (علامة). وتحذف نونه بالإضافة. وقد شذّ نحو (سنين) و(أرضين).

ترجمہ: "[جمع مذکر سالم]: (جمع) مذکر (سالم) :وہ (اسم) ہے جس کے آخر میں ایسی واو جس کا ما قبل مضموم ہو، یا ایسی یاء جس کا ما قبل مکسور ہو، اور ایک نونِ مفتوح کا اضافہ کیا جائے؛ تاکہ وہ اس بات پر دلالت کرے کہ اس کے ساتھ اس (واحد) سے زیادہ افراد موجود ہیں، پس اگر اس (اسم) کے آخر میں ایسی یاء ہو جس سے پہلے کسرہ ہو تو وہ حذف ہو جائے گی، جیسے :(قَاضُوْنَ)۔ اور اگر اس کا آخر مقصور ہو تو الف حذف ہو جائے گا اور اس کا ما قبل مفتوح ہی رہے گا، جیسے :(مُصْطَفَوْنَ) اور (مُصْطَفَيْنَ)، اور اس کی شرط یہ ہے کہ اگر وہ اسم ہو تو مذکر، عَلَم (نام) اور عاقل ہو۔ اور اگر صفت ہو تو (اس کا موصوف) مذکر، عاقل ہو، اور یہ کہ وہ 'أَفْعَل فَعْلَاء' کے وزن پر نہ ہو، جیسے (أَحْمَر حَمْرَاء)، اور نہ 'فَعْلَان فَعْلَى' کے وزن پر ہو جیسے (سَكْرَان سَكْرَى)، اور نہ وہ (صفت) ہو جو مذکر و مؤنث میں برابر استعمال ہوتی ہو جیسے (جَرِيْح) اور (صَبُوْر)، اور نہ اس میں تاءِ تانیث ہو جیسے (عَلَّامَة)، اور اضافت کی وجہ سے اس کا نون حذف ہو جاتا ہے۔ اور (سنين) اور (أرضين) جیسی مثالیں شاذ (خلافِ قیاس)

آئی ہیں۔

"تشریح:

جمع مذکر سالم کی تعریف

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ جمع کی اقسام میں سے پہلی قسم، جمع مذکر سالم، کی تعریف اور اس کے قواعد بیان فرمار ہے ہیں۔

قولہ :(المذكر :ما لحق آخره واو مضموم ما قبلها...) مصنفؒ جمع مذکر سالم کی لفظی بناوٹ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ اسم ہے جس کے آخر میں کچھ حروف کا اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ جمع بن جائے۔ یہ اضافہ اعراب کی مختلف حالتوں میں مختلف ہوتا ہے: حالتِ رفع میں: اسم کے آخر میں واو ساکن ما قبل مضموم (ُو) اور نونِ مفتوح (نَ) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے "مُسْلِمٌ" سے "مُسْلِمُوْنَ"۔ حالتِ نصب و جر میں: اسم کے آخر میں یاء ساکن ما قبل مکسور (ِی) اور نونِ مفتوح (نَ) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے "مُسْلِمٌ" سے "مُسْلِمِیْنَ"۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تثنیہ اور جمع مذکر سالم دونوں کے نون اور یاء میں فرق ہے: تثنیہ کا نون مکسور (نِ) ہوتا ہے، جبکہ جمع کا نون مفتوح (نَ) ہوتا ہے۔ تثنیہ کی یاء سے پہلے فتحہ (زبر) ہوتی ہے (َیْنِ)، جبکہ جمع کی یاء سے پہلے کسرہ (زیر) ہوتی ہے (ِیْنَ)۔

قولہ :(ليدلّ على أنّ معه أكثر منه)

یہاں مصنفؒ اس جمع کا معنوی مقصد بیان فرمار ہے ہیں کہ یہ اضافہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ یہ لفظ دو سے زیادہ افراد پر دلالت کرے۔

اسم منقوص اور اسم مقصور سے جمع بنانے کا قاعدہ

مصنفؒ اب ان اسماء سے جمع مذکر سالم بنانے کا قاعدہ بیان فرمار ہے ہیں جن کے آخر میں حرفِ علت ہو۔

.1 اسمِ منقوص کا قاعدہ:

قولہ :(فإن كان آخره ياء قبلها كسرة حذفت)

اسمِ منقوص وہ اسم ہے جس کے آخر میں یاءِ لازمہ ما قبل مکسور ہو، جیسے "اَلْقَاضِیْ"۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب ایسے اسم کی جمع مذکر سالم بنائی جائے گی تو اس کی آخری یاء کو حذف کر دیا جائے گا اور اس سے پہلے والے حرف کو واو کی مناسبت سے ضمہ (پیش) دیا جائے گا۔ مثال: "قَاضِیْ" + "وْنَ" "قَاضِیُوْنَ" آخری یاء حذف ہوئی "قَاضُوْنَ"۔ حالتِ نصب و جر میں "قَاضِیِیْنَ" سے یاء حذف ہو کر "قَاضِیْنَ" رہ جائے گا۔

.2 اسمِ مقصور کا قاعدہ:

قولہ :(وإن كان آخره مقصورا حذفت الألف وبقي ما قبلها مفتوحا)

اسمِ مقصور وہ اسم ہے جس کے آخر میں الفِ لازمہ ہو، جیسے "مُصْطَفٰی"۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب ایسے اسم کی جمع مذکر سالم بنائی جائے گی تو اس کے آخری الف کو حذف کر دیا جائے گا، لیکن اس الف سے پہلے والے حرف کی فتحہ (زبر) کو برقرار رکھا جائے گا

تاکہ یہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہاں سے الف حذف ہوا ہے۔مثال :"مُصْطَفَی" + "وْنَ" الف حذف ہوا "مُصْطَفَوْنَ"۔اسی طرح حالتِ نصب وجر میں "مُصْطَفَیْنَ"۔"فاء "پر فتحہ دونوں حالتوں میں باقی ہے۔

جمع مذکر سالم کی شرائط

مصنفؒ یہاں ان شرائط کو بیان فرمارہے ہیں جن کا کسی اسم یا صفت میں پایا جانا ضروری ہے تاکہ اس کی جمع مذکر سالم بنائی جا سکے۔

.1 اسم) کے لیے شرائط:

قولہ :(وشرطه إن كان اسما فمذكر علم يعقل)

کسی اسم کی جمع مذکر سالم بنانے کے لیے تین شرطیں ہیں:مذکر ہو :مؤنث نہ ہو، جیسے "زَیْنَبُ"۔عَلَم ہو (کسی کا نام) :اسم نکرہ نہ ہو، جیسے "رَجُلٌ"۔عاقل ہو (انسان) :غیر عاقل نہ ہو، جیسے "حِصَانٌ" (گھوڑا) اگر کسی کا نام بھی ہو۔

مثال :"زَیْدٌ" میں تینوں شرطیں ہیں، للذا اس کی جمع "زَیْدُوْنَ" آئے گی۔

.2 صفت کے لیے شرائط:

قولہ :(وإن كان صفة فمذكر يعقل...)

کسی صفت کی جمع مذکر سالم بنانے کے لیے کچھ مثبت اور کچھ منفی شرطیں ہیں:

مثبت شرائط :وہ صفت کسی مذکر عاقل کے لیے ہو۔ **منفی شرائط** :وہ صفت درج ذیل اوزان پر نہ ہو:**أَفْعَلُ فَعْلَاءُ** :وہ صفت جو رنگ یا عیب پر دلالت کرے، جیسے "أَحْمَرُ" (سرخ) جس کی مؤنث "حَمْرَاءُ" آتی ہے۔اس کی جمع "أَحْمَرُوْنَ" نہیں آتی۔**فَعْلَانُ فَعْلَی** :وہ صفت جو خالی یا بھرے ہونے پر دلالت کرے، جیسے "سَکْرَانُ" (نشے میں دھت) جس کی مؤنث "سَکْرَی" آتی ہے۔اس کی جمع "سَکْرَانُوْنَ" نہیں آتی۔

مذکر و مؤنث میں یکساں :وہ صفت جو مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے بغیر کسی تبدیلی کے استعمال ہو، جیسے "جَرِیْحٌ" (زخمی) اور "صَبُوْرٌ" (صبر کرنے والا)۔کہا جاتا ہے "رَجُلٌ جَرِیْحٌ" اور "اِمْرَأَۃٌ جَرِیْحٌ"۔ان کی جمع سالم نہیں آتی۔

تاءِ تانیث پر مشتمل :وہ صفت جس کے آخر میں تاءِ تانیث ہو، خواہ وہ مذکر کے لیے ہی استعمال ہو، جیسے "عَلَّامَۃٌ" (بہت بڑا عالم)۔اس کی جمع "عَلَّامُوْنَ" نہیں آتی۔

متفرق احکام اور شاذ مثالیں

قولہ :(وتحذف نونه بالإضافة)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ تثنیہ کی طرح جمع مذکر سالم کا نون بھی اضافت کی حالت میں گر جاتا ہے۔

مثال :"مُعَلِّمُوْنَ" (اساتذہ) + "اَلْمَدْرَسَۃِ" (اسکول) "مُعَلِّمُوْ الْمَدْرَسَۃِ" (اسکول کے اساتذہ)۔

قولہ :(وقد شذّ نحو سنين وأرضين)

آخر میں مصنفؒ کچھ ایسی مثالیں بیان کر رہے ہیں جو جمع مذکر سالم کے قواعد پر پوری نہ اترنے کے باوجود اہلِ عرب نے ان کی جمع اسی طرز پر بنائی ہے لیکن وہ شاذ ہے۔

انہیں "ملحق بجمع المذکر السالم" (جمع مذکر سالم کے ساتھ ملائی گئی چیزیں) کہا جاتا ہے۔

سِنِيْنَ : یہ "سَنَةٌ" (سال) کی جمع ہے۔ "سَنَةٌ" مؤنث ہے، اس لیے قاعدے کے مطابق اس کی جمع مذکر سالم نہیں آنی چاہیے تھی۔

أَرَضِيْنَ : یہ "أَرْضٌ" (زمین) کی جمع ہے۔ "أَرْضٌ" غیر عاقل کا اسم جنس ہے، لہٰذا اس کی بھی جمع مذکر سالم نہیں آنی چاہیے تھی۔ یہ الفاظ اور ان جیسے دیگر (مثلاً عِشْرُوْنَ، عَالَمِيْنَ، أَهْلُوْنَ وغیرہ) اعراب میں تو جمع مذکر سالم کی طرح ہیں (حالتِ رفع واو سے اور نصب و جر یاء سے) لیکن ان میں جمع مذکر سالم کی شرائط نہیں پائی جاتیں۔

[جمع المؤنث السالم]:

المؤنّث :ما لحق آخره ألف وتاء. وشرطه إن كان صفة وله مذكّر فأن يكون مذكّره جمع بالواو والنّون، وإن لم يكن له مذكّر فأن لا يكون مجرّدا عن تاء التّأنيث (حائض)، وإلّا جمع مطلقا.

ترجمہ: "[جمع مؤنث سالم]: (جمع) مؤنث (سالم) :وہ (اسم) ہے جس کے آخر میں الف اور تاء کا اضافہ کیا گیا ہو، اور اس کی شرط یہ ہے کہ اگر وہ (اسم) صفت ہو اور اس کا مذکر بھی ہو تو (شرط یہ ہے) کہ اس کے مذکر کی جمع واو اور نون کے ساتھ آتی ہو، اور اگر اس کا کوئی مذکر نہ ہو تو (شرط یہ ہے) کہ وہ تاءِ تانیث سے خالی نہ ہو جیسے (حائض)، ورنہ (ان دو صورتوں کے علاوہ) مطلقاً اس کی جمع (اسی طریقے سے) بنائی جائے گی۔

"تشریح:

جمع مؤنث سالم کی تعریف

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ جمع صحیح کی دوسری قسم، یعنی جمع مؤنث سالم، کی تعریف سے بحث کا آغاز فرما رہے ہیں۔

قولہ :(المؤنّث :ما لحق آخره ألف وتاء) مصنفؒ نہایت اختصار کے ساتھ جمع مؤنث سالم کی لفظی بناوٹ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ جمع ہے جو کسی اسمِ مفرد کے آخر میں الف (ا) اور لمبی تاء (ت) کا اضافہ کرکے بنائی جاتی ہے۔ اس جمع کو "جمع بالف وتاء مزیدتین" بھی کہا جاتا ہے۔ مثال :"مُسْلِمَةٌ" کے آخر سے علامتِ تانیث (ۃ) کو حذف کرکے الف اور تاء کا اضافہ کیا گیا تو یہ "مُسْلِمَاتٌ" بن گیا۔

جمع مؤنث سالم کی شرائط

یہاں مصنفؒ ان شرائط کو ایک انتہائی منطقی اور دقیق انداز میں بیان فرما رہے ہیں کہ کن اسماء و صفات کی جمع مؤنث سالم بنائی جا سکتی ہے۔ آپؒ نے کلام کی بنیاد صفت پر رکھی ہے اور پھر باقی اسماء کو ایک عمومی قاعدے میں شامل کر لیا ہے۔

قولہ :(وشرطه إن كان صفة وله مذكّر فأن يكون مذكّره جمع بالواو والنّون)

پہلی شرط (ایسی صفت جس کا مذکر ہو): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی لفظ صفت ہو اور اس صفت کا مذکر بھی موجود ہو (جیسے "عَالِمَۃٌ" کا مذکر "عَالِمٌ" ہے)، تو اس مؤنث صفت کی جمع مؤنث سالم بنانے کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کے مذکر کی جمع مذکر سالم (واو اور نون کے ساتھ) بنتی ہو۔ مثال (جو شرط پر پوری اترے): "ضَارِبَۃٌ" کی جمع "ضَارِبَاتٌ" بن سکتی ہے، کیونکہ اس کے مذکر "ضَارِبٌ" کی جمع "ضَارِبُوْنَ" آتی ہے۔ مثال (جو شرط پر پوری نہ اترے): "حَمْرَاءُ" (سرخ) کی جمع "حَمْرَاوَاتٌ" نہیں بن سکتی، کیونکہ اس کے مذکر "أَحْمَرُ" کی جمع مذکر سالم "أَحْمَرُوْنَ" نہیں آتی (کیونکہ یہ "أَفْعَلُ فَعْلَاءُ" کے وزن پر ہے جو جمع مذکر سالم کی شرائط کے خلاف ہے)۔

قولہ :(وإن لم يكن له مذكّر فأن لا يكون مجرّدا عن تاء التّأنيث كحائض)

دوسری شرط (ایسی صفت جو صرف مؤنث کے لیے ہو): اب مصنفؒ اس صفت کا حکم بیان فرمارہے ہیں جو صرف مؤنث کے ساتھ خاص ہو اور اس کا کوئی مذکر نہ ہو۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ ایسی صفت کی جمع مؤنث سالم بنانے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اپنے واحد کے صیغے میں تاءِ تانیث (ۃ) سے خالی نہ ہو۔ اگر وہ تاء سے خالی ہوئی تو اس کی جمع مؤنث سالم نہیں بنے گی۔

مثال (جو شرط پر پوری نہ اترے): "حَائِضٌ" (حیض والی عورت)۔ یہ صفت عورت کے ساتھ خاص ہے، لیکن اس کے واحد کے صیغے میں تاء (ۃ) نہیں ہے۔ للذا اس کی جمع "حَائِضَاتٌ" نہیں آئے گی، بلکہ اس کی جمع مکسر "حَوَائِض" آتی ہے۔ اسی طرح "طَالِقٌ" (طلاق والی عورت) کی جمع "طَوَالِقُ" ہے۔

مثال (جو شرط پر پوری اترے): "مُرْضِعَۃٌ" (دودھ پلانے والی)۔ یہ صفت بھی عورت کے ساتھ خاص ہے، لیکن اس کے آخر میں تاء (ۃ) موجود ہے، للذا یہ شرط کے خلاف نہیں ہے۔ اس لیے اس کی جمع "مُرْضِعَاتٌ" آسکتی ہے۔

قولہ :(وإلاّ جمع مطلقا) **عمومی قاعدہ** (باقی تمام صورتیں): آخر میں مصنفؒ نے "وإلّا" کہہ کر ایک جامع اصول بیان فرمادیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر مذکورہ بالا دو ممنوعہ صورتیں (جو صرف صفت سے متعلق تھیں) نہ پائی جائیں، تو باقی تمام اسماء کی جمع مؤنث سالم مطلقاً، یعنی بغیر کسی مزید شرط کے، بنائی جائے گی۔ اس عمومی قاعدے میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں: تمام مؤنث عَلَم (نام) :خواہ ان کے آخر میں تاء ہو یا نہ ہو۔ جیسے :"زَيْنَبُ" سے "زَيْنَبَاتٌ"، "فَاطِمَۃُ" سے "فَاطِمَاتٌ"، "هِنْدٌ" سے "هِنْدَاتٌ"۔ وہ اسم جس کے آخر میں علامتِ تانیث ہو :جیسے "شَجَرَۃٌ" سے "شَجَرَاتٌ"، "صَحْرَاءُ" سے "صَحْرَاوَاتٌ"، "ذِكْرَى" سے "ذِكْرَيَاتٌ"۔ غیر عاقل مذکر کی تصغیر :جیسے "نَهْرٌ" (دریا) کی تصغیر "نُهَيْرٌ" کی جمع "نُهَيْرَاتٌ" آتی ہے۔ وہ تمام صفات جو اوپر بیان کی گئی دو ممنوعہ شرائط میں داخل نہ ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جمع مؤنث سالم کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور مصنفؒ نے صرف ان دو خاص صورتوں کو بیان کیا ہے جہاں یہ جمع نہیں بنتی، اور باقی سب کو ایک عمومی قاعدے کے تحت جائز قرار دیا ہے۔

[جمع التكسير]:

جمع التّكسير :ما تغيّر بناء واحده كـ(رجال) و(أفراس). وجمع القلّة :(أفعل) و(أفعال) و(أفعلة) و(فعلة)، والصّحيح

وما عدا ذلك جمع كثرة.

ترجمہ: "[جمعِ تکسیر]: جمعِ تکسیر وہ (جمع) ہے جس کے واحد کی بناوٹ (صیغہ) بدل گئی ہو، جیسے (رِجَالٌ) اور (اَفْرَاسٌ)، اور جمعِ قلّت کے اوزان یہ ہیں: (أَفْعُلٌ)، (أَفْعَالٌ)، (أَفْعِلَةٌ) اور (فِعْلَةٌ)۔ اور جمعِ صحیح (دونوں قسمیں) اور اس (جمعِ قلّت) کے علاوہ باقی تمام (جمعیں) جمعِ کثرت ہیں۔

"تشریح:

جمعِ تکسیر (مکسر) کی تعریف

مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ جمعِ صحیح کی بحث کے بعد اب جمع کی دوسری قسم، یعنی جمعِ تکسیر (جسے جمع مکسر بھی کہا جاتا ہے)، کی تعریف بیان فرمارہے ہیں۔

قوله :(جمع التّكسير :ما تغيّر بناء واحده)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جمع مکسر وہ جمع ہے جس میں اس کے واحد کا صیغہ اور اس کی اصل بناوٹ سلامت نہ رہے بلکہ "ٹوٹ" جائے، یعنی اس میں کوئی ظاہری تبدیلی واقع ہو جائے۔ اسی وجہ سے اسے "تکسیر" (توڑنے) والی جمع کہا جاتا ہے، جو کہ جمع "سالم" (سلامت) کے برعکس ہے۔ واحد کے صیغے میں یہ تبدیلی چھ طرح کی ہو سکتی ہے: صرف حرکات کی تبدیلی: جیسے "أَسَدٌ" سے "أُسُدٌ"۔ (حروف وہی رہے، صرف حرکات بدل گئیں) حروف کی زیادتی: جیسے "رَجُلٌ" سے "رِجَالٌ"۔ (الف کا اضافہ ہوا) حروف کی کمی: جیسے "تُخَمَةٌ" سے "تُخَمٌ"۔ (آخر سے تاء حذف ہو گئی) حرکات کی تبدیلی اور حروف کی زیادتی: جیسے "سَبَبٌ" سے "أَسْبَابٌ"۔ (حرکات بھی بدلیں اور حروف بھی زیادہ ہوئے) حرکات کی تبدیلی اور حروف کی کمی: جیسے "رَسُوْلٌ" سے "رُسُلٌ"۔ (حرکات بھی بدلیں اور واؤ حذف ہو گیا) حرکات کی تبدیلی اور حروف کی کمی و زیادتی دونوں: جیسے "غُلَامٌ" سے "غِلْمَانٌ"۔ (حرکات بھی بدلیں، الف حذف ہوا اور نون کا اضافہ ہوا) مصنفؒ نے مثال میں "رِجَالٌ" (جو "رَجُلٌ" کی جمع ہے) اور "أَفْرَاسٌ" (جو "فَرَسٌ" کی جمع ہے) پیش کیا ہے، اور ان دونوں میں واحد کی بناوٹ بدل گئی ہے۔

جمعِ تکسیر کی اقسام: جمعِ قلت اور جمعِ کثرت

مصنفؒ اب جمعِ تکسیر کو اس کے معنی اور مدلول (تعداد) کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم فرمارہے ہیں

.1: جمعِ قلت: قوله :(وجمع القلّة :أفعل وأفعال وأفعلة وفعلة)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جمعِ قلّت وہ جمع ہے جو کم تعداد پر دلالت کرے۔ نحویوں کے نزدیک "قلّت" سے مراد تین (۳) سے لے کر دس (۱۰) تک کی تعداد ہے۔ پھر آپؒ نے جمعِ قلّت کے مشہور اور مخصوص چار اوزان بیان فرمائے ہیں۔ جب کوئی جمع مکسر ان اوزان میں سے کسی ایک پر آئے گی تو وہ جمعِ قلّت کہلائے گی: أَفْعُلٌ: جیسے "كَلْبٌ" سے "أَكْلُبٌ" (کچھ کتے)، "نَفْسٌ" سے "أَنْفُسٌ" (کچھ جانیں)۔ أَفْعَالٌ: جیسے "بَابٌ" سے "أَبْوَابٌ" (کچھ دروازے)، "وَقْتٌ" سے "أَوْقَاتٌ" (کچھ اوقات)۔ أَفْعِلَةٌ: جیسے "طَعَامٌ" سے "أَطْعِمَةٌ" (کچھ کھانے)، "عَمُوْدٌ" سے "أَعْمِدَةٌ" (کچھ ستون)۔ فِعْلَةٌ: جیسے "فَتًى"

سے "فِتْيَةٌ" (چند نوجوان)، "أَخٌ" سے "إِخْوَةٌ" (چند بھائی)۔

.2 جمعِ کثرت:

قوله :(والصّحيح وما عدا ذلك جمع كثرة)

مصنفؒ جمع کثرت کی تعریف کرتے ہوئے دو چیزوں کو اس میں شامل فرماتے ہیں۔ "کثرت" سے مراد گیارہ (١١) سے لے کر لامتناہی تعداد تک ہے۔الصّحیح :اس سے مراد جمعِ صحیح کی دونوں قسمیں ہیں، یعنی جمع مذکر سالم اور جمع مؤنث سالم۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ جمع سالم اپنے اصل وضع کے اعتبار سے کثرت (زیادہ تعداد) پر دلالت کرتی ہے، جب تک کوئی قرینہ قلت پر دلالت نہ کرے۔ پس "مُسْلِمُوْنَ" کا اصل معنی "گیارہ یا اس سے زیادہ مسلمان" ہے۔

وماعداذلک :اس سے مراد جمعِ قلت کے مذکورہ بالا چار اوزان کے علاوہ جمع تکسیر کے باقی تمام اوزان ہیں۔ ان کی تعداد بیس سے زیادہ ہے اور وہ سب کثرت پر دلالت کرتے ہیں۔ جمع کثرت کے اوزان کی چند مثالیں:فُعُوْلٌ :جیسے "قَلْبٌ" سے "قُلُوْبٌ" (بہت سے دل)۔فِعَالٌ :جیسے "رَجُلٌ" سے "رِجَالٌ" (بہت سے مرد)۔فُعَلَاءُ :جیسے "عَالِمٌ" سے "عُلَمَاءُ" (بہت سے علماء)۔مَفَاعِلُ :جیسے "مَسْجِدٌ" سے "مَسَاجِدُ" (بہت سی مسجدیں)۔خلاصہ یہ ہوا کہ جمعِ قلت صرف چار مخصوص اوزان تک محدود ہے، جبکہ جمع سالم کی دونوں قسمیں اور جمعِ مکسر کے باقی تمام اوزان کثرت کے معنی کے لیے آتے ہیں۔

[المصدر]:

المصدر :اسم الحدث الجاري على الفعل. وهو من الثّلاثيّ سماع، ومن غيره قياس، مثل :أخرج إخراجا، واستخرج استخراجا. ويعمل عمل فعله ماضيا وغيره، إذا لم يكن مفعولا مطلقا. ولا يتقدّم معموله عليه، ولا يضمر فيه، ولا يلزم ذكر الفاعل. ويجوز إضافته إلى الفاعل، وقد يضاف إلى المفعول. وإعماله باللاّم قليل. فإن كان مفعولا مطلقا فالعمل للفعل، وإن كان بدلا منه فوجهان.

ترجمہ :المصدر :وہ اسم ہے جو فعل پر واقع ہونے والے حدث کا نام ہے۔ وہ ثلاثی افعال سے سماعی (یعنی اہلِ زبان سے سُنا ہوا) ہوتا ہے اور غیر ثلاثی (رباعی، خماسی، سداسی) سے قیاسی (یعنی قاعدے کے مطابق) ہوتا ہے، جیسے :أَخْرَجَ سے إِخْرَاجًا اور اِسْتَخْرَجَ سے اِسْتِخْرَاجًا۔اور مصدر عمل کرتا ہے اپنے فعل کا، خواہ وہ فعل ماضی ہو یا کوئی اور (یعنی مضارع یا امر)، بشرطیکہ وہ مفعول مطلق نہ ہو۔اور اس کا معمول اس سے پہلے نہیں آتا، اور اس میں ضمیر پوشیدہ نہیں کی جاتی، اور اس میں فاعل کا ذکر کرنا لازم نہیں۔اور اس کی فاعل کی طرف اضافت جائز ہے، اور کبھی مفعول کی طرف بھی اس کی اضافت کی جاتی ہے۔اور الف لام کے ساتھ اس کا عمل کرنا بہت کم ہے۔پس اگر مصدر مفعول مطلق ہو تو عمل فعل کا ہوتا ہے، اور اگر وہ فعل کا بدل ہو تو دو صورتیں ہیں۔

تشریح

مصدر کی تعریف

قولہ :اسم الحدث الجاری علی الفعل.

مصنفؒ یہاں مصدر کی تعریف بیان فرمارہے ہیں یہ وہ اسم ہے جو ایسے حدث پر دلالت کرے جو کسی فعل پر جاری ہو۔ یعنی جو فعل کسی خاص معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو، مصدر بھی اس معنی کو ادا کرے۔

تعریف میں تین بنیادی باتیں ہیں:

اسم :مصدر اسم ہوتا ہے، فعل یا حرف نہیں۔ یہ اسے فعل سے ممتاز کرتا ہے کیونکہ فعل زمانے پر بھی دلالت کرتا ہے جبکہ مصدر صرف حدث (کام) پر دلالت کرتا ہے، زمانے پر نہیں۔

الحدث :مصدر کا معنی "حدث" یعنی کام کا نفسِ تصور ہوتا ہے، جیسے الضَّرْبُ (مارنا)، الأَكْلُ (کھانا)۔ یہ اسے دیگر اسماء جامدہ سے الگ کرتا ہے۔

الجاری علی الفعل :

اس قید کا مطلب یہ ہے کہ مصدر کے تمام حروفِ اصلیہ اس کے فعل میں لفظاً یا تقدیراً پائے جاتے ہیں۔ جیسے ضَرَبَ میں ض، ر، اور ب ہیں اور اس کے مصدر ضَرْب میں بھی یہی حروف موجود ہیں۔ یہ قید ان اسماء سے احتراز کے لیے ہے جو حدث کے معنی تو دیتے ہیں لیکن ان کے تمام حروف فعل میں موجود نہیں ہوتے۔

وهو من الثلاثي سماع، ومن غيره قياس، مثل :أخرج إخراجا، واستخرج استخراجا.

مصنفؒ نے یہاں مصدر کی اقسام کو بیان کیا ہے کہ مصدر کے اوزان ثلاثی مجرد سے محفوظ نہیں ہیں بلکہ وہ سماع پر موقوف ہیں۔ امام سیبویہ نے تتبع اور تلاش کرکے بتیس (۳۲) تک اور بعض کے نزدیک تینتیس تک نقل کیے ہیں جو علم الصرف کی کتابوں میں مذکور ہیں اور ثلاثی مجرد کے جو علاوہ ہیں تو اس میں اوزان قیاسی ہیں۔

اس کے برعکس غیر ثلاثی سے مصدر قیاسی ہوتا ہے، یعنی اس کا ایک قاعدہ ہوتا ہے جس کے مطابق مصدر بنایا جاتا ہے۔ جیسے 'أَفْعَلَ' کے وزن پر 'أَفْعَلَ' سے 'إِفْعَالًا'، 'فَعَّلَ' سے 'تَفْعِيلًا' اور 'اسْتَفْعَلَ' سے 'إِسْتِفْعَالًا'۔ مصنفؒ نے دو مثالیں دی ہیں 'أَخْرَجَ' (غیر ثلاثی) سے 'إِخْرَاجًا' اور 'إِسْتَخْرَجَ' (غیر ثلاثی) سے 'إِسْتِخْرَاجًا'، اسی طرح دوسرے اوزان کو ان پر قیاس کرلیں۔

ويعمل عمل فعله ماضيا وغيره إذا لم يكن مفعولا مطلقا.

یہاں سے صاحبِ کتاب نے مصدر کے عمل کو بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ مصدر اگر مفعول مطلق نہ ہو تو اپنے فعل جیسا عمل کرے گا یعنی اگر مصدر لازم ہو تو جس طرح فعل لازم اپنے فاعل کو رفع دیتا ہے اسی طرح مصدر بھی اپنے فاعل کو رفع دے گا جیسے أَعْجَبَنِي قِيَامٌ زَيْدٌ اس کو بغیر اضافت کے مصدر کو قِيَامٌ اور فاعل کو زَيْدٌ پڑھ سکتے ہیں، دونوں کو مرفوع پڑھ سکتے ہیں اور اضافت کے ساتھ قِيَامُ زَيْدٍ پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور فعل اگر متعدی ہو تو مفعول کو نصب دیتا ہے اور فاعل کو رفع دیتا ہے تو مصدر اگر متعدی ہو تو مصدر بھی فاعل کو

رفع اور مفعول کو نصب دے گا جیسے بغیر اضافت کے جیسے أَعْجَبَنِيْ ضَرْبٌ زَيْدٌ عَمْرًا ۔اور اضافت کے ساتھ جیسے أَعْجَبَنِيْ ضَرْبُ زَيْدٍ عَمْرًا ۔

ولا يتقدّم معموله عليه،ولا يضمر فيه،ولا يلزم ذكر الفاعل.

مصنفؒ نے یہاں مصدر کے عمل کی تین مزید شرائط بیان کی ہیں۔

ولا يتقدم معموله عليه : یہاں سے صاحبِ کتاب اس بات کو بیان فرماتے ہیں کہ مصدر کے معمول کو مصدر پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔چاہے وہ معمول فاعل ہو یا مفعول ہو وجہ یہ ہے کہ مصدر عامل ضعیف ہے اور عامل ضعیف پر معمول کو مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔

تَقْدِیْمِ فاعل کی مِثَال :...أَعْجَبَنِيْ زَيْدٌ ضَرْبٌ عَمْرًا ۔

تَقْدِیْمِ مَفْعُوْل کی مِثَال :...أَعْجَبَنِيْ عَمْرًا ضَرْبٌ زَيْدٌ۔

یاد رکھیں یہ مسلک جمہور ہے۔

علامہ رضی فرماتے ہیں کہ ظروف کے اندر تقدیم جائز ہے کیونکہ ظروف میں وسعت ہوتی ہے

ولا يضمر فيه : مصدر میں کوئی ضمیر پوشیدہ نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اسم ہے اور اسم میں ضمیر کا چھپنا شاذ و نادر ہوتا ہے، فعل کی طرح ضمیر کا اسم میں ہونا عام نہیں ہے۔

ولا يلزم ذكر الفاعل : فاعل کا ذکر کرنا ضروری نہیں، بلکہ فاعل کو حذف کرکے مصدر کو مفعول کی طرف بھی مضاف کیا جاسکتا ہے۔

ويجوز إضافته إلى الفاعل،وقد يضاف إلى المفعول.

یہاں سے صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف بھی جائز ہے اور مفعول کی طرف بھی جائز ہے۔ایسی صورت میں اگر فاعل کی طرف اضافت ہو تو فاعل لفظاً مجرور ہوگا اور معنًا مرفوع ہوگا۔

فاعل کی طرف اضافت کی مثال :... كَرِهْتُ ضَرْبَ زَيْدٍ عَمْرًا ۔

اس مثال میں ضَرب مصدر جو ہے اس کی اضافت ہے زیدٌ کی جو اس کا فاعل ہے۔

مفعول کی طرف اضافت کی مثال :... كَرِهْتُ ضَرْبَ عَمْرٍو زَيْدٌ ۔

یہ تو اس کی مثال ہے جہاں مصدر کا فاعل اور مفعول بہ مذکور ہو اور اگر ایسی کوئی صورت ہو جس میں مصدر کا مفعول بہ تو مذکور ہو لیکن فاعل مذکور نہ ہو تو وہاں پر بھی اضافت جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ

انسان خیر طلب کرنے سے نہیں تھکتا اس مثال میں جو دُعَاءِ ہے یہ مصدر ہے اور اس کی اضافت ہوئی ہے الخَیرِ مصدر کی طرف۔

گویا عامل بنتا ہے اضافت کے ساتھ بھی اور بغیر اضافت کے بھی۔ اضافت کے ساتھ ہوگا تو فاعل لفظاً مجرور ہوگا اور معناً مرفوع ہو اور اگر مفعول مذکور ہو تو وہ منصوب ہوگا اور اگر اضافت مفعول لہ کی طرف ہو تو مفعول بہ لفظاً مجرور ہوگا اور معناً منصوب اور اگر مصدر بغیر اضافت کے استعمال ہو تو فاعل لفظاً اور معناً مرفوع ہوگا اور اگر مفعول بہ مذکور ہوگا تو وہ بھی لفظاً اور معناً منصوب ہو گا۔

فإن كان مفعولا مطلقا فالعمل للفعل، وإن كان بدلا منه فوجهان.

مصنفؒ یہ آخری دو صورتیں بیان فرماتے ہیں:

فإن كان مفعولا مطلقا فالعمل للفعل:

یہاں سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو بیان فرماتے ہیں کہ اگر مصدر مفعول مطلق واقع ہو تو عمل فعل ہی کرے گا مصدر نہیں کرے گا جو مصدر سے پہلے فعل ہے وہی فعل عمل کرے گا جیسے "ضَرَبْتُ ضَرْبًا عَمْرًوا" تو اس مثال میں جو "ضَرْبًا" ہے یہ مصدر ہے اور مفعول مطلق ہے اور آگے جو "عَمْرًوا" ہے یہ منصوب ہے پیچھے والے "ضَرَبْتُ" فعل کی وجہ سے "ضَرْبًا" کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ "ضَرْبًا" خود منصوب ہے "ضَرَبْتُ" فعل کی وجہ سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل عامل قوی ہے جب قوی موجود ہو تو پھر عامل ضعیف عمل نہیں کرتا۔

وإن كان بدلا منه فوجهان: اگر مصدر اپنے فعل کا بدل ہو تو اس میں دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ عمل کرے اور دوسری یہ کہ وہ عمل نہ کرے۔ مثال کے طور پر 'حمدا لله'، 'شكرا لله' حمدا اور شکرا فعل کا بدل ہے، اس میں عمل کرنے کا بھی احتمال ہے اور نہ کرنے کا بھی۔

[اسم الفاعل]:

اسم الفاعل: ما اشتق من فعل لمن قام به بمعنى الحدوث. وصيغته من الثلاثي المجرد على فاعل، ومن غير الثلاثي على صيغة المضارع بميم مضمومة وكسر ما قبل الآخر، مثل: (مخرج)، و(مستخرج). ويعمل عمل فعله بشرط معنى الحال أو الاستقبال، والاعتماد على صاحبه أو الهمزة أو (ما). فإن كان للماضي وجبت الإضافة معنى، خلافا للكسائي. فإن كان له معمول آخر فبفعل مقدر، نحو (زيد معطي عمرو درهما أمس)، فإن دخلت اللام استوى الجميع. وما وضع منه للمبالغة ك(ضرّاب)، و(ضروب)، و(مضراب)، و(عليم)، و(حذر) مثله. والمثنى والمجموع مثله. ويجوز حذف النون مع العمل والتعريف تخفيفا.

ترجمہ: [اسم الفاعل] اسم الفاعل: وہ اسم ہے جو ایسے فعل سے مشتق ہو جو اُس ذات پر دلالت کرے جس کے ساتھ وہ (فعل) بمعنی الحدوث قائم ہو۔ اور اس کا صیغہ ثلاثی مجرد سے 'فَاعِلٌ' کے وزن پر آتا ہے، اور غیر ثلاثی سے مضارع کے صیغے پر، میم مضمومہ (مُ) اور ما قبل آخر (آخری حرف سے پہلے والے حرف) پر کسرہ (زیر) کے ساتھ آتا ہے، جیسے: مُخْرِجٌ اور مُسْتَخْرِجٌ۔ اور یہ اپنے فعل والا عمل کرتا ہے حال یا استقبال کے معنی کی شرط کے ساتھ، اور اپنے صاحب (موصوف/مبتدا وغیرہ)، ہمزہ استفہام، یا 'ما'

نافیہ پر اعتماد کرنے کی شرط کے ساتھ۔ پس اگر یہ ماضی کے معنی میں ہو تو معنوی طور پر اضافت واجب ہو گی، امام کسائیؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ پس اگر اس کا کوئی دوسرا معمول بھی ہو تو وہ ایک مقدر فعل کی وجہ سے ہوگا، جیسے :زَيْدٌ مُعْطِي عَمْرٍو دِرْهَمًا أَمْسِ۔ پس اگر (اس پر) لامِ تعریف داخل ہو جائے تو سب (زمانے) برابر ہو جاتے ہیں۔ اور اس (اسم فاعل) میں سے جو صیغے مبالغہ کے لیے وضع کیے گئے ہیں، جیسے ضَرَّابٌ، ضَرُوبٌ، مِضْرَابٌ، عَلِيمٌ، اور حَذِرٌ، وہ بھی اسی کی طرح ہیں۔ اور تثنیہ و جمع بھی اسی کی طرح ہیں۔ اور عمل اور معرفہ ہونے کے باوجود تخفیف (آسانی) کے لیے نون (تثنیہ و جمع کا) حذف کرنا جائز ہے۔

تشریح:

اسم فاعل کی تعریف:

اسم الفاعل :ما اشتقّ من فعل لمن قام به بمعنى الحدوث. یعنی اسم فاعل وہ اسم ہے جو فعل سے مشتق ہو تاکہ دلالت کرے اس ذات پر کہ فعل بطور حدوث اس کے ساتھ قائم ہو۔

فوائد و قیود:

مصنفؒ یہاں اسم فاعل کی جامع تعریف بیان فرمارہے ہیں۔ ما اشتقّ من فعل (جو فعل سے مشتق ہو) :یہ قید اسم فاعل کے مشتق ہونے کو ظاہر کرتی ہے، یعنی یہ کسی فعل سے نکلا ہے۔ یہ اسے اسم جامد سے الگ کرتی ہے۔ لمن قام به (اس ذات کے لیے جس کے ساتھ وہ قائم ہو) :یہ حصہ واضح کرتا ہے کہ اسم فاعل اس ذات کو بتاتا ہے جس نے کام کیا ہے یا جس سے کام صادر ہوا ہے۔ جیسے ضَارِبٌ (مارنے والا)۔

بمعنى الحدوث (حدوث کے معنی میں) :یہ تعریف کی سب سے اہم قید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم فاعل اُس ذات پر دلالت کرتا ہے جس کے ساتھ کام عارضی طور پر اور نئے سرے سے قائم ہو۔ یہ قید اسم فاعل کو "صفتِ مشبہ" سے ممتاز کرتی ہے، کیونکہ صفتِ مشبہ میں کام کا معنی ثبوت اور دوام کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر :زیدٌ ضاربٌ کا مطلب ہے زید مارنے کا کام کر رہا ہے (عارضی طور پر)۔ جبکہ زیدٌ حسنٌ کا مطلب ہے زید کی ذات میں حُسن ثابت اور دائمی ہے۔

صاحبِ کتاب نے انتہائی عمیق طریقے سے ایک اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اختلاف :یہ ہے کہ آیا اشیآء فعل سے مشتق ہیں یا مصدر سے؟ تو اس میں بصریین کا مذہب یہ ہے کہ اشیاء مشتق ہوتی ہیں فعل سے اور کوفیین کہتے ہیں کہ یہ مشتق ہوتی ہیں اسم سے یعنی مصدر سے۔

تو صاحبِ کتاب نے اسم فاعل میں فرمایا اِسْمٌ مُشْتَقٌّ مِنْ فِعْلٍ اس سے بصریین کے مذہب کو راجح قرار دیا کہ میرے نزدیک وہ مذہب راجح ہے کہ اشیاء مشتق ہوتی ہیں فعل سے مصدر سے مشتق نہیں ہوتیں۔

قوله :وصيغته من الثّلاثيّ المجرّد على فاعل، ومن غير الثّلاثيّ على صيغة المضارع.

مصنفؒ اسم فاعل بنانے کا قاعدہ بیان فرمارہے ہیں ثلاثی مجرد سے :تین حرفی فعل سے یہ ہمیشہ فَاعِلٌ کے وزن پر آتا ہے۔ جیسے

ضَرَبَ سے ضَارِبٌ، نَصَرَ سے نَاصِرٌ۔

غیر ثلاثی سے ثلاثی مزید فیہ اور رباعی ابواب سے اسے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس فعل کے مضارع معروف کے صیغے میں علامتِ مضارع (ی) کو ہٹا کر میم مضمومہ (مُ) لگا دیں اور آخری حرف سے پہلے والے حرف کو کسرہ (زیر) دے دیں۔ مثالیں: أَكْرَمَ سے مضارع يُكْرِمُ، پھر اسم فاعل مُكْرِمٌ۔ اِسْتَخْرَجَ سے مضارع يَسْتَخْرِجُ، پھر اسم فاعل مُسْتَخْرِجٌ۔

قولہ :ویعمل عمل فعلہ بشرط معنی الحال أو الاستقبال، والاعتماد...

مصنفؒ یہاں اسم فاعل کے عمل کرنے کی شرائط بیان کر رہے ہیں۔

یاد رکھیں اسم فاعل کے عمل کرنے کے لیے دو شرطیں ہیں:

(۱) پہلی شرط:

اسم فاعل حال یا استقبال کے معنی میں ہو وجہ یہ ہے کہ اسم فاعل عمل کرنے میں مضارع کے مشابہ ہے تو حال یا استقبال کے معنی میں ہو تا کہ مضارع کے ساتھ مشابہت قوی ہو جائے کیونکہ مضارع بھی حال یا استقبال پر دلالت کرتا ہے۔

(۲) دوسری شرط:

یہ ہے کہ وہ اسم فاعل (۶) چھ چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا سہارا لیے ہوئے ہو، وہ چھ چیزیں یہ ہیں: (۱) مبتداء (۲) ذوالحال (۳) موصول (۴) موصوف (۵) ہمزہ استفہام (۶) حرف نفی وجہ یہ ہے کہ اسم فاعل عمل کرنے میں کمزور ہے ان کے ساتھ مل کر قوی بن جائے گا، ان سب کی مثالیں یہ ہیں:

(۱) مبتداء کی مثال: جب اسم فاعل مبتداء پر معتمدہ ہو مبتدا کا سہارا لیے ہوئے ہو جیسے زَيْدٌ قَائِمٌ اَبُوْهُ ۔ (۲) ذوالحال کی مثال: جَآءَ زَيْدٌ قَائِمٌ اَبُوْهُ۔ (۳) موصول کی مثال : مَرَرْتُ بِالضَّارِبِ اَبُوْهُ عَمْرًوا۔ (۴) موصوف کی مثال : عِنْدِيْ رَجُلٌ ضَارِبٌ اَبُوْهُ عَمْرًوا۔

(۵) ہمزہ استفہام کی مثال : اَقَائِمٌ زَيْدٌ (۶) حرف نفی کی مثال : مَا قَائِمٌ زَيْدٌ۔

قولہ :فإن کان للماضی وجبت الإضافۃ معنی

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر اسم فاعل ماضی کے معنی دے (مثلاً جملے میں أمس جیسا لفظ ہو)، تو وہ عمل نہیں کرے گا بلکہ اپنے معمول کی طرف مضاف ہو جائے گا۔ یہ اضافت معنوی ہوتی ہے، یعنی لفظوں میں تنوین یا نونِ اعرابی گر جاتا ہے اور مابعد مجرور ہو جاتا ہے۔ مثال :زیدٌ ضاربُ عمرٍو أمسِ (زید کل عمرو کا مارنے والا تھا)۔ امام کسائیؒ اس کے خلاف ہیں اور وہ ماضی کی صورت میں بھی عمل کے قائل ہیں۔

قولہ :فإن کان لہ معمول آخر فبفعل مقدّر

یہاں ایک سوال کا جواب ہے کہ اگر فعل دو مفعول والا ہو (جیسے أعطی) اور اسم فاعل ماضی کی وجہ سے مضاف ہو جائے تو پہلا مفعول تو مضاف الیہ بن جائے گا، دوسرے مفعول کا کیا ہوگا؟ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ دوسرا مفعول ایک محذوف فعل کی وجہ سے

منصوب ہوگا۔ مثال :زیدٌ معطی عمروٍ درھمًا أمس۔ یہاں معطی مضاف اور عمرو مضاف الیہ ہے (پہلا مفعول)۔ جبکہ درھمًا (دوسرا مفعول) ایک مقدر فعل مثلاً أعطی کی وجہ سے منصوب ہے۔

قولہ :فإن دخلت اللام استوی الجمیع.

:اب صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ یہاں تک جو تفصیل ہم نے آپ کو بتائی یہ اس صورت میں ہے جب اسم فاعل نکرہ ہو اور جب اسم فاعل معرفہ ہو الف لام کے ساتھ یعنی معرف باللام ہو اور الف لام سے مراد وہ الف ہے جو اسم فاعل کے شروع میں ہوتا ہے اور وہ الذی اسم موصول کے معنی میں ہوتا ہے تو پھر اسم فاعل کے عمل کرنے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے چاہے وہ حال یا استقبال کے معنی میں ہو یا نہ ہو موصول کے علاوہ کسی اور پر اعتماد کیے ہوئے نہ ہو ہر صورت میں مابعد والے اسم میں وہ عمل کرے گا جیسے زَیْدٌنِ الضَّارِبُ اَبُوْہُ عَمْرًوا الْاٰنَ اَوْ غَدًا اَوْ اَمْسِ ہر زمانے میں اور ہر حال اسم فاعل عمل کرے گا۔

قولہ :وما وضع منہ للمبالغة...مثلہ.

مصنفؒ فرمارہے ہیں کہ صیغہ مبالغہ بھی عمل کرنے میں اسم فاعل کی طرح ہی ہیں۔ یہ وہ اوزان ہیں جو کام کی کثرت یا شدت بتانے کے لیے آتے ہیں۔ ان کے مشہور اوزان یہ ہیں :فَعَّالٌ (ضرّاب۔ بہت مارنے والا)، فَعُوْلٌ (ضروب)، مِفْعَالٌ (مضراب)، فَعِیْلٌ (علیم۔ بہت جاننے والا)، فَعِلٌ (حذر۔ بہت محتاط)۔ یہ بھی انہی شرائط کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

قولہ :والمثنّی والمجموع مثلہ.

مصنفؒ واضح فرمارہے ہیں کہ اسم فاعل کا تثنیہ اور جمع کا صیغہ بھی واحد کی طرح ہی عمل کرتا ہے۔ جیسے الزیدان ضاربانِ عمرًا اور الزیدون ضاربون عمرًوا۔

ویجوز حذف النّون مع العمل والتّعریف تخفیفا.

مصنفؒ یہاں ایک خاص اور دقیق مسئلہ بیان فرمارہے ہیں جو اسم فاعل کے تثنیہ اور جمع کے ساتھ خاص ہے۔ عام طور پر تثنیہ اور جمع کا نون (-انِ اور -وْنَ والا) اضافت کی وجہ سے گرتا ہے۔ لیکن مصنفؒ فرمارہے ہیں کہ اضافت نہ ہونے کے باوجود بھی اس نون کو صرف تخفیفًا یعنی کلام میں آسانی اور خفت پیدا کرنے کے لیے حذف کرنا جائز ہے، لیکن اس جواز کے لیے دو حالتیں ہیں:

مع العمل (عمل کرنے کی حالت میں) :یعنی اسم فاعل کا تثنیہ یا جمع جب اپنے مفعول میں عمل کررہا ہو تو اس کا نون گرایا جاسکتا ہے۔

مع التعریف (معرف باللام ہونے کی حالت میں) :یعنی جب اسم فاعل کے تثنیہ یا جمع پر الف لام (ال) داخل ہو۔

مسئلے کی وضاحت:عام قاعدہ یہ ہے کہ نونِ اعرابی اضافت کے بغیر حذف نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں مصنفؒ فرمارہے ہیں کہ اسم فاعل کا معاملہ خاص ہے۔ چونکہ یہ فعل کے مشابہ ہوتا ہے اور اس پر الف لام کا داخل ہونا بھی اسے اضافت سے دور کردیتا ہے، اس لیے اہل عرب نے کلام میں روانی اور آسانی کے لیے اس کے نون کو حذف کرنا جائز قرار دیا ہے، اگرچہ اس کے بعد مضاف الیہ نہ بھی ہو۔ قرآن کریم سے مثال :اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :وَالْمُقِیْمِی الصَّلٰوۃِ (سورۃ الحج 35)۔اس کی اصل تھی وَالْمُقِیْمِیْنَ

الصَّلَاۃَ۔ یہاں الْمُقِیْمِیْنَ اسم فاعل (أَقَامَ سے) کی جمع ہے اور معرف باللام ہے۔ اس نے الصَّلَاۃَ کو نصب دیا ہے۔ لیکن یہاں نون کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا اور الْمُقِیْمِي پڑھا گیا، لیکن اہم نکتہ نون کا بغیر اضافت کے حذف ہونا ہے۔ اسی طرح شاعر کے کلام میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے: الحَافِظَا عَوْرَۃِ العَشِیْرَۃِ اصل میں الحَافِظَانِ تھا۔ یہاں بھی معرف باللام اسم فاعل کے تثنیہ سے نون کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے۔ پس خلاصہ یہ ہوا کہ اسم فاعل کا تثنیہ اور جمع عمل کرنے میں واحد کی طرح ہے، اور ان دونوں کے نون کو دو حالتوں میں (جب وہ عامل ہوں یا معرف باللام ہوں) صرف تخفیف کی غرض سے حذف کرنا جائز ہے۔

[اسم المفعول]

اسم المفعول: هو ما اشتقّ من فعل لمن وقع عليه. وصيغته من الثّلاثيّ المجرّد على (مفعول)، كمضروب. ومن غيره على صيغة اسم الفاعل بميم مضمومة وبفتح ما قبل الآخر ك(مستخرج). وأمره في العمل والاشتراط كأمر اسم الفاعل، مثل: (زيد معطى غلامه درهما).

ترجمہ: [اسم المفعول] اسم المفعول: وہ اسم ہے جو ایسے فعل سے مشتق ہو جو اس ذات پر دلالت کرے جس پر وہ (فعل) واقع ہوا ہو۔ اور اس کا صیغہ ثلاثی مجرد سے 'مَفْعُوْلٌ' کے وزن پر آتا ہے، جیسے مَضْرُوْبٌ۔ اور غیر ثلاثی سے اسم فاعل کے صیغے پر، میم مضمومہ (مُ) اور ما قبل آخر پر فتحہ (زبر) کے ساتھ آتا ہے، جیسے مُسْتَخْرَجٌ۔ اور عمل کرنے اور شرائط کے معاملے میں اس کا حکم اسم فاعل جیسا ہی ہے، جیسے: زَيْدٌ مُعْطًى غُلَامُهُ دِرْهَمًا (زید کو اس کا غلام ایک درہم دیا گیا ہے)۔

تشریح

اسم مفعول کی تعریف

قولہ: هو ما اشتقّ من فعل لمن وقع عليه۔ (وہ اسم ہے جو ایسے فعل سے مشتق ہو جو اس ذات پر دلالت کرے جس پر وہ واقع ہوا ہو۔)

مصنفؒ یہاں اسم مفعول کی تعریف بیان فرما رہے ہیں۔ اس تعریف کے دو بنیادی جز ہیں: ما اشتقّ من فعل (جو فعل سے مشتق ہو): یہ قید اسے اسماء جامدہ سے جدا کرتی ہے، اور واضح کرتی ہے کہ اسم مفعول کی بنیاد فعل ہے۔ لمن وقع عليه (اس ذات کے لیے جس پر فعل واقع ہوا ہو): یہ تعریف کا کلیدی حصہ ہے جو اسم مفعول کو اسم فاعل سے ممتاز کرتا ہے۔ اسم فاعل اس ذات پر دلالت کرتا ہے جس نے کام کیا (مَنْ قَامَ بِهِ الْفِعْلُ)، جبکہ اسم مفعول اس ذات پر دلالت کرتا ہے جس پر کام کیا گیا۔ مثال کے طور پر زَيْدٌ ضَارِبٌ عَمْرًوا مَضْرُوْبٌ میں ضَارِبٌ (مارنے والا) زید ہے اور مَضْرُوْبٌ (جسے مارا گیا) عمرو ہے۔ پس اسم مفعول ہمیشہ فعلِ مجہول کے معنی دیتا ہے۔

قولہ: وصيغته من الثّلاثيّ المجرّد على (مفعول)، ومن غيره على صيغة اسم الفاعل.

یہاں مصنفؒ اسم مفعول کے صیغے بنانے کا قاعدہ بیان فرما رہے ہیں:

من الثلاثي المجرد (تین حرفی فعل سے) :ثلاثی مجرد فعل سے اسم مفعول کا صیغہ ہمیشہ **مَفْعُوْلٌ** کے وزن پر آتا ہے۔ یہ قاعدہ کلی ہے۔ مثالیں :**مَضْرُوْبٌ** (مارا ہوا)، **مَنْصُوْرٌ** (مدد کیا ہوا)، **مَفْتُوْحٌ** (کھولا ہوا)۔

من غیرہ (غیر ثلاثی سے) :غیر ثلاثی ابواب (ثلاثی مزید فیہ اور رباعی) سے اسم مفعول بنانے کا طریقہ وہی ہے جو اسم فاعل کا ہے، صرف ایک معمولی مگر اہم فرق کے ساتھ۔ طریقہ یہ ہے کہ اس فعل کے مضارع مجہول کے صیغے میں علامتِ مضارع کو ہٹا کر میم مضمومہ (مُ) لگا دیں اور آخری حرف سے پہلے والے حرف کو فتحہ (زبر) دے دیں۔ مصنفؒ نے اسے اسم فاعل کے صیغے سے تشبیہ دی ہے کہ دونوں کی ابتدا میم مضمومہ سے ہوتی ہے، فرق صرف ما قبل آخر کی حرکت کا ہے :اسم فاعل میں کسرہ (زیر) اور اسم مفعول میں فتحہ (زبر)۔ مثال :**اِسْتَخْرَجَ** (نکالنا) سے اسم فاعل **مُسْتَخْرِجٌ** (نکالنے والا) ہے جبکہ اسم مفعول **مُسْتَخْرَجٌ** (نکالی ہوئی چیز) ہے۔

قولہ :وأمرہ فی العمل والاشتراط کأمر اسم الفاعل

مصنفؒ یہاں نہایت جامع انداز میں اسم مفعول کے عمل کا قاعدہ بیان فرما رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسم مفعول کا عمل اور اس کی شرائط وہی ہیں جو اسم فاعل کے لیے بیان کی گئی ہیں، یعنی :شرائط :اسم مفعول بھی اس وقت عمل کرے گا جب وہ حال یا استقبال کے معنی میں ہو اور کسی چیز پر اعتماد کر رہا ہو (مثلاً مبتدا، موصوف، ہمزہ استفہام یا مانافیہ پر)۔ اور اگر اس پر الف لام (ال) داخل ہو جائے تو یہ تمام شرائط ختم ہو جاتی ہیں اور وہ مطلقاً عمل کرتا ہے۔ عمل :فرق صرف عمل کی کیفیت کا ہے۔ چونکہ اسم مفعول فعلِ مجہول کے معنی میں ہوتا ہے، اس لیے وہ فعلِ مجہول والا عمل کرتا ہے، یعنی اپنے بعد آنے والے اسم کو نائب فاعل ہونے کی بنا پر رفع دیتا ہے۔ مثال :**أَمَضْرُوْبٌ زَیْدٌ**؟ (کیا زید مارا گیا ہے؟)۔ یہاں **مَضْرُوْبٌ** نے **زَیْدٌ** کو نائب فاعل ہونے کی بنا پر رفع دیا ہے۔

قولہ :مثل :(زید معطی غلامہ درھما).

مصنفؒ نے یہاں ایک ایسی مثال پیش کی ہے جو دو مفعول والے فعل سے بنی ہے تاکہ اسم مفعول کے عمل کو مکمل طور پر واضح کیا جا سکے۔ فعل :یہ مثال فعل أَعْطٰی (دینا) سے ہے جو دو مفعول چاہتا ہے :**أَعْطٰی خَالِدٌ زَیْدًا دِرْھَمًا** (خالد نے زید کو ایک درہم دیا)۔ فعل مجہول :جب اسے مجہول بنائیں گے تو یہ **أُعْطِیَ زَیْدٌ دِرْھَمًا** (زید کو ایک درہم دیا گیا) ہو جائے گا۔ پہلا مفعول (زَیْدٌ) نائب فاعل بن کر مرفوع ہو گیا اور دوسرا مفعول (**دِرْھَمًا**) اپنی حالت یعنی نصب پر باقی رہا۔

اسم مفعول کا عمل :

مصنف کی مثال **زَیْدٌ مُعْطًی غُلَامُهٗ دِرْھَمًا** (زید ایسا شخص ہے جسے اس کا غلام ایک درہم دیا گیا ہے) میں **مُعْطًی** (اسم مفعول) نے بالکل یہی فعل مجہول والا عمل کیا ہے :**غُلَامُهٗ** :یہ اس کا نائب فاعل ہے اور مرفوع ہے۔ **دِرْھَمًا** :یہ اس کا مفعول بہ ثانی ہے اور منصوب ہے۔ **زَیْدٌ** :یہ مبتدا ہے جس پر **مُعْطًی** خبر بن کر اعتماد کر رہا ہے اور عمل کر رہا ہے۔ اس مثال سے مصنفؒ نے یہ واضح کر دیا کہ اسم مفعول کا عمل صرف ایک معمول تک محدود نہیں، بلکہ اگر اس کا فعل متعدی بہ دو مفعول ہو تو وہ بھی اسی طرح

عمل کرے گا۔

[الصفة المشبهة]:

الصّفة المشبّهة :ما اشتقّ من فعل لازم لمن قام به على معنى الثّبوت. وصيغتها مخالفة لصيغة اسم الفاعل على حسب السماع ك(حسن) و(صعب) و(شديد). وتعمل عمل فعلها مطلقا. وتقسيم مسائلها أن تكون الصّفة باللّام، أو مجرّدة عنها ومعمولها مضافا أو باللّام أو مجردا عنهما، فهذه ستّة. والمعمول في كلّ واحد منها مرفوع ومنصوب ومجرور، صارت ثمانية عشر. فالرّفع على الفعليّة، والنّصب على التّشبيه بالمفعول في المعرفة وعلى التّمييز في النّكرة، والجرّ على الإضافة.

ترجمہ :الصّفۃ المشبّہۃ :وہ (اسم) ہے جو فعلِ لازم سے اس ذات کے لیے مشتق ہو جس کے ساتھ وہ (فعل) معنی ثبوت پر قائم ہو۔اور اس کا صیغہ سماع کے مطابق اسم فاعل کے صیغے کے خلاف (مختلف) ہوتا ہے، جیسے حَسَنٌ، صَعْبٌ اور شَدِیْدٌ۔اور یہ اپنے فعل والا عمل مطلقاً کرتی ہے۔اور اس کے مسائل کی تقسیم یوں ہے کہ صفت یا تو لامِ تعریف کے ساتھ ہوگی یا اس سے خالی ہوگی، اور اس کا معمول یا تو مضاف ہوگا یا لامِ تعریف کے ساتھ ہوگا یا ان دونوں سے خالی ہوگا۔ پس یہ چھ صورتیں ہوئیں۔اور ان میں سے ہر ایک میں معمول مرفوع، منصوب اور مجرور ہو سکتا ہے، (یوں کل) اٹھارہ صورتیں ہوگئیں۔پس رفع فاعلیت کی بنا پر ہے، اور نصب معرفہ میں تشبیہ بالمفعول کی بنا پر اور نکرہ میں تمیز ہونے کی بنا پر ہے، اور جر اضافت کی بنا پر ہے۔

تشریح:

صفتِ مشبہ کی جامع ومانع تعریف

مصنفؒ یہاں صفتِ مشبہ کی جامع ومانع تعریف فرما رہے ہیں:

قوله :ما اشتقّ من فعل لازم لمن قام به على معنى الثّبوت.

وہ اسم ہے جو فعلِ لازم سے اس ذات کے لیے مشتق ہو جس کے ساتھ وہ معنی ثبوت پر قائم ہو۔)

فوائد وقیود

ما اشتقّ...لمن قام به :یہ حصہ اسم فاعل کے ساتھ مشترک ہے، یعنی یہ بھی فعل سے مشتق ہوتی ہے اور فاعل (ذات) پر دلالت کرتی ہے۔**من فعل لازم** (فعل لازم سے) :یہ پہلی قید ہے جو اسے اسم فاعل سے ممتاز کرتی ہے، کیونکہ اسم فاعل لازم اور متعدی دونوں سے آتا ہے جبکہ صفتِ مشبہ صرف فعل لازم سے بنتی ہے جو افعالِ سجایا (ذاتی کیفیات) اور طبائع پر دلالت کرتے ہیں، جیسے حَسُنَ (خوبصورت ہونا)، کَرُمَ (معزز ہونا)، **على معنى الثّبوت** (ثبوت کے معنی پر) :یہ دوسری اور اہم ترین قید ہے۔اس کا مطلب ہے کہ صفتِ مشبہ جس معنی پر دلالت کرتی ہے وہ ذات کے لیے دائمی اور ثابت ہوتا ہے، عارضی اور حادث (حدوث) نہیں ہوتا۔ یہی وہ نکتہ ہے جو اسے اسم فاعل سے جدا کرتا ہے، کیونکہ اسم فاعل "حدوث" یعنی کام کے وقتی طور پر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ زیدٌ حسنٌ کا مطلب ہے کہ حسن زید کی ذات کا حصہ ہے، جبکہ زیدٌ ضاربٌ کا مطلب ہے کہ وہ مارنے کا کام وقتی طور پر کر رہا ہے۔

صفتِ مشبہ کے اوزان

قولہ :وصیغتہا مخالفۃ لصیغۃ اسم الفاعل علی حسب السماع.

مصنفؒ فرمارہے ہیں کہ صفتِ مشبہ کے اوزان قیاسی نہیں بلکہ سماعی ہیں، یعنی اہل عرب سے جو سنے گئے ہیں وہی مستعمل ہیں۔ اس کے اکثر اوزان اسم فاعل کے وزن فَاعِلٌ پر نہیں آتے، جیسے :حَسَنٌ، صَعْبٌ (فَعْلٌ کے وزن پر)، شَدِیْدٌ (فَعِیْلٌ کے وزن پر)، شُجَاعٌ، ضَخْمٌ وغیرہ۔

قولہ :وتعمل عمل فعلہا مطلقا.

مصنفؒ کے نزدیک صفتِ مشبہ اپنے فعل (فعل لازم) والا عمل یعنی فاعل کو رفع دینے کا کام مطلقاً کرتی ہے۔ "مطلقاً" کا مطلب ہے کہ اس کے لیے اسم فاعل کی طرح حال یا استقبال کے زمانے یا کسی چیز پر اعتماد کرنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ ماضی، حال، استقبال تینوں زمانوں میں بغیر کسی شرط کے عمل کرتی ہے، کیونکہ یہ ذات کا مستقل وصف بیان کرتی ہے جو کسی زمانے سے مقید نہیں ہوتا۔

ممکنہ عقلی صورتوں کا بیان

قولہ :وتقسیم مسائلہا... صارت ثمانیۃ عشر.

مصنفؒ یہاں صفتِ مشبہ اور اس کے معمول (جس میں وہ عمل کرتی ہے) کی ممکنہ عقلی صورتوں کا بیان فرمارہے ہیں، جو ایک دقیق نحوی تقسیم ہے۔ صفت کی 2 حالتیں :یا تو وہ نکرہ ہوگی (حسنٌ) یا معرفہ باللام (الحسنُ)۔ معمول کی 3 حالتیں :یا تو وہ مضاف الی ضمیر ہوگا (وجہُہ)، یا معرفہ باللام (الوجہ)، یا نکرہ مجردہ (وجہٌ)۔ ان کو آپس میں ضرب دینے سے (6) بنیادی صورتیں بنتی ہیں۔ پھر ہر صورت میں معمول تین اعرابی حالتوں میں آسکتا ہے :مرفوع، منصوب، مجرور۔ اس طرح کل صورتیں (18) ہو جاتی ہیں۔

اعرابی حالتوں کی وجہ

قولہ :فالرّفع علی الفعلیّۃ،والنّصب... والجرّ علی الإضافۃ.

مصنفؒ ان تینوں اعرابی حالتوں کی وجہ بیان فرمارہے ہیں:

الرّفع (پیش) :معمول کو رفع اس بنا پر دیا جاتا ہے کہ وہ صفتِ مشبہ کا فاعل ہے۔ جیسے :زیدٌ حسنٌ وجہُہُ (زید کا چہرہ خوبصورت ہے)۔

النّصب (زبر) :اگر معمول معرفہ ہو تو اسے تشبیہ بالمفعول بہ کی وجہ سے نصب دیا جاتا ہے۔ یعنی صفتِ مشبہ کو فعل متعدی کے مشابہ مان کر اس کے فاعل کو مفعول بنا دیا جاتا ہے۔ اگر معمول نکرہ ہو تو اسے تمییز ہونے کی بنا پر نصب دیا جاتا ہے، جو ذات کی جہت سے ابہام کو دور کرتی ہے۔ جیسے :زیدٌ حسنٌ وجہًا (زید چہرے کے اعتبار سے خوبصورت ہے)۔

الجرّ (زیر) :معمول کو جر اضافت کی وجہ سے دی جاتی ہے۔ یعنی صفت کو معمول کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے :زیدٌ

حسنُ الوجہِ۔

صفت مشبّہ کی آٹھارہ (۱۸) اقسام

وتفصیلھا :(حسن وجھہ) ثلاثۃ، و کذلك (حسن الوجہ)، (حسن وجہ)، (الحسن وجھہ)، (الحسن الوجہ)، (الحسن وجہ). اثنان منھا ممتنعان :(الحسن وجھہ)، (الحسن وجہ). واختلف فی (حسن وجھہ). والبواقی، ما کان فیہ ضمیر واحد أحسن، وما کان فیہ ضمیران حسن، وما لا ضمیر فیہ قبیح. ومتی رفعت بھا فلا ضمیر فیھا، فھی کالفعل، وإلاّ ففیھا ضمیر الموصوف، فتؤنّث وتثنّی وتجمع. واسما الفاعل والمفعول غیر المتعدّیین مثل الصّفۃ فیما ذکر

ترجمہ:اور ان کی تفصیل یہ ہے :حَسَنٌ وَجْهُهُ (تین صورتیں)، اسی طرح حَسَنٌ الْوَجْهَ، حَسَنٌ وَجْهًا، اَلْحَسَنُ وَجْهُهُ، اَلْحَسَنُ الْوَجْهَ، اَلْحَسَنُ وَجْهًا۔ان میں سے دو صورتیں ممتنع (ناممکن) ہیں :اَلْحَسَنُ وَجْهُهُ (جب معمول مضاف ہو) اور اَلْحَسَنُ وَجْهٍ (جب معمول نکرہ مجردہ ہو)۔اور حَسَنٌ وَجْهَهُ (جب صفت نکرہ اور معمول معرف باللام منصوب ہو) میں اختلاف ہے۔اور باقی صورتوں میں، جس میں ایک ضمیر ہو وہ احسن (سب سے بہتر) ہے، جس میں دو ضمیریں ہوں وہ حسن (بہتر) ہے، اور جس میں کوئی ضمیر نہ ہو وہ قبیح (ضعیف) ہے۔اور جب تم اس (صفت) کے ذریعے (معمول کو) رفع دو تو اس میں کوئی ضمیر نہیں ہوتی، پس وہ فعل کی طرح ہوتی ہے۔ ورنہ (نصب اور جر کی حالت میں) اس میں موصوف کی ضمیر ہوتی ہے، پس وہ مؤنث، تثنیہ اور جمع لائی جاتی ہے۔اور اسم فاعل اور اسم مفعول جو (فعل) غیر متعدی سے بنے ہوں، وہ مذکورہ باتوں میں صفتِ مشبہ کی طرح ہیں۔

تشریح:

صفت مشبّہ کی آٹھارہ (۱۸) اقسام

وتفصیلھا :(حسن وجھہ) ثلاثۃ، و کذلك (حسن الوجہ)، (حسن وجہ)، (الحسن وجھہ)، (الحسن الوجہ)، (الحسن وجہ).

اس عبارت میں صاحبِ کتاب نے صفت مشبہ کی اقسام کو بیان فرمایا ہے۔

یہ آٹھارہ (۱۸) اقسام ہیں۔تو اس کو انتہائی مختصر اور سہل طریقے سے آپ یوں سمجھیں کہ اوّلاً صفت مشبّہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱)...صفت مشبہ معرف باللام ہو جیسے اَلْحَسَنُ۔

(۲)...یا غیر معرف باللام ہو جیسے حَسَنٌ۔

تو صفت مسبہ معرف باللام ہو یا غیر معرف باللام ہو دونوں کے معمول کی تین (۳) صورتیں ہیں :(۱) معمول مضاف ہو۔ (۲) معمول معرف باللام ہو۔ (۳) دونوں سے خالی ہو یعنی نہ مضاف ہو نہ معرف باللام ہو۔پھر صفت مشبہ معرف باللام کی تین قسمیں ہیں یا تین صورتیں ہیں:

(۱) :اَلْحَسَنُ وَجْهُهُ۔(۲) :اَلْحَسَنُ وَجْهَهُ۔(۳) اَلْحَسَنُ وَجْهِهٖ

جہاں صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اس کی بھی تین صورتیں ہیں:

(۱) حَسَنُ وَجْھُہٗ۔(۲) حسن وَجْھَہٗ۔(۳) حسن وَجْھِہٖ۔
تو یہ کُل چھ (۶) قسمیں ہو گئیں۔ہر ایک کی پھر تین قسمیں ہیں اعراب کے اعتبار سے (۱) مرفوع (۲) منصوب (۳) مجرور۔ تو چھ (۶) کو تین میں ضرب دیں گے تو یہ کُل ۱۸۔ ۳ + ۶ چھ (۶) ضرب تین (۱۸) اٹھارہ قسمیں ہو جائیں گی یہ اجمال ہے اس کی تفصیل آپ یوں سمجھیں:

(۱۔۳) پہلی دوسری اور تیسری صورت:

صفت مشبہ معرف باللام ہو اور معمول مضاف ہو اور اعراب کے اعتبار سے مرفوع منصوب مجرور ہو جیسے: اَلْحَسَنُ وَجْھُہٗ۔ اَلْحَسَنُ وَجْھَہٗ۔ اَلْحَسَنُ وَجْھِہٖ۔

(۴۔۶) چوتھی پانچویں اور چھٹی صورت:

صفت مشبہ معرف باللام ہو اور معمول بھی معرف باللام ہو اور اعراب کے اعتبار سے مرفوع منصوب مجرور ہو جیسے: اَلْحَسَنُ وَجْہُہٗ۔ اَلْحَسَنُ وَجْہَہٗ۔ اَلْحَسَنُ وَجْہِہٖ۔

(۷۔۹) ساتویں آٹھویں اور نویں صورت:

صفت مشبہ معرف باللام ہو اور معمول اضافت اور تعریف سے خالی ہو یعنی نہ مضاف ہو اور نہ معرف باللام ہو دونوں سے خالی ہو جیسے: اَلْحَسَنُ وَجْہٌ۔ اَلْحَسَنُ وَجْھًا اَلْحَسَنُ وَجْہٍ۔

(۱۰۔۱۲) دسویں گیارہویں بارہویں صورت:

صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور معمول مضاف ہو اور اعراب کے اعتبار سے تینوں صورتیں مرفوع منصوب مجرور جیسے: حَسَنُ وَجْھُہٗ۔ حَسَنٌ وَجْھَہٗ حَسَنٌ وَجْھِہٖ۔

(۱۳۔۱۵) تیرہویں چودہویں پندرہویں صورت:

صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور معمول معرف باللام ہو اور اعراب کے اعتبار سے مرفوع منصوب مجرور ہو جیسے: حَسَنُ الْوَجْہُ۔ حَسَنُ الْوَجْہَ حَسَنُ الْوَجْہِ۔

(۱۶۔۱۸) سولہویں سترہویں اٹھارہویں صورت:

صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور معمول بھی غیر معرف باللام ہو مضاف بھی نہ ہو اور اعراب کے اعتبار سے تینوں صورتیں مرفوع منصوب مجرور ہو جیسے حَسَنٌ وَجْہٌ۔ حَسَنٌ وَجْھًا حَسَنٌ وَجْہٍ۔

صفت مشبہ کی اٹھارہ (۱۸) صورتوں کی پانچ قسمیں ہیں:

اثنان منہا ممتنعان: (الحسن وجھہ)، (الحسن وجہ). واختلف فی (حسن وجھہ). والبواقی، ما کان فیہ ضمیر واحد أحسن،

وما كان فيه ضمير ان حسن، وما لا ضمير فيه قبيح.

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، فرماتے ہیں کہ ممتنع اور حسن وقبح کے اعتبار سے صفت مشبہ کی اٹھارہ (۱۸) صورتوں کی پانچ قسمیں ہیں :(۱) مُمْتَنِعٌ (۲) مُخْتَلِفٌ فِيْهِ (۳) اَحْسَنُ (۴) حَسَنٌ (۵) قَبِيْحٌ :

(۱) ... مُمْتَنِعٌ :

ان اٹھارہ صورتوں میں سے دو صورتیں ہیں :

(۱)... نمبر ایک صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول مجرور ہو اضافت اور الف لام سے خالی ہو جیسے اَلْحَسَنُ وَجْهٍ۔

(۲)... نمبر دو (۲) صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول مضاف مجرور ہو۔ یعنی اضافت ہو جیسے اَلْحَسَنُ وَجْهِهٖ اور ان دونوں صورتوں کے ممتنع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں صفت مشبہ کی اضافت اس کے معمول کی طرف اضافت لفظیہ ہے اور اضافت لفظیہ وہاں جائز ہوتی ہے جہاں اس کا فائدہ ہو اضافت سے تخفیف ہوتی ہے اور یہاں کوئی تخفیف نہیں ہے لہٰذا اضافت اس کے معمول کی طرف جائز نہیں ہے۔

(۲)... مُخْتَلِفٌ فِيْهِ :

اٹھارہ صورتوں میں سے مختلف فیہ صرف ایک ہی صورت ہے کہ جب صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول مضاف مجرور ہو جیسے حَسَنُ وَجْهِهٖ یہ صورت مختلف فیہ اس لیے ہے کہ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ یہ صورت جائز ہی نہیں ہے اس لیے کہ یہاں صفت مشبہ اور اس کے معمول دونوں کا مصداق ایک ہی ہے۔ اضافت الشی الی نفسہ کے قبیل سے ہے اور یہ جائز نہیں ہے اور کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ صورت جائز ہے اس لیے کہ صفت مشبہ اپنے معمول کی نسبت عام ہوتا ہے لہٰذا صفت مشبہ کی اس کے معمول کی طرف اضافت کرنے میں اضافت الشیٔ الی نفسہ لازم نہیں آتا۔

(۳) ... اَحْسَنُ :

وہ صورتیں ہیں جن میں موصوف کی طرف لوٹنے والی ایک ضمیر ہو، خواہ وہ ضمیر صفت مشبہ میں ہو یا اس کے معمول میں ہو اور یہ (۹) نو صورتیں ہیں :

(۱)... صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول بھی معرف باللام ہو منصوب ہو جیسے :اَلْحَسَنُ الْوَجْهَ۔

(۲)... صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول بھی معرف باللام مجرور ہو جیسے :اَلْحَسَنُ الْوَجْهِ۔

(۳)... صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول منصوب ہو اضافت اور لام سے خالی ہو جیسے :اَلْحَسَنُ وَجْهًا۔

(۴)... صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول معرف باللام منصوب ہو جیسے :حَسَنُ الْوَجْهَ۔

(۵)... صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول معرف باللام مجرور ہو جیسے :حَسَنُ الْوَجْهِ۔

(۶)... صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول منصوب ہو اضافت اور لام سے خالی ہو جیسے :حَسَنُ وَجْهًا۔

(۷)... صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول مجرور ہو اضافت اور لام سے خالی ہو جیسے :حَسَنُ وَجْهٍ۔

یہ سات وہ صورتیں ہیں کہ ان صورتوں میں خود صفت مشبہ میں ضمیر ہوتی ہے اس کے معمول میں ضمیر نہیں ہوتی۔

(۸)...صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول مضاف مرفوع ہو جیسے :اَلْحَسَنُ وَجْهُهُ۔

(۹)...صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول مضاف مرفوع ہو جیسے :حَسَنُ وَجْهُهُ۔

ان دونوں صورتوں میں صفت مشبہ میں ضمیر نہیں ہوتی صفت مشبہ کے معمول میں ضمیر ہوتی ہے۔

(۴)...چوتھی قسم حَسَن:

وہ صورتیں ہیں جن میں موصوف کی طرف لوٹنے والی دو (۲) ضمیریں ہوں ایک غیر صفت مشبہ میں ہو اور دوسری ضمیر اس کے معمول میں ہو اور اس کی دو صورتیں ہیں:

۱)... نمبر ایک صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول مضاف منصوب ہو جیسے :اَلْحَسَنُ وَجْهَهُ۔

۲)... نمبر دو صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول مضاف منصوب ہو جیسے :حَسَنٌ وَجْهَهُ۔

(۵)...پانچویں قسم قَبیح:

قبیح وہ صورتیں ہیں جن میں موصوف کی طرف لوٹنے والی ضمیر نہ ہو نہ صفت مشبہ میں نہ اس کے معمول میں اور اس کی (۴) چار صورتیں ہیں:

(۱)... نمبر ایک یہ ہے کہ صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول بھی معرف باللام مرفوع ہو جیسے :اَلْحَسَنُ الْوَجْهُ۔

(۲)... نمبر دو یہ کہ صفت مشبہ معرف باللام ہو اور اس کا معمول بھی مرفوع ہو اضافت اور لام سے خالی ہو جیسے :اَلْحَسَنُ وَجْهٌ۔

(۳)... نمبر تین یہ کہ صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول معرف باللام مرفوع ہو جیسے :حَسَنُ الْوَجْهُ۔

(۴)... نمبر چار صفت مشبہ غیر معرف باللام ہو اور اس کا معمول مرفوع ہو اضافت اور لام سے خالی ہو جیسے :حَسَنٌ وَجْهٌ۔

ومتی رفعت بها فلا ضمیر فیها، فهی کالفعل، وإلاّ ففیها ضمیر الموصوف، فتؤنّث وتثنّی وتجمع۔

یہاں سے صاحب کتاب صفت مشبہ کی طرف لوٹنے والی ضمیر کے متعلق ایک قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ کہاں ہو گی اور کہاں نہیں ہو گی۔

قاعدہ:

یہ ایک نہایت اہم نحوی نکتہ ہے۔جب صفتِ مشبہ اپنے معمول کو فاعل ہونے کی بنا پر رفع دیتی ہے، تو وہ خود فعل کی طرح ہو جاتی ہے اور اس کے اندر موصوف کی طرف لوٹنے والی کوئی ضمیر مستتر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ واحد مذکر رہتی ہے خواہ موصوف تثنیہ، جمع یا مؤنث ہو۔ جیسے :هندٌ حسنٌ وجهُها (یہاں حسنٌ آیا، حسنةٌ نہیں)۔ لیکن جب معمول منصوب یا مجرور ہو، تو صفتِ مشبہ میں موصوف کے مطابق ضمیر مستتر ہوتی ہے اور وہ موصوف کے مطابق تثنیہ، جمع اور تانیث میں تبدیل ہوتی ہے۔ جیسے :هندٌ حسنةُ الوجهِ، الزیدان حسنا الوجهِ۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں صفت مشبہ کو فاعل کی ضرورت ہے اور وہ فاعل یہاں بشکل ضمیر ہی ہو سکتی ہے۔

فائدہ:

یہاں جس موصوف کا ذکر کیا جارہا ہے اس موصوف سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ صفت مشبہ کا معنی قائم ہو چاہے وہ موصوف ہو، مبتداء ہو، ذوالحال ہو کچھ بھی ہو موصوف سے مراد موصوف اصطلاحی نہیں ہے۔

صفت مشبہ کی اٹھارہ صورتوں کا نقشہ بمعہ حکم

	قسم معمول	مثال	اعراب	حکم
صفت مشبہ معرف باللام	معمول مضاف	زَيْدٌ اَلْحَسَنُ وَجْهُهٗ	مرفوع	احسن
▯▯ ▯▯	▯▯▯	▯▯▯وَجْهَهٗ	منصوب	حسن
▯▯	▯▯	وَجْهِهٖ	مجرور	ممتنع
▯▯	معمول معرف باللام	زَيْدٌ اَلْحَسَنُ الْوَجْهُ	مرفوع	قبیح
▯▯	▯▯	الْوَجْهَ	منصوب	احسن
▯▯	▯▯	الْوَجْهِ	مجرور	احسن
▯▯	معمول دونوں سے خالی	زَيْدٌ اَلْحَسَنُ وَجْهٌ	مرفوع	قبیح
▯▯	▯▯	وَجْهًا	منصوب	احسن
▯▯	▯▯	وَجْهٍ	مجرور	ممتنع
صفت مشبہ غیر معرف باللام	معمول مضاف	زَيْدٌ حَسَنٌ وَجْهُهٗ	مرفوع	احسن
▯▯	▯▯	وَجْهَهٗ	منصوب	حسن
▯▯	▯▯	وَجْهِهٖ	مجرور	مختلف فیہ
▯▯	معمول معرف باللام	زَيْدٌ حَسَنٌ الْوَجْهُ	مرفوع	قبیح
▯▯	▯▯	اَلْوَجْهَ	منصوب	احسن
▯▯	▯▯	اَلْوَجْهِ	مجرور	احسن

	معمول دونوں سے خالی	زَیْدٌ حَسَنٌ وَجْهُهٗ	مرفوع	قبیح
		وَجْهًا	منصوب	احسن
		وَجْهٍ	مجرور	احسن

واسما الفاعل والمفعول غیر المتعدّیین مثل الصّفة فیما ذکر.

آخر میں مصنفؒ ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمارہے ہیں کہ فعل لازم سے بننے والا اسم فاعل (جیسے طَاھِرٌ) اور اسم مفعول (جیسے مَذْھُوْبٌ بِہٖ)، جب ثبوت اور دوام کے معنی دیں تو ان کا حکم بھی مذکورہ تمام تفصیلات میں صفتِ مشبہ والا ہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ بھی مطلقاً عمل کرتے ہیں، ان کے معمول کی بھی وہی 18 صورتیں بنتی ہیں اور فصاحت کے درجات بھی وہی ہوتے ہیں۔

[اسم التفضیل]:

اسم التّفضیل :ما اشتقّ من فعل لموصوف بزیادة علی غیرہ،وھو (أفعل). وشرطه أن یبنی من ثلاثیّ مجرّد لیمکن البناء، لیس بلون، ولا عیب، لأنّ منھما (أفعل) لغیرہ مثل (زید أفضل النّاس)، فإن قصد غیرہ توصّل إلیه ب(أشدّ) ونحوہ، مثل :(ھو أشدّ منه استخراجا وبیاضا وعمی). وقیاسه للفاعل، وقد جاء للمفعول نحو :(أعذر) و(ألوم)، و(أشھر) و (أشغل).

ترجمہ؛اسم التّفضیل :وہ (اسم) ہے جو کسی فعل سے ایسے موصوف کے لیے مشتق ہو جو (اس وصف میں) اپنے غیر سے زیادہ ہو، اور وہ أَفْعَلُ (کے وزن پر) ہے۔اور اس کی شرط یہ ہے کہ اسے ثلاثی مجرد سے بنایا جائے تاکہ اس کی ساخت ممکن ہو، (اور وہ فعل) رنگ یا عیب پر دلالت کرنے والا نہ ہو، کیونکہ ان دونوں سے أَفْعَلُ کا صیغہ دوسرے معنی (صفتِ مشبہ) کے لیے آتا ہے۔ جیسے :زَیْدٌ أَفْضَلُ النَّاسِ (زید لوگوں میں سب سے افضل ہے)۔ پس اگر اس (غیر مذکورہ افعال) سے تفضیل کا ارادہ کیا جائے تو اس مقصد کو أَشَدُّ اور اس جیسے (الفاظ) کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے، جیسے :ھُوَ أَشَدُّ مِنْهُ اسْتِخْرَاجًا وَبَیَاضًا وَعَمًی (وہ اس سے نکالنے، سفیدی اور اندھے پن میں زیادہ سخت ہے)۔اور قیاس یہ ہے کہ یہ فاعل کے معنی کے لیے ہو، اور تحقیق یہ مفعول کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسے :أَعْذَرُ (زیادہ معذور)، أَلْوَمُ (زیادہ قابلِ ملامت)، أَشْھَرُ (زیادہ مشہور) اور أَشْغَلُ (زیادہ مصروف)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں اسم تفضیل کی تعریف فرمارہے ہیں

قوله :ما اشتقّ من فعل لموصوف بزیادة علی غیرہ، وھو (أفعل).

وہ اسم ہے جو کسی فعل سے ایسے موصوف کے لیے مشتق ہو جو اپنے غیر سے زیادہ ہو، اور وہ أَفْعَلُ ہے۔)

فوائد و قیود:

صاحب کتاب نے جب فرمایا ما اشتقّ من فعل :تو اس کے ذریعے سے احتراز کیا ان اسماء سے جو مشتق نہیں ہیں اور " من فعل" کی قید سے وہ اسماء خارج ہو گئے جو فعل سے مشتق نہیں ہوتے، اور "لموصوف بزیادة علی غیرہ :" یہ وہ قید ہے جس کے ذریعے سے اسم فاعل اور اسم مفعول اور صفت مشتبہ بھی خارج ہو گئے اور " علی غیرہ" کی قید سے اسم مبالغہ بھی خارج ہو گیا کیونکہ اسم مبالغہ میں بھی اگرچہ معنی کی زیادتی پائی جاتی ہے لیکن وہ غیر کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنے اعتبار سے ہے، جیسے " ضراب" زیادہ مارنے والا یہ غیر کے اعتبار سے نہیں ہے جیسے؛

زیدٌ أفضلُ من عمروٍ میں فضیلت کا وصف زید اور عمرو دونوں میں ہے، لیکن زید میں یہ وصف عمرو سے زیادہ ہے۔

جس میں زیادتی ہو اسے مفضّل اور جس پر زیادتی ہو اسے مفضّل علیہ کہتے ہیں۔ وھو أفعل :مصنفؒ نے اس کا سب سے مشہور اور قیاسی وزن اَفْعَلُ ذکر فرمایا ہے۔

قولہ :وشرطہ أن یبنی من ثلاثیّ مجرّد... لیس بلون، ولا عیب.

اس عبارت میں صاحبِ کتاب اسم تفضیل کے بنانے کے لیے دو شرطیں بیان فرمارہے ہیں:

(۱)... اسم تفضیل کا صیغہ ثلاثی مجرد سے ہو۔

(۲)... یہکہ وہ ثلاثی مجرد لون اور عیب ظاہری سے خالی ہو۔

ثلاثی کے علاوہ سے نہ بننے کی شرط کی وجہ یہ ہے کہ ثلاثی کے علاوہ "اَفْعَل" کا وزن نہیں آتا کیونکہ وزن بنانے کے لیے دو کام کرنے پڑیں گے۔

(۱)... یا تو حروف کو کم کرنا پڑے گا اور ایسا کبھی بھی لفظًا اَفْعَل کے وزن پر نہیں آسکتا۔

(۲)... اور اگر حروف کو کم نہیں کرتے تو پھر بھی وہ افعل کے وزن پر نہیں بن سکتا۔ مثلاً آپ دیکھیں یہ دَحْرَجَ ہے اور اس طریقے سے اَخْرَجَ ہے تو ان دونوں سے آپ اسم تفضیل نہیں بنا سکتے۔

دحرج رباعی ہے اور اخرج ثلاثی مزید ہے۔ الفاظ کو کم کرتے ہیں تو لفظًا اور معنًا دونوں طرح اسم تفضیل نہیں بن سکتا کیونکہ آپ اگر اَخْرَجَ کو اِسْتَخْرَجَ سے بناتے ہیں تو پھر معنی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اس سے مراد زیادہ اخراج ہے یا زیادہ استخراج ہے۔ یعنی زیادہ نکلنا مراد ہے یا زیادہ نکالنا مراد ہے۔ اس وجہ سے یہ شرط ہے کہ ثلاثی مجرد کے علاوہ سے یہ نہیں بن سکتا اور دوسری شرط یہ لگائی کہ یہ اس ثلاثی سے بھی نہیں بن سکتا جس میں لَون اور عیب کے معنی ہوں اگرچہ ثلاثی ہو لیکن لون و عیب کے معنی ہوں تو اس سے بھی اسم تفضیل نہیں بن سکتا۔۔ وجہ یہ ہے کہ جس میں لون اور عیب ظاہری کا معنی ہو وہ وضع کیا گیا ہے صفت کے لیے اور ہم اس سے اسم تفضیل بنائیں گے تو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ بھی یہ صفت ہے یا

اسم تفضیل جیسے اَسْوَدُ، ابیض، احمر، اَعْوَرُ تو یہاں پتہ نہیں چلے گا لیکن ایسا عیب جو ظاہری نہ ہو اس سے اسم تفضیل آسکتا ہے جیسے اَجْھَلَ اور اَبْلَحَ تو یہ ایسے عیوب ہیں جو ظاہری نہیں ہیں باطنی ہیں تو اس سے اسم تفضیل آسکتا ہے۔ شرائط کے پائے جانے کی مثال صاحبِ کتاب کی زَیْدٌ اَفْضَلُ النَّاسِ یہ ایسی مثال ہے کہ جس میں تمام شرائط پائی جارہی ہیں۔

فإن قصد غيره توصّل إليه ب(أشدّ) ونحوه. مثل :(هو أشدّ منه استخراجا وبياضا وعمى).

اس عبارت میں صاحبِ کتاب ثلاثی مجرد کے علاوہ سے افعل کے وزن پر اسم تفضیل بنانے کا طریقہ اسی طرح اس ثلاثی مجرد سے جس میں لون وعیب ظاہری کا معنی ہو اس سے اسم تفضیل بنانے کا طریقہ بیان فرمارہے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ وزن زَائِدٌ عَلَى الثَّلَاثِيْ ہو اور آپ اس سے اسم تفضیل بنانا چاہیں یا ایسے ثلاثی مجرد سے جس میں لون وعیب ظاہری کا معنی ہو اس سے اسم تفضیل بنانا چاہیں تو سب سے پہلے اس کے شروع میں لفظِ (۱) شدت ، (۲) ضعف ، (۳) کثرت (۴) قوت یا (۵) قباحت وغیرہ کے الفاظ لگائیں پھر اس کے بعد اس فعل کا مصدر ذکر کیا جائے جو منصوب ہے تمیز ہونے کی بناء پر۔

صاحب کتاب نے اس کی تین مثالیں دی ہیں:

پہلی مثال ثلاثی مزید فیہ کی ہے اس سے اسم تفضیل کی مثال بنے گی:

هُوَ اَشَدُّ اِسْتِخْرَاجًا اور لون وعیب کی مثال جیسے :هُوَ اَقْوٰی مِنْهُ بیاضا یہ لون کی مثال ہے اور عیب کی مثال یہ ہے جیسے هُوَ اَقْبَحُ عمی عمی اندھے پن کو کہتے ہیں۔اور یہ اسم تفضیل تب بنیں گے جب ان میں جیسے اوپر بیان ہو چکا اشد کا لفظ موجود ہو اسم تفضیل اور اس کے بعد اس فعل کے مصدر کو ذکر کیا جائے جو تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

قوله :وقياسه للفاعل، وقد جاء للمفعول.

مصنفؒ فرمارہے ہیں کہ قیاس اور اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسم تفضیل ہمیشہ فاعل کے معنی میں ہو، یعنی وہ ذات جس نے زیادتی والے وصف کو خود قائم کیا ہو۔ زیدٌ اعلمُ یعنی زید جاننے میں زیادہ ہے۔ لیکن سماعاً اہل عرب سے یہ چند الفاظ مفعول کے معنی میں بھی منقول ہیں، جیسے أَشْهَرُ کا معنی "زیادہ مشہور" ہے، نہ کہ "زیادہ شہرت دینے والا"۔ اسی طرح أَشْغَلُ کا معنی "زیادہ مصروف" ہے، نہ کہ "زیادہ مصروف کرنے والا"، اعذر بمعنی زیادہ معذور

ويستعمل على أحد ثلاثة أوجه: مضافا، أو ب(من)، أو معرّفا باللّام. فلا يجوز (زيد الأفضل من عمرو)، ولا (زيد أفضل) إلّا أن يعلم. فإذا أضيف فله معنيان: أحدهما -وهو الأكثر- أن تقصد به الزّيادة على من أضيف إليه. فيشترط أن يكون منهم، مثل (زيد أفضل النّاس). فلا يجوز (يوسف أحسن إخوته)، لخروجه عنهم بإضافتهم إليه. ويجوز في الأوّل الإفراد والمطابقة لمن هو له. وأمّا الثّاني، والمعرّف باللّام، فلا بدّ من المطابقة. والّذي ب(من) مفرد مذكّر لا غير.

ترجمہ:اور یہ تین طریقوں میں سے کسی ایک پر استعمال ہوتا ہے: مضاف ہو کر، یا مِن کے ساتھ، یا لام تعریف کے ساتھ معرفہ ہو کر۔پس زَيْدٌ الْأَفْضَلُ مِنْ عَمْرٍو کہنا جائز نہیں، اور نہ ہی زَيْدٌ أَفْضَلُ کہنا جائز ہے، مگر یہ کہ (مفضّل علیہ) معلوم ہو۔پس جب یہ مضاف ہو تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں: پہلا-اور یہی اکثر ہے- یہ کہ اس سے اس کی فضیلت مقصود ہو جس کی طرف اسے مضاف کیا گیا ہے، پس شرط یہ ہے کہ وہ (مفضّل) ان (مضاف الیہ) میں سے ایک ہو، جیسے :زَيْدٌ أَفْضَلُ النَّاسِ۔ لہٰذا يُوسُفُ أَحْسَنُ إِخْوَتِهِ کہنا جائز نہیں؛ کیونکہ ان کی طرف مضاف کرنے سے وہ ان سے خارج ہو جاتا ہے۔اور پہلی صورت میں (جب مضاف ہو) اس کا مفرد رہنا اور اس کے مطابق لانا جس کے لیے وہ صفت ہے (مطابقت)، دونوں جائز ہیں۔اور بہر حال

دوسری صورت (جب مضاف ہو اور زیادتی مقصود نہ ہو) اور معرف باللام کی صورت میں مطابقت ضروری ہے۔ اور جو مِن کے ساتھ آئے، وہ ہمیشہ مفرد مذکر ہی رہتا ہے۔

تشریح:

اسم تفضیل کے استعمال کی تین جائز صورتیں

قوله :ويستعمل على أحد ثلاثة أوجه :مضافا، أوب(من)، أومعرّفا باللاّم.

یہاں سے مصنفؒ اسم تفضیل کے استعمال کے مختلف طریقوں اور ان سے متعلق احکام کو نہایت ہی منظم انداز میں بیان فرمارہے ہیں۔

مصنفؒ یہاں اسم تفضیل کے استعمال کی تین مشہور اور جائز صورتیں بیان فرمارہے ہیں :ب

مِن :یعنی اس کے بعد مِن جارّہ اور مفضّل علیہ (جس پر فضیلت دی گئی ہو) کا ذکر ہو۔ جیسے :زَيْدٌ أَفْضَلُ مِنْ عَمْرٍو۔ معرّفاً باللام :یعنی اسم تفضیل پر الف لام داخل ہو۔ جیسے :زَيْدٌ الْأَفْضَلُ۔ مضافاً :یعنی اسم تفضیل کو کسی اسم کی طرف مضاف کر دیا جائے۔ جیسے :زَيْدٌ أَفْضَلُ الْقَوْمِ۔

قوله :فلا يجوز (زيد الأفضل من عمرو)، ولا (زيد أفضل) إلاّ أن يعلم.

یہاں مصنفؒ دو قاعدے بیان فرمارہے ہیں:

پہلا قاعدہ :اسم تفضیل پر ال اور اس کے بعد مِنْ کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ال تعریف کے ذریعے اسم تفضیل کو ایک مطلق اور کامل وصف کا درجہ دیتا ہے، جبکہ مِنْ اسے کسی دوسرے کے مقابلے میں محدود کر کے جزوی فضیلت دیتا ہے۔ یہ دونوں معنی ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا ان کا اجتماع درست نہیں پس زَيْدٌ الْأَفْضَلُ مِنْ عَمْرٍو کہنا جائز نہیں،

دوسرا قاعدہ :اسم تفضیل کو ال، مِنْ یا اضافت کے بغیر، بالکل تنہا استعمال کرنا بھی جائز نہیں، جیسے صرف زَيْدٌ أَفْضَلُ کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفضیل کا مفہوم ہی کسی دوسرے پر برتری کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک مفضّل علیہ (مقابل کا فرد) مذکور یا کم از۔ کم مخاطب کو معلوم نہ ہو، کلام میں ابہام رہ جاتا ہے۔ ہاں، اگر قرینے سے معلوم ہو، جیسے کوئی پوچھے "زید اور عمرو میں سے کون افضل ہے؟" تو جواب میں زَيْدٌ أَفْضَلُ کہنا جائز ہے۔

قوله :فإذا أضيف فله معنيان... أحدهما... أن تقصد به الزّيادة على من أضيف إليه.

یہاں سے مصنفؒ اضافت والی صورت کی دو قسمیں بیان فرمارہے ہیں۔

پہلی اور اکثر استعمال ہونے والی قسم وہ ہے جس میں مفضّل (جسے فضیلت دی گئی) کو مضاف الیہ (پوری جماعت) پر فضیلت دینا مقصود ہو۔ جیسے زَيْدٌ أَفْضَلُ النَّاسِ میں زید کو تمام لوگوں پر فضیلت دی جارہی ہے۔

شرط :مصنفؒ اس کے لیے ایک دقیق شرط بیان فرماتے ہیں کہ مفضّل کا شمار مضاف الیہ میں ہونا ضروری ہے، یعنی وہ اسی جماعت کا ایک فرد ہو۔ زَيْدٌ أَفْضَلُ النَّاسِ میں زید "الناس" کا ہی ایک فرد ہے۔

متنازع مثال :اسی شرط کی بنیاد پر مصنفؒ یُوسُفُ أَحْسَنُ إِخْوَتِهِ (یوسف اپنے بھائیوں میں سب سے حسین ہے) کو نحوی قاعدے کی رو سے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ إِخْوَتِهِ (اس کے بھائی) کہنے سے حضرت یوسف علیہ السلام خود اس جماعت سے خارج ہو جاتے ہیں، حالانکہ شرط یہ ہے کہ وہ اس میں شامل ہوں۔ (واضح رہے کہ یہ ایک خاص نحوی نکتہ نظر ہے؛ جمہور نحویین اور مفسرین قرآنی آیت لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي کی تاویل کی طرح اس کی بھی تاویل کرکے اسے جائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ معنی اور مفہوم واضح ہے)۔

قوله :ويجوز في الأوّل الإفراد والمطابقة... وأمّا الثّاني، والمعرّف باللاّم، فلا بدّ من المطابقة. والذي ب(من) مفرد مذكّر لا غير.

آخر میں مصنفؒ تینوں صورتوں کے کلیدی احکام کو نہایت جامعیت سے بیان فرما رہے ہیں:

جب مِنْ کے ساتھ ہو :اسم تفضیل ہمیشہ واحد، مذکر اور نکرہ رہے گا، خواہ اس کا موصوف (مفضّل) کوئی بھی ہو (تثنیہ، جمع، مؤنث)۔

مثالیں :الزَّيْدَانِ أَفْضَلُ مِنْ عَمْرٍو، الْهِنْدَاتُ أَفْضَلُ مِنْ زَيْدٍ۔

جب ال کے ساتھ ہو :اسم تفضیل کا اپنے موصوف کے ساتھ ہر حالت میں مطابق ہونا واجب ہے (یعنی واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث میں)۔ **مثالیں** :زَيْدٌ الْأَفْضَلُ، الْهِنْدُ الْفُضْلَى، الزَّيْدُونَ الْأَفَاضِلُ۔

جب مضاف ہو :پہلی قسم (جب مفضّل، مضاف الیہ کا حصہ ہو) :اس میں دو صورتیں جائز ہیں: الإفراد :یعنی اسے واحد مذکر ہی رکھا جائے۔

جیسے :الزَّيْدُونَ أَفْضَلُ الْقَوْمِ۔ المطابقة :یعنی اسے موصوف کے مطابق لایا جائے۔ جیسے :الزَّيْدُونَ أَفَاضِلُ الْقَوْمِ۔ دوسری قسم (جب مفضّل، مضاف الیہ کا حصہ نہ ہو، یا محض وصف مراد ہو) :اس صورت میں بھی مطابقت واجب ہے۔

"مسئلة الكحل"

ولا يعمل في مظهر إلاّ إذا كان صفة لشيء وهو في المعنى لمسبّب مفضّل باعتبار الأوّل على نفسه، باعتبار غيره منفيّا. مثل :(ما رأيت رجلا أحسن في عينه الكحل منه في عين زيد)، لأنّه بمعنى حسن، مع أنّهم لو رفعوا الفصلوا بين (أحسن) ومعموله بأجنبيّ وهو (الكحل)، ولك أن تقول :أحسن في عينه الكحل من عين زيد، فإن قدّمت ذكر العين قلت :(ما رأيت كعين زيد أحسن فيها الكحل) مثل:

مررت على وادي السّباع ولا أرى... كوادي السّباع حين يظلم واديا؛ أقلّ به ركب أتوه تئيّة ...وأخوف إلاّ ما وقى الله ساريا

ترجمہ:اور یہ اسم ظاہر میں عمل نہیں کرتا مگر جب وہ کسی چیز کی صفت ہو اور وہ معنوی طور پر ایک ایسے سبب کے لیے ہو جسے پہلے والے کے اعتبار سے خود اسی پر فضیلت دی گئی ہو، دوسرے کے اعتبار سے نفی کے ساتھ۔ جیسے :مَا رَأَيْتُ رَجُلًا أَحْسَنَ فِي

عَيْنِهِ الْكُحْلُ مِنْهُ فِي عَيْنِ زَيْدٍ (میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جس کی آنکھ میں سرمہ اس سے زیادہ اچھا لگتا ہو جتنا زید کی آنکھ میں)؛ کیونکہ یہ حُسْنَ کے معنی میں ہے، باوجود اس کے کہ اگر وہ (کحل کو) رفع دیتے تو أَحْسَنَ اور اس کے معمول کے درمیان ایک اجنبی یعنی الْكُحْل کے ساتھ فاصلہ کر دیتے، اور آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں :أَحْسَنَ فِي عَيْنِهِ الْكُحْلُ مِنْ عَيْنِ زَيْدٍ۔ پس اگر آپ عین کا ذکر پہلے کر دیں تو کہیں گے :مَا رَأَيْتُ كَعَيْنِ زَيْدٍ أَحْسَنَ فِيهَا الْكُحْلُ۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے :میں درندوں کی وادی سے گزرا اور میں نے درندوں کی وادی جیسی کوئی وادی نہیں دیکھی جب وہ تاریک ہو جائے، کہ اس میں آنے والے قافلے کم ٹھہرتے ہوں اور وہ زیادہ خوفناک ہو، سوائے اس کے جس کی اللہ حفاظت کرے۔

تشریح:

"مسئلۃ الکحل"

قولہ :ولا یعمل فی مظهر إلاّ إذا کان صفة لشیء۔

یہاں سے مصنفؒ اسم تفضیل کے عمل کی ایک نہایت ہی خاص اور مستثنیٰ صورت کو بیان فرما رہے ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ اسم تفضیل اپنے اندر موجود ضمیر مستتر کے علاوہ کسی اسم ظاہر کو فاعل ہونے کی بنا پر رفع نہیں دے سکتا۔ لیکن مصنفؒ فرماتے ہیں کہ چند شرائط کے اجتماع کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے، اور اسی کو "مسئلۃ الکحل" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قولہ :ولا یعمل فی مظهر إلاّ إذا کان صفة لشیء وهو فی المعنی لمسبّب مفضّل باعتبار الأوّل علی نفسه باعتبار غیره منفیّا.

مصنفؒ نے یہاں اسم تفضیل کے اسم ظاہر کو رفع دینے کے لیے مجموعی طور پر چار شرائط بیان فرمائی ہیں، جن کا ایک ساتھ پایا جانا ضروری ہے:

أن یکون صفة لشیء (کسی چیز کی صفت ہو) :یعنی اسم تفضیل خود کسی موصوف کی صفت بن کر آ رہا ہو۔

أن یکون لمسبّب (کسی سبب کے لیے ہو) :یعنی اسم تفضیل جس اسم کو رفع دے رہا ہے، وہ اسم معنوی طور پر موصوف کے لیے کسی وصف کے ثبوت کا سبب بن رہا ہو۔

أن یکون مفضّلاً علی نفسه (اسے خود اسی پر فضیلت دی گئی ہو) :یہ سب سے دقیق شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موصوف کو کسی دوسرے شخص پر فضیلت نہیں دی جا رہی، بلکہ موصوف کی ایک حالت کو خود اسی کی دوسری حالت پر فضیلت دی جا رہی ہے۔ یعنی "مفضّل" اور "مفضّل علیہ" معنوی طور پر ایک ہی ذات کے دو مختلف اعتبارات ہوں۔

أن یکون منفیّاً (کلام میں نفی ہو) :یعنی یہ پوری ترکیب نفی، نہی یا استفہام انکاری کے سیاق میں ہو۔

مثال سے ان شرائط کا انطباق:

قولہ :مثل :(ما رأیت رجلا أحسن فی عینه الکحل منه فی عین زید)۔ (مصنف کی مثال :میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جس کی آنکھ میں سرمہ اس سے زیادہ اچھا لگتا ہو جتنا زید کی آنکھ میں۔) آیئے اس مثال پر مذکورہ بالا چاروں شرائط کو

منطبق کرتے ہیں:

صفت ہونا : یہاں أَحْسَنَ، رَجُلًا (موصوف) کی صفت ہے۔ **سبب ہونا** : اَلْکُحْلُ (سرمہ) رَجُلًا کی آنکھ میں حُسن کا سبب ہے۔ یعنی سرمے کی وجہ سے آنکھ حسین لگ رہی ہے۔ **خود پر فضیلت** : یہاں ایک مرد کے حُسن کا مقابلہ کسی دوسرے مرد (مثلاً زید) سے نہیں ہو رہا، بلکہ "رجل کی آنکھ میں سرمے کے حُسن" کا مقابلہ "زید کی آنکھ میں سرمے کے حُسن" سے ہو رہا ہے۔ مِنْهُ میں ہُ کی ضمیر رَجُلًا کی طرف نہیں، بلکہ اَلْکُحْل فِي عَيْنِهِ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تو گویا مقابلہ "ایک حالت کے حُسن" کا "دوسری حالت کے حُسن" سے ہے۔ **نفی کا ہونا** : جملے کی ابتدا مَا نافیہ سے ہو رہی ہے۔ چونکہ اس مثال میں تمام شرائط جمع ہیں، لہٰذا اسم تفضیل أَحْسَنَ کا اپنے فاعل اَلْکُحْلُ کو رفع دینا جائز ہوا۔

مثال کی ترکیب:

مَا رَأَيْتُ رَجُلًا اَحْسَنَ فِي عَيْنِهِ الْكُحْلُ مِنْهُ فِي عَيْنِ زَيْدٍ:

(ترکیب):

ماحرف نفی رأیت فعل ضمیر فاعل رجلًا موصوف احسن اسم تفضیل فی حرف جار عینہ مجرور، جار مجرور مل کر متعلق اوّل الکحل فاعل من حرف جر ھا ضمیر ذوالحال فی حرف جار عین زید مجرور جار مجرور مل کر ثابتًا کے متعلق ہو کر حال، ذوالحال اور حال مل کر مجرور من جار کے لیے جار مجرور مل کر متعلق ثانی، اسم تفضیل اپنے فاعل اور دونوں متعلقوں سے مل کر شبہ جملہ ہو کر صفت رَجُلًا موصوف کی، موصوف صفت سے مل کر مفعول بہ رأیت فعل کے لیے فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ خبیرہ ہوا۔

قولہ :لأنّہ بمعنی حسن.

جواز کی علت

مصنفؒ اس جواز کی علت بیان فرمارہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان شرائط کے ساتھ اسم تفضیل اپنے اصلی معنی (مقابلہ) سے نکل کر محض فعل (حَسُنَ یعنی اچھا ہوا) کے معنی میں ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ فعل کے معنی میں ہوگیا تو اس کا اپنے فاعل (اسمِ ظاہر) کو رفع دینا بھی درست ہوگیا، بالکل اسی طرح جیسے فعل اپنے فاعل کو رفع دیتا ہے۔

قولہ :ولك أن تقول :أحسن في عينه الكحل من عين زيد.

مصنفؒ یہاں ایک جائز صورت بیان فرمارہے ہیں کہ اگر مِنْهُ کی ضمیر لانے کے بجائے مِنْ عَيْنِ زَيْدٍ کہہ دیا جائے تب بھی جائز ہے کیونکہ معنی واضح ہے جیسے أَحْسَنَ فِي عَيْنِهِ الْكُحْلُ مِنْ عَيْنِ زَيْدٍ

قولہ :فإن قدّمت ذكر العين قلت :(ما رأيت كعين زيد أحسن فيها الكحل).

یہاں مصنفؒ ترکیب میں ایک اور تبدیلی کو بیان کر رہے ہیں کہ اگر مفضّل علیہ کو پہلے ذکر کر دیا جائے تو کلام کی صورت یوں ہوگی؛ مَا رَأَيْتُ كَعَيْنِ زَيْدٍ أَحْسَنَ فِيهَا الْكُحْلُ۔)

۔اس مثال میں أَحْسَنَ حال واقع ہو رہا ہے اور اس نے الْكُحْلُ کو رفع دیا ہے، اور اس کی تمام شرائط یہاں بھی تقدیراً موجود ہیں۔

شاہد شعری (شعری دلیل):

قولہ :مررت على وادي السّباع ولا أرى... كوادي السّباع حين يظلم واديا

أقلّ به ركب أتوه تئيّة ...وأخوف إلاّ ما وقى الله ساريا.

میں درندوں کی وادی سے گزرا اور میں نے درندوں کی وادی جیسی کوئی وادی نہیں دیکھی جب وہ تاریک ہو جائے، کہ اس میں آنے والے قافلے کم ٹھہرتے ہوں اور وہ زیادہ خوفناک ہو، سوائے اس کے جس کی اللہ حفاظت کرے۔

مصنفؒ اپنے قاعدے کو مزید پختہ کرنے کے لیے عربی شعر سے دلیل لا رہے ہیں۔

محل استشہاد (دلیل کی جگہ) :أَقَلُّ بِهِ رَكْبٌ وضاحت :یہاں اقَلُّ اسم تفضیل ہے جو وَادِيًا کی صفت ہے۔ اس نے اپنے فاعل رَكْبٌ کو رفع دیا ہے۔ یہاں بھی تمام شرائط پائی جا رہی ہیں: أَقَلُّ، وَادِيًا کی صفت ہے۔ رَكْبٌ کا ٹھہرنا وادی میں قلّتِ مکث (کم ٹھہرنے) کا سبب ہے۔ مقابلہ "اس وادی میں قافلوں کے ٹھہرنے" کا "دوسری وادیوں میں قافلوں کے ٹھہرنے" سے ہے۔ لا أرى کی صورت میں کلام میں نفی موجود ہے۔ للذا، اس شعر سے بھی ثابت ہوا کہ ان مخصوص شرائط کے تحت اسم تفضیل کا اسم ظاہر کو رفع دینا فصیح عربی میں جائز اور مستعمل ہے۔

[الأفعال]

الفعل :ما دلّ على معنى في نفسه مقترن بأحد الأزمنة الثّلاثة. ومن خواصّه دخول (قد)، والسّين، و (سوف)، والجوازم، ولحوق تاء (فعلت)، وتاء التّأنيث ساكنة.

ترجمہ: [افعال] فعل :وہ (کلمہ) ہے جو اپنے آپ میں ایک ایسے معنی پر دلالت کرے جو تین زمانوں (ماضی، حال، استقبال) میں سے کسی ایک کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ اور اس کی خصوصیات میں سے (اپنے شروع میں) قَدْ، س (سین)، سَوْفَ اور جوازم (جزم دینے والے عوامل) کا داخل ہونا، اور (آخر میں) فَعَلْتُ والی تاء اور تاءِ تانیث ساکنہ کا لگنا ہے۔

تشریح:

کلمہ کی دوسری قسم

یہاں سے مصنفؒ کلمہ کی دوسری قسم "فعل" اور اس کے احکام کا بیان شروع فرما رہے ہیں۔

قولہ :الفعل :ما دلّ على معنى في نفسه مقترن بأحد الأزمنة الثّلاثة.

مصنفؒ یہاں فعل کی جامع اور مانع تعریف بیان فرما رہے ہیں۔ اس تعریف کے دو بنیادی ارکان ہیں جو اسے کلمہ کی دیگر اقسام (اسم اور حرف) سے ممتاز کرتے ہیں: ما دلّ على معنى في نفسه (جو اپنے آپ میں معنی پر دلالت کرے) :یہ قید فعل کو "حرف" سے جدا کرتی ہے، کیونکہ حرف کے اپنے مستقل معنی نہیں ہوتے جب تک وہ کسی اسم یا فعل کے ساتھ نہ ملے۔ یہ

وصف اسم اور فعل دونوں میں مشترک ہے، کیونکہ دونوں کے اپنے مستقل معنی ہوتے ہیں۔ جیسے ضَرَبَ میں "مارنا" ایک مستقل معنی ہے۔ مقترن بأحد الأزمنة الثلاثة (جو تین زمانوں میں سے کسی ایک سے ملا ہو): یہ قید فعل کو "اسم" سے ممتاز کرتی ہے۔ اسم صرف ایک معنی یا ذات پر دلالت کرتا ہے (جیسے الرَّجُلُ۔ مرد) اور اگر معنی حدثی (کام) بھی ہو، جیسے مصدر (الضَّرْبُ۔ مارنا)، تب بھی وہ زمانے سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، فعل نہ صرف حدث (کام) پر دلالت کرتا ہے بلکہ اس کام کے وقوع کے زمانے (ماضی، حال یا استقبال) کو بھی اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔ جیسے ضَرَبَ کا مطلب صرف "مارنا" نہیں، بلکہ "گزشتہ زمانے میں مارنا" ہے۔ پس فعل وہ کلمہ ہے جو حدث اور زمانہ، دونوں پر بیک وقت دلالت کرے۔

قوله :ومن خواصّه دخول (قد)، والسّين، و (سوف)، والجوازم، ولحوق تاء (فعلت)، وتاء التّأنيث ساكنة.

علامات

تعریف کے بعد، مصنفؒ فعل کی وہ لفظی علامات بیان فرما رہے ہیں جو صرف فعل میں پائی جاتی ہیں اور اسم و حرف میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ علامات فعل کو پہچاننے کی کلید ہیں: دخول (قد) :قد کا داخل ہونا فعل کی علامت ہے۔ یہ ماضی پر داخل ہو تو تحقیق (قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ) یا تقریب (قریب کرنا، جیسے قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ) کا معنی دیتا ہے، اور اگر مضارع پر آئے تو تقلیل (کمی، جیسے قَدْ يَصْدُقُ الْكَذُوْبُ۔ جھوٹا کبھی سچ بھی بول دیتا ہے) کا معنی دیتا ہے۔ دخول السّین وسوف :یہ دونوں حروف صرف فعل مضارع پر داخل ہوتے ہیں اور اس کے معنی کو مستقبل کے ساتھ خاص کر دیتے ہیں۔ س مستقبل قریب کے لیے اور سوف مستقبل بعید کے لیے آتا ہے۔ جیسے سَيَعْلَمُوْنَ اور سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ دخول الجوازم :جزم دینے والے عوامل، جیسے لَمْ اور لَا ناھیه، کا داخل ہونا فعل کی خاص علامت ہے، کیونکہ اعراب میں "جزم" (سکون یا حذف) صرف فعل (مضارع) کے ساتھ خاص ہے۔ اسم پر کبھی جزم نہیں آتا۔ لحوق تاء (فعلت) :اس سے مراد تاء الفاعل ہے جو متحرک ہوتی ہے (تُ برائے متکلم، تَ برائے مخاطب، تِ برائے مخاطبہ) اور یہ ہمیشہ فعل ماضی کے آخر میں لگتی ہے۔ جیسے ضَرَبْتُ، ضَرَبْتَ، ضَرَبْتِ۔ یہ اسم کے آخر میں کبھی نہیں آتی۔ لحوق تاء التأنيث ساكنة :فعل کے مؤنث ہونے کی علامت، یعنی تاء ساکنہ (تْ) کا لگنا بھی فعل ماضی کی خاصیت ہے۔ جیسے ضَرَبَتْ۔ مصنف کا ساکنة (ساکن) کی قید لگانا نہایت اہم ہے، کیونکہ یہ اسے اسم کے آخر میں آنے والی تائے تانیث سے ممتاز کرتا ہے جو ہمیشہ متحرک ہوتی ہے، جیسے مُسْلِمَةٌ۔

[الفعل الماضي]:

الماضي :ما دلّ على زمان قبل زمانك، مبنيّ على الفتح مع غير ضمير المرفوع المتحرّك والواو.

ترجمہ:" [فعل ماضی]:" "ماضی :وہ جو تمھارے زمانے سے پہلے کے زمانے پر دلالت کرے، یہ فتح پر مبنی ہوتا ہے، سوائے ضمیرِ مرفوعِ متحرک اور واو کے ساتھ۔

"تشریح:

فعلِ ماضی کی جامع تعریف

مصنف، رحمہ اللہ، یہاں فعلِ ماضی کی جامع تعریف اور اس کے اعراب (بناء) کا حکم بیان فرما رہے ہیں۔
فعلِ ماضی کی تعریف (زمانے کے اعتبار سے) "ما دلّ علی زمانٍ قبل زمانِك" مصنفؒ فرماتے ہیں کہ فعلِ ماضی وہ فعل ہے جو اس وقت سے پہلے کے زمانے پر دلالت کرے جب تم کلام کر رہے ہو۔ مثال کے طور پر جب آپ کہتے ہیں: "کَتَبَ محمدٌ الدرسَ" (محمد نے سبق لکھا)، تو اس جملے میں لکھنے کا عمل اس لمحے سے پہلے مکمل ہو چکا ہے جب آپ یہ جملہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ زمانی تعیین فعلِ ماضی کو فعلِ مضارع اور فعلِ امر سے ممتاز کرتا ہے۔
فعلِ ماضی کا اعرابی حکم (بناء) "مبنیٌ علی الفتح مع غیر ضمیر المرفوع المتحرك والواو" اس حصے میں مصنفؒ ماضی کے اعراب کا بنیادی اصول بیان فرما رہے ہیں۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ فعلِ ماضی ہمیشہ فتح پر مبنی ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے دو استثنائی صورتیں ہیں۔ ان استثنائی صورتوں کے علاوہ ہر حال میں فعلِ ماضی فتح پر مبنی ہوگا۔
"ضمیرِ مرفوعِ متحرک": وہ ضمیریں جو فاعل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اور حرکت والی ہوتی ہیں۔ یہ تین ہیں: تاء الفاعل (متحرک فاعل کی تاء): جیسے "کَتَبْتُ" (میں نے لکھا)، "کَتَبْتَ" (تم نے لکھا)، "کَتَبْتِ" (تم (عورت) نے لکھا)۔ ان مثالوں میں فعلِ ماضی سکون پر مبنی ہوتا ہے۔
نا الفاعلین (فاعلین کی 'نا'): جیسے "کَتَبْنَا" (ہم نے لکھا)۔ یہاں بھی فعل سکون پر مبنی ہوتا ہے۔ نون النسوۃ (عورتوں کی 'نون'): جیسے "النساءُ کَتَبْنَ" (عورتوں نے لکھا)۔ اس صورت میں بھی فعل سکون پر مبنی ہے۔
"اور واو": یعنی جب فعل کے ساتھ واوِ جمع متصل ہو۔ جیسے "کَتَبُوا" (ان سب نے لکھا)۔ اس حالت میں فعلِ ماضی ضم پر مبنی ہو جاتا ہے تاکہ واو کے ساتھ مناسبت پیدا ہو سکے۔ اس تفصیل سے مصنفؒ یہ واضح کر رہے ہیں کہ فعلِ ماضی کی بناء کا اصل قاعدہ فتح پر ہونا ہے، اور وہ حالات جن میں یہ سکون یا ضم پر مبنی ہوتا ہے، وہ اس قاعدے کے استثنا ہیں جو اس کے ساتھ متصل ہونے والی ضمائر کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

[الفعل المضارع]:

المضارع: ما أشبه الاسم بأحد حروف (نأیت) لوقوعه مشترکا، وتخصیصه بالسّین و(سوف). فالهمزة للمتکلّم مفردا، والنّون له مع غیره، والتّاء للمخاطب وللمؤنّث والمؤنّثین غیبة، والیاء للغائب غیرهما. وحروف المضارعة مضمومة فی الرّباعیّ، ومفتوحة فیما سواه. ولا یعرب من الفعل غیره، إذا لم یتّصل به نون التّأکید، ولا نون جمع المؤنّث.

ترجمہ: [فعلِ مضارع]: "مضارع: وہ جو اسم سے مشابہ ہو، حروفِ (نأیت) میں سے کسی ایک حرف کی وجہ سے، اس کے مشترک ہونے (مختلف زمانوں پر دلالت کرنے) کی وجہ سے، اور اس کے 'س' اور 'سوف' کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے۔ پس، ہمزہ متکلمِ مفرد کے لیے ہے، اور نون اس کے (متکلم کے) لیے ہے جب اس کے ساتھ کوئی دوسرا ہو، اور تاء مخاطب، مؤنث اور دو غائب مؤنثوں کے لیے ہے، اور یاء ان دونوں کے علاوہ غائب کے لیے ہے۔ اور حروفِ مضارعہ (یأتی) رباعی (چار حروف والے) فعل میں مضموم ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ میں مفتوح ہوتے ہیں۔ اور فعل میں سے اس (فعلِ مضارع) کے علاوہ کوئی

معرب نہیں ہوتا، جب اس کے ساتھ نونِ تاکید اور نونِ جمع مؤنث متصل نہ ہو۔

" تشریح

فعلِ مضارع کی تعریف

مصنف، رحمہ اللہ، یہاں فعلِ مضارع کی تعریف، اس کی علامات، اس کے حروفِ مضارعہ کا استعمال، اور اس کے اعرابی حکم کو بیان فرمارہے ہیں۔

فعلِ مضارع کی تعریف اور اس کی اسم سے مشابہت

"ما أشبه الاسم بأحد حروف (نأيت) لوقوعه مشتركا، وتخصيصه بالسّين و(سوف)"

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ فعلِ مضارع کو 'مضارع' (مشابہ) اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اسمِ فاعل کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ یہ مشابہت دو وجوہ سے ہے: حروفِ (نأیت) کی موجودگی : فعلِ مضارع ہمیشہ ن، ا، ی، ت میں سے کسی ایک حرف سے شروع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر : نَكْتُبُ، أكْتُبُ، يَكْتُبُ، تَكْتُبُ۔ یہ حروف کلام میں فعل کے فاعل کی نوعیت (متکلم، مخاطب، غائب) کو ظاہر کرتے ہیں۔ زمانوں کا اشتراك : اسمِ فاعل دو زمانوں (حال اور استقبال) پر دلالت کرتا ہے، جیسے "ضَارِبٌ" کا معنی "مارنے والا" ہے جو ماضی اور حال دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح فعلِ مضارع بھی دو زمانوں پر دلالت کرتا ہے : حال (موجودہ زمانہ) اور استقبال (آنے والا زمانہ)۔ مثلاً، "يَكْتُبُ" کا معنی "وہ لکھ رہا ہے" (حال) بھی ہو سکتا ہے اور "وہ لکھے گا" (استقبال) بھی۔ اس اشتراک کو ختم کرنے اور مستقبل کو یقینی بنانے کے لیے "س" اور "سوف" استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے "سَيَكْتُبُ" (وہ عنقریب لکھے گا) یا "سَوْفَ يَكْتُبُ" (وہ ضرور لکھے گا)۔ یہ دونوں حروف صرف فعلِ مضارع کے ساتھ خاص ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مصنفؒ نے ان کا ذکر کیا۔

حروفِ مضارعہ کا استعمال

"فالهمزة للمتكلّم مفردا، والنّون له مع غيره، والتّاء للمخاطب وللمؤنّث وللمؤنّثين غيبة، والياء للغائب غيرهما."

مصنفؒ حروفِ مضارعہ (ن، ا، ی، ت) کا استعمال بیان کرتے ہیں: "اَ" (ہمزہ) متکلمِ مفرد (واحد) کے لیے آتا ہے، جیسے : أكْتُبُ (میں لکھتا ہوں/لکھوں گا)۔ "نَ" متکلم کے لیے جب اس کے ساتھ کوئی دوسرا ہو، یعنی جمع متکلم یا متکلم مع الغیر کے لیے، جیسے : نَكْتُبُ (ہم لکھتے ہیں/لکھیں گے)۔ "تَ" تین مقامات پر استعمال ہوتا ہے: مخاطب کے لیے، جیسے : تَكْتُبُ (تم لکھتے ہو)۔ مؤنث کے لیے (واحد غائب)، جیسے : هِنْدٌ تَكْتُبُ (ہند لکھتی ہے)۔ دو غائب مؤنثوں کے لیے (تثنیہ غائب مؤنث)، جیسے : هِنْدَانِ تَكْتُبَانِ (دو ہند لکھتی ہیں)۔ "یَ" ان مذکورہ بالا (متکلم، مخاطب اور مؤنث واحد غائب و تثنیہ غائب) کے علاوہ غائب کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے : يَكْتُبُ (وہ لکھتا ہے)، هُمَا يَكْتُبَانِ (وہ دونوں لکھتے ہیں)، هُمْ يَكْتُبُونَ (وہ سب لکھتے ہیں)۔

حروفِ مضارعہ کی حرکت

"وحروف المضارعة مضمومة في الرّباعيّ، ومفتوحة فيما سواه."

مصنفؒ یہ قاعدہ بیان کرتے ہیں کہ فعلِ مضارع کا پہلا حرف (حرفِ مضارعہ) مضموم ہوتا ہے اگر ماضی چار حروف پر مشتمل ہو، جیسے: ماضی: "أَكْرَمَ" (چار حرفی) مضارع: "يُكْرِمُ" (یہاں 'ی' پر ضمہ ہے)۔ اور اس کے علاوہ تمام صورتوں میں (یعنی جب ماضی تین، پانچ یا چھ حروف والا ہو) حرفِ مضارعہ مفتوح ہوتا ہے، جیسے ثلاثی: "كَتَبَ" (تین حرفی) سے "يَكْتُبُ" (یاء پر فتحہ) خماسی: "اِنْطَلَقَ" (پانچ حرفی) سے "يَنْطَلِقُ" (یاء پر فتحہ) سداسی: "اِسْتَخْرَجَ" (چھ حرفی) سے "يَسْتَخْرِجُ" (یاء پر فتحہ)

فعلِ مضارع کا معرب ہونا

"ولا يعرب من الفعل غيره، إذا لم يتّصل به نون التّأكيد، ولا نون جمع المؤنّث.

"مصنفؒ اس جملے میں ایک نہایت اہم اصول بیان کرتے ہیں کہ تمام افعال میں سے صرف فعلِ مضارع ہی معرب ہوتا ہے (جس پر مختلف عوامل کی وجہ سے رفع، نصب اور جزم آتا ہے)، جبکہ فعلِ ماضی اور فعلِ امر ہمیشہ مبنی ہوتے ہیں۔ تاہم، اس معرب ہونے کی بھی دو شرطیں ہیں: نونِ تاکید (ثقیلہ یا خفیفہ) متصل نہ ہو: جیسے "لَيَكْتُبَنَّ" (وہ ضرور لکھے گا)۔ یہاں فعل نونِ تاکید کی وجہ سے مبنی (فتح پر) ہو گیا ہے۔ نونِ جمعِ مؤنث (نون النسوۃ) متصل نہ ہو: جیسے "يَكْتُبْنَ" (وہ عورتیں لکھتی ہیں)۔ یہاں فعل نونِ نسوۃ کی وجہ سے مبنی (سکون پر) ہو گیا ہے۔

فعلِ مضارع کے اعراب کی اقسام

وإعرابه: رفع ونصب وجزم. فالصّحيح المجرّد عن ضمير بارز مرفوع للتّثنية والجمع، والمخاطب المؤنّث، بالضّمّة والفتحة لفظاً والسّكون، مثل: (يضرب). والمتّصل به ذلك بالنّون وحذفها، مثل: (يضربان)، و(يضربون) و(تضربين). والمعتلّ بالواو والياء بالضّمّة تقديرا، والفتحة لفظا، والحذف. والمعتلّ بالألف بالضّمّة والفتحة تقديرا، والحذف. ويرتفع إذا تجرّد عن النّاصب والجازم، نحو (يقوم زيد).

ترجمہ "اور اس کا اعراب: رفع، نصب اور جزم ہے۔ پس، صحیح (آخر والا) جو تثنیہ، جمع اور مخاطبِ مؤنث کی بارز (ظاہر) ضمیر سے خالی ہو، وہ ضمہ، فتحہ اور سکون کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے: 'يَضْرِبُ'۔ اور جو ان (مذکورہ ضمیروں) کے ساتھ متصل ہو، وہ نون اور اس کے حذف سے ہوتا ہے، جیسے: 'يَضْرِبَانِ'، 'يَضْرِبُونَ' اور 'تَضْرِبِينَ'۔ اور معتل بالواو اور بالیاء ضمہ کو تقدیراً (اندازاً) اور فتحہ کو لفظاً (ظاہراً) لیتا ہے، اور حذف (کے ساتھ مجزوم ہوتا ہے)۔ اور معتل بالالف ضمہ اور فتحہ کو تقدیراً لیتا ہے، اور حذف (کے ساتھ مجزوم ہوتا ہے)۔ اور یہ (فعلِ مضارع) مرفوع ہوتا ہے جب یہ ناصب اور جازم سے خالی ہو، جیسے: 'يَقُومُ زَيْدٌ'۔

"تشریح:

فعلِ مضارع کے اعرابی احکام

مصنف، رحمہ اللہ، اس عبارت میں فعلِ مضارع کے اعرابی احکام کو تفصیل سے بیان فرما رہے ہیں۔

"واعرابه :رفع ونصب وجزم

"مصنفؒ فرماتے ہیں کہ فعلِ مضارع کا اعراب تین حالتوں میں ہوتا ہے:رفع :یہ فعلِ مضارع کی اصل حالت ہے، جب کوئی عاملِ ناصب یا جازم اس پر داخل نہ ہو۔ نصب :جب اس سے پہلے کوئی حرفِ ناصب (جیسے :أن،لن، کی، اذن) آجائے۔ جزم: جب اس سے پہلے کوئی حرفِ جازم (جیسے :لم،لما،لِأمر،لا نہی) آجائے۔

فعلِ مضارع کا اعراب (حروفِ علّت کے اعتبار سے) مصنفؒ یہاں فعلِ مضارع کی اعرابی حالتوں کو اس کی نوعیت کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ فعلِ مضارع دو قسم کا ہوتا ہے : **صحیح الآخر** (جس کا آخری حرف صحیح ہو) اور **معتل الآخر** (جس کا آخری حرف حرفِ علت ہو)۔

.1 صحیح الآخر کا اعراب

"فالصّحیح المجرّد عن ضمیر بارز مرفوع للتّثنیة والجمع، والمخاطب المؤنّث، بالضّمّة والفتحة لفظاً والسّکون، مثل: (یضرب)"

مصنفؒ اس قسم کے فعلِ مضارع کا اعراب بیان فرماتے ہیں جو صحیح الآخر ہو اور اس کے ساتھ تثنیہ کی ضمیر (ا)، جمع کی ضمیر (و) یا مخاطبِ مؤنث کی ضمیر (ی) متصل نہ ہو۔ ایسے فعل کا اعراب تینوں حالتوں میں ظاہر ہوتا ہے:رفع :ضمہ کے ساتھ، جیسے : یَضْرِبُ زیدٌ (زید مارتا ہے)۔ نصب :فتحہ کے ساتھ، جیسے :لن یَضْرِبَ زیدٌ (زید نہیں مارے گا)۔ جزم :سکون کے ساتھ، جیسے :لم یَضْرِبْ زیدٌ (زید نے نہیں مارا)۔

.2 وہ افعال جو مذکورہ ضمائر سے متصل ہوں

"والمتّصل به ذلك بالنّون وحذفها، مثل :(یضربان)، و(یضربون) و(تضربین)"

مصنفؒ ان افعال کا حکم بیان فرماتے ہیں جن کے ساتھ تثنیہ، جمع مذکر اور واحد مؤنث مخاطب کی ضمیریں متصل ہوں (انہیں افعالِ خمسہ بھی کہتے ہیں)۔ ان کا اعراب حروف کے ساتھ ہوتا ہے:رفع :نون کے ثبوت کے ساتھ، جیسے :یَضْرِبَانِ، یَضْرِبُونَ، تَضْرِبِینَ۔ نصب :نون کے حذف کے ساتھ، جیسے :لن یَضْرِبَا، لن یَضْرِبُوا، لن تَضْرِبِی۔ جزم :نون کے حذف کے ساتھ، جیسے :لم یَضْرِبَا، لم یَضْرِبُوا، لم تَضْرِبِی۔

.3 معتل الآخر کا اعراب یہ وہ فعل ہے جس کا آخری حرف حرفِ علت (ا، و، ی) ہو۔

"والمعتلّ بالواو والیاء بالضّمّة تقدیرا، والفتحة لفظاً، والحذف."

مصنفؒ معتل بالواو (جیسے :یَدْعُو) اور معتل بالیاء (جیسے :یَقْضِی) کا اعراب بیان فرماتے ہیں:

رفع :

ضمہ ان پر تقدیراً (اندازاً) ہوتا ہے، یعنی ظاہر نہیں ہوتا۔ جیسے :یَدْعُو (اصل میں یَدْعُوُ)، یَقْضِی (اصل میں یَقْضِیُ)۔ یہاں ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوتا۔

نصب :

فتحہ ان پر لفظاً (ظاہراً) آتا ہے، کیونکہ وہ خفیف ہوتا ہے۔ جیسے :لن یَدْعُوَ،لن یَقْضِیَ۔

جزم :

آخری حرفِ علت کے حذف سے ہوتا ہے، جیسے :لم یَدْعُ،لم یَقْضِ۔

"والمعتلّ بالألف بالضّمّة والفتحة تقدیرا، والحذف."

مصنفؒ معتل بالالف (جیسے :یَخْشَی) کا اعراب بیان کرتے ہیں: رفع :ضمہ اس پر تقدیراً ہوتا ہے، جیسے :یَخْشَی۔ نصب :فتحہ بھی اس پر تقدیراً ہوتا ہے، جیسے :لن یَخْشَی۔ جزم :آخری حرفِ علت کے حذف سے ہوتا ہے، جیسے :لم یَخْشَ۔

رفع کی حالت کی شرط

"ویرتفع إذا تجرّد عن النّاصب والجازم، نحو (یقوم زید)"

آخر میں مصنفؒ فعلِ مضارع کی رفع کی حالت کی شرط بیان فرماتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ فعلِ مضارع اس وقت مرفوع ہوتا ہے جب اس سے پہلے کوئی عاملِ ناصب (نصب دینے والا) یا عاملِ جازم (جزم دینے والا) موجود نہ ہو۔ جیسے :"یَقُومُ زیدٌ" (زید کھڑا ہوتا ہے)، یہاں 'یقوم' سے پہلے نہ کوئی ناصب ہے اور نہ ہی جازم، لہٰذا یہ اپنی اصل حالت یعنی رفع میں ہے۔

[نواصب الفعل المضارع]:

وینتصب ب(أن)، و(لن)، و(إذن)، و(کی)، وب(أن) مقدّرة بعد(حتّی)، ولام (کی)، ولام الجحود، والفاء، والواو، و(أو). ف(أن) مثل :(أرید أن تحسن إلیّ)، {وَأَنْ تَصُومُوا خَیْرٌ لَکُمْ} والّتی تقع بعد العلم هی المخفّفة من المثقّلة، ولیست هذه، نحو :(علمت أن سیقوم) و(أن لا یقوم)، والّتی تقع بعد الظّنّ ففیها الوجهان. و(لن) مثل (لن أبرح) ومعناها نفی المستقبل. و(إذن) إذا لم یعتمد ما بعدها علی ما قبلها، وکان الفعل مستقبلا مثل :(إذن تدخل الجنّة)، وإذا وقعت بعد الواو والفاء فالوجهان. و(کی) مثل (أسلمت کی أدخل الجنّة)، ومعناها السّببیّة.

ترجمہ [فعلِ مضارع کو نصب دینے والے حروف] :اور فعلِ مضارع منصوب ہوتا ہے (أن)، (لن)، (إذن)، اور (کی) کی وجہ سے۔ اور پوشیدہ (أن) کی وجہ سے جو (حتّی)، لامِ (کی)، لامِ جحود، (فاء)، (واو)، اور (أو) کے بعد آتا ہے۔ پس (أن) کی مثال جیسے :(أرید أن تحسن إلیّ ۔ میں چاہتا ہوں کہ تو مجھ پر احسان کرے)، اور اللہ کا فرمان :{وَأَنْ تَصُومُوا خَیْرٌ لَکُمْ ۔ اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے}۔ اور وہ (أن) جو 'علم' (یقین) کے بعد واقع ہو تو وہ 'أنَّ' مثقلہ سے مخفف ہوتا ہے، یہ (ناصبہ) نہیں ہوتا، جیسے :(علمت أنْ سیقومُ ۔ میں نے جان لیا کہ وہ عنقریب کھڑا ہوگا) اور (علمت أنْ لا یقومُ ۔ میں نے جان لیا کہ وہ کھڑا نہیں ہوگا)۔ اور وہ (أن) جو 'ظن' (گمان) کے بعد واقع ہو تو اس میں دونوں صورتیں جائز ہیں۔ اور (لن) کی مثال جیسے (لن أبرح ۔ میں ہرگز نہیں ہٹوں گا)، اور اس کا معنی مستقبل کی نفی کرنا ہے۔ اور (إذن) (جواب اور جزا کے لیے آتا ہے)، جب اس کے بعد والا جملہ ما قبل پر موقوف نہ ہو، اور فعل مستقبل میں ہو، جیسے (إذن تدخل الجنّة ۔ تب تو جنت میں

داخل ہوگا)۔ اور جب یہ واو اور فاء کے بعد آئے تو دونوں صورتیں (نصب اور رفع) جائز ہیں۔اور (کی) کی مثال جیسے (أسلمت کی أدخل الجنّة- میں اسلام لایا تاکہ میں جنت میں داخل ہوں)، اور اس کا معنی سبب بیان کرنا ہے۔

تشریح:

مضارع کے معرب ہونے کی دوسری حالت

یہاں سے مصنفؒ (علامہ ابن حاجب) فعل مضارع کے معرب ہونے کی دوسری حالت، یعنی حالتِ نصب کو بیان فرما رہے ہیں۔ پہلی قسم ان عوامل کی ہے جو خود ظاہر ہو کر فعل مضارع کو نصب دیتے ہیں، اور دوسری قسم ان عوامل کی ہے جہاں ناصب (أن) پوشیدہ ہوتا ہے۔

۱۔نواصبِ ظاہرہ

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ فعل مضارع چار حروف کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے جو کہ یہ ہیں :أن،لن،إذن، کی.

الف۔ (أن) الناصبۃ مصنفؒ سب سے پہلے (أن) کا ذکر فرماتے ہیں کیونکہ یہ نواصب میں اصل (ام الباب) ہے۔ یہ حرف مصدری کہلاتا ہے کیونکہ یہ اپنے بعد آنے والے فعل کو مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔

مصنفؒ نے اس کی دو مثالیں دی ہیں: "أريدُ أنْ تحسنَ إليّ" :اس مثال میں "أنْ تحسنَ" کو مصدر کی تاویل میں لا کر "إحسانَكَ" پڑھا جائے گا، اور عبارت یوں ہوگی "أريدُ إحسانَكَ إليّ" (میں تجھ سے احسان کا ارادہ رکھتا ہوں)۔ یہاں (أنْ) نے فعل مضارع (تحسنُ) کو نصب دے کر (تحسنَ) کر دیا۔ "{وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ}" :یہ قرآن کی آیت ہے۔ یہاں "أنْ تصوموا" مصدر کی تاویل میں ہے اور اس کی تقدیر "صيامُكم خيرٌ لكم" (تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے) ہوگی۔ "أنْ تصوموا" پورا جملہ مبتدا واقع ہو رہا ہے اور "خيرٌ" اس کی خبر ہے۔ یہاں (أنْ) نے (تصومون) کے نونِ اعرابی کو گرا کر اسے منصوب کر دیا ہے۔

والّتي تقع بعد العلم هي المخفّفة من المثقّلة، وليست هذه، نحو: (علمت أن سيقوم) و(أن لا يقوم) والّتي تقع بعد الظّنّ ففيها الوجهان.

ایک اہم فرق: مصنفؒ یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ ناصبہ (أنْ) اور مخفف (أنْ) میں فرق ہے۔وہ (أنْ) جو فعلِ علم (جیسے :علمتُ، رأيتُ بمعنی علمتُ) کے بعد آئے، وہ دراصل (أنَّ) حرفِ مشبہ بالفعل کی تخفیف شدہ صورت ہوتی ہے اور عمل نہیں کرتی، بلکہ اس کے بعد فعل مضارع مرفوع آتا ہے۔ جیسے :"علمتُ أنْ سيقومُ" (میں نے جان لیا کہ وہ کھڑا ہوگا)۔ یہاں فعل سے پہلے فاصلہ (جیسے سین، سوف، لا) کا آنا ضروری ہے۔اور اگر (أنْ) فعلِ ظن (جیسے :ظننتُ، حسبتُ) کے بعد آئے تو دونوں صورتیں جائز ہیں :اسے ناصبہ مان کر فعل کو نصب دیں یا مخففہ مان کر فعل کو رفع دیں۔ نحویوں کے نزدیک نصب دینا زیادہ بہتر (راجح) ہے۔

ب۔ (لنْ) مصنفؒ دوسرے ناصب (لنْ) کا ذکر فرماتے ہیں۔ اس کا معنی مستقبل میں کسی کام کی تاکید کے ساتھ نفی کرنا ہے۔

مثال :"لنْ أبرحَ" (میں ہر گز نہیں ہٹوں گا)۔ یہاں (لنْ) نے فعل مضارع (أبرحُ) کو نصب دیا ہے۔ اس کا عمل بغیر کسی شرط کے ہوتا ہے۔

ج۔ (إذنْ) مصنفؒ تیسرے ناصب (إذنْ) کا ذکر فرماتے ہیں۔ یہ حرف کسی کلام کے جواب میں آتا ہے اور جزاء کا معنی دیتا ہے۔ اس کے عمل کرنے کے لیے مصنفؒ نے دو شرطیں ذکر کی ہیں:

مابعد کا ماقبل پر اعتماد نہ ہو :یعنی (إذنْ) جملے کے شروع میں ہو۔ اگر اس سے پہلے واو یا فاء آجائے تو اس کا عمل باطل بھی ہو سکتا ہے۔

فعل کا زمانہ مستقبل کا ہو :اگر فعل حال کا ہو تو یہ عمل نہیں کرے گا۔ مثال :کوئی کہے "أنا أتوبُ إلی الله" (میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں)، تو آپ جواب میں کہیں :"إذنْ تدخلَ الجنّةَ" (تب تو جنت میں داخل ہوگا)۔ چونکہ یہاں دونوں شرطیں پائی جا رہی ہیں، اس لیے (إذنْ) نے فعل (تدخلُ) کو نصب دیا ہے۔ اگر (إذنْ) سے پہلے واو یا فاء آجائے، جیسے "وإذنْ تدخلُ الجنّةَ"، تو اس صورت میں فعل کو نصب دینا بھی جائز ہے اور رفع دینا بھی جائز ہے، لیکن رفع دینا بہتر ہے۔

د۔ (كيْ) مصنفؒ چوتھے ناصب (كيْ) کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ حرف بھی (أنْ) کی طرح مصدری ہے اور سبب (تعلیل) بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کی مثال :"أسلمتُ كيْ أدخلَ الجنّةَ" (میں اسلام لایا تاکہ میں جنت میں داخل ہوں)۔ یہاں اسلام لانے کا سبب جنت میں داخل ہونا بیان کیا جا رہا ہے۔ (كيْ) نے فعل مضارع (أدخلُ) کو نصب دیا ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے :"أسلمتُ للدخولِ في الجنّة"۔

۲۔نواصبِ مُقدّرہ(پوشیدہ)

و(حتّی) إذا كان مستقبلا بالنّظر إلی ما قبلها بمعنی (كي) أو (إلی) مثل (أسلمت حتّی أدخل الجنّة)، و(كنت سرت حتّی أدخل البلد)، و(أسير حتّی تغيب الشّمس). فإن أردت الحال تحقيقا، أو حكاية كانت حرف ابتداء، فيرفع وتجب السّببيّة، مثل: (مرض فلان حتّی لا يرجونه)، ومن ثمّ امتنع الرّفع في (كان سيري حتّی أدخلها) في النّاقصة، و(أسرت حتّی تدخلها؟). وجاز في التّامّة (كان سيري حتّی أدخلها)، و(أيّهم سار حتّی يدخلها). ولام (كي) مثل (أسلمت لأدخل الجنّة). ولام الجحود :لام تأكيد بعد النّفي ل(كان)، مثل :{وَما كانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ}

ترجمہ اور (حتّی) (فعل مضارع کو نصب دیتا ہے) جب اس کے بعد آنے والا فعل اپنے ماقبل فعل کے اعتبار سے مستقبل میں ہو، اور وہ (حتّی) بمعنی (كي) یا (إلی) ہو، جیسے :(أسلمتُ حتّی أدخلَ الجنّةَ۔ میں اسلام لایا تاکہ میں جنت میں داخل ہوں)، اور (كنتُ سِرتُ حتّی أدخلَ البلدَ۔ میں چلا تھا یہاں تک کہ میں شہر میں داخل ہوا)، اور (أسيرُ حتّی تغيبَ الشّمسُ۔ میں چلتا ہوں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے)۔ پس اگر تم (فعل سے) زمانہ حال مراد لو، چاہے حقیقی طور پر ہو یا حکایتِ حال کے طور پر، تو (حتّی) حرفِ ابتداء ہوگا، اور فعل مضارع مرفوع ہوگا، اور (مابعد کا ماقبل کے لیے) سبب ہونا واجب ہوگا، جیسے : (مَرِضَ فلانٌ حتّی لا يرجونَه۔ فلاں اتنا بیمار ہوا کہ اب لوگ اس سے کوئی امید نہیں رکھتے)۔ اور اسی وجہ سے رفع ممتنع

(ناجائز) ہے (كان سيري حتّى أدخلُها) میں جب "کان" ناقصہ ہو، اور (أسرتَ حتّى تدخلُها؟) میں۔ اور (رفع) جائز ہے جب "کان" تامہ ہو جیسے: (كان سيري حتّى أدخلُها)، اور (أيُّهم سارَ حتّى يدخلُها)۔ اور لامِ (کی) جیسے (أسلمتُ لأدخلَ الجنّةَ۔ میں اسلام لایا تاکہ میں جنت میں داخل ہوں)۔ اور لامِ جحود: یہ وہ لامِ تاکید ہے جو "کان" کی نفی کے بعد آتا ہے، جیسے: اللہ کا فرمان {وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ۔ اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ انہیں عذاب دے}۔

تشریح:

یہاں سے مصنفؒ (علامہ ابن حاجب) ان حروف کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں جن کے بعد فعل مضارع پوشیدہ "اَن" کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے۔ پچھلے سبق میں ان کا اجمالی ذکر تھا، اب تفصیلی کلام فرمارہے ہیں۔

۱۔ (حتّی) کے احکام مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "حتّی" کے بعد فعل مضارع "أن" مقدرہ کی وجہ سے اس وقت منصوب ہوگا جب اس میں ایک بنیادی شرط پائی جائے: فعل کا زمانہ مستقبل کا ہو۔ اس مستقبل سے مراد حقیقی مستقبل نہیں، بلکہ ماقبل فعل کے زمانے کے اعتبار سے مستقبل ہو۔ یعنی جس فعل پر "حتّی" داخل ہو رہا ہے، اس کا وقوع ماقبل فعل کے بعد ہو۔ پھر مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں "حتّی" دو معانی میں سے ایک کے لیے آتا ہے: بمعنی (کی) تعلیلیہ (سبب بیان کرنے کے لیے): جیسے مصنفؒ کی مثال: "أسلمتُ حتّى أدخلَ الجنّةَ"۔ یہاں جنت میں داخل ہونا اسلام لانے کے بعد ہوگا، لہٰذا فعل مستقبل میں ہے، اور یہ اسلام لانے کا سبب (علت) ہے، تو معنی ہوگا: "أسلمتُ كي أدخلَ الجنّةَ" (تاکہ میں جنت میں داخل ہوں)۔ بمعنی (إلی) غائیہ (انتہا بیان کرنے کے لیے): جیسے مصنفؒ کی مثالیں: "كنتُ سِرتُ حتّى أدخلَ البلدَ": میرا چلنا ماضی میں تھا اور شہر میں داخل ہونا اس چلنے کے بعد (یعنی اس کے اعتبار سے مستقبل میں) ہوا۔ یہ چلنے کی انتہا اور غایت ہے۔ معنی ہے: "سِرتُ إلى أن أدخلَ البلدَ" (یہاں تک کہ میں شہر میں داخل ہوا)۔ "أسيرُ حتّى تغيبَ الشّمسُ": میرا چلنا حال میں ہے اور سورج کا غروب ہونا اس کے بعد ہوگا، پس یہ غایت ہے۔ معنی ہے: "أسيرُ إلى أن تغيبَ الشّمسُ"۔ ان تمام مثالوں میں شرط پوری ہونے کی وجہ سے فعل مضارع (أدخلَ، تغيبَ) منصوب ہے۔

فإن أردتَ الحالَ تحقيقاً، أو حكايةً كانت حرفَ ابتداءٍ، فيرفع وتجب السّببيّة

"حتّی" کب نصب نہیں دیتا؟ (حالتِ رفع) پھر مصنفؒ اس ضابطے سے احتراز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر "حتّی" کے بعد فعل کا زمانہ حال ہو، تو فعل مضارع مرفوع ہوگا منصوب نہیں ہوگا۔ اس صورت میں "حتّی" کو حرفِ ابتداء مانا جائے گا، یعنی اس کے بعد ایک نیا جملہ شروع ہوگا اور اس کا ماقبل سے صرف معنوی تعلق ہوگا۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ حال کا زمانہ مراد لینا دو طرح سے ہو سکتا ہے: تحقیقاً: یعنی واقعتاً بولنے کے وقت وہ کام ہو رہا ہو۔ حکایۃً: یعنی کسی ماضی کے قصے کو اس طرح بیان کیا جائے گویا وہ ابھی ہو رہا ہے۔ اور مصنفؒ نے ایک اور شرط عائد کی کہ اس حالت میں مابعد کا ماقبل کے لیے سبب ہونا ضروری ہے۔ مثال: "مَرِضَ فلانٌ حتّى لا يرجونَه" (فلاں ایسا بیمار ہوا کہ اب لوگ اس کے بچنے کی امید نہیں رکھتے)۔ یہاں "لا يرجونَه" (وہ امید نہیں رکھتے) کا عمل مرض کے ساتھ ہی حال میں جاری ہے، یہ کوئی مستقبل کا کام نہیں ہے۔ اور لوگوں کا ناامید ہونا اس کے

مرض کا سبب ہے۔ للذا یہاں (یرجونَه) کو مرفوع پڑھا گیا، کیونکہ "حتّٰی" حرفِ ابتداء ہے۔

ومن ثمّ امتنع الرّفع فی (کان سیری حتّٰی أدخلها) فی النّاقصة، و (أسرت حتّٰی تدخلها؟)، وجاز فی التّامّة (کان سیری حتّٰی أدخلها)، و (أیّهم سار حتّٰی یدخلها).

ایک دقیق نحوی مسئلہ: اسی ضابطے پر تفریع کرتے ہوئے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے چند صورتوں میں رفع ناجائز ہے اور چند میں جائز۔

رفع کا امتناع: "کان سیری حتّٰی أدخلُها" جب "کان" ناقصہ ہو۔ "کان" ناقصہ اپنے اسم (سیری) اور خبر پر آتا ہے۔ یہاں "سیری" اس کا اسم ہے اور خبر محذوف ہے۔ اس صورت میں داخل ہونے کا عمل چلنے کی غایت (مقصد) ہے جو کہ مستقبل میں ہوگی، حال نہیں ہو سکتی۔ للذا فعل کو نصب دینا واجب ہے۔ "أسرتَ حتّٰی تدخلُها؟" (کیا تو اس لیے چلا کہ تو اس میں داخل ہو؟) استفہام کی وجہ سے یہاں بھی دخول کو چلنے کا مقصد اور علت پوچھا جا رہا ہے جو مستقبل میں ہی متصور ہو سکتا ہے، حال میں نہیں۔ للذا رفع جائز نہیں۔

رفع کا جواز: "کان سیری حتّٰی أدخلُها" جب "کان" تامہ ہو۔ "کان" تامہ کا معنی "پایا گیا" یا "واقع ہوا" ہوتا ہے اور یہ صرف فاعل لیتا ہے۔ تو معنی ہوگا "میرا چلنا واقع ہوا، یہاں تک کہ میں اس میں داخل ہوتا ہوں"۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ چلنے کے واقع ہونے کے ساتھ ہی داخل ہونے کے عمل کو حکایتِ حال کے طور پر بیان کیا جائے، اس لیے رفع جائز ہے۔

"أیُّهم سارَ حتّٰی یدخلُها" (ان میں سے کون ہے جو چلا اور اب وہ داخل ہو رہا ہے)۔ یہاں استفہام ذات کے بارے میں ہے، فعل کے مقصد کے بارے میں نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی چل کر منزل پر پہنچ چکا ہو اور اس کے داخل ہونے کا عمل حال میں جاری ہو، اس لیے یہاں رفع جائز ہے۔

۲۔ **لام کی (لامِ تعلیل)** مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ لامِ تعلیل ہے، یعنی سبب اور علت بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس کے بعد بھی "أن" مقدر ہوتا ہے جو فعل کو نصب دیتا ہے۔ مثال: "أسلمتُ لأدخلَ الجنّةَ" (میں اسلام لایا تاکہ میں جنت میں داخل ہوں)۔ اس کی تقدیر ہے: "أسلمتُ لأنْ أدخلَ الجنّةَ"۔ یہاں بھی جنت میں داخل ہونا اسلام لانے کا سبب ہے۔

۳۔ **لامِ جحود** مصنفؒ اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ لامِ تاکید ہے جو "کان" کے منفی صیغے (ما کان، لم یکن) کے بعد آتا ہے۔ "جحود" کا معنی انکار کرنا ہے۔ یہ لام نفی کے معنی میں شدت اور تاکید پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد بھی فعل مضارع "أن" مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہوتا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال قرآن کریم سے مصنفؒ نے نقل فرمائی: "{وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ}" (اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ انہیں عذاب دے)۔ یہاں "ما کان" کے بعد لام آیا ہے جس نے اس بات پر زور دیا کہ اللہ کا انہیں عذاب دینا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ یہاں فعل (یعذبَ) لامِ جحود کے بعد پوشیدہ "أن" کی وجہ سے منصوب ہے۔

دیگر حروف

والفاء بشرطين: أحدهما: السّببيّة، والثّاني: أن يكون قبلها أمر، أو نهي، أو استفهام، أو نفي، أو تمنّ، أو عرض. والواو بشرطين: الجمعيّة، وأن يكون قبلها مثل ذلك. و(أو) بشرط معنى (إلى أن)، أو (إلا أن). والعاطفة إذا كان المعطوف عليه اسما. ويجوز إظهار (أن) مع لام (كي) والعاطفة، ويجب مع (لا) في اللاّم.

ترجمہ اور (فاء) دو شرطوں کے ساتھ (فعل مضارع کو "أن" مقدرہ کی وجہ سے نصب دیتی ہے): پہلی شرط: (فاء کا) سببیّہ ہونا۔ دوسری شرط: اس سے پہلے امر، یا نہی، یا استفہام، یا نفی، یا تمنّی، یا عرض میں سے کچھ پایا جائے۔ اور (واو) دو شرطوں کے ساتھ (نصب دیتا ہے): (واو کا) جمعیّہ (معیّہ) ہونا، اور یہ کہ اس سے پہلے بھی ویسی ہی چیزیں (یعنی امر، نہی، وغیرہ) ہوں۔ اور (أو) اس شرط کے ساتھ (نصب دیتا ہے) کہ وہ (إلى أن) یا (إلا أن) کے معنی میں ہو۔ اور (فاء/واو عاطفہ) اس شرط کے ساتھ (نصب دیتا ہے) جب معطوف علیہ (خالص) اسم ہو۔ اور (أن) کا ظاہر کرنا لامِ (کی) اور عاطفہ کے ساتھ جائز ہے، اور لام کے بعد (جبکہ "لا" بھی ہو تو) واجب ہے۔

تشریح

یہاں سے مصنفؒ (علامہ ابن حاجب) ان دیگر حروف کو بیان فرما رہے ہیں جن کے بعد "أن" وجوبی طور پر پوشیدہ رہ کر فعل مضارع کو نصب دیتا ہے۔

۱۔ الفاء السببیہ: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "فاء" کے بعد فعل مضارع اس وقت منصوب ہوگا جب اس میں دو شرطیں جمع ہوں:

پہلی شرط: فاء کا سببیّہ ہونا۔ یعنی فاء اس بات پر دلالت کرے کہ اس کا ما قبل (پہلا جملہ) اس کے ما بعد (دوسرے جملے) کے لیے سبب ہے۔

دوسری شرط: اس سے پہلے طلب یا نفی کا پایا جانا۔ مصنفؒ نے اس کی چھ صورتیں بیان کی ہیں، جن کو "طلب" یا "نفی" میں جمع کیا جا سکتا ہے:

امر (حکم دینا): جیسے: "أكرِمْنِي فأُكرِمَكَ" (تو میری عزت کر، تو میں تیری عزت کروں گا)۔ یہاں پہلا فعل (اکرام) دوسرے فعل (اکرام) کا سبب ہے۔

نہی (روکنا): جیسے: "لا تَكْفُرْ فَتَدْخُلَ النَّارَ" (کفر نہ کرو ورنہ تو آگ میں داخل ہوگا)۔ یہاں کفر کرنا جہنم میں داخلے کا سبب ہے۔

استفہام (پوچھنا): جیسے: "هل تَزُورُنا فَنُكْرِمَكَ؟" (کیا تم ہماری زیارت کروگے کہ ہم تمہاری عزت کریں؟)۔

نفی (انکار کرنا): جیسے: "ما تأتِينا فتُحَدِّثَنا" (تم ہمارے پاس نہیں آتے کہ ہم سے بات کرو)۔ یہاں نہ آنا بات نہ کرنے کا سبب ہے۔

تمنّی (آرزو کرنا): جیسے: "يا ليتَ لي مالاً فأتصدَّقَ به" (اے کاش! میرے پاس مال ہوتا تو میں اس سے صدقہ کرتا)۔

عرض (نرمی سے پیشکش کرنا) : جیسے :"ألا تَنْزِلُ بنا فتُصِيبَ خيراً؟" (تم ہمارے ہاں کیوں نہیں اترتے تاکہ تمہیں بھلائی پہنچے؟)۔

ان تمام مثالوں میں چونکہ دونوں شرطیں پائی جارہی ہیں، اس لیے "فاء" کے بعد فعل مضارع "أن" مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو فعل منصوب نہیں ہوگا۔

۲۔ واو المعیۃ (الجمعیۃ) مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "واو" بھی دو شرطوں کے ساتھ فعل مضارع کو نصب دیتا ہے: **پہلی شرط** :واو کا جمعیۃ (بمعنی "مع" یعنی ساتھ) ہونا۔ یعنی یہ اس بات پر دلالت کرے کہ ماقبل اور مابعد کے افعال ایک ساتھ وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اسے "واو المعیۃ" بھی کہتے ہیں۔ **دوسری شرط** :اس سے پہلے بھی امر، نہی، استفہام، نفی، تمنی، یا عرض کا ہونا۔ یہ وہی چھ چیزیں ہیں جو فاء سببیہ سے پہلے آتی ہیں۔

مثال کے طور پر: نہی کے بعد :"لا تأكلِ السمكَ وتشربَ اللبنَ" (مچھلی کھانے کے ساتھ دودھ مت پیو)۔ یہاں مقصد دو کاموں کو ایک ساتھ کرنے سے روکنا ہے۔ اگر واو کو عطف کا مانا جائے تو معنی ہوگا کہ دونوں کو الگ الگ بھی مت کرو، جبکہ یہ مراد نہیں۔ امر کے بعد :"زُرْنِي وأُحسِنَ إليكَ" (میری زیارت کرو اور میں ساتھ ہی تم پر احسان کروں گا)۔ ان صورتوں میں "واو" کے بعد فعل مضارع "أن" مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔

۳۔ (أو) کے احکام مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "أو" کے بعد فعل مضارع اس شرط پر منصوب ہوتا ہے کہ وہ دو معانی میں سے کوئی ایک معنی دے رہا ہو: **بمعنی (إلی أن - یہاں تک کہ)** :جب ماقبل کا فعل آہستہ آہستہ مکمل ہوتا ہو۔ جیسے :"لأستسهِلَنَّ الصَّعبَ أو أُدرِكَ المُنَى" (میں مشکل کو آسان سمجھتا رہوں گا یہاں تک کہ اپنی آرزوؤں کو پالوں)۔ یعنی "إلی أن أُدرِكَ"۔ **بمعنی (إلا أن - مگر یہ کہ)** :جب ماقبل کا فعل ایک ہی دفعہ میں مکمل ہو جاتا ہو۔ جیسے :"لأقتُلَنَّ الكافرَ أو يُسلِمَ" (میں کافر کو ضرور قتل کروں گا مگر یہ کہ وہ مسلمان ہو جائے)۔ یعنی "إلا أن يُسلِمَ"۔ ان دو معانی میں سے کوئی ایک مراد ہو تو "أو" کے بعد فعل مضارع منصوب ہوگا۔

۴۔ واو/فاء العاطفہ مصنفؒ ایک خاص صورت بیان فرماتے ہیں کہ جب "واو" یا "فاء" عاطفہ ہوں (یعنی معیّہ یا سببیّہ نہ ہوں) تب بھی فعل مضارع کو نصب دے سکتے ہیں، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ فعل کا عطف کسی اسم صریح (خالص اسم) پر ہو۔ اسم صریح سے مراد وہ مصدر ہے جس میں فعل کا معنی تو ہو لیکن فعل کا صیغہ نہ ہو۔ مثال: "لُبْسُ العَباءَةِ وتَقَرَّ عيني أحبُّ إليَّ من لُبْسِ الشفوفِ" (چادر کا پہننا اور میری آنکھ کا ٹھنڈا ہونا مجھے باریک کپڑے پہننے سے زیادہ پسند ہے)۔ یہاں فعل مضارع "تقرَّ" کا عطف "لُبس" پر ہے جو کہ ایک خالص مصدر (اسم) ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے :"لُبْسُ العَباءَةِ وأنْ تَقَرَّ عيني"۔

ويجوز إظهار (أن) مع لام (كي) والعاطفة، ويجب مع (لا) في اللام.

۵۔ "أن" کا اظہار اور وجوب آخر میں مصنفؒ ایک عمومی قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ کن صورتوں میں پوشیدہ "أن" کو ظاہر کیا جا

سکتا ہے اور کہاں واجب ہے۔

جوازِ اظہار (ظاہر کرنے کی اجازت): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ لامِ کی اور واو/فاء عاطفہ (جب اسم پر عطف ہو) کے بعد "أن" کو ظاہر کرنا جائز ہے، یعنی آپ کہہ سکتے ہیں: "جئتُ لِكَيْ أتعلمَ" اور "جئتُ لأَنْ أتعلمَ"۔ دونوں درست ہیں۔ "لُبْسُ العباءةِ وأَنْ تقرَّ عيني"۔

وجوبِ اظہار (ظاہر کرنے کا واجب ہونا): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر لامِ جر اور فعل مضارع کے درمیان "لا" نافیہ آجائے تو "أن" کو ظاہر کرنا واجب ہے، تاکہ دو حروف (لامِ جر اور "لا" نافیہ) ایک ساتھ جمع نہ ہوں۔ جیسے قرآن میں ہے: "{لِئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ}" یہاں اصل میں "لِ + أنْ + لا + يَعْلَمَ" تھا۔ "أنْ" اور "لا" کو ملا کر "أَلَّا" لکھا گیا اور شروع میں لامِ جر لگانے سے "لِئَلَّا" بن گیا۔ یہاں "أن" کو حذف کرکے "لِلا يعلمَ" کہنا جائز نہیں۔

[جوازم الفعل المضارع]:

وينجزم ب(لم) و(لمّا)، ولام الأمر، و(لا) في النّهي، وكلم المجازاة وهي: (إن)، و(مهما)، و(إذما)، و(حيثما)، و(أين)، و(متى)، و(ما)، و(من)، و(أيّ)، و(أنّى). وإما مع (كيفما) و(إذا) فشاذٌ. وب(إن) مقدّرة. ف(لم) لقلب المضارع ماضيا ونفيه، و(لمّا) مثلها، وتختصّ بالاستغراق، وجواز حذف الفعل. ولام الأمر: اللّام المطلوب بها الفعل. و(لا) النّهي: المطلوب بها التّرك. وكلم المجازاة تدخل على الفعلين لسببيّة الأوّل ومسبّبيّة الثّاني، ويسمّيان شرطا وجزاء.

ترجمہ [فعل مضارع کو جزم دینے والے عوامل]: اور (فعل مضارع) مجزوم ہوتا ہے (لَمْ)، (لَمَّا)، لامِ امر، اور (لَا) نہی والے کی وجہ سے۔ اور کلماتِ مجازاۃ (شرط و جزاء) کی وجہ سے، اور وہ یہ ہیں: (إِنْ)، (مَهْمَا)، (إِذْمَا)، (حَيْثُمَا)، (أَيْنَ)، (مَتَى)، (مَا)، (مَنْ)، (أَيٌّ)، اور (أَنَّى)۔ اور رہا (كَيْفَمَا) اور (إِذَا) کے ساتھ (جزم دینا) تو وہ شاذ (خلافِ قیاس) ہے، اور (کبھی) پوشیدہ (إِنْ) کی وجہ سے (بھی جزم ہوتی ہے)۔ پس (لَمْ) مضارع (کے معنی) کو ماضی میں بدلنے اور اس کی نفی کرنے کے لیے آتا ہے۔ اور (لَمَّا) بھی اسی کی طرح ہے، اور یہ استغراق (نفی کا زمانہ حال تک کھینچنا) اور فعل کے حذف کے جواز کے ساتھ خاص ہے۔ اور لامِ امر: وہ لام ہے جس کے ذریعے کسی کام کا مطالبہ کیا جائے یہ لام ہمیشہ مکسور ہوتا ہے۔ اور (لَا) نہی والا: وہ (لاء) ہے جس کے ذریعے کسی کام کو چھوڑنے کا مطالبہ کیا جائے، اور کلماتِ مجازاۃ (شرطیہ کلمات) دو فعلوں پر داخل ہوتے ہیں، اس طور پر کہ پہلا فعل سبب ہوتا ہے اور دوسرا اس کا مسبّب (نتیجہ)، ان (پہلے اور دوسرے فعل) کو شرط اور جزاء کہا جاتا ہے۔

تشریح:

مضارع کے معرب ہونے کی تیسری اور آخری حالت

یہاں سے مصنفؒ (علامہ ابن حاجب) فعل مضارع کے معرب ہونے کی تیسری اور آخری حالت، یعنی حالتِ جزم کو بیان فرما رہے ہیں، جزم کا لغوی معنی "کاٹنا" ہے اور اصطلاح میں یہ فعل کی آخری حالت میں تبدیلی کا نام ہے جو سکون یا حذفِ نون یا حذفِ حرفِ علت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

مصنفؒ نے ان عوامل کو دو بڑی قسموں میں تقسیم فرمایا ہے، وہ عوامل جو صرف ایک فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔ وہ عوامل جو دو فعلوں کو جزم دیتے ہیں، جنہیں ادواتِ شرط کہتے ہیں۔

وينجزم ب(لم) و(لمّا)، ولام الأمر، و(لا) في النّهي

پہلی قسم: ایک فعل کو جزم دینے والے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ فعل مضارع چار حروف کی وجہ سے مجزوم ہوتا ہے:

لَمْ: یہ حرف دو کام کرتا ہے: قلبِ معنی: فعل مضارع کے معنی کو ماضی میں بدل دیتا ہے۔ نفی: اس ماضی کے معنی میں نفی پیدا کر دیتا ہے۔ پس "لَمْ يَضْرِبْ" کا معنی ہے "اس نے نہیں مارا"۔ یہ "مَا ضَرَبَ" کے ہم معنی ہے۔

لَمَّا: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی "لَمْ" کی طرح مضارع کو ماضی منفی کے معنی میں کرتا ہے، لیکن دو باتوں میں اس سے مختلف ہے: استغراق: "لَمَّا" کی نفی کا زمانہ، زمانۂ حال تک ممتد (کھنچا ہوا) ہوتا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں "لَمَّا يَأْتِ زَيْدٌ" تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ زید ابھی تک نہیں آیا۔ اس میں اس کے آنے کی توقع بھی شامل ہوتی ہے۔ جبکہ "لَمْ يَأْتِ" میں محض ماضی میں نہ آنے کی خبر ہے۔ جوازِ حذفِ فعل: "لَمَّا" کے بعد کبھی فعل کو حذف کر دیا جاتا ہے جب قرینہ موجود ہو، جیسے کوئی کہے: "قَارَبْتُ الْمَدِيْنَةَ وَلَمَّا" یعنی میں شہر کے قریب پہنچ گیا لیکن ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوا۔ یہاں "أَدْخُلْهَا" محذوف ہے۔ یہ جواز "لَمْ" کو حاصل نہیں۔

لامِ امر: مصنفؒ اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ لام (لِ) ہے جس کے ذریعے کسی کام کا مطالبہ کیا جائے۔ یہ مخاطب کے علاوہ (غائب اور متکلم) کے صیغوں پر آتا ہے۔ جیسے قرآنِ کریم میں ہے: لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ (صاحبِ وسعت کو اپنی وسعت سے خرچ کرنا چاہیے)۔ یہاں لِيُنْفِقْ امر کا صیغہ ہے اور لام کی وجہ سے مجزوم ہے۔

یہ لام ہمیشہ مکسور ہوتا ہے اور فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے، جیسے: "لِيَكْتُبْ زَيْدٌ" (چاہیے کہ زید لکھے)، لیکن اگر اس سے پہلے فاء یا واو آجائے تو یہ ساکن ہو جاتا ہے، جیسے "فَلْيَقُمْ"۔

لاءِ نہی: اس کی تعریف میں مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ وہ "لا" ہے جس کے ذریعے کسی کام سے رکنے کا مطالبہ کیا جائے۔ یہ مخاطب اور غائب دونوں صیغوں پر آتا ہے۔ جیسے: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے)۔ یہاں لَا تَحْزَنْ فعل نہی ہے اور "لا" کی وجہ سے مجزوم ہے۔

وكلم المجازاة وهي: (إن)، و(مهما)، و(إذما)، و(حيثما)، و(أين)، و(متى)، و(ما)، و(من)، و(أيّ)، و(أنّى). وإما مع (كيفما) و(إذا) فشاذّ، وب(إن) مقدّرة.ف

دوسری قسم: یہاں سے مصنفؒ ان کلمات کا ذکر فرما رہے ہیں جو دو جملوں پر داخل ہوتے ہیں اور دونوں کے فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔ پہلے جملے کو "شرط" اور دوسرے کو "جزاء" کہتے ہیں۔ یہ تمام اسماء ہیں سوائے "إِنْ" اور "إِذْمَا" کے کہ یہ دونوں حرف ہیں۔ مصنفؒ نے ان کی یہ فہرست دی ہے:

(۱) إِنْ (۲) مَهْمَا (۳) إِذْمَا (۴) حَيْثُمَا (۵) أَيْنَ (۶) مَتٰى (۷) مَا (۸) مَنْ (۹) أَيٌّ (۱۰) أَنّٰى

(۱) ان شرطیہ : جیسے إِنْ تَضْرِبْ أَضْرِبْ۔ (۲) مہما : جیسے مَهْمَا تَفْعَلْ أَفْعَلْ۔ (۳) إذما : جیسے إِذْمَا تُسَافِرْ أُسافر۔ (۴) حیثما : جیسے حیثما تَفْعَلْ أَفْعَلْ۔ (۵) أین : جیسے أَيْنَ تَذْهَبْ أَذْهَبْ۔ (۶) متی : جیسے مَتٰى تَقُمْ أَقُمْ۔ (۷) ما : جیسے مَا تَفْعَلْ أَفْعَلْ۔ (۸) من : جیسے مَنْ تَضْرِبْ أَضْرِبْ۔ (۹) أیّ : جیسے أَيَّ شَيْءٍ تَأْكُلْ آكُلْ۔ (۱۰) أنّی : جیسے أَنّٰى تَكْتُبْ أَكْتُبْ۔

وإما مع (كيفما) و(إذا) فشاذٌ، وب(إن) مقدّرة.

چند اضافی نکات مصنفؒ چند اہم باتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

(كَيْفَمَا) اور (إِذَا) کا حکم : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان دو کلمات کا فعل مضارع کو جزم دینا شاذ ہے، یعنی یہ فصیح عربی کے عام قاعدے کے خلاف ہے۔ اگرچہ بعض عرب شعراء کے کلام میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن جمہور نحویین کے نزدیک یہ جزم نہیں دیتے۔

پوشیدہ (إِنْ) کی وجہ سے جزم : بعض اوقات فعل مضارع کو جزم کسی ظاہری عامل کی وجہ سے نہیں بلکہ پوشیدہ "إِنْ" شرطیہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کی سب سے عام صورت طلب (امر، نہی وغیرہ) کے جواب میں ہے۔ مثال : "إِئْتِنِي أَزُرْكَ" (میرے پاس آ، میں تیری زیارت کروں گا)۔ یہاں "أَزُرْكَ" مجزوم ہے کیونکہ یہ جوابِ امر ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے : "إِئْتِنِي فَإِنْ تَأْتِنِي أَزُرْكَ" (میرے پاس آ، پس اگر تو میرے پاس آئے گا تو میں تیری زیارت کروں گا)۔

کلماتِ مجازاۃ کے احکام

فإن كانا مضارعين، أو الأوّل فالجزم. وإن كان الثّاني فالوجهان. وإذا كان الجزاء ماضيا بغير (قد) لفظا أو معنى لم يجز الفاء. وإن كان مضارعا مثبتا أو منفيّا ب(لا) فالوجهان، وإلا فالفاء. ويجيء (إذا) مع الجملة الاسميّة موضع الفاء، و(إن) مقدّرة بعد الأمر والنّهي والاستفهام والتّمنّي والعرض إذا قصد السّببيّة نحو : (أسلم تدخل الجنّة) و(لا تكفر تدخل الجنّة)، وامتنع (لا تكفر تدخل النّار) خلافا للكسائيّ لأنّ التّقدير : إن لا تكفر.

ترجمہ؛ پس اگر شرط اور جزاء دونوں مضارع ہوں، یا صرف پہلا (شرط) مضارع ہو تو جزم دیا جائے گا۔ اور اگر صرف دوسرا (جزاء) مضارع ہو تو دونوں صورتیں (جزم اور رفع) جائز ہیں۔ اور جب جزاء فعل ماضی ہو بغیر قد کے (خواہ لفظاً یا معناً)، تو اس پر فاء کا آنا جائز نہیں۔ اور اگر (جزاء) مضارع مثبت ہو یا لا کے ساتھ منفی ہو، تو دونوں صورتیں (فاء لانا اور نہ لانا) جائز ہیں، ورنہ (ان صورتوں کے علاوہ) فاء لانا واجب ہے۔ اور کبھی جملہ اسمیہ کے ساتھ إذا فجائیہ، فاء کی جگہ آجاتا ہے، اور امر، نہی، استفہام، تمنّی اور عرض کے بعد إن پوشیدہ ہوتا ہے جب سببیت کا ارادہ ہو، جیسے : "(أسلم تدخل الجنّة) اسلام لاؤ جنت میں داخل ہوگے" اور "(لا تكفر تدخل الجنّة) کفر نہ کرو جنت میں داخل ہوگے"۔ اور "(لا تكفر تدخل النّار) کفر نہ کرو آگ میں داخل ہو گے" کہنا ممنوع ہے، امام کسائیؒ کے خلاف، کیونکہ اس میں تقدیر عبارت ہے : "إن لا تكفر" (اگر تم کفر نہیں کروگے)۔

تشریح

فإن کانا مضارعین، أو الأوّل فالجزم. وإن کان الثّانی فالوجھان. وإذا کان الجزاء ماضیا بغیر (قد) لفظا أو معنی لم یجز الفاء. وإن کان مضارعا مثبتا أو منفیّا ب(لا) فالوجھان، وإلا فالفاء.

مصنفؒ یہاں سے شرط اور جزاء کے فعلوں کی مختلف حالتوں کے احکام بیان فرمار ہے ہیں:

پہلی صورت :اگر شرط اور جزاء دونوں فعل مضارع ہوں تو دونوں کو جزم دینا واجب ہے۔ جیسے "إنْ تقمْ أقمْ"

دوسری صورت :اگر پہلا فعل (شرط) مضارع ہو اور دوسرا (جزاء) ماضی، تو صرف پہلے یعنی مضارع کو جزم دیا جائے گا، جبکہ دوسرا یعنی ماضی مبنی ہونے کی وجہ سے لفظاً تو مبنی رہے گا لیکن محلًا مجزوم کہلائے گا۔ جیسے :إنْ تَقُمْ قَامَ زَيْدٌ۔

تیسری صورت :اگر پہلا فعل (شرط) ماضی ہو اور دوسرا (جزاء) مضارع ہو تو مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جزاء میں دو صورتیں (الوجھان) جائز ہیں؛اسے مجزوم بھی پڑھ سکتے ہیں اور مرفوع بھی۔ جیسے إنْ قَامَ زَيْدٌ يَقُمْ عَمْرٌو (جزم کے ساتھ) اور يَقُومُ عَمْرٌو (رفع کے ساتھ)۔ جزم اس لیے کہ یہ اداتِ شرط کی جزاء ہے، اور رفع اس لیے کہ شرط کا فعل ماضی ہونے کی وجہ سے اداتِ شرط کا عمل کمزور ہو گیا۔

وإذا کان الجزاء ماضیا بغیر (قد) لفظا أو معنی لم یجز الفاء.

یہاں سے صاحبِ کتاب کلمات مجازات کی جزاء کے متعلق چند قواعد بیان فرمار ہے ہیں۔

(۱) پہلا قاعدہ:

اِذَا كَانَ الجزآءُ مَاضِيًا بِغَيْرِ قَدْ پہلا قاعدہ ماضی کے متعلق ہے فرماتے ہیں جب کلمات مجازات کی جزا ماضی ہو اور وہ بغیر قَدْ کے ہو یعنی ماضی قریب نہ ہو تو جزاء پر ف کا داخل کرنا جائز نہیں ہے جیسے ان اکرمتنی اکرمتك اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔

(۲) دوسرا قاعدہ:

وان كان مضارعًا مثبتًا او منفيا دوسرا قاعدہ مضارع کے متعلق ہے کہ جب کلمات مجازات کی جزاء مضارع ہو چاہے مضارع مثبت ہو یا منفی ہو لیکن منفی لائے نفی کے ساتھ ہو تو اس پر دو طرح کا اعراب پڑھنا جائز ہے۔ یعنی جزاء پر ف بھی داخل کر سکتے ہیں۔ جیسے اِنْ تَضْرِبْنِیْ فَاَضْرِبُكَ اور ان تشتمنی فلا اضربك اور بغیر ف کے پڑھنا بھی جائز ہے جیسے ان تشتمنی لا اضربك اور اِنْ تَضْرِبْنِیْ اَضْرِبْكَ۔

فائدہ:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حروف شرط اگر جزاء میں موثر ہوں یعنی تاثیر کریں تو اس پر (ف) کا داخل کرنا جائز نہیں ہے اور اگر اسکا اثر اور عدم دونوں برابر ہوں تو پھر (ف) کا داخل کرنا یا نہ کرنا دونوں صحیح ہیں اور اگر وہ جزاء میں بالکل موثر نہ ہو تو پھر ف کا داخل کرنا واجب ہے۔

والا فالفاء.

اس مختصر عبارت میں صاحب کتاب نے اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ اگر جزاء ان تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو یعنی نہ تو وہ ماضی ہو بغیر قَدْ کے اور نہ مضارع مثبت ہو اور نہ مضارع منفی ہو لَا نفی کے ساتھ تو کلمات مجازات کی جزاء پر (ف) کا داخل کرنا واجب ہے اور یہ چار صورتوں میں ہوتا ہے۔

پہلی صورت : جب شرط کی جزاء فعل ماضی ہو قَدْ کے ساتھ تو اس جزاء پر ف کا داخل کرنا واجب ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد قد لفظاً کی مثال جیسے اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ۔ اگر اسنے چوری کی ہے تو چوری کر چکا ہے اس کا بھائی اس سے پہلے اور قد لفظوں میں موجود نہ ہو بلکہ مقدر ہو جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ اگر اس کا کُرتا آگے سے پھٹا ہو تو وہ سچی ہے اس مثال میں صَدَقَتْ جزاء میں ف کو لایا گیا ہے اس لیے کہ اس سے پہلے قد مقدر ہے اصل میں ہے: فَقَدْ صَدَقَتْ۔

دوسری صورت : کہ جزاء فعل مضارع ہو لیکن لَا اور لَمْ کے ساتھ نہ ہو بلکہ مَا، لَنْ یا اِنْ نافیہ کے ساتھ ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ یہاں پر حرف لَنْ داخل ہے مضارع ہے لَنْ کے ساتھ اور اس پر (ف) داخل ہے۔

تیسری صورت : جزاء جملہ اسمیہ ہو جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اس مثال میں دیکھیں عَشْرُ اَمْثَالِهَا جزا ہے جملہ اسمیہ ہے اس وجہ سے اس کے شروع میں (ف) کو لایا گیا۔

چوتھی صورت : اور چوتھی صورت یہ ہے کہ جزا جملہ انشائیہ ہو خواہ امر ہو یا نہی۔

امر کی مثال : جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

نہی کی مثال: جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ۔

ویجیء (إذا) مع الجملة الاسميّة موضع الفاء.

إذا المفاجاتية : مصنفؒ نے ایک نکتہ بیان فرمایا کہ جب جزاء جملہ اسمیہ ہو تو کبھی فاء کی جگہ "إذا المفاجاتية" (اچانک پن ظاہر کرنے والا) آجاتا ہے۔ جیسے : وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ۔

و (إن) مقدّرة بعد الأمر والنّهي والاستفهام والتّمنّي والعرض إذا قصد السّببيّة نحو : (أسلم تدخل الجنّة) و (لا تكفر تدخل الجنّة)، وامتنع (لا تكفر تدخل النّار) خلافاً للكسائيّ لأنّ التّقدير : إن لا تكفر.

اس عبارت میں صاحبِ کتاب نے ان مواضع کو بیان فرمایا جہاں اِنْ شرطیہ شرط کے ساتھ مقدر ہوتی ہے اور فعل مضارع کو جزم

دیتی ہے اور صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ ایسے مواقع پانچ ہیں:

۱)...الامر: امر کے بعد جیسے تَعَلَّمْ تَنْجُ یہاں تعلم فعل امر کے بعد اِن حرف شرط، شرط کے ساتھ مقدر ہے اسی وجہ سے اس نے پہلے مضارع کو جزم دیا تقدیری عبارت اس طرح ہے: تَعَلَّمْ اِنْ تَتَعَلَّمْ تَنْجُ۔

۲)... نہی: نہی کے بعد جیسے لَا تکذب یکن خیرا لك اس مثال میں لا تکذب فعل نہی ہے اور حرف ان شرط کے ساتھ مقدر ہے اس وجہ سے یکن فعل مضارع مجزوم ہے تقدیری عبارت ہے لَا تکذب ان لا تکذب یکن خیرا لك۔

۳)...استفہام کے بعد: جیسے هَلْ تَزُوْرُنَا نُكْرِمْكَ اس مثال میں تزورنا جملہ استفہامیہ کے بعد اِن شرط کے ساتھ مقدر ہے اسی وجہ سے نکرم فعل مضارع مجزوم ہے تقدیری عبارت ہے هَلْ تَزُوْرُنَا اِنْ تَزُوْرُنَا نُكْرِمْكَ۔

۴)... تمنی کے بعد: جیسے لیتك عندی اخدمك اس مثال میں لیتك عندی تمنی کے بعد اِن شرط کے ساتھ مقدر ہے اسی وجہ سے اخدم فعل مضارع مجزوم ہے تقدیری عبارت ہے لیتك عندی ان تکن عندی اخدمك۔

۵)...عرض کے بعد: یسے الا تنزل بنا فتصیب خیرا اس مثال میں الا تنزل بنا عرض ہے اس کے بعد اِن حرف شرط شرط کے ساتھ مقدر ہے اسی وجہ سے تصب فعل مضارع مجزوم ہے تقدیری عبارت ہے الا تنزل بنا ان تنزل تصیب خیرا۔

وامتنع (لا تكفر تدخل النّار) خلافا للكسائي، لأنّ التّقدير: إن لا تكفر.

امام کسائیؒ سے اختلاف: اسی قاعدے کی بنیاد پر مصنفؒ فرماتے ہیں کہ لَا تَكْفُرْ تَدْخُلِ النَّارَ کہنا ممنوع ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی تقدیر بنتی ہے اِنْ لَا تَكْفُرْ تَدْخُلِ النَّارَ (اگر تم کفر نہیں کروگے تو آگ میں داخل ہوگے)۔ یہ معنی کے لحاظ سے بالکل غلط ہے، کیونکہ جزاء (آگ میں داخلہ) شرط (کفر نہ کرنا) کا صحیح نتیجہ نہیں ہے۔ مصنفؒ نے واضح کیا کہ امام کسائیؒ اسے جائز قرار دیتے تھے، لیکن جمہور نحویین کا موقف وہی ہے جو مصنفؒ نے بیان فرمایا کہ جزاء کا شرط کے موافق ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر پہلی چیز دوسری چیز کے لیے سبب نہ ہو تو وہاں ان شرط کے ساتھ مقدر نہیں ہوگا اسی وجہ سے لا تکفر تدخل النار یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ لا تکفر فعل نہی کے بعد اِن شرط کے ساتھ مقدر ہے تو اس کی اصل ہے لا تکفر ان لا تکفر تدخل النار اس لیے کہ یہاں پہلی چیز یعنی کفر کا نہ ہونا دوسری چیز یعنی دخول نار کا سبب نہیں ہے بلکہ کفر دخول نار کا سبب ہے لہٰذا یہاں لا تکفر فعل نہی کے بعد حرف ان کا شرط کے ساتھ مقدر ہونا محال ہے۔

[فعل الأمر]:

الأمر: صيغة يطلب بها الفعل من الفاعل المخاطب بحذف حرف المضارعة. وحكم آخره حكم المجزوم. فإن كان بعده ساكن وليس برباعيّ، زدت همزة وصل مضمومة إن كان بعده ضمّة، ومكسورة فيما سواه مثل: (اقتل) و(اضرب) و(اعلم). وإن كان رباعيًا فمفتوحة مقطوعة.

ترجمہ؛ "امر وہ صیغہ ہے جس کے ذریعے مخاطب فاعل سے فعل (کے کرنے) کا مطالبہ کیا جائے، بشرطیکہ حرفِ مضارع کو حذف کر دیا جائے۔" "اور اس کے آخر کا حکم مجزوم کے حکم کی طرح ہے۔" "پس اگر (حرفِ مضارع کے حذف کے بعد) اس کے بعد ساکن

ہو اور وہ رباعی نہ ہو، تو تم ایک ہمزۂ وصل کا اضافہ کروگے، اگر (دوسرے حرف پر) ضمہ ہو تو وہ ہمزہ بھی مضموم ہوگی، اور اس کے علاوہ صورتوں میں وہ ہمزہ مکسور ہوگی، جیسے :اُقْتُلْ،اِضْرِبْ، اور اِعْلَمْ۔" "اور اگر وہ (فعل) رباعی ہو، تو (ہمزہ) مفتوح اور مقطوع ہوگی۔

تشریح:

الأمر :صيغة يطلب بها الفعل من الفاعل المخاطب

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، اس عبارت میں فعل کی تیسری قسم امر کو بیان فرمارہے ہیں۔

امر کی تعریف:

الأمر :صيغة يطلب بها الفعل من الفاعل المخاطب إِلٰى آخِرِهٖ امر ایسا صیغہ ہے جس کے ذریعے سے فاعل مخاطب سے فعل طلب کیا جائے۔

فوائد و قیود:

صاحب کتاب نے جب فرمایا **صِيغَةٌ يُطْلَبُ بِهَا الْفِعْلُ** تو الفعل کے ذریعے سے نہی سے احتراز کیا گیا کیونکہ وہاں فاعل سے فعل طلب نہیں ہوتا بلکہ فعل کی نہی ہوتی ہے اور جب فرمایا **فاعل المخاطب** کہ فاعل مخاطب سے فعل طلب کیا جائے تو اس کے ذریعے سے احتراز کیا گیا اور امر غائب اور متکلم سے تو ان دونوں کو امر کی تعریف سے خارج کیا گیا...اس لیے کہ امر غائب اور متکلم یہ درحقیقت مضارع بالام کے صیغے ہیں لیکن ان کے شروع میں لام امر آنے سے اس میں فعل کے طلب کے معنی پیدا ہو گئے اس لیے امر حاضر کی طرح ان کو بھی جملہ انشائیہ کہتے ہیں

بحذف حرف المضارعة.

اس کی پہچان یہ ہے کہ اسے حرفِ مضارع کو حذف کرکے بنایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، تَكْتُبُ سے اُكْتُبْ۔

وحكم آخره حكم المجزوم.

امر کے آخر کا اعراب: یہاں سے مصنف امر حاضر کا حکم بیان فرمارہے ہیں کہ امر حاضر علامت جزم کے ساتھ مبنی ہوتا ہے علامت جزم تین ہیں:

۱)...سکون جیسے اِضْرِبْ اور اُنْصُرْ اور اِعْلَمْ۔

۲)...لام کلمے کے حذف کے ساتھ جیسے اُغْزُ،اِرْمِ،اِسْعَ۔

۳)...نون اعرابی کے ساتھ حذف کے جیسے اِضْرِبَا،اِضْرِبُوا،اِضْرِبِيْ،اُغْزُ،اُغْزُوْا،اُغْزِيْ

فإن كان بعده ساكن وليس برباعيّ، زدت همزة وصل مضمومة إن كان بعده ضمّة، ومكسورة فيما سواه مثل :(اقتل) و (اضرب) و (اعلم). وإن كان رباعيًا فمفتوحة مقطوعة.

امر بنانے کا طریقہ: یہاں مصنفؒ نے فعلِ امر بنانے کے دو طریقے بیان کیے ہیں جو کہ حرفِ مضارع کے حذف کے بعد آنے

والے حرف کی حالت پر منحصر ہیں:

جب حرفِ مضارع کے حذف کے بعد پہلا حرف ساکن ہو: یہ صورت ثلاثی مجرد اور غیر ثلاثی مزید فیہ میں پائی جاتی ہے جو رباعی نہ ہو۔ اس صورت میں فعل کو قابلِ تلفظ بنانے کے لیے اس کے شروع میں ایک ہمزۂ وصل کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس ہمزۂ وصل کی حرکت (ضمّہ یا کسرہ) کا قاعدہ یہ ہے: اگر تیسرا حرف مضموم ہو: تو ہمزہ کو بھی مضموم کیا جائے گا، جیسے: تَقْتُلُ سے اُقْتُلْ۔ یہاں ت حذف کرنے کے بعد ق ساکن ہے اور اس کے بعد والا حرف (ت) مضموم ہے، للذا ہمزہ کو بھی مضموم کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ: یعنی اگر تیسرا حرف مفتوح یا مکسور ہو، تو ہمزہ کو مکسور کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر: تَضْرِبُ سے اِضْرِبْ (تیسرا حرف مکسور ہے۔) تَعْلَمُ سے اِعْلَمْ (تیسرا حرف مفتوح ہے۔)

جب فعل رباعی ہو: مصنفؒ نے رباعی افعال سے امر بنانے کا ایک الگ قاعدہ بیان کیا ہے۔ رباعی افعال سے امر بناتے وقت شروع میں ہمزۂ وصل کی بجائے ہمزۂ قطع لائی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ مفتوح ہوتی ہے۔ جیسے: تُكْرِمُ سے أَكْرِمْ۔ یہاں ت کو حذف کرنے کے بعد ک ساکن ہے اور یہ فعل رباعی ہے، اس لیے ہمزۂ قطع مفتوح کے ساتھ لایا گیا۔

فائدہ

اگر علامت مضارع کا مابعد متحرک ہو تو ہمزہ وصل لانے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ صرف اس کے آخر میں وقف کر دیں گے جیسے تُحَاسِبُ سے حَاسِبْ اور تَعِدُ سے عِدْ۔

[فعل مالم يسمّ فاعله]:

فعل مالم يسمّ فاعله: هو ما حذف فاعله. فإن كان ماضيا ضمّ أوّله و كسر ما قبل آخره. ويضمّ الثّالث مع همزة الوصل، والثاني مع التّاء خوف اللّبس ومعتلّ العين الأفصح (قيل) و (بيع)، وجاء الإشمام والواو. ومثله باب (اختير) و (انقيد) دون (استخير) و (أقيم). وإن كان مضارعا ضمّ أوّله وفتح ما قبل آخره. ومعتلّ العين ينقلب فيه ألفا.

ترجمہ: "فعل مالم یسمّ فاعلہ وہ فعل ہے جس کا فاعل حذف کر دیا جائے۔" "اگر وہ ماضی ہو تو اس کے پہلے حرف کو ضمہ اور ما قبل آخر کو کسرہ دیا جاتا ہے۔ اور ہمزۂ وصل کے ساتھ (آنے والا) تیسرا حرف بھی مضموم کیا جاتا ہے، اور (مضارع کی) تا کے ساتھ (آنے والا) دوسرا حرف بھی، التباس کے خوف سے۔" "اور معتل العین (عین کلمہ میں حرف علت والا) میں سب سے فصیح قِيلَ اور بِيعَ ہے، اور اس میں اِشمام اور واو بھی آیا ہے۔" "اور اسی کی طرح اختِيرَ اور انقِيدَ کا باب بھی ہے، نہ کہ اُستُخِيرَ اور أُقِيمَ کا۔" "اور اگر وہ مضارع ہو تو اس کے پہلے حرف کو ضمہ اور ما قبل آخر کو فتحہ دیا جاتا ہے، اور اس میں معتل العین (فعل) الف میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

تشریح

فعل مجہول (فعل مالم یسمّ فاعلہ) کے قواعد اور اس کی مختلف صورتیں

اس سبق کو سمجھنے کے لیے بطور تمہید کے ایک دو باتیں سمجھ لیں۔

پہلی بات:... فعل کی دو قسمیں ہیں۔ فعل معروف۔ (۲) فعل مجہول۔
فعل معروف:...وہ ہے جس کا فاعل مذکور ہو۔ جیسے ضَرَبَ زیدٌ وغیرہ۔
فعل مجہول:...وہ اس کو فِعْلُ مَالَمْ یُسَمَّ فَاعِلُهٗ بھی کہا جاتا ہے جس کی تعریف آگے مذکور ہے کہ جس کے فاعل کو حذف کرکے مفعول کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا ہو جیسے ضُرِبَ زیدٌ وغیرہ۔
دوسری بات:... فعل مجہول صرف متعدی سے آتا ہے لازم سے نہیں آتا کیونکہ فعل لازم میں تو فعل فاعل پر بات پوری ہو جاتی ہے مفعول کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تو پھر مفعول کو کیسے فاعل کی جگہ پر رکھا جائے گا۔اور فعل مجہول کی پھر دو قسمیں ہیں:(۱) ماضی مجہول۔ (۲) مضارع مجہول۔

فعل مالم یسمّ فاعله :هو ما حذف فاعله.

مصنفؒ اس عبارت میں فعل مجہول (فعل مالم یسمّ فاعلہ) کے قواعد اور اس کی مختلف صورتیں بیان کر رہے ہیں۔
فعل مجہول کی تعریف: مصنفؒ نے فعل مجہول کی جامع تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ فعل ہے جس کا فاعل حذف کر دیا گیا ہو۔ چونکہ فاعل کو حذف کر دیا گیا، اس لیے اس کا قائم مقام کوئی اور بنتا ہے جو اکثر مفعول ہوتا ہے۔ جیسے :ضَرَبَ زیدٌ عمرًا (زید نے عمرو کو مارا) میں "زید" فاعل ہے، لیکن جب ہم کہتے ہیں :ضُرِبَ عمرٌو (عمرو کو مارا گیا) تو فاعل حذف کر دیا گیا اور مفعول (عمرو) فاعل کا قائم مقام بن گیا۔
فعل مجہول بنانے کا طریقہ :مصنفؒ نے فعل ماضی اور فعل مضارع سے مجہول بنانے کا الگ الگ طریقہ بیان کیا ہے

فإن كان ماضيا ضمّ أوّله و كسر ما قبل آخره. ويضمّ الثّالث مع همزة الوصل، والثاني مع التّاء خوف اللّبس.

.1: فعل ماضی کو مجہول بنانا: قاعدہ :اس کے پہلے حرف کو ضمہ دیا جاتا ہے اور ما قبل آخر کو کسرہ۔ جیسے :ضَرَبَ سے ضُرِبَ، فَتَحَ سے فُتِحَ۔
خاص صورتیں: ہمزۂ وصل والے افعال :اگر فعل کا آغاز ہمزۂ وصل سے ہو تو اس کے تیسرے حرف کو بھی ضمہ دیا جاتا ہے، جیسے :اِستَخْرَجَ سے اُستُخْرِجَ۔ یہاں پہلے حرف (ہمزہ) کو قاعدے کے مطابق ضمہ دیا، اور چونکہ تیسرا حرف بھی ساکن تھا، اس لیے اس کو بھی ضمہ دیا گیا۔
"ت" سے شروع ہونے والے افعال :اگر فعل کے شروع میں زائد "تا" ہو تو اس کے دوسرے حرف کو بھی ضمہ دیا جاتا ہے، تاکہ فعل کے معنی میں التباس نہ ہو۔ جیسے :تَكَلَّمَ سے تُكُلِّمَ۔

ومعتلّ العين الأفصح (قيل) و (بيع)، وجاء الإشمام والواو.

معتل العین (اجوف) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جن افعال کی عین کلمہ میں حرفِ علت (ا، و، ی) ہو، ان کو مجہول بنانے کا سب سے فصیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے حرف کو کسرہ دیا جائے، جیسے :قَالَ سے قِيلَ اور بَاعَ سے بِيعَ۔
الاشمام اور واو :اس میں ایک اور طریقہ اِشمام ہے، یعنی ضمہ اور کسرہ کے درمیان کی آواز دینا، اور دوسرا طریقہ پہلے حرف کو ضمہ

دے کر حرفِ علت کو واو میں تبدیل کر دینا ہے، جیسے :قُوْلَ اور بُوْعَ۔ لیکن یہ فصیح نہیں ہے۔

ومثله باب (اختير) و (انقيد) دون (استخير) و (أقيم).

مزید فیہ اجوف کے ابواب :مصنفؒ نے کچھ مزید فیہ ابواب کے بارے میں بتایا ہے:افتِعَال اور انفِعَال :ان ابواب میں فصیح وہی کسرہ والی صورت ہے، جیسے :اِخْتَارَ سے اُخْتِيْرَ اور اِنْقَادَ سے اُنْقِيْدَ۔

اِستِفْعَال اور اِفْعَال :ان ابواب میں صرف ضمہ والی صورت ہی استعمال ہوتی ہے، جیسے :اِسْتَخَارَ سے اُسْتُخِيْرَ اور أَقَامَ سے أُقِيْمَ۔

وإن كان مضارعا ضمّ أوّله وفتح ما قبل آخره، ومعتلّ العين ينقلب فيه ألفا.

.2 **فعل مضارع کو مجہول بنانا: قاعدہ** :اس کے پہلے حرف کو ضمہ دیا جاتا ہے اور ما قبل آخر کو فتحہ۔ جیسے :يَضْرِبُ سے يُضْرَبُ، يَفْتَحُ سے يُفْتَحُ۔

معتل العین :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مضارع میں اگر عین کلمہ میں حرفِ علت ہو تو وہ الف میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے : يَقُوْلُ سے يُقَالُ، يَبِيْعُ سے يُبَاعُ۔

[المتعدّي وغير المتعدّي]:

فالمتعدّي :ما يتوقّف فهمه على متعلّق، ك (ضرب). وغير المتعدّي :بخلافه، ك (قعد). والمتعدّي يكون إلى واحد ك (ضرب)، وإلى اثنين ك (أعطى) و (علم)، وإلى ثلاثة ك (أعلم) و (أرى) و (أنبأ) و (نبّأ) و (خبّر) و (أخبر) و (حدّث)، وهذه مفعولها الأوّل كمفعول (أعطيت)، والثّاني والثّالث كمفعولي (علمت).

ترجمہ؛[فعل متعدی اور غیر متعدی]:پس متعدی وہ (فعل) ہے جس کا سمجھنا ایک متعلق (مفعول) پر موقوف ہو، جیسے ضرب (اس نے مارا)۔ اور غیر متعدی اس کے برعکس ہے، جیسے قعد (وہ بیٹھا)۔اور متعدی کبھی ایک مفعول کی طرف ہوتا ہے جیسے ضرب، اور کبھی دو مفعولوں کی طرف جیسے أعطى (اس نے دیا) اور علم (اس نے جانا)، اور کبھی تین مفعولوں کی طرف جیسے أعلم (اس نے بتلایا)، أرى (اس نے دکھلایا)، أنبأ، نبّأ، خبّر، أخبر، حدّث (ان سب کا معنی خبر دینا/بتلانا ہے)۔ اور ان (افعال) کا پہلا مفعول أعطيت کے مفعول کی طرح ہوتا ہے، اور دوسرا اور تیسرا مفعول علمت کے دو مفعولوں کی طرح ہوتے ہیں۔

تشریح

فعل متعدی اور غیر متعدی کی تعریف

فالمتعدّي :ما يتوقّف فهمه على متعلّق، ك (ضرب). وغير المتعدّي :بخلافه، ك (قعد).

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، فعل کی تقسیمات میں سے ایک اہم تقسیم، فعل کا متعدی اور غیر متعدی (جسے لازم بھی کہا جاتا ہے) ہونا، بیان فرما رہے ہیں۔

فعل متعدی اور غیر متعدی کی تعریف مصنفؒ سب سے پہلے فعل متعدی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ متعدی وہ فعل ہے جس کا مفہوم سمجھنے کے لیے فاعل کے علاوہ کسی متعلّق کی بھی ضرورت ہو۔ یہاں "متعلّق" سے مراد وہ اسم ہے جس پر فاعل کا فعل واقع ہو، جسے اصطلاح میں مفعول بہ کہتے ہیں۔ یعنی متعدی وہ فعل ہے جو صرف اپنے فاعل پر پورا نہ ہو بلکہ اس کا اثر مفعول تک پہنچے۔ مصنفؒ نے اس کی مثال ضرب (مارنا) سے دی ہے۔ اگر کوئی کہے "ضَرَبَ زَيْدٌ" (زید نے مارا)، تو فوراً سننے والے کے ذہن میں سوال پیدا ہوگا کہ "کس کو مارا؟"۔ جب تک مفعول (جیسے "عَمْرًا") کا ذکر نہ کیا جائے، جملے کا پورا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ پس اس کا سمجھنا مفعول پر موقوف ہوا۔

اس کے بعد مصنفؒ غیر متعدی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ متعدی کے برعکس ہے۔ یعنی غیر متعدی وہ فعل ہے جس کا مفہوم سمجھنے کے لیے مفعول بہ کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے فاعل کے ساتھ مل کر ہی پورا مفہوم ادا کر دیتا ہے۔ اس کی مثال مصنفؒ نے قعد (بیٹھنا) سے دی ہے۔ اگر کہا جائے "قَعَدَ زَيْدٌ" (زید بیٹھا)، تو بات مکمل ہے اور سننے والے کو پورا مطلب سمجھ آگیا ہے۔ بیٹھنے کا عمل فاعل (زید) تک ہی محدود ہے، اس کے لیے کسی مفعول کی ضرورت نہیں۔

والمتعدّی یکون إلی واحد ك(ضرب)، وإلی اثنین ك(أعطی) و(علم)، وإلی ثلاثة ك(أعلم) و(أری) و(أنبأ) و(نبّأ) و(خبّر) و(أخبر) و(حدّث)،

فعل متعدی کی اقسام اب مصنفؒ فعل متعدی کی اقسام بلحاظِ تعدادِ مفعول بیان فرمارہے ہیں۔

۱۔ایک مفعول کی طرف متعدی: یہ وہ افعال ہیں جنہیں اپنا معنی مکمل کرنے کے لیے صرف ایک مفعول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر افعال اسی قسم کے ہیں۔ مصنفؒ نے اس کے لیے وہی مثال ضرب دی ہے۔ جیسے :ضَرَبَ زَيْدٌ عَمْرًا (زید نے عمرو کو مارا)۔ یہاں "عَمْرًا" ایک ہی مفعول ہے۔

۲۔دو مفعولوں کی طرف متعدی: یہ وہ افعال ہیں جنہیں اپنا معنی پورا کرنے کے لیے دو مفعول درکار ہوتے ہیں۔ مصنفؒ نے ان کی بھی دو قسموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

پہلی قسم، جیسے "أعطی" :اور کبھی دو مفعولوں کی طرف فعل متعدی ہوتا ہے جس میں ایک مفعول پر اکتفا جائز ہے جیسے : اعطیتُ زَيْدًا دِرْهَمًا ۔اس مثال میں ہم اعطیتُ زَيْدًا بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک مفعول پر اکتفاء بھی جائز ہے وجہ یہ ہے کہ یہاں پر جو مفعول ثانی ہے وہ مفعول اول کا غیر ہے جیسے دِرْهَمًا یہ زید کا غیر ہے تو وہاں ایک مفعول پہ اکتفاء جائز ہے،اس باب میں "کسا" (پہنانا)، "سأل" (مانگنا) اور "منح" (عطا کرنا) جیسے افعال بھی شامل ہیں۔

دوسری قسم، ایسا فعل جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو اور اسمیں ایک مفعول پر اکتفاء جائز نہ ہو اور یہ صورت باب علمت (افعال قلوب) میں ہوتی ہے کیونکہ باب علمت میں مفعول ثانی مفعول اول کا غیر نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں ایک ہی چیز ہوتے ہیں جیسے مثال :علمت زیدا فاضلا۔

اس مثال میں زیدا اور فاضلا ایک ہی چیز ہے دونوں سے ایک ہی چیز مراد ہے لہٰذا علمت زیدا کہنا جائز نہیں ہے۔ یعنی ایک

مفعول پر اکتفاء جائز نہیں ہے۔
۳۔ تین مفعولوں کی طرف متعدی: یعنی وہ فعل جو تین مفعولوں کی طرف متعدی ہو اور یہ سات افعال میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) اریٰ (۲) أَنْبَأَ (۳) نَبَّأَ (۴) أَخْبَرَ (۵) خَبَّرَ (۶) حَدَّثَ (۷) اعلم۔
اریٰ اور أَعْلَمَ یہ دونوں تعدیہ میں اصل ہیں۔ اور أنبأ، نبأ، أخبر، خبر، حدث یہ پانچ جو ہیں یہ اصلا تعدیہ کے لیے نہیں ہیں جیسے :

اعلم الله فعل زیدًا عمروًا فاضلًا

اس مثال میں دیکھیں اعلم فعل ہے اور یہ زیدًا عمروًا فاضلا یہ تینوں اس کے مفعول ہیں اور لفظ اللہ اس کا فاعل ہے۔

وهذہ مفعولها الأوّل كمفعول (أعطيت)،

یہاں سے صاحبِ کتاب ان سات افعال کے مفعولوں کا حکم بیان فرمارہے ہیں کہ افعال سبعہ کا جو مفعول اول ہے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ آخری دو مفعولوں کے مقابلے میں باب اعطیت کے مفعولوں کی طرح ہے ان ابواب سبعہ میں جو مفعول اول ہے وہ آخری دو مفعولوں کے مقابلے میں بمنزلہ باب اعطیت کے دو مفعولوں کی طرح ہے یعنی مفعول اول کو حذف کرکے پہلے مفعول پر اکتفاء کرنا یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ آخر کے دو مفعولوں کو حذف کرکے پہلے مفعول پر اکتفاء کرنے کی مثال: اعلم الله زیدًا

اس مثال میں عمروًا فاضلا دونوں کو حذف کردیا۔
اور آخر کے دو مفعولوں کو باقی رکھ کر مفعول اول کو حذف کرنے کی مثال جیسے اعلم الله عمروًا فاضلا اور جواز کی وجہ وہی ہے جو باب اعطیت میں گزر چکی کہ مفعول اول آخر کے دونوں مفعولوں کا غیر ہے لہٰذا یا تو آخر کے دونوں مفعول کو حذف کرکے اول کو ذکر کریں گے یا مفعول اول کو حذف کرکے آخرین پر اکتفاء کریں گے۔

والثّاني والثّالث كمفعولي (علمت).

اس عبارت میں صاحبِ کتاب ان افعال سبعہ کے آخری دو مفعول جو ہیں ان کا حکم بیان فرمارہے ہیں کہ مفعول ثانی مفعول ثالث کے مقابلے میں باب علمت کے دونوں مفعولوں کی طرح ہے۔ جس طرح باب علمت کے دو مفعولوں میں سے ایک کو حذف کرکے دوسرے پر اکتفاء جائز نہیں ہے اسی طرح ان افعال سبعہ میں آخری کے دو مفعولوں میں سے ایک کو ذکر کیا جائے کہ مفعول ثانی پر اکتفاء کرنا مفعول ثالث کو حذف کرکے یہ جائز نہیں ہے اور نا یہ جائز ہے کہ مفعول ثالث کو ذکر کیا جائے اور مفعول ثانی کو حذف کیا جائے تو مفعول ثانی کو بھی ذکر کرنا واجب ہوگا جیسے باب علمت کے مفعولوں میں ہوتا ہے کیونکہ وہاں باب علمت کے دو مفعولوں میں سے ایک پر اکتفاء جائز نہیں ہے تو یہ صورت یہاں ہے تو اسی طریقے سے متعدی بسہ مفعول کے اندر جو آخر کے دو مفعول ہیں وہ بھی ان ہی افعال میں سے ہے لہٰذا اعلمت زیدا خیر الناس یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ مفعول ثانی کو ذکر کیا جائے اور مفعول ثالث کو حذف کیا جائے بلکہ اس کو اعلمت زیدا وعمروا خیر الناس

اعلمت فعل ضمیر فاعل زیدًا مفعول اوّل عمرًا مفعول ثانی خیر الناس مضاف مضاف الیہ مفعول ثالث۔

یہ پورا پڑھا جائے گا یہ نہیں جائز کہ مفعول ثالث یا مفعول ثانی میں سے ایک کو ذکر کرلیں اور ایک کو حذف کرلیں اور اس کی بھی وجہ وہی ہے کہ مفعول ثانی مفعول ثالث کا غیر نہیں ہے بلکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

[أفعال القلوب]:

(ظننت)، و(حسبت)، و(خلت)، و(زعمت)، و(علمت)، و(رأيت)، و(وجدت). تدخل على الجملة الاسميّة لبيان ما هي عنه، فتنصب الجزءين. ومن خصائصها أنّه إذا ذكر أحدهما ذكر الآخر، بخلاف باب (أعطيت). ومنها جواز الإلغاء إذا توسّطت أو تأخّرت؛ لاستقلال الجزءين كلاما، بخلاف باب (أعطيت) مثل (زيد-علمت-قائم). ومنها أنّها تعلّق قبل الاستفهام، والنّفي، واللاّم، مثل: (علمت أزيد عندك أم عمرو). ومنها أنّه يجوز أن يكون فاعلها ومفعولها ضميرين لشيء واحد، مثل: (علمتني منطلقا). ولبعضها معنى آخر يتعدّى به إلى واحد، ف(ظننت) بمعنى اتّهمت، و(علمت) بمعنى عرفت، و(رأيت) بمعنى أبصرت، و(وجدت) بمعنى أصبت.

ترجمہ؛[افعالِ قلوب]: (یہ افعال ہیں:) ظننت (میں نے گمان کیا)، حسبت (میں نے شمار کیا/گمان کیا)، خلت (میں نے خیال کیا)، زعمت (میں نے دعویٰ/گمان کیا)، علمت (میں نے جانا)، رأیت (میں نے جانا/دیکھا)، اور وجدت (میں نے پایا)۔ یہ (افعال) جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں تاکہ اس (جملہ اسمیہ) کے بارے میں (فاعل کا گمان یا علم) بیان کریں، پس یہ دونوں جزء (مبتدا اور خبر) کو نصب دیتے ہیں۔ اور ان کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ جب ان میں سے ایک (مفعول) کا ذکر کیا جائے تو دوسرے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، بخلاف بابِ أعطیت کے۔ اور ان (کی خصوصیات) میں سے الغاء (عمل کو لفظاً ختم کرنا) کا جائز ہونا بھی ہے، جب یہ (فعل) درمیان میں آئیں یا آخر میں؛ اس وجہ سے کہ دونوں جزء (مفعول بننے سے پہلے) خود ایک مستقل کلام ہوتے ہیں، بخلاف بابِ أعطیت کے، جیسے: (زیدٌ-علمتُ-قائمٌ)۔ اور ان (کی خصوصیات) میں سے یہ بھی ہے کہ استفہام، نفی اور لام سے پہلے ان کا عمل معلق ہو جاتا ہے، جیسے: (علمتُ أزیدٌ عندك أم عمرو)۔ اور ان (کی خصوصیات) میں سے یہ بھی ہے کہ یہ جائز ہے کہ ان کا فاعل اور مفعول دو ایسی ضمیریں ہوں جو ایک ہی چیز کے لیے ہوں، جیسے: (علمتُنی منطلقًا)۔ اور ان میں سے بعض افعال کا ایک دوسرا معنی بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ یہ صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتے ہیں، پس ظننت بمعنی اتّهمت (میں نے تہمت لگائی)، علمت بمعنی عرفت (میں نے پہچانا)، رأیت بمعنی أبصرت (میں نے آنکھوں سے دیکھا)، اور وجدت بمعنی أصبت (میں نے گمشدہ چیز پائی)۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے ان افعال کا بیان فرما رہے ہیں جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں اور جنہیں ان کے معنوی تعلق کی بناپر "افعالِ قلوب" کہا جاتا ہے،

افعال قلوب کی تعریف:

افعال قلوب ان افعال کو کہتے ہیں جن کا تعلق دل کے ساتھ ہو ظاہری اعضاء کے ساتھ نہ ہو۔ افعال قلوب سات ہیں اور ان سات افعال میں سے بعض شک کے لیے آتے ہیں اور بعض یقین کے لیے آتے ہیں اس لیے ان کو افعال قلوب کہتے ہیں کہ شک اور یقین کا تعلق دل سے ہے۔

افعال قلوب یہ ہیں:

(۱)علمت(۲)ظننت(۳)حسبت(۴)خلت(۵)رأیت(۶)وجدت(۷)زعمت.

اور ان افعال قلوب میں جو شک کے لیے آتے ہیں وہ تین ہیں :(۱) ظَنَنْتُ (۲)حَسِبْتُ(۳)خِلْتُ...

اور جو یقین کے لیے آتے ہیں وہ بھی تین ہیں:(۱)عَلِمْتُ (۲) رَأَيْتُ (۳) وَجَدْتُ۔ اور ان سات میں سے جو زَعَمْتُ ہے وہ شک اور یقین دونوں کے لیے آتا ہے۔

تدخل على الجملة الاسميّة لبيان ما هي عنه، فتنصب الجزءين

افعالِ قلوب کا عمل

مصنفؒ سب سے پہلے ان افعال کو شمار کراتے ہیں، جن میں سے پہلی چار (ظننت، حسبت، خلت، زعمت) رجحان اور گمان پر دلالت کرتی ہیں اور آخری تین (علمت، رأیت، وجدت) علم اور یقین پر۔

پھر مصنفؒ ان کا بنیادی عمل بیان فرماتے ہیں کہ یہ افعال جملہ اسمیہ (مبتدا اور خبر) پر داخل ہوتے ہیں اور اس کے دونوں اجزاء کو نصب دیتے ہیں، جو پھر اس فعل کے دو مفعول بن جاتے ہیں۔ مثلاً، ایک جملہ ہے زَيْدٌ قَائِمٌ (زید کھڑا ہے)۔ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ جب آپ اس جملے کے بارے میں اپنا علم یا گمان ظاہر کرنا چاہیں گے تو اس پر فعلِ قلب داخل کریں گے، جیسے :عَلِمْتُ زَيْدًا قَائِمًا (میں نے زید کو کھڑا ہوا جانا) یا ظَنَنْتُ زَيْدًا قَائِمًا (میں نے زید کو کھڑا ہوا گمان کیا)۔ یہاں زَيْدٌ (مبتدا) پہلا مفعول بن کر زَيْدًا ہو گیا اور قَائِمٌ (خبر) دوسرا مفعول بن کر قَائِمًا ہو گیا۔

ومن خصائصها أنّه إذا ذكر أحدهما ذكر الآخر، بخلاف باب (أعطيت).

افعالِ قلوب کی خصوصیات

مصنفؒ یہاں سے افعالِ قلوب کے وہ چار امتیازی اوصاف بیان فرما رہے ہیں جو انہیں بابِ "أعطی" (یعنی وہ افعال جن کے دو مفعول مبتدا۔خبر نہیں ہوتے) سے ممتاز کرتے ہیں۔

۱۔دونوں مفعولوں کا لازم ہونا:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان افعال کا ایک مفعول ذکر کیا جائے تو دوسرے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ آپ صرف عَلِمْتُ زَيْدًا کہہ کر خاموش نہیں ہو سکتے کیونکہ کلام ناقص رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دونوں مفعول اصل میں مبتدا۔خبر تھے جو مل کر ہی ایک مکمل بات بناتے ہیں۔ اس کے برعکس بابِ "أعطی" میں أَعْطَيْتُ زَيْدًا (میں نے زید کو دیا) کہنا جائز ہے، اگرچہ یہ نہ بتایا جائے کہ کیا دیا۔

ومنها جواز الإلغاء إذا توسّطت أو تأخّرت، لاستقلال الجزءين كلاما، بخلاف باب (أعطيت) مثل (زيد علمت قائم).

۲۔جوازِ الغاء (عمل کو منسوخ کرنا):

الغاء کا مطلب ہے فعلِ قلب کے لفظی عمل (یعنی نصب دینے) کو ختم کر دینا، جبکہ معنوی عمل باقی رہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ دو صورتوں میں جائز ہے:توسط :جب فعلِ قلب اپنے دو معمولوں (مفعولوں) کے درمیان آجائے۔ تاخر :جب فعلِ قلب دونوں معمولوں کے بعد آجائے۔ مثال :اصل جملہ عَلِمْتُ زَيْدًا قَائِمًا ہے۔ اگر فعل درمیان میں آئے تو زَيْدٌ، عَلِمْتُ، قَائِمٌ کہنا جائز ہے (یعنی زید اور قائم کو مبتدا۔ خبر کی حالتِ رفع میں پڑھنا)۔ اور اگر فعل آخر میں آئے تو زَيْدٌ قَائِمٌ، عَلِمْتُ کہنا بھی جائز ہے۔ مصنفؒ اس جواز کی علت یہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ دونوں جزء (زید اور قائم) اپنی اصل میں ایک مستقل کلام (مبتدا۔ خبر) ہیں، اس لیے فعل کا عمل ان پر سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ یہ خصوصیت بابِ "أعطى" کو حاصل نہیں، کیونکہ اس کے مفعول زَيْدٌ دِرْهَمٌ کوئی مستقل کلام نہیں بنتے۔

ومنها أنّها تعلّق قبل الاستفهام، والنّفي، واللاّم، مثل :(علمت أزيد عندك أم عمرو)

۳۔ تعلیق (عمل کو معلق کرنا):

تین مقامات ایسے ہیں جہاں افعال قلوب کا عمل معلق ہو گا یعنی مابعد میں معنیً عمل کرے گا اس حیثیت سے کہ وہ ترکیب میں اس کا مفعول بہ ہی بنے گا لیکن لفظًا یہ افعال قلوب کوئی عمل نہیں کریں گے۔

(۱) پہلا مقام :جب افعال قلوب استفہام سے پہلے واقع ہو جیسے عَلِمْتُ أَزَيْدٌ عِنْدَكَ أَمْ عَمْرٌو یہاں پر دیکھیں عَلِمْتُ ہمزہ استفہام سے پہلے واقع ہے تو یہاں افعال قلوب کا کوئی عمل نہیں ہوگا۔

(۲) دوسرا مقام : یہ ہے کہ افعال قلوب نفی کے بعد واقع ہوں جیسے علمت ما زَيْدٌ في الدار یہاں پر دیکھیں افعال قلوب میں سے علمت ہے اس نے کوئی عمل لفظوں میں نہیں کیا کیونکہ نفی سے پہلے واقع۔

(۳) تیسرا مقام : تیسرا مقام یہ ہے کہ لام ابتدا سے پہلے واقع ہو جیسے عَلِمْتُ لَزَيْدٌ مُنْطَلِقٌ...تو ان تینوں صورتوں میں افعال قلوب لفظًا عمل نہیں کرے گا وجہ یہ ہے کہ استفہام نفی اور لام ابتداء میں سے ہر ایک صدارت کلام کو چاہتا ہے (یعنی شروع میں آنا چاہتے ہیں) تو اگر افعال قلوب عمل کریں گے تو پھر ان تینوں کی صدارت فوت ہو جائے گی اس لیے ایسے مقامات پر افعال قلوب لفظًا عمل نہیں کرتے صرف معنًی عمل کرتے ہیں۔

.ومنها أنّه يجوز أن يكون فاعلها ومفعولها ضميرين لشيء واحد، مثل :(علمتني منطلقا).

۴۔ فاعل اور مفعول کا ایک ہونا:مصنفؒ چوتھی خصوصیت یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان افعال میں یہ ممکن ہے کہ فاعل اور مفعول کی ضمیریں ایک ہی ذات کی طرف لوٹ رہی ہوں۔ جیسے عَلِمْتُنِي مُنْطَلِقًا (میں نے خود کو جانے والا جانا)۔ یہاں تُ (فاعل) اور نی (مفعول) دونوں متکلم یعنی "میں" کی ذات کے لیے ہیں۔ یہ عام افعال جیسے "ضرب" میں نہیں ہوتا، جہاں ضَرَبْتُنِي (میں نے اپنے آپ کو مارا) ایک غیر فصیح تعبیر ہے۔

ولبعضها معنى آخر يتعدّى به إلى واحد، ف(ظننت) بمعنى اتّهمت، و(علمت) بمعنى عرفت، و(رأيت) بمعنى أبصرت، و(وجدت) بمعنى أصبت.

دیگر معانی اور عمل آخر میں مصنفؒ اس بات پر تنبیہ فرمارہے ہیں کہ مذکورہ افعال ہمیشہ دو مفعول نہیں چاہتے، بلکہ بعض اوقات ان کا معنی بدل جاتا ہے اور یہ صرف ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتے ہیں۔ظننت جب اتّھمت (تہمت لگانا) کے معنی میں ہو، جیسے :ظَنَنْتُ زَيْدًا (میں نے زید پر تہمت لگائی)۔علمت جب عرفت (پہچانا) کے معنی میں ہو، جیسے :عَلِمْتُ المَسْأَلَةَ (میں نے مسئلہ پہچان لیا)۔رأيت جب أبصرت (آنکھوں سے دیکھنا) کے معنی میں ہو، جیسے :رَأَيْتُ الهِلَالَ (میں نے چاند دیکھا)۔وجدت جب أصبت الضالّة (گمشدہ چیز پانا) کے معنی میں ہو، جیسے :وَجَدْتُ كِتَابِي (میں نے اپنی کتاب پالی)۔ان تمام صورتوں میں یہ افعال، افعالِ قلوب نہیں رہتے اور ان پر مذکورہ بالا خصائص کا اطلاق نہیں ہوتا۔

[الأفعال الناقصة]:

الأفعال النّاقصة :ما وضع لتقرير الفاعل على صفة،وهي :(كان)،و(صار)،و(أصبح)،و(أمسى)،و(أضحى)،و(ظلّ)،و(بات)،و(آض)،و(عاد)،و(غدا)،و(راح)،و(مازال)،و(مابرح)،و(مافتئ)،و(ما انفكّ)،و(مادام)،و(ليس).وقد جاء (ما جاءت حاجتك؟)،و(قعدت كأنّها حربة)، تدخل على الجملة الاسميّة لإعطاء الخبر حكم معناها،فترفع الأوّل وتنصب الثّاني،مثل(كان زيد قائما). ف(كان) تكون ناقصة لثبوت خبرها ماضيا دائما أو منقطعا،وبمعنى (صار)،ويكون فيها ضمير الشّأن،وتكون تامّة بمعنى ثبت،وزائدة.و(صار) للانتقال.و(أصبح)و(أمسى)و(أضحى) لاقتران مضمون الجملة بأوقاتها،وبمعنى (صار)،وتكون تامّة.

ترجمہ؛[افعالِ ناقصہ]:افعالِ ناقصہ وہ ہیں جو فاعل کو کسی صفت پر ثابت کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں، اور وہ یہ ہیں :كان، صار، أصبح، أمسى، أضحى، ظلّ، بات، آض، عاد، غدا، راح، ما زال، ما برح، ما فتئ، ما انفكّ، ما دام، اور ليس۔اور (شاذ طور پر) آیا ہے :"(ما جاءت حاجتك؟)" (تمہاری حاجت کیا ہوئی؟ بمعنی ما صارت)، اور "(قعدت كأنّها حربة)" (وہ ایسے بیٹھی گویا نیزہ ہو بمعنی صارت)۔یہ (افعال) جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں تاکہ خبر کو اپنے معنی کا حکم دیں، پس یہ پہلے (جزء) کو رفع اور دوسرے کو نصب دیتے ہیں، جیسے :(كان زيد قائما)۔پس کان ناقصہ ہوتا ہے اپنی خبر کو زمانہ ماضی میں ثابت کرنے کے لیے، خواہ وہ ثبوت دائمی ہو یا منقطع، اور یہ صار کے معنی میں بھی آتا ہے، اور اس میں ضمیرِ شان بھی ہوتی ہے، اور یہ ثبت (پایا گیا/ہوا) کے معنی میں تامّہ بھی ہوتا ہے، اور زائدہ بھی۔اور صار (ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف) منتقل ہونے کے لیے ہے۔اور أصبح، أمسى، أضحى جملے کے مضمون کو ان کے اوقات (صبح، شام، چاشت) کے ساتھ ملانے کے لیے ہیں، اور صار کے معنی میں بھی آتے ہیں، اور تامّہ بھی ہوتے ہیں۔

تشریح:

مصنفِ کتابِ کافیہ، امام ابن الحاجب رحمۃ اللہ علیہ، یہاں سے "افعالِ ناقصہ" کا بیان فرما رہے ہیں۔انہیں "ناقصہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ صرف اپنے فاعل (جسے یہاں "اسم" کہا جاتا ہے) کے ساتھ مل کر ایک مکمل اور بامعنی جملہ نہیں بنا سکتے، بلکہ اپنے معنی کی تکمیل کے لیے خبر کے محتاج رہتے ہیں۔

افعال ناقصہ کی تعریف:

افعال ناقصہ ان افعال کو کہتے ہیں جو اپنے صفت کے علاوہ فاعل کو مخصوص صفت کے ساتھ ثابت کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہوں جیسے كَانَ زَيْدٌ قَائِمًا اس مثال میں کَانَ سے اپنی صفت مصدر کون کے علاوہ فاعل کو یعنی زید کو صفت قیام کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ دیکھیے جو باقی افعال ہوتے ہیں جیسے ضَرَبَ تو وہاں پر فعل ضَرَبَ فاعل کے لیے اپنی صفت ثابت کرتا ہے کہ اس فاعل نے ضرب والا فعل کیا ہے لیکن افعال ناقصہ جو ہوتے ہیں یہ فاعل کے لیے اپنے مصدر کی صفت کے علاوہ دوسری مخصوص صفت کو ثابت کرتے ہیں جیسے كَانَ زَيْدٌ قَائِمًا تو اس مثال میں جو افعال ناقصہ میں فعل کون ہے تو اس نے اپنی صفت کون کے علاوہ فاعل کے لیے صفت قیام کو ثابت کیا ہے تو یہ اس تعریف کا خلاصہ ہے۔

افعال ناقصہ سترہ ہیں:

(كان)، و (صار)، و (أصبح)، و (أمسى)، و (أضحى)، و (ظلّ)، و (بات)، و (آض)، و (عاد)، و (غدا)، و (راح)، و (مازال)، و (مابرح)، و (مافتئ)، و (ماانفكّ)، و (مادام)، و (ليس).

وقد جاء (ما جاءت حاجتك؟)، و (قعدت كأنّها حربة)

شاذ مثالیں: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ سترہ افعال کے علاوہ کبھی کبھار کچھ دیگر افعال بھی افعالِ ناقصہ کے معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں، اگرچہ یہ شاذ ہے۔ جیسے عربی محاورے میں "جَاءَ" کا استعمال "صَارَ" کے معنی میں ہوتا ہے۔ مثال "مَا جَاءَتْ حَاجَتُكَ؟" کا مطلب ہے "مَا صَارَتْ حَاجَتُكَ؟" یعنی "تیری حاجت کیا ہوئی؟"۔ اسی طرح "قَعَدَ" کا استعمال بھی "صَارَ" کے معنی میں آیا ہے۔ اس سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ عمل (رفع اور نصب دینا) صرف لفظ پر موقوف نہیں بلکہ معنی پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ جب ان افعال نے "صَارَ" کا معنی اختیار کیا تو انہوں نے اس کا عمل بھی اپنا لیا۔

تدخل على الجملة الاسميّة... فترفع الأوّل وتنصب الثّاني

مصنفؒ ان افعال کا عمل بیان فرما رہے ہیں کہ یہ جملہ اسمیہ (جو مبتدا اور خبر پر مشتمل ہوتا ہے) پر داخل ہوتے ہیں اور دو تبدیلیاں کرتے ہیں:

لفظی تبدیلی: مبتدا کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں۔ مبتدا کو ان کا "اسم" اور خبر کو ان کی "خبر" کہا جاتا ہے۔

معنوی تبدیلی: خبر کے معنی کو اپنے مخصوص معنی (مثلاً زمانہ ماضی، حال یا استقبال میں کسی وقت کے ساتھ مقید کرنا) کا حکم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، "زَيْدٌ قَائِمٌ" (زید کھڑا ہے) ایک جملہ اسمیہ ہے۔ جب اس پر "كَانَ" داخل ہوا تو یہ "كَانَ زَيْدٌ قَائِمًا" بن گیا۔ یہاں "زَيْدٌ" (جو پہلے مبتدا تھا) "كَانَ" کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع رہا، اور "قَائِمٌ" (جو پہلے خبر تھا) "كان" کی خبر بن کر منصوب ہو گیا۔

معنوی تبدیلی یہ آئی کہ قیام کا ثبوت زمانہ ماضی کی طرف منتقل ہو گیا۔

ف (كان) تكون ناقصة...

یہاں سے مصنفؒ ہر فعل کی الگ الگ وضاحت فرما رہے ہیں۔

کَانَ ناقصہ :

اس کا بنیادی استعمال یہی ہے۔ یہ اپنی خبر کو اپنے اسم کے لیے زمانہ ماضی میں ثابت کرتا ہے۔

ثبوتِ دائمی : اس کی مثال وہ ہے جہاں خبر کا ثبوت ہمیشہ کے لیے ہو اور اس میں انقطاع کا تصور نہ ہو، جیسے قرآن کی آیت **"وَكَانَ اللهُ عَلِيمًا حَكِيمًا"** (اور اللہ ہمیشہ سے علم والا، حکمت والا ہے)۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے علم و حکمت کا ثبوت دائمی اور ازلی ہے۔

ثبوتِ منقطع : اس کی مثال وہ ہے جہاں خبر کا ثبوت ماضی میں کسی وقت تھا لیکن اب اس کا استمرار ضروری نہیں، جیسے **"كَانَ زَيْدٌ قَائِمًا"** (زید کھڑا تھا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماضی میں کھڑا تھا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اب بھی کھڑا ہو۔

بمعنی صَارَ :

کبھی "كَانَ" انتقالِ حالت کے معنی میں آتا ہے، یعنی "ہو گیا/بن گیا"۔ جیسے **"كَانَ الفَقِيرُ غَنِيّاً"** یعنی **"صَارَ الفَقِيرُ غَنِيّاً"** (فقیر امیر ہو گیا)۔

ضمیر الشأن : کبھی "كَانَ" میں اس کا اسم ایک ضمیرِ شان ہوتا ہے (ضمیرِ شان وہ ضمیر ہوتی ہے جس کی تفسیر بعد والا پورا جملہ کرتا ہے)۔ جیسے **"كَانَتْ هِنْدٌ ذَاهِبَةٌ"** کی بجائے کہا جائے "**كَانَ الْأَمْرُ هِنْدٌ ذَاهِبَةٌ**"۔

کَانَ تامّہ :

"كَانَ" کبھی فعل تام بھی ہوتا ہے، اس صورت میں اسے خبر کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ صرف فاعل پر پورا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا معنی **"ثَبَتَ"** (ثابت ہوا)، **"وَقَعَ"** (واقع ہوا) یا **"وُجِدَ"** (پایا گیا) ہوتا ہے۔ جیسے قرآنِ مجید میں ہے : **"وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ"** (اور اگر کوئی تنگ دست ہو)۔ یہاں "**كَانَ**" کا معنی **"وُجِدَ"** (اگر کوئی تنگ دست پایا جائے) ہے، اور **"ذُو عُسْرَةٍ"** اس کا فاعل ہے۔ اسے خبر کی حاجت نہیں۔

کَانَ زائدہ :

کبھی "كَانَ" کلام میں صرف تاکیدِ معنی کے لیے آتا ہے اور اس کا کوئی اعرابی عمل نہیں ہوتا۔ جیسے تعجب کے صیغے میں **"مَا كَانَ أَحْسَنَ زَيْدًا!"**۔ یہاں "كَانَ" زائدہ ہے اور اصل جملہ **"مَا أَحْسَنَ زَيْدًا!"** (زید کتنا حسین ہے!) ہے۔

و (صار) للانتقال مصنفؒ فرماتے ہیں کہ فعل "صَارَ" کا بنیادی معنی انتقال ہے۔ یعنی اپنے اسم کا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا۔ جیسے **"صَارَ الطِّينُ خَزَفًا"** (مٹی برتن بن گئی)۔ یہاں مٹی کی حالت بدل کر برتن کی حالت میں منتقل ہو گئی ہے۔

و (أصبح) و (أمسى) و (أضحى)... مصنفؒ ان تین افعال کا ذکر فرما رہے ہیں جن کا تعلق اوقات سے ہے۔ ان میں تین طرح کے معانی پائے جاتے ہیں:

لاقتران مضمون الجملة بأوقاتها (خبر کے مضمون کا مخصوص اوقات سے جڑنا) : ان کا پہلا اور اصلی معنی یہ ہے کہ یہ خبر کے ثبوت کو

اپنے اسم کے لیے ایک خاص وقت میں بیان کرتے ہیں: أَصْبَحَ : صبح کے وقت۔ جیسے "أَصْبَحَ زَيْدٌ نَشِيطًا" (زید صبح کے وقت چست تھا)۔

أَمْسَى :شام کے وقت۔ جیسے "أَمْسَى الطَّائِرُ عَائِدًا إِلَى عُشِّهِ" (پرندہ شام کے وقت اپنے گھونسلے کو لوٹ رہا تھا)۔

أَضْحَى : چاشت کے وقت۔ جیسے "أَضْحَى الطَّالِبُ مُجْتَهِدًا" (طالب علم چاشت کے وقت محنتی تھا)۔

بمعنی صَارَ : یہ تینوں افعال بھی کبھی وقت کی قید سے آزاد ہو کر محض "ہو جانے" (صَارَ) کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے "أَصْبَحَ الْجَوُّ بَارِدًا" (موسم سرد ہوگیا)۔ یہاں مراد یہ نہیں کہ صرف صبح کے وقت سرد ہوا، بلکہ مطلقاً سرد ہو گیا۔

تامّہ : یہ تینوں افعال بھی "كَانَ" کی طرح فعل تام کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کا معنی "اس وقت میں داخل ہونا" ہوتا ہے۔ جیسے: "أَصْبَحْنَا" کا معنی ہوگا "ہم صبح کے وقت میں داخل ہوئے"۔ حدیث شریف میں ہے: "أَصْبَحْنَا وَأَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ" (ہم نے صبح کی اور تمام بادشاہی اللہ کے لیے ہے)۔ یہاں پہلا "أَصْبَحْنَا" تامّہ ہے جس کا فاعل "نَا" ضمیر ہے، جبکہ دوسرا "أَصْبَحَ" ناقصہ ہے جس کا اسم "الْمُلْكُ" ہے۔

بقیہ افعالِ ناقصہ

و (ظلّ) و (بات) لاقتران مضمون الجملة بوقتيهما، وبمعنى (صار). و (ما زال) و (ما برح) و (ما فتئ) و (ما انفكّ) لاستمرار خبرها لفاعلها مذ قبله، ويلزمها النّفي. و (ما دام) لتوقيت أمر بمدّة ثبوت خبرها لفاعلها، ومن ثمّ احتاج إلى كلام؛ لأنّه ظرف. و (ليس) لنفي مضمون الجملة حالا، وقيل: مطلقا. ويجوز تقديم أخبارها كلها على أسمائها، وهي في تقديمها عليها على ثلاثة أقسام: قسم يجوز، وهو من (كان) إلى (راح). وقسم لا يجوز، وهو ما في أوّله (ما)، خلافا لابن كيسان في غير (ما دام). وقسم مختلف فيه، وهو (ليس).

ترجمہ: اور ظلّ، بات جملے کے مضمون کو ان کے دو وقتوں (دن، رات) کے ساتھ ملانے کے لیے ہیں، اور صار کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ اور ما زال، ما برح، ما فتئ، ما انفكّ اپنی خبر کے استمرار (تسلسل) کے لیے ہیں اپنے فاعل (اسم) کے لیے پہلے سے، اور ان کے لیے نفی کا ہونا لازم ہے۔ اور ما دام کسی کام کو ایک مدت کے ساتھ مقید کرنے کے لیے ہے (یعنی) اس مدت تک جب تک اس کی خبر اس کے فاعل (اسم) کے لیے ثابت ہو، اور اسی وجہ سے اسے (اپنے سے پہلے) ایک کلام کی ضرورت ہوتی ہے؛ کیونکہ یہ ظرف (کے معنی میں) ہے۔ اور لیس جملے کے مضمون کی زمانہ حال میں نفی کے لیے ہے، اور کہا گیا ہے کہ مطلقاً (کسی زمانے کی قید کے بغیر) نفی کے لیے ہے۔ اور ان سب (افعال) کی خبروں کو ان کے اسموں پر مقدم کرنا جائز ہے، اور ان (افعال) کی خبروں کو خود ان (افعال) پر مقدم کرنے کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جس میں (تقدیم) جائز ہے، اور یہ کان سے لے کر راح تک ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں جائز نہیں، اور یہ وہ ہیں جن کے شروع میں ما ہے، سوائے ابن کیسان کے اختلاف کے ما دام کے علاوہ میں۔ اور ایک قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے، اور وہ لیس ہے۔

تشریح:

مصنفؒ سابقہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بقیہ افعالِ ناقصہ کے معانی اور ان سے متعلقہ احکام کو بیان فرمارہے ہیں۔

و (ظلّ) و (بات) لاقتران مضمون الجملة بوقتيهما، وبمعنى (صار)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "ظَلّ" اور "بَاتَ" بھی "أَصْبَحَ" وغیرہ کی طرح اوقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ "ظَلّ" خبر کے مضمون کو دن کے وقت کے ساتھ اور "بَاتَ" رات کے وقت کے ساتھ ملانے کے لیے آتا ہے۔ان افعال کا پہلا معنی یہ ہے کہ یہ اسم کے لیے خبر کے ثبوت کو ایک مخصوص وقت کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ "ظَلّ" کا استعمال دن کے لیے ہوتا ہے، جیسے "ظَلّ زَيْدٌ صَائِمًا" (زید دن بھر روزہ دار رہا)۔ اور "بَاتَ" کا استعمال رات کے لیے ہوتا ہے، جیسے "بَاتَ الْمُؤْمِنُ قَائِمًا" (مومن نے رات عبادت میں گزاری)۔اور جس طرح "أَصْبَحَ" وغیرہ "صَارَ" کے معنی میں آتے ہیں، اسی طرح یہ دونوں فعل بھی کبھی وقت کی قید سے آزاد ہو کر محض "ہو جانے" کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے "ظَلّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا" (اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا)۔ یہاں دن کے وقت کی قید مراد نہیں، بلکہ حالت کی تبدیلی مراد ہے۔

و (مازال) و (مابرح) و (مافتئ) و (ماانفكّ) لاستمرار خبرها.

..مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ چار افعال، جنہیں "افعالِ استمرار" بھی کہا جاتا ہے، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی خبر ان کے اسم کے لیے زمانہِ گزشتہ سے لے کر زمانہِ حال تک مسلسل اور لگاتار ثابت ہے۔

مثلاً "مَا زَالَ زَيْدٌ عَالِمًا" کا مطلب ہے کہ زید کا عالم ہونا پہلے سے ثابت ہے اور ابھی تک وہ وصف اس میں جاری ہے۔ یہ افعال اس بات کا فائدہ دیتے ہیں کہ خبر کا تعلق اسم کے ساتھ منقطع نہیں ہوا بلکہ برقرار ہے۔

مصنفؒ نے فرمایا "ويلزمها النّفي" (ان کے لیے نفی لازم ہے)۔ یہ ایک اہم شرط ہے۔ان افعال سے استمرار کا معنی اسی وقت حاصل ہو گا جب ان سے پہلے نفی (جیسے مَا، لَا) یا نہی (جیسے لَا تزل) یا استفہام انکاری (جیسے هَلْ يَزَالُ) موجود ہو۔ اگر ان پر نفی داخل نہ ہو تو یہ افعالِ ناقصہ نہیں رہتے بلکہ افعالِ تامہ بن جاتے ہیں اور ان کا معنی بدل جاتا ہے۔ مثلاً "زَالَ" کا معنی "ہلاک ہونا" یا "جدا ہونا" ہوتا ہے۔

و (مادام) لتوقيت أمر بمدّة ثبوت خبرها.

..مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "مَا دَامَ" کسی کام کے وقت کو اس مدت کے ساتھ محدود کرنے کے لیے آتا ہے جس مدت تک اس کی خبر اس کے اسم کے لیے ثابت ہے۔

مثال کے طور پر قرآنِ مجید میں ہے: "وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا" (اور اللہ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں)۔ اس کا مطلب ہے "مُدَّةَ دَوَامِي حَيًّا" (میرے زندہ رہنے کی مدت تک)۔ یہاں نماز اور زکوٰۃ کے حکم کو زندگی کی مدت کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے۔

مصنفؒ نے فرمایا "ومن ثمّ احتاج إلى كلام" (اسی وجہ سے اسے اپنے سے پہلے کلام کی ضرورت ہوتی ہے)۔ چونکہ "مَا دَامَ" اور اس کا جملہ ایک مدت اور ظرف کو بیان کرتا ہے، اور ظرف کا تعلق کسی فعل یا عامل سے ہونا ضروری ہے، اس لیے

یہ لازم ہے کہ اس سے پہلے کوئی جملہ موجود ہو جس کے لیے یہ ظرف بن سکے۔ مذکورہ مثال میں "أَوْصَانِي" وہ عامل ہے جس کے لیے "مَا دُمْتُ حَيًّا" ظرف ہے۔

و(ليس) لنفي مضمون الجملة حالا.

..مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "لَيْسَ" جملہ اسمیہ کے مضمون کی زمانہ حال میں نفی کرنے کے لیے آتا ہے۔

جیسے "لَيْسَ زَيْدٌ قَائِمًا" (زید کھڑا نہیں ہے)۔ یہاں زید سے حالتِ موجودہ میں قیام کی نفی کی گئی ہے۔

مصنفؒ نے فرمایا "وقيل :مطلقا" (اور کہا گیا ہے کہ مطلقاً نفی کے لیے آتا ہے)۔ یہ دوسرا قول ہے، جس کے مطابق "لَيْسَ" کسی خاص زمانے کے ساتھ مقید نہیں، بلکہ مطلق نفی کرتا ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :"أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ" (سن لو! جس دن وہ (عذاب) ان پر آئے گا تو ان سے پھیرا نہیں جائے گا)۔ یہاں نفی زمانہ مستقبل کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "لَيْسَ" صرف حال کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ قرینہ کے مطابق کسی بھی زمانے کی نفی کر سکتا ہے۔

احکامِ تقدیمِ خبر

ويجوز تقديم أخبارها كلها على أسمائها.

..مصنفؒ یہاں ایک اہم قاعدہ بیان فرما رہے ہیں کہ تمام افعالِ ناقصہ میں یہ جائز ہے کہ ان کی خبر کو ان کے اسم پر مقدم کر دیا جائے، جیسے "كَانَ فِي الدَّارِ زَيْدٌ" (اصل میں "كَانَ زَيْدٌ فِي الدَّارِ" تھا)۔

لیکن خبر کو افعال پر مقدم کرنے کے جواز کے اعتبار سے ان کی تین قسمیں ہیں۔

.1 قسم یجوز (وہ قسم جس میں تقدیم جائز ہے): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "كَانَ" سے لے کر "رَاحَ" تک کے تیرہ (13) افعال میں بالاتفاق خبر کو افعال پر مقدم کرنا جائز ہے۔ ان میں کوئی مانع موجود نہیں۔ جیسے "فِي الدَّارِ كَانَ زَيْدٌ" (اصل میں "كَانَ زَيْدٌ فِي الدَّارِ" تھا)۔

.2 قسم لا یجوز (وہ قسم جس میں تقدیم جائز نہیں): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جن افعال کے شروع میں "مَا" آتا ہے (یعنی افعالِ استمرار اور مَا دَامَ)، ان میں خبر کو اسم پر مقدم کرنا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ "مَا" صدارتِ کلام چاہتا ہے، یعنی وہ چاہتا ہے کہ کلام کے شروع میں رہے۔ اگر ہم خبر کو فعل سے بھی پہلے لے آئیں تو "مَا" کی صدارت ختم ہو جائے گی، جو کہ جائز نہیں۔ مثلاً آپ "مَا زَالَ زَيْدٌ قَائِمًا" میں "قَائِمًا" کو "مَا زَالَ" سے پہلے لا کر "قَائِمًا مَا زَالَ زَيْدٌ" نہیں کہہ سکتے۔

مصنفؒ نے "خلافا لابن كيسان" کہہ کر ایک نحوی ابن کیسان کے اختلاف کا ذکر کیا ہے، جن کے نزدیک "مَا دَامَ" کے علاوہ باقی "ما" والے افعال میں تقدیم جائز ہے۔

لیکن جمہور نحویین اس کے خلاف ہیں۔

.3 قسم مختلف فیہ (وہ قسم جس میں اختلاف ہے): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ تیسری قسم "لَيْسَ" ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا

اس کی خبر کو اس پر مقدم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

مانعین کی دلیل :جو لوگ منع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "لَیْسَ" اگرچہ لفظاً فعل ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے حرفِ نفی "مَا" کے مشابہ ہے۔ اور جس طرح "مَا" کے معمول کو اس پر مقدم نہیں کر سکتے، اسی طرح "لَیْسَ" کے معمول (خبر) کو بھی اس پر مقدم نہیں کرنا چاہیے۔

مجوزین کی دلیل :جو لوگ جائز قرار دیتے ہیں، وہ اس کے فعلی معنی اور عمل کو دیکھتے ہوئے اسے دیگر افعال پر قیاس کرتے ہیں اور اس کی خبر کی تقدیم کو جائز کہتے ہیں، جیسے "قَائِمًا لَیْسَ زَیْدٌ"۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

[أفعال المقاربة]:

أفعال المقاربة :ما وضع لدنوّ الخبر رجاء أو حصولا أو أخذا فيه. فالأوّل (عسى)، وهو غير متصرّف، تقول :(عسى زيد أن يخرج)، و (عسى أن يخرج زيد)، وقد تحذف (أن). والثّاني :(كاد)، تقول :(كاد زيد يجيء)، وقد تدخل (أن)، وإذا دخل النّفي على (كاد) فهو كالأفعال على الأصحّ، وقيل :يكون للإثبات مطلقا، وقيل :يكون في الماضي للإثبات، وفي المستقبل كالأفعال، تمسكا بقوله تعالى :{وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ}، وبقول ذي الرّمّة

إذا غيّر الهجر المحبّين لم يكد...رسيس الهوى من حب ميّة يبرح

والثّالث :(طفق) و (كرب) و (جعل) و (أخذ)، وهي مثل (كاد) و (أوشك)، وهي مثل (عسى) و (كاد) في الاستعمال.

ترجمہ؛[افعالِ مقاربہ]:افعالِ مقاربہ وہ (افعال) ہیں جو خبر کے قریب ہونے کو بیان کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں، خواہ (یہ قربت) امید کے طور پر ہو، یا وقوع کے طور پر، یا اس (خبر) میں شروع ہو جانے کے طور پر۔ پس پہلی قسم (امید کے لیے) عسی ہے، اور یہ غیر متصرف (جس کی گردان نہ ہو) ہے۔ آپ کہتے ہیں :"(عسى زيد أن يخرج)" (امید ہے کہ زید نکلے گا)، اور "(عسى أن يخرج زيد)"۔ اور کبھی کبھی "أن" کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسری قسم (وقوع کے لیے) کاد ہے۔ آپ کہتے ہیں :"(كاد زيد يجيء)" (قریب تھا کہ زید آجاتا)۔ اور کبھی اس پر "أن" بھی داخل ہو جاتا ہے۔ اور جب کاد پر نفی داخل ہو تو اصح قول کے مطابق وہ دیگر افعال کی طرح ہی (نفی کا معنی دیتا) ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ وہ مطلقاً اثبات کے لیے ہوتا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ ماضی میں اثبات کے لیے ہوتا ہے اور مستقبل میں دیگر افعال کی طرح (نفی کے لیے)؛ اللہ تعالیٰ کے فرمان {وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ} (اور وہ کرنے کے قریب نہ تھے) اور ذوالرمہ کے شعر کی دلیل پکڑتے ہوئے:"جب جدائی محبت کرنے والوں کو بدل دے تو قریب نہیں کہ میّہ کی محبت کا پوشیدہ درد ختم ہو جائے۔" اور تیسری قسم (شروع کرنے کے لیے) طفق، کرب، جعل اور أخذ ہیں، اور یہ کاد کی مثل ہیں اور أوشك بھی (اسی باب سے ہے)، اور وہ استعمال میں عسی اور کاد دونوں کی مثل ہے۔

تشریح

افعالِ مقاربہ کی تعریف اور اقسام

مصنف رحمہ اللہ، افعالِ ناقصہ کے بعد ان سے مشابہت رکھنے والے افعال یعنی "افعالِ مقاربہ" کا بیان شروع فرمارہے ہیں۔ یہ افعال عمل میں تو "کان" کی طرح ہیں (یعنی اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں)، لیکن ان کی خبر ہمیشہ فعل مضارع کا صیغہ ہوتی ہے۔ انہیں "مقاربہ" یعنی "قربت والے افعال" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی خبر وقوع کے قریب ہے۔

افعالِ مقاربہ کی تعریف اور اقسام

أفعال المقاربة :ما وضع لدنوّ الخبر رجاء أو حصولا أو أخذا فيه.

مصنفؒ ان کی جامع تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ افعال ہیں جو خبر کے قریب ہونے کو بتانے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

پھر مصنفؒ اس قربت کی تین مختلف نوعیتوں کی بنیاد پر ان افعال کو تین قسموں میں تقسیم فرماتے ہیں:

رجاءً (امید کے طور پر) :جب خبر کے واقع ہونے کی امید اور توقع ہو۔ انہیں افعالِ رجاء کہتے ہیں۔

حصولًا (وقوع کے طور پر) :جب خبر حقیقتاً واقع ہونے کے بہت قریب ہو۔ انہیں افعالِ مقاربہ (خاص) کہتے ہیں۔

أخذًا فیہ (شروع ہونے کے طور پر) :جب فاعل نے خبر والے کام کو شروع کر دیا ہو۔ انہیں افعالِ شروع کہتے ہیں۔

پہلی قسم :افعالِ رجاء (امید کے لیے) مصنفؒ فرماتے ہیں کہ متکلم کو اس بات کی اُمید ہو کہ خبر کا حصول فاعل کے لیے قریب ہے اور اسکے لیے افعال مقاربہ میں سے عَسٰی استعمال ہوتا ہے۔عَسٰی وہ فعل جامد ہے جس کے ماضی کے صیغوں کے علاوہ اور کوئی صیغہ نہیں بن سکتا اور وہ صیغے یہ ہیں :عَسٰی، عَسَتْ پس اس سے مضارع امر نہی اسم فاعل اسم مفعول کے صیغے نہیں آئیں گے۔ ماضی کے اس کے چند صیغے آتے ہیں جو یہ ہیں عَسٰی،عَسَتْ،عَسَیْتَ، عَسَیْتُمَا ، عَسَیْتُمْ ،عَسَیْتِ،عَسَیْتُمَا،عَسَیْتُنَّ " اور عَسَیْتُ۔ یہ چند صیغے اس کے آتے ہیں۔

اس کی خبر پر أن ناصبہ کا آنا غالب اور فصیح ہے، اگرچہ مصنفؒ کے بقول کبھی اسے حذف بھی کر دیا جاتا ہے۔

مصنفؒ نے اس کے استعمال کی دو صورتیں بیان کی ہیں :عَسَی زَیْدٌ أَنْ یَخْرُجَ :اس صورت میں عَسَی فعل ناقص ہے، زَیْدٌ اس کا اسم مرفوع ہے، اور أَنْ یَخْرُجَ کا پورا جملہ (مصدر مؤول) محلًا منصوب اس کی خبر ہے۔

عَسَی أَنْ یَخْرُجَ زَیْدٌ :اس صورت میں عَسَی فعل تامّہ ہے، اور أَنْ یَخْرُجَ کا پورا جملہ (مصدر مؤول) محلًا مرفوع اس کا فاعل ہے، اور زَیْدٌ آگے فعل یَخْرُجَ کا فاعل ہے۔

دوسری قسم :افعالِ مقاربہ (وقوع کے لیے) مصنفؒ اس قسم کے لیے فعل کَادَ کا ذکر فرماتے ہیں، جس کا معنی ہے "قریب تھا کہ۔۔۔"۔

اس کے احکام یہ ہیں :اس کی خبر عموماً فعل مضارع بغیر "أن" کے ہوتی ہے، جیسے کَادَ زَیْدٌ أن یجیء (قریب تھا کہ زید آجاتا، مگر آیا نہیں)۔

مصنفؒ کے بقول کبھی کبھی اس پر "أن" بھی داخل ہو جاتا ہے، لیکن یہ بہت کم ہے، جیسے کَادَ زَیْدٌ أن یَجِیءَ

وإذا دخل النّفي على (كاد) فهو كالأفعال على الأصحّ، وقيل: يكون للإثبات مطلقا، وقيل: يكون في الماضي للإثبات، وفي المستقبل كالأفعال، تمسكا بقوله تعالى: {وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ}، وبقول ذي الرّمّة

کَادَ پر نفی کا حکم: یہ ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے جسے مصنفؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جب کَادَ پر نفی (مَا یا لَمْ) داخل ہو تو اس کا معنی کیا ہوگا؟

اصح قول: یہ ہے کہ یہ باقی افعال کی طرح ہی ہے، یعنی نفی قربت کی نفی کرے گی۔ پس مَا کَادَ یَفْعَلُ کا معنی ہوگا "وہ کرنے کے قریب بھی نہیں ہوا"۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ یہ مطلقاً اثبات کا معنی دیتا ہے۔ یعنی مَا کَادَ یَفْعَلُ کا معنی ہوگا فَعَلَهُ (اس نے کام کر لیا) لیکن بہت مشکل اور مشقت کے بعد۔

تیسرا قول: یہ تفصیل کا قول ہے کہ اگر نفی ماضی (مَا کَادَ) پر ہو تو یہ اثبات کا معنی دے گا، اور اگر مستقبل (لَمْ یَکَدْ) پر ہو تو یہ عام افعال کی طرح نفی کا ہی معنی دے گا۔ اس قول کے قائلین نے دو دلیلیں پیش کی ہیں:

قرآنی دلیل (ماضی): وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا بَقَرَةً ... فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ (پھر انہوں نے اسے ذبح کر دیا حالانکہ وہ ذبح کرنے کے قریب نہ تھے)۔ یہاں وَمَا کَادُوا یَفْعَلُونَ کے باوجود آخر کار انہوں نے کام کر لیا، تو نفی نے اثبات کا فائدہ دیا۔

شعری دلیل (مستقبل): ذوالرمہ کے شعر میں؛

إذا غيّر الهجر المحبّين لم يكد ... رسيس الهوى من حب ميّة يبرح

"جب جدائی محبت کرنے والوں کو بدل دے تو قریب نہیں کہ میّہ کی محبت کا پوشیدہ درد ختم ہو جائے۔"

لَمْ یَکَدْ ... یَبْرَحُ کا مطلب ہے کہ "محبت کا درد ہرگز ختم نہیں ہوگا"، جو کہ خالص نفی ہے۔

تیسری قسم: افعالِ شروع (شروع کرنے کے لیے) مصنفؒ اس قسم کے لیے طفق، کرب، جعل، اور أخذ جیسے افعال شمار کراتے ہیں۔ ان سب کا معنی "شروع کرنا" ہوتا ہے۔ ان کا حکم کاد کی طرح ہے، یعنی ان کی خبر فعل مضارع ہوتی ہے اور اس پر "أن" داخل نہیں ہوتا۔ "أن" کا نہ آنا اس لیے ضروری ہے کہ "أن" استقبال پر دلالت کرتا ہے جبکہ یہ افعال کام کے فی الحال شروع ہو جانے کو بتاتے ہیں، جیسے طفق زید یتلو۔ باقی الفاظ بھی اسی طرح ہیں جیسے جعل زید یکتب، کرب زید یکتب، طفق زید یَکتبُ اور أخَذَ زید یکتبُ

أَوْشَكَ: آخر میں مصنفؒ نے فعل أوشك کا ذکر فرمایا۔ یہ بھی مقاربہ کے معنی میں ہے لیکن استعمال میں یہ عسی اور کاد دونوں کی طرح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خبر پر "أن" لانا بھی فصیح ہے (یہ عسی کی مشابہت ہے) اور "أن" کے بغیر لانا بھی جائز ہے (یہ کاد کی مشابہت ہے)، تاہم "أن" کا لانا زیادہ عام ہے۔

[أفعال التّعجّب]:

فعل التّعجّب :ما وضع لإنشاء التّعجّب، وله صيغتان :ما أفعله، وأفعل به. وهما غير متصرّفين، مثل :(ما أحسن زيدا) و (أحسن بزيد)، ولا يبنيان إلاّ ممّا يبنى منه أفعل التّفضيل، ويتوصّل في الممتنع بمثل (ما أشدّ استخراجه) و (أشدد باستخراجه). ولا يتصرّف فيهما بتقديم ولا تأخير ولا فصل، وأجاز المازنيّ الفصل بالظّرف. و (ما) ابتداء نكرة عند سيبويه وما بعدها الخبر، وموصولة عند الأخفش والخبر محذوف. و (به) فاعل، [و (أفعل) أصله خبر] عند سيبويه، ولا ضمير في (أفعل)، وأمر عند الأخفش، والباء للتّعدية، أو زائدة ففيه ضمير.

ترجمہ؛[افعالِ تعجب]: فعلِ تعجب وہ ہے جو تعجب (حیرت) پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو، اور اس کے دو صیغے ہیں: مَا أَفْعَلَهُ، اور أَفْعِلْ بِهٖ۔ اور یہ دونوں (صیغے) غیر متصرف ہیں، جیسے :(مَا أَحْسَنَ زَيْدًا) (زید کتنا حسین ہے!) اور (أَحْسِنْ بِزَيْدٍ) (زید کیا ہی حسین ہے!)۔ اور یہ دونوں صیغے صرف اسی (فعل) سے بنائے جاتے ہیں جس سے "أفعل التفضيل" (اسم تفضیل) بنتا ہے، اور جس فعل سے (براہِ راست بنانا) ممنوع ہو، اس میں (مَا أَشَدَّ اسْتِخْرَاجَهُ) اور (أَشْدِدْ بِاسْتِخْرَاجِهٖ) جیسی ترکیب کے ذریعے (تعجب کا معنی) حاصل کیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں (صیغوں) میں تقدیم، تاخیر یا فصل (اجزاء کو الگ کرنے) کے ذریعے کوئی تصرف نہیں کیا جاسکتا، البتہ امام مازنیؒ نے ظرف کے ساتھ فصل کی اجازت دی ہے۔ اور (مَا) سیبویہ کے نزدیک نکرہ مبتدا ہے اور اس کے بعد والا (جملہ) خبر ہے، اور اخفش کے نزدیک یہ اسم موصولہ ہے اور خبر محذوف ہے۔ اور (بِہٖ) سیبویہ کے نزدیک فاعل ہے، [اور "أَفْعِلْ" دراصل خبر تھا]، اور "أَفْعِلْ" میں کوئی ضمیر نہیں ہے۔ اور اخفش کے نزدیک یہ (أَفْعِلْ) امر کا صیغہ ہے، اور "باء" تعدیہ کے لیے ہے، یا زائدہ ہے، پس (اگر زائدہ ہے تو) اس (فعل) میں ضمیر ہے۔

تشریح:

فعلِ تعجب کی تعریف اور صیغے

مصنف رحمہ اللہ یہاں سے اسلوبِ تعجب اور اس کے لیے وضع کردہ افعال کا بیان فرمارہے ہیں۔ تعجب دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو کسی چیز کی صفت میں عظمت یا خوبی کو غیر معمولی انداز میں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

فعلِ تعجب کی تعریف اور صیغے

فعل التّعجّب :ما وضع لإنشاء التّعجّب،

مصنفؒ اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ وہ فعل ہے جسے "اِنشاءِ تعجب" کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ "اِنشاء" کا لفظ یہاں بہت اہم ہے، جس کا مطلب ہے کہ ان صیغوں کا مقصد تعجب کی خبر دینا نہیں، بلکہ خود تعجب کا اظہار کرنا اور اسے وجود میں لانا ہے۔

پھر مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس کے دو بنیادی صیغے ہیں:

مَا أَفْعَلَهُ: جیسے مَا أَحْسَنَ زَيْدًا! (زید کتنا خوبصورت ہے!)

أَفْعِلْ بِهِ: جیسے أَحْسِنْ بِزَيْدٍ! (زید کیا ہی خوبصورت ہے!) مصنفؒ نے واضح فرمایا کہ یہ دونوں صیغے غیر متصرف ہیں، یعنی یہ ہمیشہ اسی شکل میں استعمال ہوتے ہیں، ان سے مضارع، امر یا دیگر صیغے نہیں بنتے۔

ولا يبنيان إلاّ ممّا يبنى منه أفعل التّفضيل، ويتوصّل في الممتنع بمثل (ما أشدّ استخراجه) و(أشدد باستخراجه).

افعالِ تعجب بنانے کے قواعد شرائط :

مصنفؒ ایک نہایت اہم اصول بیان کرتے ہیں کہ یہ صیغے ہر فعل سے نہیں بنائے جا سکتے، بلکہ صرف ان افعال سے بنتے ہیں جن سے اسم تفضیل (أفعل التفضیل) بن سکتا ہو۔ اس کی شرائط یہ ہیں کہ فعل :(۱) ثلاثی مجرد ہو، (۲) تام ہو، (۳) مثبت ہو، (۴) معلوم ہو، (۵) متصرف ہو، (۶) اس کا معنی درجوں اور کمی بیشی کو قبول کرتا ہو، اور (۷) وہ رنگ یا عیب پر دلالت نہ کرتا ہو۔

ممنوع افعال سے تعجب کا طریقہ :

اگر کسی فعل میں مذکورہ شرائط نہ پائی جائیں، جیسے وہ ثلاثی سے زائد ہو (اسْتَخْرَجَ) یا رنگ پر دلالت کرے (احمر)، تو مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس سے تعجب کا معنی حاصل کرنے کے لیے ایک فعل جیسے أَشَدَّ یا أَكْثَرَ استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس فعل کا مصدر منصوب ذکر کر دیا جاتا ہے۔

مثال :اسْتَخْرَجَ سے تعجب بنانے کے لیے کہیں گے :مَا أَشَدَّ اسْتِخْرَاجَهُ! (اس کا نکالنا کتنا سخت ہے!) اور أَشْدِدْ بِاسْتِخْرَاجِهِ!۔

ولا يتصرّف فيهما بتقديم ولا تأخير ولا فصل، وأجاز المازنيّ الفصل بالظّرف.

نحوی ساخت کے احکام

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان صیغوں کی ساخت جامد ہے، ان میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں، نہ تو ان کے اجزاء کو آگے پیچھے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فاصلہ لایا جا سکتا ہے۔ آپ مَا زَيْدًا أَحْسَنَ! یا أَحْسِنْ-وَاللهِ-بِزَيْدٍ نہیں کہہ سکتے۔

امام مازنیؒ کی رائے :مصنفؒ نے ایک استثناء ذکر کیا ہے کہ امام مازنیؒ کے نزدیک اگر فاصلہ لانے والی چیز ظرف یا جار مجرور ہو تو جائز ہے۔ جیسے مَا أَحْسَنَ الْيَوْمَ زَيْدًا!۔

و(ما) ابتداء نكرة عند سيبويه وما بعدها الخبر، وموصولة عند الأخفش والخبر محذوف. و(به) فاعل، و(أفعل) أصله خبر عند سيبويه، ولا ضمير في (أفعل)، وأمر عند الأخفش، والباء للتّعدية، أو زائدة ففيه ضمير.

دونوں صیغوں کی نحوی ترکیب

یہاں سے مصنفؒ ان دونوں صیغوں کی نحوی ترکیب میں نحویوں کے دو بڑے اماموں، سیبویہ اور اخفش، کے اختلاف کو بیان فرما رہے ہیں۔

پہلا صیغہ :مَا أَحْسَنَ زَيْدًا

امام سیبویہؒ کا مسلک :

ان کے نزدیک ما نکرہ تامہ ہے بمعنی "شَیْءٌ عَظِیْمٌ" (کوئی عظیم چیز) اور یہ مبتدا ہے۔اس کے بعد پورا جملہ أَحْسَنَ زَیْدًا (جس میں احسن فعل، اس کا فاعل ضمیر "ھو" جو "ما" کی طرف لوٹ رہی ہے، اور "زیدًا" مفعول بہ ہے) اس کی خبر ہے۔ ترکیب کا لفظی معنی ہوگا: "ایک عظیم چیز نے زید کو حسین بنادیا"۔

امام اخفشؒ کا مسلک :

ان کے نزدیک ما اسم موصولہ بمعنی "الَّذِیْ" ہے اور مبتدا ہے۔ اس کے بعد أَحْسَنَ زَیْدًا اس کا صلہ ہے۔ اور مبتدا کی خبر محذوف ہے، تقدیر عبارت ہوگی: اَلَّذِیْ أَحْسَنَ زَیْدًا شَیْءٌ عَظِیْمٌ (وہ چیز جس نے زید کو حسین بنایا، عظیم ہے)۔

دوسرا صیغہ: أَحْسِنْ بِزَیْدٍ

امام سیبویہؒ کا مسلک

: ان کے نزدیک أَحْسِنْ فعل ماضی ہے جو امر کی صورت پر آیا ہے تاکہ انشاء (تعجب پیدا کرنے) کا معنی دے سکے۔ بِ حرف جر زائدہ ہے جو تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ اور زَیْدٍ لفظاً مجرور لیکن محلاً مرفوع فاعل ہے۔ اصل عبارت حَسُنَ زَیْدٌ (زید حسین ہوا) کی طرح تھی۔

امام اخفشؒ کا مسلک :

ان کے نزدیک أَحْسِنْ اپنی صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے فعل امر ہے۔ اس کی ترکیب میں پھر دو رائے ہیں

: بِ تعدیہ کے لیے ہے۔ یعنی اس نے فعل لازم حَسُنَ کو متعدی بنادیا۔ معنی ہوگا: "اے مخاطب! زید کو حسین بنادے"۔ بِ زائدہ ہے، اور اس صورت میں أَحْسِنْ میں "أَنْتَ" کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ معنی ہوگا: "تو حسین ہو جا زید کے ساتھ"۔

[أفعال المدح والذّم]:

أفعال المدح والذّم: ما وضع لإنشاء مدح أو ذمّ، فمنها: (نعم) و(بئس). وشرطهما أن يكون الفاعل معرّفا باللّام، أو مضافا الى المعرّف بها، أو مضمرا مميّزا بنكرة منصوبة، أو ب(ما) مثل {فَنِعِمَّا هِيَ}، وبعد ذلك المخصوص، وهو مبتدأ ما قبله خبره، أو خبر مبتدأ محذوف مثل (نعم الرّجل زيد)، وشرطه مطابقة الفاعل، و{بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا} وشبهه متأوّل. وقد يحذف المخصوص إذا علم مثل {نِعْمَ الْعَبْدُ} و{فَنِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ} و(ساء) مثل (بئس)، ومنها (حبّذا) وفاعله (ذا)، ولا يتغيّر وبعده المخصوص، وإعرابه كإعراب مخصوص (نعم)، ويجوز أن يقع قبل المخصوص وبعده تمييز أو حال على وفق مخصوصه.

ترجمہ: [افعال مدح وذم]: افعالِ مدح وذم وہ ہیں جو مدح (تعریف) یا ذم (برائی) پیدا کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہوں، پس ان میں سے نعم (کیا ہی اچھا ہے) اور بئس (کیا ہی برا ہے) ہیں۔ اور ان دونوں کی شرط یہ ہے کہ ان کا فاعل یا تو لامِ تعریف کے ساتھ معرفہ ہو، یا ایسے اسم کی طرف مضاف ہو جو لام سے معرفہ ہو، یا ایک پوشیدہ ضمیر ہو جس کی وضاحت ایک نکرہ منصوب (تمییز) سے کی گئی ہو، یا "ما" کے ساتھ کی گئی ہو جیسے {فَنِعِمَّا هِيَ}۔ اور اس (فاعل) کے بعد مخصوص (جس کی مدح یا ذم کی

جائے) آتا ہے، اور وہ (مخصوص) مبتدا ہوتا ہے جس کا ماقبل اس کی خبر ہے، یا وہ ایک محذوف مبتدا کی خبر ہوتا ہے، جیسے :(نعم الرّجل زید)۔ اور اس (مخصوص) کی شرط فاعل کے مطابق ہونا ہے، اور آیت {بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا} اور اس جیسی مثالیں تاویل شدہ ہیں۔ اور کبھی مخصوص کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے جب وہ معلوم ہو، جیسے {نِعْمَ الْعَبْدُ} اور {فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ}۔ اور ساء بھی بئس کی طرح ہے۔ اور ان (افعال) میں سے حبّذا بھی ہے، اور اس کا فاعل ذا ہے اور وہ بدلتا نہیں، اور اس کے بعد مخصوص آتا ہے، اور اس کا اعراب نعم کے مخصوص کے اعراب کی طرح ہے۔ اور جائز ہے کہ مخصوص سے پہلے اور بعد میں تمیز یا حال واقع ہو جو مخصوص کے موافق ہو۔

تشریح:

مصنف رحمہ اللہ یہاں سے مدح وذم اور اس کے لیے وضع کردہ افعال کا بیان فرما رہے ہیں۔ یہ وہ افعال ہیں جن کا مقصد کسی کی تعریف یا برائی کی خبر دینا نہیں، بلکہ "إنشاء" یعنی خود تعریف یا برائی کا اظہار کرنا ہے۔ یہ افعال جامد ہوتے ہیں، یعنی صرف ماضی کے صیغے میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔

افعال مدح وذم کی تعریف :

افعال مدح وذم ان افعال کو کہتے ہیں جو کسی کی اچھائی یا بُرائی پر دلالت کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہوں۔ اور افعال مدح وذم چار ہیں: (۱) نِعْمَ اور (۲) حَبَّذَا یہ اچھائی اور تعریف کے لیے آتے ہیں اور (۳) بِئْسَ اور (۴) سَاءَ یہ برائی اور مذمت کے لیے آتے ہیں۔

پہلی قسم :نعم اور بئس

مصنفؒ سب سے پہلے نعم (مدح کے لیے) اور بئس (ذم کے لیے) کا ذکر فرماتے ہیں۔ پھر ان کے فاعل کی شرائط بیان کرتے ہیں۔

نعم اور بئس کے فاعل کی صورتیں:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ان کا فاعل چار میں سے کسی ایک حالت پر ہونا شرط ہے:

معرّف باللام :فاعل پر الف لام داخل ہو، جیسے :نِعْمَ **الرَّجُلُ** زَيْدٌ (زید کیا ہی اچھا آدمی ہے!)۔

معرف باللام کی طرف مضاف :فاعل ایسے اسم کی طرف مضاف ہو جس پر الف لام ہو، جیسے :نِعْمَ **صَاحِبُ الدَّارِ** زَيْدٌ (زید گھر کا کیا ہی اچھا ساتھی ہے!)۔

ضمیر مستتر جس کی تمیز نکرہ ہو :فاعل ایک پوشیدہ ضمیر (مثلاً "ھو") ہو جس کی وضاحت بعد میں آنے والا کوئی نکرہ منصوب اسم بطورِ تمیز کر رہا ہو، جیسے :نِعْمَ **رَجُلًا** زَيْدٌ۔ یہاں نِعْمَ کا فاعل "ھو" کی ضمیر ہے جو اس میں پوشیدہ ہے اور رَجُلًا تمیز ہے۔

ضمیر مستتر جس کی تمیز "ما" ہو :فاعل پوشیدہ ضمیر ہو جس کی وضاحت "ما" سے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان :فَنِعِمَّا هِيَ۔

مصنفؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی اصل نِعْمَ مَا هِيَ ہے، یعنی "کیا ہی اچھی چیز ہے وہ"۔
بئس کا فاعل بھی نعم کی طرح سے آسکتا ہے (۱) مطلب بئس کا فاعل معرف باللام ہو جیسے :بئس الرجل عَمْرٌو :بئس فعل ذم الرجل فاعل عمرٌو مبتدا مخصوص بالذم۔
(۲) بئسکا فاعل معرف باللام کی طرف مضاف ہو جیسے :بِئْسَ غُلَامُ الرَّجُلِ عمرو۔
(۳) فاعل بشکل ضمیر مستتر ہو۔ یعنی اس کی ضمیر لائی جائے گی۔ نکرہ منصوبہ کے ساتھ یا ما زندہ کے ساتھ جیسے بئس رجل عمرو اور بئس ما در ھما

المخصوص بالمدح أو الذم

فاعل کے بعد وہ اسم آتا ہے جس کی تعریف یا مذمت مقصود ہوتی ہے، جسے "مخصوص" کہتے ہیں۔
اعراب :
مصنفؒ اس کے اعراب کی دو جائز صورتیں بیان فرماتے ہیں: یہ مبتدأ مؤخر ہو اور اس سے پہلے والا جملہ (نِعْمَ الرَّجُلُ) خبر مقدم ہو۔ یہ ایک محذوف مبتدا کی خبر ہو، یعنی نِعْمَ الرَّجُلُ کے بعد تقدیر عبارت هُوَ زَيْدٌ (وہ زید ہے) ہو۔

وشرطه مطابقة الفاعل، و {بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا} وشبهه متأوّل.

مخصوص کی شرط اور ایک اشکال کا جواب :
مصنفؒ شرط بیان فرماتے ہیں کہ مخصوص کو فاعل کے مطابق (عدد اور جنس میں) ہونا چاہیے۔ لیکن اس پر قرآن کی آیت بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا سے اعتراض ہوتا ہے کہ یہاں فاعل مَثَلُ مفرد ہے جبکہ مخصوص الَّذِينَ جمع ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ اور اس جیسی مثالیں "متأوّل" ہیں، یعنی ان کی نحوی توجیہ اور تاویل کی گئی ہے۔ تاویل یہ ہے کہ یہاں مخصوص محذوف ہے، یعنی بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ مَثَلُهُمْ (قوم کی مثال کیا ہی بری ہے، یعنی ان کی مثال)۔ اور الَّذِينَ كَذَّبُوا آگے الْقَوْمِ کی صفت ہے، مخصوص بالذم نہیں۔

وقد يحذف المخصوص إذا علم مثل {نِعْمَ الْعَبْدُ} و {فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ}

مخصوص کا حذف :
مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کلام میں قرینہ موجود ہو اور مخصوص معلوم ہو تو اسے حذف کیا جا سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمان :نِعْمَ الْعَبْدُ (کیا ہی اچھا بندہ ہے!)، یہاں مخصوص یعنی أَيُّوبُ محذوف ہے۔ اسی طرح فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ (ہم کیا ہی اچھے ہموار کرنے والے ہیں!)، یہاں مخصوص یعنی نَحْنُ محذوف ہے۔
سَاءَ : مصنفؒ نے فرمایا کہ سَاءَ (برا ہے) بھی ذم میں بِئْسَ کی طرح ہی عمل کرتا ہے۔ جیسے :سَاءَ رَجُلًا زَيْدٌ۔
سَاءَ کے فاعل کی بھی تین ہی قسمیں ہیں:
(۱)... سَاءَ کا فاعل معرف باللام ہو جیسے سَاءَ الرجل زید۔

(۲)...سَاءَ کا فاعل معرف باللام کی طرف مضاف ہو جیسے سَآءَ غلامُ الرجلِ زیدٌ۔
(۳)...سَاءَ کا فاعل بشکل ضمیر مستتر ہو پھر اس کی تمیز نکرہ منصوبہ ہو جیسے سَآءَ رجلاً زیدٌ... یا تمیز ما کے ساتھ ہو جیسے سَآءَ ما دینارٌ۔

ومنها (حبّذا) وفاعله (ذا)، ولا يتغيّر وبعده المخصوص، وإعرابه كإعراب مخصوص (نعم)، ويجوز أن يقع قبل المخصوص وبعده تمييز أو حال على وفق مخصوصه.

دوسری قسم :

حبّذا مصنفؒ مدح کے لیے دوسری قسم حبّذا بیان فرمارہے ہیں۔

ساخت اور فاعل :

یہ ترکیب حَبَّ (فعل) اور ذَا (اسم اشارہ) سے مل کر بنی ہے اور مصنفؒ نے واضح فرمایا کہ اس کا فاعل ہمیشہ ذَا ہی ہوتا ہے۔

عدمِ تغیر : ذَا بطورِ فاعل ہمیشہ مفرد مذکر ہی رہتا ہے، خواہ مخصوص کوئی بھی ہو۔ آپ کہیں گے : حَبَّذَا زَيْدٌ، حَبَّذَا الزَّيْدَانِ، حَبَّذَا هِنْدٌ۔

مخصوص کا اعراب : اس کا مخصوص بھی نِعْمَ کے مخصوص کی طرح مبتدأ مؤخر یا خبر لمبتدأ محذوف ہوتا ہے۔

تمیز اور حال کا استعمال : مصنفؒ نے ایک اضافی نکتہ بیان کیا کہ حبّذا کے مخصوص سے پہلے یا بعد میں کوئی اسم بطورِ تمیز یا حال آ سکتا ہے جو مخصوص کے مطابق ہوگا۔ جیسے : حَبَّذَا زَيْدٌ رَاكِبًا (زید کیا ہی اچھا ہے سوار ہونے کی حالت میں !)۔ یہاں رَاكِبًا حال ہے۔

[الحروف]

الحرف : ما دلّ على معنى في غيره ومن ثمّ احتاج في جزئيّته إلى اسم أو فعل.

ترجمہ "الحرف" وہ ہے جو خود تو کوئی معنی نہ رکھتا ہو لیکن جب کسی دوسرے کلمے (اسم یا فعل) کے ساتھ ملے تو اس میں ایک خاص معنی پیدا ہو جائے۔

تشریح

حرف کی جامع اور مانع تعریف

مصنفؒ یہاں سے حرف کی جامع اور مانع تعریف بیان فرمارہے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ حرف وہ کلمہ ہے جو بذاتِ خود اپنے معنی پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ اسے اپنے معنی کی تکمیل کے لیے کسی دوسرے کلمے (اسم یا فعل) کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس تعریف کے دو حصے ہیں: "ما دلّ على معنى في غيره" : یہ عبارت حرف کی حقیقت اور اس کی سب سے بڑی پہچان بیان کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرف کے اندر کوئی مستقل معنی نہیں ہوتے۔ اس کا معنی کسی اور کلمے کے ساتھ جڑ کر ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، "في" کا لفظ اکیلا کوئی خاص معنی نہیں دیتا، لیکن جب یہ کسی جملے میں آتا ہے جیسے "في الدار" (گھر میں)،

تو "فی" نے "گھر" کے ساتھ مل کر "ظرفیت" (کسی چیز کے اندر ہونے) کا معنی پیدا کر دیا۔ اسی طرح "من" کا معنی "ابتداء" کا ہوتا ہے، لیکن یہ معنی کسی اسم یا فعل کے ساتھ مل کر ہی واضح ہوتا ہے۔ "ومن ثمّ احتاج في جزئيّته إلى اسم أو فعل": یہ عبارت پہلے حصے کا نتیجہ ہے۔ جب حرف کا معنی کسی اور کے ساتھ مل کر ہی ظاہر ہوتا ہے، تو لازمی طور پر اسے اپنے معنی کی وضاحت کے لیے کسی اسم یا فعل کی ضرورت پڑتی ہے۔ للذا، حرف اپنے معنی کے اظہار کے لیے مکمل طور پر اسم یا فعل کا محتاج ہوتا ہے۔

[حروف الجر]:

حروف الجرّ :ما وضع للإفضاء بفعل أو معناه إلى ما يليه، وهي: (من)، و (إلى)، و (حتّى)، و (في)، والباء، واللام، و (ربّ)، وواوها، وواو القسم، وتاؤه، وباؤه، و (عن)، و (على)، والكاف، و (مذ)، و (منذ)، و (حاشا)، و (عدا)، و (خلا). ف (من) للابتداء، والتّبيين، والتّبعيض، وزائدة في غير الموجب (1)، خلافا للكوفيّين والأخفش، و (قد كان من مطر) وشبهه متأوّل. و (إلى) للانتهاء، وبمعنى (مع) قليلا. و (حتّى) كذلك، وبمعنى (مع) كثيرا، و تختصّ بالظّاهر، خلافا للمبرّد. و (في) للظّرفيّة، وبمعنى (على) قليلا. و (الباء) للإلصاق، والاستعانة، والمصاحبة، والتّعدية، والمقابلة، والظّرفيّة، وزائدة في الخبر في الاستفهام، والنّفي قياسا، وفي غيره سماعا مثل (بحسبك زيد)، و (ألقى بيده).

ترجمہ حروفِ جر وہ ہیں جو فعل یا اس کے معنی کو اس کے بعد والے اسم تک پہنچانے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ یہ ہیں :مِنْ، إِلَى، حَتَّى، فِي، باء، لام، رُبَّ اور اس کی واؤ، قسم کی واؤ، تا، اور با، عَنْ، عَلَى، کاف، مُذْ، مُنْذُ، حَاشَا، عَدَا، خَلَا۔ پس، مِنْ ابتداء، بیان، تبعیض (حصہ) کے لیے اور غیرِ موجب جملے میں زائد ہوتا ہے، برخلاف کوفیوں اور اخفش کے، اور (قَدْ كَانَ مِنْ مَطَرٍ) اور اس جیسے جملوں کی تاویل کی جاتی ہے۔ اور إِلَى انتہا کے لیے اور کبھی کبھار 'مع' کے معنی میں آتا ہے۔ اور حَتَّى بھی اسی طرح (انتہا کے لیے) اور کثرت سے 'مع' کے معنی میں آتا ہے، اور یہ اسمِ ظاہر کے ساتھ خاص ہے، برخلاف مبرّد کے۔ اور فِي ظرفیت کے لیے اور کبھی کبھار 'علی' کے معنی میں آتا ہے۔ اور بأء الصاق (ملا دینے)، استعانت، مصاحبت (ساتھ)، تعدیہ (فعل کو متعدی کرنا)، مقابلہ، ظرفیت کے لیے، اور استفہام اور نفی کے خبری جملے میں زائد ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ میں سماعی (عربوں سے سننے پر منحصر) ہوتا ہے جیسے :(بِحَسْبِكَ زَيْدٌ) اور (أَلْقَى بِيَدِهِ)۔

تشریح

حروفِ جر کی تعریف، تعداد، اور ان کے اہم معانی

مصنفؒ اس عبارت میں حروفِ جر کی تعریف، تعداد، اور ان کے اہم معانی کو بیان کر رہے ہیں۔

1. تعریف اور تعداد مصنفؒ فرماتے ہیں کہ حروفِ جر وہ ہیں جو اپنے سے پہلے فعل یا اس کے مشابہ (مثلاً اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ) کے معنی کو اپنے بعد والے اسم تک پہنچاتے ہیں۔ ان کو "حروفِ جر" اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے معمول (جس اسم پر داخل ہوتے ہیں) کو جر دیتے ہیں۔ مصنفؒ نے ان کی تعداد انیس بیان کی ہے، جو کہ (مِنْ، إِلَى، حَتَّى، فِي، باء، لام، رُبَّ، واوُ

رُبَّ، واوُ القسم، تاءُ القسم، باءُ القسم، عَنْ، عَلَی، کاف، مُذْ، مُنْذُ، حَاشَا، عَدَا، خَلَا) ہیں۔ یہ تمام حروف اپنے معمول کو جر دیتے ہیں۔

.2 حروف کے اہم معانی مصنفؒ ہر حرف کا ایک یا ایک سے زیادہ اہم معانی بیان کرتے ہیں

مِنْ :ابتداء : یہ کسی چیز کی ابتداء یا شروع ہونے کی جگہ بتاتا ہے، جیسے "سِرْتُ مِنَ الْبَيْتِ" (میں گھر سے چلا)۔

تبیین (بیان) : یہ موصوف کی صفت کو واضح کرتا ہے، جیسے "مَا فِي السَّمَاءِ إِلَّا سَحَابٌ مِنْ مَاءٍ" (آسمان میں پانی کا بادل ہے)۔

تبعیض (حصہ) : یہ کل میں سے ایک حصے کو ظاہر کرتا ہے، جیسے "أَخَذْتُ مِنْ مَالِهِ" (میں نے اس کے مال میں سے کچھ لیا)۔

زائدہ :یعنی کلام میں تاکیدِ معنی کے لیے آنا، جبکہ اس کا اپنا کوئی مستقل معنی نہ ہو۔ مصنف نے اس کے لیے شرط لگائی کہ یہ غیر موجب کلام میں ہو، یعنی نفی، نہی یا استفہام پر مشتمل جملے میں ہو۔ مثال (قرآن سے) :"مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ" (المائدہ: 19)۔ اصل میں "مَا جَاءَنَا بَشِيرٌ" تھا، "مِنْ" تاکید کے لیے لایا گیا، اور چونکہ کلام میں "مَا" نافیہ ہے، اس لیے یہاں اس کا زائد ہونا جائز ہے۔

اختلافِ علماء :

مصنف فرماتے ہیں کہ نحویینِ کوفہ اور امام اخفش بصرہ کے نزدیک "مِنْ" کلامِ موجب (مثبت جملے) میں بھی زائدہ آسکتا ہے، لیکن جمہور بصرہ (اور مصنف) اس کے قائل نہیں۔ وہ عرب کے قول "قَدْ كَانَ مِنْ مَطَرٍ" (بارش ہوئی تھی) جیسی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ مصنف اس کا جواب دیتے ہیں کہ "وَشِبْهُهُ مُتَأَوَّلٌ" یعنی ایسی مثالوں کی تاویل کی جائے گی۔ شارح فرماتے ہیں کہ اس کی تاویل یہ ہے کہ یہاں "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے اور اس کا مجرور محذوف ہے، یعنی اصل عبارت تھی "قَدْ كَانَ مِنْ مَطَرٍ شَيْءٌ" (بارش کا کچھ حصہ برسا تھا)۔ یا یہ کہ یہاں "مَطَرٍ" فاعل نہیں بلکہ "كَانَ" کا اسم ہے جو لفظاً مجرور ہے۔

إِلَی :دو معنوں کے لیے آتا ہے (۱) لانتہا الغاية غایت کی انتہاء کو بیان کرنے کے لیے کہ یہاں پر آکر بات پوری ہو گئی ہے جیسے پیچھے گزر چکا سرت من البصرة الی الکوفة تو کوفہ جو ہے یہ انتہائے غایۃ ہے یہاں پر سیر کی انتہاء ہو گئی۔ (۲) دوسرا الی بہت کم مَعَ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ ای مع المرافق اور یہی احناف کا قول کہ کہنیاں غسل ید میں داخل ہیں۔ مرافق تک نہیں بلکہ مع مرافق ہے اس کی تائید ہمارے اس نحو کے قاعدے سے بھی ہوتی ہے۔

حَتّٰی: حتی بھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے پہلا معنی اس کا الی کی طرح ہے جیسے :نمت البارحة حتی الصباح کہ حتی بھی انتہاء غایت کے لیے ہے۔

لیکن الی اور حتیٰ میں دو طرح کا فرق ہے۔

(۱) پہلا فرق :تو یہ ہے کہ الی، مَعَ کے معنی میں بہت کم استعمال ہوتا ہے اور حَتّٰی، مَعَ کے معنی میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا فرق :یہ ہے الیٰ اسم ظاہر پر بھی داخل ہوتا ہے اور اسم ضمیر پر بھی داخل ہوتا ہے لیکن حتیٰ صرف اسم ظاہر پر داخل ہو گا اور ضمیر پر کبھی بھی داخل نہیں ہو گا۔اسی کے اندر حتیٰ کا دوسرا معنی بھی آگیا کہ اکثر حتیٰ، مَعَ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے قدم الحاج حتی المشاۃ۔

حتی کے متعلق ایک ختلاف

جمہور کا مسلک :جمہور کا مسلک یہ ہے کہ حتی صرف اسم ظاہر پر داخل ہو گا ضمیر پر کبھی بھی داخل نہیں ہوگا۔ جیسے حتاہ یا حتاك وغیرہ یہ کہنا جائز نہیں ہے۔

جمہور کے برخلاف امام مبرد فرماتے ہیں کہ حتی اسم ظاہر پر اور ضمیر پر دونوں پر داخل ہو سکتا ہے استدلال کرتے ہیں ایک شاعر کے شعر سے اور وہ شعر یہ ہے:

فلا واللہ لا یبقی اناس حتاك یا ابن ابی زیاد

اللہ کی قسم کوئی انسان جوان باقی نہیں رہے گا یہاں تک کہ تو بھی اے ابن زیاد۔

شعر کی ترکیب:

فلا زائدہ وَاو قسمیہ جارہ لفظِ اللہ مجرور، جار مجرور مل کر متعلق اُقسِمُ فعل محذوف کا پھر یہ جملہ فعلیہ انشائیہ ہو کر قسم لایَبْقٰی فعل اُنَاسٌ فاعل فتًی مفعول حتاكَ جار مجرور مل کر فعل کا متعلق پھر یہ جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر جواب قسم، یاحرف نداء قائم مقام ادعوا فعل ضمیر مستتر فاعل ابن ابی زیاد مرکب اضافی ہو کر مفعول اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا۔

محل استشہاد اس شعر میں حتاكَ ہے۔امام مبرد کو جمہور کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے کہ شاذ یہ کیا ہے۔شاذ ہے ۔ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔

وفی للظرفیۃ :حروف جارہ میں سے ایک حرف فی بھی ہے۔حرف فی دو معنوں کے لیے آتا ہے (ا)... بمعنی ظرف۔ (۲)... بمعنی علیٰ۔

(ا)... بمعنی ظرف۔ بمعنی ظرف یعنی اس بات کو بتانے کے لیے کہ فی کا مدخول کسی چیز کے لیے ظرف ہے پھر چاہے یہ ظرف حقیقتًا ہو جیسے زیدفی الدّار زید گھر میں ہے اور نحن فی الفصل ہم کلاس میں ہیں اور المآءفی الکوز پانی کوزے میں ہے۔ یا مجازًا ہو جیسے نظرت فی الکتاب ایسے ہی النجات فی الصدق یہاں پر ظرف مجازا ہے۔

(۲)... بمعنی علیٰ :اور فی کبھی کبھی عَلیٰ کے معنی میں ہوتا ہے لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ای عَلٰی جُذُوْعِ النَّخْلِ میں تم کو ضرور بضرور پھانسی دوں گا کھجور کے تنوں پر۔(سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ا۷)

باء :الصاق :مصنفؒ کا کہنا ہے کہ حرف "باء" کے مندرجہ ذیل معانی ہیں

.1: الصاق (چپکنا یا قریب ہونا) :اس کا مطلب ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کے ساتھ چپکی ہوئی ہے یا اس کے بالکل قریب

ہے۔ یہ حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور مجازی بھی۔ مثال :"مَرَرْتُ بِزَيْدٍ" (میں زید کے پاس سے گزرا)۔ اس میں "باء" زید کے قریب سے گزرنے کو ظاہر کر رہی ہے۔

.2 **استعانت (مدد یا سہارا لینا)** :اس کا مطلب ہے کہ کوئی کام کسی چیز کی مدد سے کیا جائے۔ مثال :"كَتَبْتُ بِالْقَلَمِ" (میں نے قلم سے لکھا)۔ یہاں "قلم" لکھنے کے کام میں مددگار ہے۔

.3 **مصاحبت (ساتھ ہونا)** :اس کا مطلب ہے کہ کوئی کام کسی چیز کے ساتھ کیا جائے۔ مثال :"خَرَجْتُ بِزَيْدٍ" (میں زید کے ساتھ نکلا)۔ یہاں "باء" زید کے ساتھ ہونے کو ظاہر کر رہی ہے۔

.4 **تعدیہ (فعل کو متعدی بنانا)** :اس کا مطلب ہے کہ یہ حرف لازم فعل (وہ فعل جو صرف فاعل پر ختم ہو) کو متعدی فعل (وہ فعل جس میں فاعل اور مفعول دونوں ہوں) بنا دیتا ہے۔ مثال :"ذَهَبْتُ بِزَيْدٍ" (میں زید کو لے کر گیا)۔ یہاں "ذھب" کا اصل معنی "گیا" ہے جو کہ لازم ہے۔ "باء" کے اضافے سے یہ "لے کر گیا" ہو گیا اور اس نے "زید" کو مفعول بنا دیا۔

.5 **مقابلہ (بدلہ یا معاوضہ)** :اس کا مطلب ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کے بدلے میں دی جائے۔ مثال :"اِشْتَرَيْتُ الْكِتَابَ بِدِرْهَمٍ" (میں نے کتاب ایک درہم کے بدلے میں خریدی)۔ یہاں "باء" کتاب کی قیمت یعنی درہم کو ظاہر کر رہی ہے۔

.6 **ظرفیت (جگہ یا وقت)** :اس کا مطلب ہے کہ کوئی کام کسی خاص جگہ یا وقت میں کیا جائے۔ مثال :"جَلَسْتُ بِالْمَكْتَبَةِ" (میں لائبریری میں بیٹھا)۔ یہاں "باء" بیٹھنے کی جگہ کو ظاہر کر رہی ہے۔

.7 **زائدہ (اضافی)** :اس کا مطلب ہے کہ "باء" کبھی کبھی صرف تاکید کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اس کے بغیر بھی جملے کا معنی مکمل ہوتا ہے۔ یہ دو صورتوں میں ہوتا ہے:

الف :قیاسی طور پر (اصول کے مطابق) :استفہام میں :جب جملے میں سوال ہو۔ مثال :"هَلْ جِئْتَ بِشَيْءٍ؟" (کیا تم کچھ لے کر آئے ہو؟) یہاں "بشیء" میں "باء" زائد ہے۔ نفی میں :جب جملے میں نفی ہو۔ مثال :"مَا أَنْتَ بِقَائِمٍ" (تم کھڑے نہیں ہو)۔ یہاں "بقاءم" میں "باء" زائد ہے۔

ب :سماعی طور پر (اہل زبان کے استعمال کے مطابق) :یہ ان جگہوں پر ہوتی ہے جہاں نہ استفہام ہو اور نہ نفی، بلکہ اہل زبان نے اسے استعمال کیا ہو، جیسے :مثال :1"بِحَسْبِكَ زَيْدٌ" (تمہارے لیے زید کافی ہے)۔ یہاں "بحسبك" میں "باء" زائد ہے۔ مثال :2"أَلْقَى بِيَدِهِ" (اس نے اپنا ہاتھ ڈالا)۔ یہاں "بیدہ" میں "باء" زائد ہے اور اس کا مقصد صرف تاکید ہے۔

دیگر حروف جر

و (اللاّم) للاختصاص، والتّعليل، وزائدة، وبمعنى (عن) مع القول، وبمعنى الواو في القسم للتّعجّب. و (ربّ) للتّقليل، ولها صدر الكلام مختصّة بنكرة موصوفة على الأصحّ، وفعلها ماضٍ محذوف غالبا. وقد تدخل على مضمر مبهم مميّز بنكرة منصوبة، والضّمير مفرد مذكّر، خلافا للكوفيّين في مطابقة التّمييز. وتلحقها (ما) فتدخل على الجمل. و (واوها) تدخل

علی نکرۃ موصوفۃ. و (واو القسم) إنما تکون عند حذف الفعل لغیر السّؤال مختصّۃ بالظّاھر. و (التّاء) مثلھا مختصّۃ باسم اللہ تعالی. و (الباء) أعمّ منھما فی الجمیع. ویتلقّی القسم باللّام. و (إنّ)، وحرف النّفی، ویحذف جوابہ إذا اعترض، أو تقدّمہ ما یدلّ علیہ. و (عن) للمجاوزۃ. و (علی) للاستعلاء، وقد یکونان اسمین بدخول (من) علیھما. و (الکاف) للتّشبیہ، وزائدۃ، وقد تکون اسماً، وتختص بالظاھر. و (مذ) و (منذ) للابتداء فی الزّمان الماضی، والظّرفیۃ فی الحاضر، نحو (ما رأیتہ مذ شھرنا) و (منذ یومنا). و (حاشا) و (عدا) و (خلا) للاستثناء.

ترجمہ: اور لام اختصاص، تعلیل (سبب)، اور زائدہ کے لیے، اور 'قول' کے ساتھ 'عن' کے معنی میں، اور قسم میں 'واؤ' کے معنی میں تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور رُبَّ تقلیل (کمی) کے لیے ہے، اس کو کلام کی ابتداء میں لایا جاتا ہے، اور یہ اس نکرہ اسم کے ساتھ خاص ہے جو موصوف ہو، یہی صحیح قول ہے، اور اس کا فعل ماضی ہوتا ہے جو اکثر حذف ہو جاتا ہے، اور یہ کبھی مبہم ضمیر پر بھی داخل ہوتا ہے جو ایک نکرہ منصوب اسم کے ذریعے ممیّز (واضح) ہوتی ہے، اور وہ ضمیر مفرد مذکر کی ہوتی ہے، برخلاف کوفیوں کے جو تمیز کی مطابقت کے قائل ہیں۔ اور رُبَّ کے ساتھ 'ما' بھی لگتا ہے جس کے بعد یہ جملوں پر داخل ہوتی ہے۔ اور اس (ربَّ) کی واؤ بھی موصوف نکرہ پر داخل ہوتی ہے۔ اور قسم کی واؤ اس وقت ہوتی ہے جب فعل کو سوال کے علاوہ حذف کر دیا جائے، اور یہ اسم ظاہر کے ساتھ خاص ہے۔ اور تا بھی اسی طرح (قسم کے لیے ہے) اور اسم اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہے۔ اور با (قسم) ان دونوں سے زیادہ عام ہے تمام چیزوں میں۔ اور قسم کا جواب لام، ان، اور حرف نفی سے دیا جاتا ہے، اور اگر جواب میں کوئی اعتراض ہو یا اس سے پہلے کوئی ایسی چیز آجائے جو اس پر دلالت کرتی ہو تو اس کا جواب حذف کر دیا جاتا ہے۔ اور عَنْ تجاوز (گزرنے) کے لیے ہے۔ اور عَلٰی استعلاء (اوپر ہونے) کے لیے ہے۔ اور یہ دونوں کبھی 'مِن' کے ان پر داخل ہونے کی وجہ سے اسم بن جاتے ہیں۔ اور کاف تشبیہ کے لیے اور زائدہ بھی ہوتا ہے، اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے، اور یہ اسم ظاہر کے ساتھ خاص ہے۔ اور مُذ اور مُنذُ ماضی کے زمانے میں ابتداء کے لیے اور حال کے زمانے میں ظرفیت کے لیے آتے ہیں، جیسے: (ما رأیتہ مذ شھرنا) اور (منذ یومنا)۔ اور حَاشَا، عَدَا اور خَلَا استثناء کے لیے ہیں۔

تشریح

مصنف رحمہ اللہ یہاں سے حرفِ جر "لام" کے معانی واستعمالات بیان فرما رہے ہیں۔

لام کئی معنوں میں ستعال ہوتا ہے:

(۱)...پہلا معنی للاختصاص: اختصاص کے لیے یعنی اپنے مدخول کو کسی چیز کے ساتھ ثابت کرنے کے لیے پھر یہ ثبوت بطور استحقاق کے ہو جیسے اَلْجُلُّ لِلْفَرَسِ زین گھوڑے کے لیے ہے یا بطریق ملکیت ہو جیسے المال لزیدٍ مال زید کا ہے۔

(۲)...دوسرا معنی بطور علت للتعلیل: لام تعلیل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی یہ بات بیان کرنے کے لیے کہ اس کا مدخول کسی چیز کی علت ہے جیسے ضَرَبْتُهُ لِلتَّأْدِيْب میں نے اس کو ادب سکھانے کے لیے مارا۔ تو یہاں لِلتَّأْدِيْب میں جو لا ہے یہ علت کا تعلیل کا ہے۔

(۳)... تیسرا معنی و بمعنی عن :اور کبھی کبھی لام استعمال ہوتا ہے عَنْ کے معنی میں اور یہ وہاں عَنْ کے معنی میں استعمال ہو گا جب لام کو قول اور اس کے مشتقات کے ساتھ استعمال کیا جائے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ○ ۰اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا ان لوگوں کے حق میں کہ اگر یہ دین بہتر ہوتا تو مؤمنین ہم پر سبقت نہ کرتے (سورۂ احقاف آیت ۱۱) یہاں پر دیکھیں لام عَنْ کے معنی میں استعمال ہوا ہے لِلَّذِيْنَ ای عن الذین ۔یہاں یہ لام، عن کے معنی میں اس وجہ سے ہے کہ اگر یہ لام، عن کے معنی میں نہ ہوتا تو لازم آتا سبقونا کی جگہ سبقتمونا کا ہونا کیونکہ قول کا صلہ جب عن آتا ہے تو وہ بمعنی خطاب ہوتا ہے جیسے جب قال لہٗ کہا تو اس کے معنی خطاب کے ہوں گے کہ اس نے اس سے خطاب کیا اور قول کا صلہ لام بمعنی عن ہوتا ہے تو اس کا معنی روایت ہوتا ہے جیسے قلت لزید انهٗ لم يفعل الشر يعني رِوَايتًا عن زيد۔

فائدہ

علامہ جار اللہ زمخشری تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں کہ صاحب مجمع البیان نے ذکر کیا کہ اس کلام کے کہنے والے کافر تھے اور اس کے مخاطب مؤمن تھے اور وہ غائب نہیں تھے ۔جب مؤمن مخاطب ہیں تو پھر لام کو عن کے معنی میں لینا یہ بہتر نہیں ہے کیونکہ یہاں لام، عن کے معنی میں نہیں بلکہ صلہ کے لیے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب کافر بات کر رہے تھے تو مؤمن موجود تھے اور لام وہاں عن کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جہاں قائل کا قول غائب کے لیے ہو تو اس وجہ سے صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ لام کو عن کے معنی میں لینا یہ محل نظر ہے یعنی قاعدے کی رو سے یہ درست نہیں ہے۔

(۴)...چوتھا معنی والزائدۃ :یہ ہے لام کبھی کبھی زائد بھی ہوتا ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان عالیشان رَدِفَ لَكُمْ تو یہاں پر دیکھیں جو ہے رَدِفَ لَكُمْ اگر اس کو ردفکم پڑھیں تو بھی یہی معنی ہو گا، یعنی لام کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑے گا۔اور یہ بات یاد رکھیں کہ لام اس وقت زائد ہو گا جب فعل متعدی بنفسہٖ ہو اور یہاں پر فعل ردف متعدی بنفسہٖ ہے تو یہاں پر یہ لام زائدہ ہے۔

(۵)...پانچواں معنی بمعنی الواؤ :اور کبھی کبھی لام واؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ وہاں لام کے معنی میں استعمال ہو گا جب لام بمعنی قسم ہو اور قسم برائے تعجب ہو یعنی جواب قسم میں ایسی چیز ہو جو قابل تعجب ہو جیسے مثال :"لِلّٰهِ لَا يُؤَخَّرُ الْاَجَلُ" (اللہ کی قسم! موت میں تاخیر نہیں ہوتی)۔ یہاں تعجب کا اظہار مقصود ہے۔

و (ربّ) للتّقليل، ولها صدر الكلام مختصّة بنكرة موصوفة على الأصحّ، وفعلها ماض محذوف غالبا، وقد تدخل على مضمر مبهم مميّز بنكرة منصوبة، والضّمير مفرد مذكّر، خلافا للكوفيّين في مطابقة التّمييز، وتلحقها (ما) فتدخل على الجمل.

مصنف رحمہ اللہ یہاں "رُبَّ" کے احکام بیان فرما رہے ہیں، جو قلّت یا کبھی کثرت کے معنی کے لیے آتا ہے۔

معنی :اس کا مشہور معنی تقلیل (کسی چیز کا کم ہونا بیان کرنا) ہے۔ مثال :"رُبَّ رَجُلٍ كَرِيْمٍ لَقِيْتُهٗ" (بہت کم ایسے سخی مرد

ہیں جن سے میں ملا)۔

شرائط :اس کے عمل کرنے کی چند شرائط ہیں:

صدرِ کلام :یہ ہمیشہ جملے کے شروع میں آتا ہے۔ **نکرہ موصوفہ** :یہ جس اسم (مجرور) پر داخل ہوتا ہے، وہ نکرہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کی صفت آتی ہے (خواہ صفت لفظوں میں ہو یا مقدر ہو)۔ یہی قول اصح ہے۔ **فعلِ ماضی** :اس کا متعلق فعل اکثر ماضی ہوتا ہے، جو عموماً محذوف ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال میں "لَقِيتُهُ" اس کا متعلق ہے۔

ضمیر پر دخول : کبھی "رُبَّ" ایک ضمیر مبہم پر داخل ہوتا ہے جس کی وضاحت آگے تمیز کرتی ہے۔ مثال :"رُبَّهُ رَجُلًا لَقِيتُ" (بہت کم ایسے مرد ہیں جن سے میں ملا)۔ یہاں "ہ" ضمیر ہے اور "رَجُلًا" اس کی تمیز ہے۔

اختلافِ علماء :مصنف فرماتے ہیں کہ یہ ضمیر ہمیشہ مفرد مذکر ہی رہے گی، چاہے تمیز مؤنث یا تثنیہ و جمع ہو۔ مثلاً "رُبَّهُ امْرَأَةً" یا "رُبَّهُ رَجُلَيْنِ"۔ جبکہ کوفی نحویین کہتے ہیں کہ ضمیر کو تمیز کے مطابق ہونا چاہیے، یعنی وہ "رُبَّهَا امْرَأَةً" یا "رُبَّهُمَا رَجُلَيْنِ" کو درست مانتے ہیں۔

دخولِ ماکافّہ :جب "رُبَّ" کے بعد "ما" آجائے تو یہ "ما" اسے عملِ جر سے روک دیتا ہے (اس لیے اسے کافّہ یعنی روکنے والا کہتے ہیں) اور تب "رُبَّمَا" پورے جملے (اسمیہ یا فعلیہ) پر داخل ہو سکتا ہے۔ مثال :"رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا..." (الحجر 2 :)۔ یہاں یہ جملہ فعلیہ پر داخل ہوا ہے۔

و (واوها) تدخل على نكرة موصوفة.

واوِ رُبَّ :واوِ رُبَّ صرف نکرہ موصوفہ پر داخل ہوتا ہے اور رُبَّ کی طرح اس کا تعلق بھی فعل ماضی ہوتا ہے جس کو اکثر و بیشتر حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثال (شعر سے) :

"وَلَيْلٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ أَرْخَى سُدُولَهُ" (کتنی ہی راتیں ہیں سمندر کی موجوں جیسی...)۔ یہاں اصل میں "وَرُبَّ لَيْلٍ" ہے۔

و (واو القسم) إنما تكون عند حذف الفعل لغير السؤال مختصّة بالظّاهر.

حروفِ قسم :یہاں سے مصنف قسم کے لیے استعمال ہونے والے حروف کا ذکر فرما رہے ہیں۔

واوِ قسم :یہ اسم ظاہر پر داخل ہوتی ہے، ضمیر پر نہیں۔ اور اس کا استعمال تب ہے جب فعلِ قسم (جیسے أُقْسِمُ) محذوف ہو۔ مثال: "وَاللهِ لَأَفْعَلَنَّ كَذَا"۔

تاءِ قسم :یہ بھی واو کی طرح ہے لیکن یہ صرف دو اسموں کے ساتھ خاص ہے :اللہ اور ربّ (بصورتِ مضاف، جیسے تَرَبِّ الْكَعْبَةِ)۔ مثال (قرآن سے) :"تَاللهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ" (الانبیاء 57 :)۔

باءِ قسم :یہ ان سب سے عام ہے۔ یعنی یہ اسم ظاہر اور ضمیر دونوں پر آسکتی ہے (جیسے بِاللهِ اور بِكَ)، اور فعلِ قسم کے ذکر اور حذف دونوں صورتوں میں استعمال ہو سکتی ہے (جیسے أُقْسِمُ بِاللهِ اور بِاللهِ)۔

ویتلقّی القسم باللاّم، و(إنّ)، وحرف النّفی،

جوابِ قسم :مصنف فرماتے ہیں کہ قسم کے بعد اس کا جواب آتا ہے جو عموماً لام تاکید (جیسے لَأَفْعَلَنَّ)، إِنَّ (جیسے إِنَّ زَيْدًا لَقَائِمٌ)، یا حروفِ نفی (ما، لا) سے شروع ہوتا ہے جیسے واللہ ما قام زید اور واللہ لا قام۔

ویحذف جوابه إذا اعترض، أو تقدّمه ما یدلّ علیه.

یہاں سے صاحبِ کتاب ایسی دو صورتیں بیان فرمارہے ہیں جس میں جواب قسم کو ہی حذف کر دیا جاتا ہے۔

پہلی صورت:... :جب قسم جملے کے درمیان میں ہو جیسے زید واللہ قائم اس کی اصل واللہ ان زیدا قائم ہے جواب قسم ان زیدا قائم کو یہاں سے حذف کر دیا اس لیے کہ قسم ایسے جملے کے درمیان واقع ہے جو جواب قسم پر دلالت کر رہا ہے۔

دوسری صورت:... جب قسم سے پہلے جواب قسم پر دلالت کرنے والا کوئی جملہ موجود ہو جیسے زید قائم واللہ اللہ کی قسم زید کھڑا ہے۔ اس کی اصل ہے واللہ ان زیدا قائم تو جواب قسم ان زیدا قائم کو حذف کر دیا گیا کیونکہ قسم سے پہلے اس پر دلالت کرنے والا جملہ زید قائم موجود ہے۔

و(عن) للمجاوزة. و(علی) للاستعلاء

عَنْ اور عَلَی: عَنْ کا بنیادی معنی مجاوزت یعنی کسی چیز سے آگے بڑھ جانا یا گزر جانا ہے۔ مثال "رَمَيْتُ السَّهْمَ عَنِ الْقَوْسِ" (میں نے تیر کمان سے پھینکا)۔

عَلَی کا بنیادی معنی استعلاء یعنی بلندی یا کسی چیز کے اوپر ہونا ہے۔ مثال :"اَلْكِتَابُ عَلَى الْمِنْضَدَةِ" (کتاب میز پر ہے)۔

،وقد یکونان اسمین بدخول (من) علیهما.

اسمیت : یہاں پر صاحبِ کتاب ایک فائدہ بیان فرماتے ہیں کہ جہاں پر عَنْ اور علیٰ اکٹھے استعمال ہوں اور ان پر من حرف جر داخل ہو جائے تو یہ دونوں معدول ہو کر اسم بن جائیں گے۔ تو اس صورت میں عن سے جانب مراد ہو گا اور علیٰ سے فوق مراد ہو گا جیسے جلست من عن یمینه اس کا مطلب ہو گا جلست من جانب یمینه اور نزلت من علی الفرس کا مطلب ہو گا نزلت من فوق الفرس

و(الکاف) للتّشبیه، وزائدة، وقد تکون اسما، وتختصّ بالظاهر.

الکاف: تشبیہ :اس عبارت صاحبِ کتاب نے حروف جارہ میں سے حرف کاف کو بیان کیا۔ کاف تین معانی کے لیے ہوتا ہے۔

(۱) پہلا معنی للتشبیہ :یعنی اس بات کو بتلانے کے لیے کہ کاف کا ما قبل کاف کے مدخول کی طرح ہے یاد رکھیں تشبیہ اور مشابہت کے لیے (۴) چار چیزیں ضروری ہیں :(۱) مشبہ یعنی جس کو تشبیہ دی جائے۔ (۲) مشبہ بہ یعنی جس سے تشبیہ دی جائے۔ (۳) وجہ تشبیہ جس وجہ سے تشبیہ دی گئی ہو۔ (۴) حرف تشبیہ۔ جیسے :زید کعمرو فی العلم

اس مثال میں زید مشبہ ہے اس کو تشبیہ دی گئی ہے عمرو مشبہ بہ ہے کہ اس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ زید عمرو کی طرح ہے فی العلم وجہ تشبیہ ہے کہ علم میں اس کے مشابہ ہے اور کاف حرف تشبیہ ہے۔

(۲) دوسرا معنی کاف زائدہ :اور کاف کبھی زائدہ ہوتا ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے سورۂ شوریٰ میں لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ اس کے مثل کوئی چیز نہیں اس میں کاف زائدہ ہے اگر اس کو مثلہ شی پڑھیں تب بھی معنی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

(۳) تیسرا معنی وقد یکون اسما :اور کبھی کبھی یہ کاف اسم کے معنٰی میں ہوتا ہے اور یہ اس صورت میں ہو گا جب کاف پر حرف جر داخل ہو جائے تو پھر یہ کاف اسم کے معنی میں ہو گا حرف نہیں رہے گا جیسے شاعر کا قول ہے :یضحکن عن کالبرد المنھم وہ ہنستی ہیں پگھلے ہوئے اولوں کی طرح۔

و(مذ)و(منذ)للابتداء فی الزّمان الماضی،والظّرفیة فی الحاضر،نحو (ما رأیته مذ شهرنا)و(منذ یومنا).

مُذْ اور مُنْذُ :یہ دونوں حروفِ جر زمانہ پر دلالت کرتے ہیں اور ان کے دو استعمال ہیں:

ابتداء فی الماضی :اگر ان کے بعد والا اسم زمانہ ماضی پر دلالت کرے تو یہ "مِنْ" (ابتدا) کے معنی میں ہوں گے۔ مثال : "مَارَأَيْتُهُ مُذْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ" (میں نے اسے جمعہ کے دن سے نہیں دیکھا)۔

ظرفیت فی الحاضر :اگر ان کے بعد والا اسم زمانہ حال پر دلالت کرے تو یہ "فِي" (ظرفیت) کے معنی میں ہوں گے۔ مثال : "مَارَأَيْتُهُ مُنْذُ يَوْمِنَا هَذَا" (میں نے اسے آج کے دن میں نہیں دیکھا)۔

و(حاشا)و(عدا)و(خلا)للاستثناء.

حَاشَا، عَدَا، خَلَا:مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تینوں استثنا کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جیسے جاءنی القوم خلا زید میرے پاس قوم آئی سوائے زید کے اور اسی طرح جاءنی القوم عدا بکر میرے پاس قوم آئی سوائے بکر کے جاءنی القوم حاشا عمرو میرے پاس قوم آئی سوائے عمرو کے۔

فائدہ:...ان تینوں حروف کی یعنی خلا عدا اور حاشا کی دو حیثیتیں ہیں۔ایک حیثیت سے یہ تینوں حروف افعال ہیں اور ایک حیثیت سے یہ تینوں حروف جارہ ہیں۔

تفصیل :یہ ہے کہ اگر یہ مابعد کو جر دیں تو یہ حروف جارہ ہے جیسے جاءنی القوم خلا زید ،جاءنی القوم عدا زید، جاءنی القوم حاشا زید۔اس قسم میں یہ حروف جارہ ہیں اور جار مجرور سے مل کر ماقبل کسی فعل یا شبہ فعل کا متعلق ہو جائیں گے ۔اور اگر یہ مابعد کو نصب دیں گے تو اس صورت میں یہ بمنزلۂ فعل کے ہوں گے اور اس میں ضمیر مستتر ان کا فاعل ہو گی اور مابعد والا جو اسم ہو گا وہ منصوب ہو گا جیسے جاءنی القوم خلا زیدا ،جاءنی القوم عدا زیدا اور جاءنی القوم حاشا زیدا۔

فائدہ:... خلا ،عدا اور حاشا یہ تینوں افعال بھی ہیں حروف بھی ہیں۔ تفصیل گزر چکی اور منذ اور مذ، لک، عن ،علی یہ حروف بھی ہیں اور اسماء بھی ہیں اور ان سے پہلے جو چاروں حروف گزر چکے وہ صرف حروف ہیں واللہ اعلم

[الحروف المشبّهة بالفعل]:

(إنّ)،و(أنّ)،و(كأنّ)،و(لكنّ)،و(ليت)،و(لعلّ).لها صدر الكلام،سوى (أنّ) فهي بعكسها .وتلحقها (ما) فتلغى على الأفصح،وتدخل حينئذ على الأفعال.ف(إنّ) لا تغيّر معنى الجملة.و(أنّ) مع جملتها في حكم المفرد،ومن ثمّ وجب

الکسر فی موضع الجمل، والفتح فی موضع المفرد. فکسرت ابتداء، وبعد القول، وبعد الموصول. وفتحت فاعلة ومفعولة ومبتدأة ومضافا إلیھا. وقالوا: (لولا أنّك) لأنّه مبتدأ، و(لو أنّك) لأنّه فاعل. فإن جاز التّقدیران جاز الأمران، مثل (من یکرمنی فإنّی أکرمه) و..

...إذا أنّه عبد القفا واللھازم...، وشبھه.

ترجمہ؛[فعل سے مشابہت رکھنے والے حروف]: (إنّ)، (أنّ)، (کأنّ)، (لکنّ)، (لیت)، اور (لعلّ)۔ ان حروف کو کلام کے شروع میں آنا ضروری ہے، سوائے (اَنّ) کے، کہ وہ اس کے برعکس ہے۔ اور جب ان حروف پر (ما) داخل ہو تو افصح قول کے مطابق یہ غیر عامل ہو جاتے ہیں، اور اس وقت یہ افعال پر بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ پس (إنّ) جملے کے معنی میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ اور (اَنّ) اپنے جملے (اسم اور خبر) کے ساتھ مفرد کے حکم میں ہوتا ہے، اسی وجہ سے ان مقامات پر کسرہ (إنّ پڑھنا) واجب ہے جہاں جملے کی ضرورت ہو، اور ان مقامات پر فتحہ (اَنّ پڑھنا) واجب ہے جہاں مفرد کی ضرورت ہو۔ پس (إنّ) کو کسرہ دیا جاتا ہے: (۱) کلام کی ابتداء میں، (۲) قول (قال، یقول وغیرہ) کے بعد، اور (۳) اسم موصول کے بعد۔ اور (اَنّ) کو فتحہ دیا جاتا ہے: (۱) جب وہ فاعل بن رہا ہو، (۲) جب وہ مفعول بن رہا ہو، (۳) جب وہ مبتدا بن رہا ہو، اور (۴) جب وہ مضاف الیہ بن رہا ہو۔ اور عرب کہتے ہیں: (لولا أنّك) کیونکہ یہ مبتدا ہے، اور (لو انّك) کیونکہ یہ فاعل ہے۔ پس اگر دونوں تقدیریں (جملہ یا مفرد ماننا) جائز ہوں تو دونوں صورتیں (فتحہ اور کسرہ) جائز ہیں، جیسے (من یکرمنی فإنّی أکرمه) اور شاعر کا قول: "...إِذَا أَنَّهُ عَبْدُ الْقَفَا وَاللَّهَازِمِ" "جب کہ وہ گدی اور جبڑوں کا غلام ہے"۔ اور اسی طرح کے دیگر موارد۔

تشریح:

[الحروف المشبّھة بالفعل]: (إنّ)، و(أنّ)، و(کأنّ)، و(لکنّ)، و(لیت)، و(لعلّ).

فصل الحروف المشبھة بالفعل: حروف کی بحث میں سے یہ دوسری فصل ہے حروف مشبہ بالفعل کے بیان میں۔

حروف مشبہ بالفعل کی تعریف:

حروف مشبہ بالفعل ان حروف کو کہا جاتا ہے جن کی فعل کے ساتھ مشابہت ہو اور وہ چھ حروف ہیں (۱) إِنَّ (۲) أَنَّ (۳) كَأَنَّ (۴) لٰكِنَّ (۵) لَيْتَ (۶) لَعَلَّ۔

وجہِ تسمیہ: ان کو حروف مشبہ بالفعل اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان حروف کی فعل کے ساتھ مشابہت ہے لفظاً اور معنیً۔ لفظاً تو اس طرح کہ جس طرح فعل ماضی مبنی بر فتحہ ہوتا ہے اسی طرح یہ حروف بھی مبنی بر فتحہ ہوتے ہیں اور جس طرح فعل ثلاثی، رباعی اور خماسی ہوتا ہے اسی طرح یہ حروف بھی ثلاثی، رباعی، خماسی ہوتے ہیں اور معناً مشابہت اس طرح ہے کہ جس طرح فعل متعدی فاعل اور مفعول کا تقاضہ کرتا ہے اسی طرح یہ حروف بھی دو اسموں کا تقاضہ کرتے ہیں ان میں سے ایک اسم ہوتا ہے ایک خبر ہوتی ہے اور ان حروف میں جو فعل کا معنی پایا جاتا ہے۔ وہ اس طور پر پایا جاتا ہے کہ إِنَّ اور أَنَّ حَقَّقْتُ کے معنی میں اور كَأَنَّ تَشَبَّهْتُ کے معنی میں ہے اور لٰكِنَّ اِسْتَدْرَكْتُ کے معنی میں اور لَيْتَ تَمَنَّيْتُ اور لَعَلَّ تَرَجَّيْتُ کے معنی میں ہے۔

لها صدر الكلام، سوى (أنّ) فهي بعكسها.

ان کا خاصہ یہ ہے کہ یہ صدرِ کلام چاہتے ہیں، یعنی ہمیشہ اپنے جملے کے شروع میں آتے ہیں۔ ان کا اسم یا خبر ان سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اس سے (أنّ) مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ مل کر مصدر بن جاتا ہے اور ایک مفرد اسم کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ مفرد اسم جملے کے بیچ میں آ سکتا ہے (فاعل، مفعول وغیرہ بن کر)، اس لیے (اَنّ) بھی جملے کے بیچ میں آ سکتا ہے۔

وتلحقها (ما) فتلغى على الأفصح، وتدخل حينئذ على الأفعال.

اس عبارت میں صاحب کتاب نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے:

قاعدہ:...فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی حروف مشبہ بالفعل کے ساتھ ما کافہ لاحق ہو جاتی ہے جب ماکافہ ان حروف کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے تو ماء کافہ ان حروف کو عمل کرنے سے روکتی ہے کیونکہ ان حروف کی مشابہت فعل کے ساتھ ہے اور ما کافہ وہ مشابہت ختم کر دے گی وجہ یہ ہے کہ عامل اور معمول کے درمیان فاصلہ آجاتا ہے اور ان حروف کا عمل ضعیف ہے جب عامل اور معمول کے درمیان فاصلہ آجائے گا تو پھر یہ حروف عمل نہیں کریں گے۔ اس صورت میں یہ حروف افعال پر داخل ہوں گے اسماء پر پھر ان کا داخل ہونا واجب نہیں ہو گا جیسے انما قام زید اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾، ﴿إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ﴾ اور ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾۔

یہاں پر دیکھیں اِنَّ حرف مشبہ بالفعل نے کوئی عمل نہیں کیا۔

اِنّ اور اَنّ کے استعمال کے مقامات

ف(إنّ) لا تغيّر معنى الجملة. و (أنّ) مع جملتها في حكم المفرد.

یہاں سے صاحب کتاب حروف مشبہ بالفعل میں سے ہر ایک کی الگ الگ تفصیل بیان فرما رہے ہیں۔

ہمزے کے کسرے کے ساتھ فرماتے ہیں حروف مشبہ بالفعل میں سے اِنَّ ہے یہ جملہ کے معنی میں کوئی تغیر نہیں کرتا بلکہ اس کو مزید پختہ کر دیتا ہے اور اَنَّ مفتوحہ جو ہے یہ اپنے مابعد والے اسم وخبر سے مل کر مفرد کے حکم میں ہوتا ہے یعنی یہ ایسے اسنادِ تام اس میں نہیں ہوتا کہ جس پر سکوت صحیح ہو۔

ومن ثمّ وجب الكسر في موضع الجمل، والفتح في موضع المفرد. فكسرت ابتداء، وبعد القول، وبعد الموصول. وفتحت فاعلة ومفعولة ومبتدأة ومضافا إليها.

یہاں مصنفؒ سب سے اہم دو حروف اِنّ (ہمزہ کے نیچے کسرہ) اور اَنّ (ہمزہ پر فتحہ) کے درمیان فرق واضح کر رہے ہیں۔

بنیادی اصول: اِنّ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں ایک مکمل اور مستقل جملے کی ضرورت ہو، جبکہ أنّ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں ایک مفرد اسم (مصدر) کی ضرورت ہو۔

اِنّ کے مواقع (جہاں جملہ مقصود ہو): ابتداءِ کلام: جب بات شروع ہو رہی ہو، جیسے: إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔

بعد القول: جب "قال" یا اس کے مشتقات کے بعد آئے، جیسے: قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ۔

صلہ موصول میں :جب اسم موصول کے صلہ میں واقع ہو، جیسے :جَاءَ الَّذِي إِنَّهُ كَرِيمٌ۔
اَنَّ کے مواقع (جہاں مفرد اسم مقصود ہو) :فاعل بن رہا ہو :جیسے :أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا (کیا ان کے لیے ہمارا نازل کرنا کافی نہیں؟)۔ یہاں أَنَّا أَنْزَلْنَا، "إنزالُنا" کی تاویل میں ہو کر فاعل ہے۔
مفعول بن رہا ہو :جیسے :وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (اور جان لو اللہ کا شدید عذاب والا ہونا)۔
مبتدأ بن رہا ہو :جیسے :وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً (اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا زمین کو خشک دیکھنا ہے)۔
مضاف الیہ (یا مجرور) بن رہا ہو :جیسے :ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ (یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ کا حق ہونا ثابت ہے)۔

مثالوں کی وضاحت اور شعر سے استدلال

لولا أنّك اور لو أنّك میں فرق

وقالوا :(لولا أنّك) لأنّه مبتدأ، و (لو أنّك) لأنّه فاعل.

مصنف یہاں أَنَّ کے ہمزہ پر آنے والی حرکت (فتحہ یا کسرہ) کی ایک بنیادی وجہ بیان کر رہے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر أَنَّ اور اس کے معمولین (اسم و خبر) کی تاویل مصدر کر کے اسے جملے کا ایسا جز بنایا جائے جو مرفوع ہو (مثلاً مبتدأ یا فاعل)، تو اس کی تعیین کرنا ضروری ہے۔
لولا إنّك (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) :قاعدہ :لولا (حرفِ شرط امتناعی) کے بعد جب أَنَّ آتا ہے تو اس کا ہمزہ مکسور ہوتا ہے، یعنی إِنَّ پڑھا جاتا ہے۔
علت (وجہ) :اس کی وجہ یہ ہے کہ لولا اپنے بعد ایک مبتدأ کا تقاضا کرتا ہے جس کی خبر عموماً محذوف ہوتی ہے اور تقدیر میں موجودٌ مانی جاتی ہے۔ یہاں إِنَّكَ اپنے اسم (ك) اور محذوف خبر کے ساتھ مل کر جملہ اسمیہ خبریہ بنتا ہے جو لولا کے بعد مبتدأ کی جگہ پر واقع ہوتا ہے۔ چونکہ إِنَّ ہمیشہ کلام کے شروع میں آتا ہے اور یہاں بھی ایک نئے جملے (جو مبتدأ بن رہا ہے) کا آغاز ہو رہا ہے، اس لیے ہمزہ مکسور ہوگا۔
تقدیرِ عبارت :لولا وجودُكَ موجودٌ (اگر تمہارا وجود نہ ہوتا)۔ یہاں أنّك کی تاویل مصدر وجودُک کی گئی جو کہ مبتدأ ہے۔
لو أنّك (ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ) :قاعدہ :لو (حرفِ شرط) کے بعد جب أَنَّ آتا ہے تو اس کا ہمزہ مفتوح ہوتا ہے۔
علت (وجہ) :لو شرطیہ اپنے بعد فعل کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں أَنَّكَ اپنے اسم و خبر سے مل کر بتاویلِ مصدر ہو کر ایک محذوف فعل کا فاعل بنتا ہے۔ جب أَنَّ اور اس کے معمولین کی تاویل مصدر کر کے انہیں جملے کا جز (فاعل، مفعول، وغیرہ) بنایا جائے تو ہمزہ کو مفتوح پڑھا جاتا ہے۔
تقدیرِ عبارت :لو ثبتَ وجودُكَ (اگر تمہارا وجود ثابت ہوتا)۔ یہاں أنّك کی تاویل مصدر وجودُک کی گئی جو کہ محذوف فعل ثبت کا فاعل ہے۔

جب دونوں تقدیریں جائز ہوں

فإن جاز التّقدیران جاز الأمران، مثل (من یکرمنی فإنّی أکرمه) و ..إذا أنّه عبد القفا واللهازم وشبهه

یہاں مصنف ایک اصول بیان کر رہے ہیں کہ اگر کسی مقام پر کلام کی ایسی دو مختلف تاویلیں یا تقدیریں ممکن ہوں جن میں سے ایک کسرہ کا تقاضا کرے اور دوسری فتحہ کا، تو وہاں دونوں صورتیں (إنَّ اور أنَّ) جائز ہوں گی۔

مثالِ شعری: إذا أنَّهٗ عبدُ القفا واللهازم یہ ایک مشہور شعر کا ٹکڑا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

وَكُنْتُ أَرَى زَيْداً كَمَا قِيْلَ سَيِّداً ... إِذَا أَنَّهُ عَبْدُ الْقَفَا وَاللَّهَازِمِ ترجمہ: میں زید کو ویسا ہی سردار سمجھتا تھا جیسا کہ کہا جاتا تھا، یہاں تک کہ اچانک پتہ چلا کہ وہ تو گُدّی اور کنپٹیوں کا غلام ہے (یعنی ذلیل اور پست ہے)۔

محلِ استشہاد (نکتے کی جگہ): اس شعر میں شاعر نے إذا مفاجائیہ کے بعد أَنَّهُ (ہمزہ پر فتحہ کے ساتھ) استعمال کیا ہے۔

وضاحت اور دو تقدیریں:

پہلی تقدیر (کسرہ کا جواز): إذا مفاجاتیہ (جس کا معنی "اچانک" ہوتا ہے) کے بعد عموماً جملہ اسمیہ آتا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق یہاں إِنَّهُ عَبْدٌ (ہمزہ پر کسرہ کے ساتھ) ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ ایک نئے جملے کا آغاز ہے۔ تقدیر یوں ہوتی: فاجأتنی عبدِیَّته (اچانک اس کی غلامی میرے سامنے آگئی)۔ اس صورت میں إذا کے بعد إِنَّهُ عَبْدٌ پورا جملہ اسمیہ ہے۔

دوسری تقدیر (فتحہ کا جواز): اہلِ عرب نے یہاں أَنَّهُ (فتحہ کے ساتھ) بھی استعمال کیا ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہاں ایک فعل محذوف مانتے ہیں اور أَنَّهُ عَبْدٌ کو اس کا معمول (فاعل یا مفعول) قرار دیتے ہیں۔ تقدیر یوں ہو گی: إذا ظهرَ أنَّهُ عبدٌ (اچانک یہ ظاہر ہوا کہ وہ غلام ہے)۔ اس صورت میں أَنَّهُ بتاویلِ مصدر ہو کر محذوف فعل ظهرَ کا فاعل ہے۔

خلاصہ: چونکہ یہاں کلام کی دو مختلف نحوی توجیہات (التقدیران) ممکن ہیں، ایک إذا کے بعد جملہ اسمیہ ماننے کی (جو کسرہ چاہتی ہے) اور دوسری فعل محذوف ماننے کی (جو فتحہ چاہتی ہے)، اس لیے دونوں صورتیں (الأمران) جائز قرار پائیں۔

إنَّ اور أنَّ کے درمیان ایک اور اہم فرق

ولذلك جاز العطف على اسم المكسورة-لفظاً أو حكماً-بالرّفع دون المفتوحة، ويشترط مضيّ الخبر لفظاً أو تقديراً خلافاً للكوفيّين، ولا أثر لكونه مبنيّاً، خلافاً للمبرّد والكسائيّ في مثل (إنّك وزيد ذاهبان). و (لكنّ)) كذلك، ولذلك دخلت اللاّم مع المكسورة دونها على الخبر، أو الاسم إذا فصل بينه وبينها، أو على ما بينهما، وفي (لكن) ضعيف. و تخفّف المكسورة فيلزمها اللاّم، ويجوز إلغاؤها، ويجوز دخولها على فعل من أفعال المبتدأ، خلافاً للكوفيّين في التّعميم. و تخفّف المفتوحة فتعمل في ضمير شأن مقدّر، وتدخل على الجمل مطلقاً، وشذّ إعمالها في غيره. ويلزمها مع الفعل السّين، أو (سوف)، أو (قد)، أو حرف النّفي. و (كأنّ) للتّشبيه، و تخفّف فتلغى على الأفصح. و (لكنّ) للاستدراك، تتوسّط بين كلامين متغايرين معنى، و تخفّف فتلغى، ويجوز معها الواو. و (ليت) للتّمنّي، وأجاز الفرّاء: (ليت زيداً قائماً). و (لعلّ) للتّرجّي، وشذّ الجرّ بها.

ترجمہ اور اسی وجہ سے مکسورہ (إنّ) کے اسم پر - خواہ لفظاً ہو یا حکماً - عطف کرتے ہوئے رفع پڑھنا جائز ہے، جبکہ مفتوحہ (أنّ) کے

اسم پر جائز نہیں،۔ اور شرط یہ ہے کہ خبر لفظاً یا حکماً گزر چکی ہو، کوفیوں کے خلاف۔ اور اسم کا مبنی ہونے کا کوئی اثر نہیں، مبرّد اور کسائی کے خلاف، جیسے مثال (إنّك وزيدٌ ذاهبان) میں۔ اور (لكنّ) بھی اسی طرح ہے، اور اسی وجہ سے لام تاکید مکسورہ (إنّ) کے ساتھ خبر پر، یا اسم پر (اگر اس کے اور إنّ کے درمیان فاصلہ ہو)، یا ان دونوں کے درمیان آنے والے معمول پر داخل ہوتا ہے، مفتوحہ (أنّ) کے ساتھ نہیں۔ اور (لكنّ) میں اس کا استعمال ضعیف ہے۔ اور جب مکسورہ (إنّ) کو مخفف (إن) کیا جائے تو اس کے ساتھ لام کا لانا لازم ہے، اور اس کا عمل ختم کرنا بھی جائز ہے، اور اس کا ایسے فعل پر داخل ہونا جائز ہے جو مبتدا پر داخل ہوتا ہے (افعال ناقصہ)، کوفیوں کے خلاف جو اس کو عام کہتے ہیں۔ اور جب مفتوحہ (أنّ) کو مخفف (أن) کیا جائے تو یہ ایک مقدر ضمیر شان میں عمل کرتا ہے، اور یہ مطلقاً جملوں پر داخل ہوتا ہے، اور اس کا غیر ضمیر شان میں عمل کرنا شاذ ہے۔ اور اس کے ساتھ فعل پر سین، سوف، قد، یا حرف نفی کا آنا لازم ہے۔ اور (كأنّ) تشبیہ کے لیے ہے، اور جب اسے مخفف (كأنْ) کیا جائے تو افصح قول کے مطابق یہ غیر عامل ہو جاتا ہے۔ اور (لكنّ) استدراک کے لیے ہے، یہ دو ایسے کلاموں کے درمیان آتا ہے جو معنی کے لحاظ سے مختلف ہوں، اور جب اسے مخفف (لكنْ) کیا جائے تو یہ غیر عامل ہو جاتا ہے، اور اس کے ساتھ واو کا آنا جائز ہے۔ اور (ليت) تمنی کے لیے ہے، اور فرّاء نے (ليت زيداً قائماً) کو جائز قرار دیا ہے۔ اور (لعلّ) ترجّی کے لیے ہے، اور اس کا بطور حرفِ جر استعمال شاذ ہے۔

تشریح:

ولذلك جاز العطف على اسم المكسورة لفظاً أو حكماً بالرّفع دون المفتوحة، مثل (إنّ زيداً قائم وعمرو)، ويشترط مضيّ الخبر لفظاً أو حكماً، خلافاً للكوفيين، ولا أثر لكونه مبنيّاً، خلافاً للمبرّد والكسائيّ في مثل (إنّك وزيد ذاهبان).

یہاں مصنف إنَّ اور أنَّ کے درمیان ایک اور اہم فرق بیان کر رہے ہیں جس کا تعلق عطف کے قاعدے سے ہے۔

بنیادی قاعدہ: إنَّ (مکسورہ) کے اسم پر رفع کے ساتھ عطف ڈالنا جائز ہے، لیکن أنَّ (مفتوحہ) کے اسم پر جائز نہیں۔

وجہ : إنَّ صرف جملہ اسمیہ (مبتدأ اور خبر) پر داخل ہو کر معنی میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ یہ مبتدأ کو نصب (حالتِ نصبی) دیتا ہے جسے اسم إنَّ کہتے ہیں اور خبر کو رفع دیتا ہے۔ اس کے باوجود اسم إنَّ کا اصلی اور معنوی محل رفع ہی رہتا ہے کیونکہ وہ اصل میں مبتدأ تھا۔ اس "محل" کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر کسی دوسرے اسم کا عطف رفع کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اسے "العطف على المحل" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس أنَّ اپنے اسم و خبر کے ساتھ مل کر مصدر کی تاویل میں ہو جاتا ہے اور ایک عامل کے تحت آتا ہے۔ اس لیے اس کے اسم کا کوئی اصلی "محلی" اعراب (رفع والا) باقی نہیں رہتا جس پر عطف کیا جا سکے۔

مثال اول : إِنَّ زَيْداً قَائِمٌ وَعَمْرٌو **تجزیہ:** إِنَّ : حرف مشبہ بالفعل۔ زَيْداً : اسم إنّ، منصوب لفظاً (لفظوں میں منصوب)۔ لیکن اس کا محل رفع ہے کیونکہ یہ اصل میں مبتدأ تھا۔ قَائِمٌ : خبرِ إنّ، مرفوع۔ وَعَمْرٌو : و حرفِ عطف، عَمْرٌو مرفوع ہے۔ اس کا رفع میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا عطف زیداً کے لفظ پر نہیں بلکہ اس کے محل پر کیا گیا ہے۔ اصل جملہ : زيدٌ قائمٌ۔ زید مبتدأ اور مرفوع تھا۔

شرطِ جواز (بصریوں کے نزدیک) :اس طرح "عطف علی المحل" کے جواز کے لیے بصری نحویوں کے نزدیک ایک شرط ہے: اِنَّ کی خبر، معطوف (جس پر عطف ڈالا جارہا ہے) سے پہلے گزر چکی ہو، خواہ لفظوں میں (جیسے اوپر کی مثال میں قائم کا ذکر عمرو سے پہلے ہے) یا حکماً۔

خلافاًللکوفیین :

کوفی نحوی اس شرط کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک إِنَّ زَيْداً وَعَمْرٌو قَائِمَانِ کہنا بھی جائز ہے۔

مثال دوم (جب اسم ضمیر مبنی ہو) :إِنَّكَ وَزَيْدٌ ذَاهِبَانِ قاعدہ :مصنف کے نزدیک اسم اِنَّ کا مبنی ہونا اس قاعدے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

ترکیب:إِنَّكَ :كَ ضمیر اِنَّ کا اسم ہے، جو مبنی بر فتح ہے لیکن محلِ نصب میں ہے۔ اس کا اصلی محل (جب یہ أَنتَ تھا) رفع تھا۔وَزَيْدٌ :زیدٌ مرفوع ہے کیونکہ اس کا عطف ضمیر کَ کے اصلی محل (یعنی أَنتَ کے محل) پر کیا گیا ہے۔ذَاهِبَانِ :اِنَّ کی خبر ہے جو کَ اور زید دونوں کو شامل ہے۔

خلافاً للمبرّد والكسائي :ا

امام مبرّد اور امام کسائی (بڑے نحوی) اس صورت کو جائز نہیں سمجھتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ضمیر متصل (جیسے کَ) اعراب میں ضعیف ہوتی ہے اور مبنی ہونے کی وجہ سے اس کا اصلی "محلّی" اعراب مزید کمزور ہو جاتا ہے، لہٰذا اس پر "عطف علی المحل" کرنا درست نہیں۔ لیکن جمہور نحویوں (اور مصنف) کے نزدیک یہ جائز ہے۔

لٰکنَّ کا حکم:

و(لكنّ) كذلك،

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ لٰکنَّ کا حکم بھی عطف کے اس معاملے میں اِنَّ جیسا ہی ہے۔

لامِ ابتداء کا دخول: قاعدہ

ولذلك دخلت اللاّم مع المكسورة دونها على الخبر، أو الاسم إذا فصل بينه وبينها، أو على ما بينهما، وفي (لكن) ضعيف.

لامِ ابتداء (جسے اِنَّ کے بعد آنے کی وجہ سے "لامِ مزحلقہ" بھی کہتے ہیں) تاکید کے لیے آتا ہے۔ یہ اِنَّ مکسورہ کے معمولات (خبر، اسم موخر، یا ان کے درمیان فاصل) پر داخل ہو سکتا ہے، جیسے إِنَّ زَيْداً لَقَائِمٌ۔

وجہ :چونکہ اِنَّ کلام کے شروع میں آتا ہے اور لامِ ابتداء بھی، اور دو تاکیدی حروف ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، اس لیے لام کو اس کے اصل مقام (مبتدأ) سے ہٹا کر خبر کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔

أَنَّ مفتوحہ کے ساتھ اس کا استعمال اس لیے نہیں ہوتا کیونکہ اَنَّ کلام کے درمیان میں آکر جملے کو مصدر بنا دیتا ہے، اور لامِ ابتداء صرف مستقل جملے کے شروع میں آتا ہے۔

لٰکنَّ کے ساتھ اس کا استعمال ضعیف (نایاب) ہے کیونکہ لٰکنَّ استدراک کے لیے آتا ہے اور کلام کے وسط میں ہوتا ہے، جو لامِ

ابتداء کی اصل جگہ نہیں۔

حروفِ عاملہ کی تخفیف کے احکام

وتخفّف المکسورۃ فیلزمھا اللاّم، ویجوز إلغاؤھا، ویجوز دخولھا علی فعل من أفعال المبتدأ، خلافا للکوفیّین فی التّعمیم۔

یہاں سے مصنفؒ ان حروف کو جب مخفف (بغیر تشدید کے) پڑھا جائے تو ان کے احکام بیان کر رہے ہیں۔

.1 **إنَّ کی تخفیف (إنْ) إلغاء (غیر عامل ہونا)** :جب إنَّ کو مخفف إنْ پڑھا جاتا ہے تو اکثر یہ غیر عامل ہو جاتا ہے جس کو اِنْ مُخَفَّفَۃٌ مِنَ الْمُثَقَّلَۃِ کہتے ہیں تو ایسی صورت میں اس کی خبر پر لام کا داخل کرنا واجب ہو جائے گا پھر جائز نہیں کہ کریں یا نہ کریں بلکہ لا کا داخل کرنا واجب ہو گا تاکہ ان نافیہ کے ساتھ اس کا التباس لازم نہ آئے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے : وَاِنْ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ ۔

فعل پر دخول :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اِنْ مخففہ کو ان افعال پر داخل کرنا جائز ہے جو مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ یعنی افعال قلوب اور افعال ناقصہ جیسے :وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ اور وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ۔

خلافاً للکوفیین :کوفی نحوی اسے ہر قسم کے فعل پر داخل کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

.2 **اَنَّ کی تخفیف (اَنْ) : عمل** :

وتخفّف المفتوحۃ فتعمل فی ضمیر شأن مقدّر، وتدخل علی الجمل مطلقا، وشذّ إعمالھا فی غیرہ، ویلزمھا مع الفعل السّین، أو (سوف)، أو (قد)، أو حرف النّفی۔

اس عبارت میں صاحبِ کتاب نے اَنَّ کا حکم بیان فرمایا ہے اور اس میں تین باتیں بیان فرمائی ہیں :

(ا) پہلی بات: فرماتے ہیں کہ اِنَّ کی طرح اَنَّ مشددہ کی بھی تشدید ختم کر کے اس کو بھی مخفف پڑھتے ہیں لیکن اِنَّ کے برعکس، جب أَنَّ کو أَنْ مخفف پڑھا جائے تو یہ عامل رہتا ہے۔ تو اس صورت میں اس کے لیے ضمیر شان لانا ضروری ہے۔ (ضمیر شان کی تفصیل پیچھے گزر چکی) کیونکہ وہ وجوبًا ضمیر شان میں عمل کرے گا اور جملے پر داخل ہو گا اور ضمیر شان اس کا اسم اور وہ جملہ جو ضمیر شان کی تفسیر کر رہا ہے وہ اس کی خبر بنے گا چاہے وہ جملہ اسمیہ ہو جیسے بلغنی اَنْ زَیْدٌ قَائِمٌ ۔

یا جملہ فعلیہ ہو جیسے بلغنی اَنْ قَدْ قَامَ زَیْدٌ۔

دونوں پر یہ اَنْ حرف مشبہ بالفعل داخل ہو گا اور ضمیر شان مقدر مانی جائے گی۔

فعل کے ساتھ فواصل کا لزوم :اور واجب ہے جب اَنْ مفتوحہ ہو اور اس کو مخففہ کر دیا جائے اور وہ فعل پر داخل ہو سکتا ہے تو اس کے فعل پر سین یا سوف یا قد یا حرف نفی کو داخل کرنا واجب ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

عَلِمَ اَنْ سَیَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى :یہاں پر دیکھیں سین کو داخل کیا ہے تو معلوم ہوا کہ ایسے مقامات پر سین یا سوف کا داخل کرنا واجب ہو جائے گا سوف کی مثال شاعر کا شعر ہے :

اَنْ سَوْفَ یَاْتِیْ کلُّ ما قدر اور قد کی مثال لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا (سورۂ جن آیت:۲۸) اور حرف نفی کی مثال لَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ یہ اَلَّایَرْجِعُ ہے یہ اصل میں اَنْ لَّا یَرْجِعُ تھا۔

بقیہ حروف کے معانی اور احکام

و (كأنّ) للتّشبيه، وتخفّف فتلغى على الأفصح. و (لكنّ) للاستدراك، تتوسّط بين كلامين متغايرين معنى، وتخفّف فتلغى، ويجوز معها الواو. و (ليت) للتّمنّي، وأجاز الفرّاء: (ليت زيدا قائما). و (لعلّ) للتّرجّي، وشذّ الجرّ بها.

وَكَاَنَّ لِلتَّشْبِيه: اس عبارت صاحبِ کتاب نے حروف مشبہ بالفعل میں سے کان کو بیان کیا ہے کَاَنَّ تشبیہ کے لیے آتا ہے یعنی اس بات کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے کہ پہلا والا اسم دوسرے اسم کے مشابہ ہے وصف مشہور میں جیسے کَاَنَّ زَیْدٌ اَسَدٌ گویا کہ زید شیر کی طرح ہے۔

صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ کَاَنَّ کو کبھی کبھی مخفف کر دیا جاتا ہے جیسے کَاَنْ تو پھر وہ عمل نہیں کرتا یعنی مشبہ بالفعل والا عمل نہیں کرتا کیونکہ اس کی فعل کے ساتھ مشابہت کمزور ہو جاتی ہے۔

ولٰکنّ للاستدراک: حروف مشبہ بالفعل میں سے چوتھا حرف لٰکِنَّ ہے اور یہ استدراک کے لیے آتا ہے یعنی دو کلاموں کے درمیان میں آتا جو کلام صادر سے پیدا شدہ وہم کو دفعہ کرے۔ مابعد والے کلام سے یہ دو کلام معنی کے اعتبار سے مختلف ہوں یعنی مثبت اور منفی ہونے کے اعتبار سے ایسے کلاموں کے اندر کے یہ استدراک کے لیے آتا ہے یہ غلطی کی اصلاح کے لیے آتا ہے اور تغائر کی دو قسمیں ہیں۔

نمبر (۱)... لفظاً اور نمبر (۲)... معنیً۔

(۱)... **تغایر لفظی**: جیسے مَا جَآءَنِیْ زَیْدٌ لٰکِنَّ عَمْروًا جَآءَ ہمارے پاس زید نہیں آیا لیکن عمرو آیا ہے یا ما جاءَنِی القوم لٰکنَّ عَمْروًا جَآءَ ہمارے پاس قوم نہیں آئی لیکن عمرو آیا۔

(۲)... **تغایر معنوی**: کہ لفظاً دونوں کلام مثبت ہو لیکن معنیً ایک مثبت ہو اور دوسرا منفی ہو جیسے غَابَ زَیْدٌ لٰکِنَّ عمروًا حاضر زید غائب ہے لیکن عمرو حاضر ہے تو یہ تغیر معنوی ہے۔

وتخفّف فتلغی: کہتے ہیں کبھی کبھی لٰکِنَّ کو مخفف کر دیا جاتا ہے تو اس صورت میں یہ ملغی عن العمل ہو گا پھر یہ فعل والا عمل نہیں کرے گا کیونکہ اس کی فعل کے ساتھ مسابہت کمزور ہو جائے گی جیسے مشی زَیْدٌ لٰکِنْ بَکْرٌ عِنْدَنَا۔

ویجوز معها الواو: صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ لٰکِنَّ جو استدراک کے لیے آتا ہے اور لٰکِنَّ جو عاطفہ ہے ان دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ لٰکِنَّ پر واؤ داخل کرنا جائز ہے لیکن جو لٰکِنَّ عطف والا ہے اس پر واؤ داخل کرنا جائز نہیں۔ لہٰذا اقَامَ زَیْدٌ وَلٰکِنَّ عَمْروا قَاعِدٌ کہنا جائز ہے اور اس پر عطف کرنا جائز ہے واؤ کے ساتھ اور لٰکِنَّ عاطفہ پر واؤ کا داخل کرنا جائز نہیں ہے۔

لیت للتمنی: اس عبارت صاحبِ کتاب نے حروف مشبہ بالفعل میں سے پانچویں حرف لیت کو بیان کیا ہے۔ لیت تمنی کے لیے آتا ہے یعنی کسی چیز کی تمنا کرنا، آرزو کرنا جیسے لیت هندا عندنا کاش ہندہ ہمارے پاس ہوتی۔

جمہور نحویین رحمہم اللہ کے نزدیک لَیتَ حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے یعنی اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے امام فرّاء کے نزدیک جس طرح لیتَ حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے اُس طرح معنیً فعل بھی ہے۔ لہٰذا لیت کے بعد آنے والے دونوں اسم لیت کا مفعول بہ ہونے کی بناء پر منصوب ہیں۔ کیونکہ تمنی کے لیے آنے کی وجہ سے لیت سے اتمنی اور تمنیت فعل معنیً سمجھ میں آتے ہیں جیسے: لیت (بمعنی تمنیت فعل بافاعل) زیدا (مفعول بہ) قائِمًا (مفعول ثانی) یعنی اتمنی زیدًا قائمًا تو بعد والے دونوں اسم اس کے لیے مفعول بہ ہوں گے۔

ولعل للترجی: اس عبارت صاحبِ کتاب نے حروف مشبہ بالفعل میں سے لعل کو بیان کیا ہے اور لعل ترجی کے لیے آتا ہے یعنی کسی ممکن چیز کے حاصل ہونے کی اُمید کرنا... جیسے اللہ پاک کی پاک کتاب میں ہے: لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۝۱ اُمید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس معاملے کے بعد کوئی بات پیدا کردے۔

شاذ استعمال: بنو عقیل کے قبیلے کی لغت میں اسے حرفِ جر کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے جو مِنْ اَجْلِ (کی وجہ سے) کا معنی دیتا ہے، جیسے لَعَلَّ اللهِ یعنی مِنْ أَجْلِ اللهِ۔ یہ استعمال بھی شاذ ہے۔

[الحروف العاطفة]:

الواو، والفاء، و(ثمّ)، و(حتّى)، و(أو)، و(إمّا)، و(أم)، و(لا)، و(بل)، و(لكن). فالأربعة الأُول للجمع، فالواو للجمع مطلقا ولا ترتيب فيها، و(الفاء) للتّرتيب، و(ثمّ) مثلها بمهلة، و(حتّى) مثلها، ومعطوفها جزء من متبوعه ليفيد قوّة أو ضعفا. و(أو) و(إما)، و(أم) لأحد الأمرين مبهما. ف(أم) المتّصلة لازمة لهمزة الاستفهام، يليها أحد المستويين والآخر الهمزة، بعد ثبوت أحدهما لطلب التّعيين، ومن ثمّ ضعف (أرأيت زيدا أم عمرا)، ومن ثمّ كان جوابها بالتّعيين دون (نعم) أو (لا). والمنقطعة لـ(بل) والهمزة، مثل (إنّها لإبل أم شاء). و(إمّا) قبل المعطوف عليه لازمة مع (إمّا)، جائزة مع (أو) و(لا) و(بل) و(لكن) لأحدهما معيّنا، و(لكن) لازمة للنّفي.

ترجمہ؛ [حروفِ عاطفہ]: واو، فاء، ثمّ، حتّى، أو، إمّا، أم، لا، بل، اور لکن۔ پس پہلے چار (واو، فاء، ثمّ، حتّى) جمع (شریک کرنے) کے لیے ہیں؛ پس "واو" مطلق جمع کے لیے ہے اور اس میں ترتیب نہیں ہوتی؛ "فاء" ترتیب (بغیر مہلت کے) کے لیے ہے؛ "ثمّ" بھی اسی (ترتیب) کی طرح ہے لیکن مہلت کے ساتھ؛ اور "حتّى" بھی اسی (ثمّ) کی طرح ہے، اور اس کا معطوف اپنے متبوع (معطوف علیہ) کا ایک حصہ ہوتا ہے تاکہ (اس میں) قوت یا ضعف کا فائدہ دے۔ اور "أو"، "إمّا"، اور "أم" دو امروں میں سے کسی ایک (غیر معین) کے لیے ہیں۔ پس "اَم متصلہ" ہمزہ استفہام کو لازم ہے، اس کے بعد دو برابر چیزوں میں سے ایک آتی ہے اور دوسری ہمزہ کے بعد، ان میں سے کسی ایک کے ثبوت کے بعد تعین طلب کرنے کے لیے۔ اسی وجہ سے "أرأيت زيداً أم عمراً" کہنا ضعیف ہے؛ اور اسی وجہ سے اس کا جواب تعین کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ "ہاں" یا "نہیں" کے ساتھ۔ اور "اَم منقطعہ" تو وہ "بل" اور ہمزہ کے معنی میں ہے، جیسے "إنّها لإبلٌ أم شاءٌ"۔ اور "إمّا" معطوف علیہ سے پہلے معطوف پر "إمّا" کے ساتھ آنا لازم ہے؛ جبکہ "أو" کے ساتھ آنا جائز ہے۔ اور "لا"، "بل"، اور "لکن" دو میں سے کسی ایک (معین) کے لیے

ہیں۔اور "لکن" کے لیے نفی کا ہونا لازم ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ عاطفہ کا بیان شروع فرمارہے ہیں۔

"عطف" کا لغوی معنی

"موڑنا" ہے،

اصطلاحی معنی؛

اور اصطلاح میں ایک لفظ کا اعرابی حکم دوسرے لفظ کی طرف نسبتِ معنوی کے ساتھ منتقل کرنے کو کہتے ہیں۔

الواو، والفاء، و (ثمّ)، و (حتّی)، و (أو)، و (إمّا)، و (أم)، و (لا)، و (بل)، و (لکن).

مصنفؒ نے یہاں دس حروفِ عاطفہ شمار کیے ہیں، جو مشہور ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا خاص معنی اور استعمال ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

جمع اور ترتیب کا معنی دینے والے حروف

فالأربعة الأول للجمع، فالواو للجمع مطلقاً ولا ترتیب فیها، و (الفاء) للتّرتیب، و (ثمّ) مثلها بمهلة، و (حتّی) مثلها، ومعطوفها جزء من متبوعه لیفید قوّة أو ضعفاً.

مصنفؒ پہلے چار حروف کا ذکر فرمارہے ہیں جو معطوف اور معطوف علیہ کو حکم میں شریک (جمع) کرنے کے لیے آتے ہیں۔

الواو: یہ مطلق جمع کے لیے ہے، یعنی یہ صرف دو چیزوں کو حکم میں شریک کرتا ہے، اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کام پہلے کس نے کیا اور بعد میں کس نے، یا دونوں نے ایک ساتھ کیا۔ جیسے: جَاءَ زَیْدٌ وَعَمْرٌو (زید اور عمرو آئے)۔ اس میں تینوں احتمال ہیں: زید پہلے آیا، عمرو پہلے آیا، یا دونوں ایک ساتھ آئے۔

الفاء: یہ ترتیب مع التعقیب کے لیے ہے، یعنی یہ بتاتا ہے کہ معطوف کا کام معطوف علیہ کے فوراً بعد بغیر کسی مہلت کے ہوا ہے۔ جیسے: دَخَلَ زَیْدٌ فَعَمْرٌو (زید داخل ہوا، پھر فوراً عمرو داخل ہوا)۔

ثمّ: یہ ترتیب مع المہلۃ کے لیے ہے، یعنی یہ بتاتا ہے کہ معطوف کا کام معطوف علیہ کے کچھ وقفے اور مہلت کے بعد ہوا ہے۔ جیسے: جَاءَ زَیْدٌ ثُمَّ عَمْرٌو (زید آیا، پھر کچھ دیر بعد عمرو آیا)۔

حتّی: یہ بھی ترتیب اور مہلت کے لیے "ثمّ" کی طرح ہے لیکن اس میں دو اضافی شرطیں ہیں: اس کا معطوف، معطوف علیہ کا حصہ (جزء) یا جزء جیسا ہو۔ یہ معطوف علیہ کی انتہائی قوت یا ضعف کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔

مثال (قوت): مَاتَ النَّاسُ حَتَّی الأَنْبِیَاءُ (لوگ مرگئے، یہاں تک کہ انبیاء بھی)۔ انبیاء، لوگوں کا سب سے اعلیٰ طبقہ ہیں۔

مثال (ضعف): أَكَلْتُ السَّمَكَةَ حَتَّی رَأْسَهَا (میں نے مچھلی کھائی، یہاں تک کہ اس کا سر بھی)۔ سر کو عموماً مچھلی کا کم تر حصہ

سمجھا جاتا ہے۔

دو میں سے ایک کا معنی دینے والے حروف

و(أو)و(إما)،و(أم)لأحد الأمرين مبهما. ف(أم) المتّصلة لازمة لهمزة الاستفهام، يليها أحد المستويين والآخر الهمزة، بعد ثبوت أحدهما لطلب التّعيين، ومن ثمّ ضعف (أرأيت زيدا أم عمرا)، ومن ثمّ كان جوابها بالتّعيين دون (نعم) أو(لا). والمنقطعة ك(بل) والهمزة، مثل (إنّها لإبل أم شاء).

اواور اما اور ام کی تعریف:

او اور اما اور ام یہ تینوں اس بات کے لیے آتے ہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ میں سے غیر متعین طور پر کسی ایک کے لیے حکم ثابت ہے جیسے مَرَرْتُ بِرَجُلٍ اَمْ اِمْرَأَةٍ، مَرَرْتُ بِرَجُلٍ اَوْ اِمْرَأَة، مَرَرْتُ بِرَجُلٍ اما اِمْرَأَةٍ۔

ام اس کی دو ۲ قسمیں (۱) متصلہ۔ (۲) منقطعہ۔

اس عبارت میں صاحبِ کتاب ام کی اقسام کو بیان فرماتے ہیں۔ اور اس ضمن میں او اور اما اور ام میں فرق بھی بیان فرماتے ہیں ام کی دو قسموں میں سے پہلی قسم:

ام متصلہ کی تعریف:

ام متصلہ وہ ام ہے جس کے ذریعے سے دو ۲ چیزوں یعنی معطوف اور معطوف علیہ میں سے ایک کی تعیین کے بارے میں سوال کیا جائے اور اس کے ذریعے سوال کرنے والا (سائل) ان دونوں ۲ میں سے ایک کے ثبوت کو جانتا ہو اور اس کا مقصد سوال کرنے سے کسی ایک کی تعیین ہو اگرچہ ہمزہ استفہام کے ساتھ او اور اما کے ذریعے بھی سوال کیا جاتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ او اور اما کے ذریعے سوال کرنے والا معطوف اور معطوف علیہ میں سے کسی ایک کے ثبوت کو بالکل نہیں جانتا نہ متعین طور پر اور نہ غیر متعین طور پر بلکہ اس کا مقصد اما حروف سے سوال کرنے سے محض اتنی بات جاننا ہوتا ہے کہ آیا معطوف اور معطوف علیہ میں سے غیر متعین طور پر کوئی ایک ثابت ہے۔

اَمْ متصلہ کی استعمال کی شرائط بیان فرماتے ہیں:

(۱) پہلی شرط:

: ام متصلہ سے پہلے والے جملے میں ہمزہ استفہام ہو چاہے لفظا ہو جیسے ازیدٌ عندَكَ اَمْ عَمروٌ کیا تیرے پاس زید ہے یا عمر ہے؟ اور یا ہمزہ استفہام مقدر ہو تقدیرا ہو جیسے شاعر کا قول ہے:

فواللہ لعمری ما ادری وان کنت داریا بسبع رمین الجمر ام بثمان

یہاں پر یہ جو بسبع ہے اس میں استفہام تقدیری ہے یہ اصل میں ابِسَبعٍ ہے۔ شعر کا ترجمہ

مجھے میری عمر کی قسم میں نہیں جانتا اگرچہ تو جانتا ہے کہ میں نے سات کنکریاں ماری جمریٰ میں یا آٹھ۔ او اور اما سے پہلے ہمزہ استفہام نہیں ہوتا یہ فرق ہے ام اور ان دونوں ۲ میں اس مثال میں ہمزہ استفہام تقدیری ہے۔ بسبع سے پہلے اصل میں ابسبع

ہے۔

دوسری شرط:

ام متصلہ کے بعد وہی چیز ہو وہی لفظ ہو جو ہمزہ استفہام کے بعد ہے یعنی اگر ہمزہ استفہام کے بعد اسم ہے تو ام کے بعد بھی اسم ہو اور ہمزہ استفہام کے بعد فعل ہے تو ام متصلہ کے بعد بھی فعل ہو جیسے اَزَیْدٌ عِنْدَكَ اَمْ عَمْرو ؟ اسم کی مثال ہے اور یہ فعل کی مثال اَقَامَ زَیْدٌ اَمْ قَعَدَ ؟ کیا زید کھڑا ہوا ہے یا بیٹھا ہے...ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمزہ استفہام کے بعد فعل ہو اور ام متصلہ کے بعد اسم ہو یا اس کا عکس ہو کہ ہمزہ استفہام سے پہلے اسم ہو اور اس کے ام متصلہ کے بعد فعل ہو جیسے اَرَأَیْتَ زَیْدًا اَمْ عَمْرًوا یہ جائز نہیں ہے۔اور اسی طرح اس کا عکس بھی جائز نہیں ہے اَزَیْدًا رَأَیْتَ اَمْ رَأَیْتَ عَمْرًوا یہ مثال بھی جائز نہیں ہے

(۳) تیسری شرط:

دونوں ۲ امر مساوی ہوں یعنی معطوف اور معطوف علیہ میں سے کوئی ایک واقعی طور پر متکلم کے نزدیک ثابت ہو۔ سوال صرف تعین کے متعلق ہو اس لیے واجب ہے کہ ام متصلہ کا جواب نعم یا لا سے نہ دیا جائے بلکہ معطوف اور معطوف علیہ میں سے کسی ایک کو متعین کیا جائے کیونکہ سوال ہی تعین کے لیے ہے مثلاً جب یہ کہا جائے گا اَزَیْدٌ عِنْدَكَ اَمْ عَمْرو ؟ تو اس کے جواب میں نعم یا لا کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ متعین کر کے کہا جائے گا عندی زید یا عندی عمرو اس لیے کہ یہاں سائل کو اتنی بات معلوم ہے کہ بھئی زید اور عمرو میں سے کوئی ایک مخاطب کے پاس ہے البتہ وہ تعیین چاہتا ہے کہ کون ہے۔ تعیین کر کے بتایا جائے۔اور اس کے برخلاف اگر او یا اما کے ذریعے سوال کیا جائے تو اس کا جواب نعم یا لا سے دیا جائے گا مثلا کوئی سوال کرے أَجَاءَكَ زَیْدٌ واما عمرو تو اس کے جواب میں نعم یا لا کہہ کر جواب دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ یہاں متکلم کو معطوف اور معطوف علیہ میں سے کسی ایک کی تعیین کے متعلق کوئی علم نہیں اس کا مقصد تو صرف او اور اما کے ذریعے سوال کرنے سے یہ جاننا ہے کہ آیا معطوف اور معطوف علیہ میں سے کوئی ایک ثابت ہے یا نہیں تو نعم یا لا کے ذریعے سے اس کا مقصد حاصل ہو گیا۔

ام منقطعہ

ام منقطعہ وہ ہے جو ہمزہ کے ساتھ بل کے معنی میں ہو یعنی پہلے کلام سے اعراض اور دوسرے کلام میں شک پیدا کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً آپ نے دور سے کوئی شبیہ دیکھی صورت دیکھی اور آپ نے کہا انہا لَاِبِلٌ قطعی طور پر آپ نے حکم لگایا کہ یہ تو اُونٹ ہے پھر جب وہ تھوڑا سا قریب ہوا تو آپ کو شک ہوا کہ وہ تو اونٹ نہیں ہے بلکہ بکری ہے تو آپ نے ڈائریکٹ کہہ دیا کہ ام ھی شاۃ تو گویا آپ نے پہلے سوال سے اپنی پہلی خبر سے اعراض کیا اور اب آپ دوسرا سوال کر رہے ہیں کہ ام ھی شاۃ کیا وہ بکری ہے ؟ تو یہاں ام منقطعہ ہو گا اس لیے کہ یہاں پہلے کلام انہا لابل سے اعراض ہے اور دوسرے کلام ام ھی شاۃ میں شک پیدا کر رہا ہے چنانچہ یہاں ام ھی شاۃ کا مطلب ہو گا بل ھی شاۃ ...

بقیہ حروف کے احکام

و(اِمّا) قبل المعطوف علیہ لازمۃ مع (اِمّا)، جائزۃ مع (أو)، و(لا) و(بل) و(لکن) لأحدھما معیّنا، و(لکن) لازمۃ للنّفی.

مصنفؒ یہاں بقیہ حروف کے احکام بیان فرما رہے ہیں۔

إِمَّا : یہاں سے اِمَّا کے متعلق بتاتے ہیں کہ اِمَّا حرف عطف اس وقت ہو گا یعنی شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی دوسرا اِمَّا ہو جیسے **العدد إمّا زوج وإمّا فردٌ** کہ عدد یا جفت ہے یا فرد ہے۔

جبکہ "أو" کے ساتھ ایسا نہیں، وہاں ایک "إما" لانا جائز ہے، جیسے **إِمَّا زَيْدٌ أَوْ عَمْرٌو**۔

لَا بَلْ لٰكِن؛ حروف عاطفہ کی تقسیم کے اعتبار سے تیسری قسم لَا بَلْ لٰكِن کی یہ تینوں حروف معطوف اور معطوف علیہ میں سے کسی ایک کے لیے معین طور پر حکم ثابت کرنے کے لیے آتے ہیں۔لَا بَلْ لٰكِن یہ تینوں اس بات میں شریک ہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ میں سے کسی ایک کے لیے معین طور پر حکم ثابت ہو لیکن تینوں میں فرق ہے۔

لا ، معطوف سے اس حکم کی نفی کرنا ہے جو حکم معطوف علیہ کے لیے ثابت ہے اسی وجہ سے یہ ہمیشہ کلام مثبت کے بعد آتا ہے جیسے **جَآءَنِیْ زَیْدٌ لا عمرو** میرے پاس زید آیا نا کہ عمرو۔ تو یہاں دیکھیں معطوف علیہ زید کے لیے آنے کا حکم ثابت کیا تھا لا حرف عطف نے آکر معطوف عمرو سے اس کی نفی کر دی کہ زید آیا عمرو نہیں آیا۔

بل معطوف علیہ سے اعراض کرکے معطوف کے لیے حکم ثابت کرنے کے لیے آتا ہے یعنی حرف بل جو ہے یہ حکم کو معطوف علیہ سے معطوف کی جانب پھیر دیتا ہے اور معطوف علیہ بے چارہ مسکوت عنہ کے حکم میں ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت ہو گا جب بَلْ سے پہلے کلام مثبت ہو جیسے **جَآءَنِیْ زَیْدٌ بل عمرو** ای **بل جآءنی عمرو** میرے پاس زید آیا نہیں بلکہ میرے پاس عمرو آیا تو اس کا معنی ہے **بل جآءنی عمرو** یہاں آنے کا حکم جو معطوف علیہ زید کے لیے زید ثابت کیا گیا تھا بل نے آکر اسے زید سے عمرو کی طرف پھیر دیا۔اور زید اب مسکوت عنہ کے حکم میں ہو گیا یعنی زید آیا نہیں تھا متکلم کو اس سے کوئی اعراض نہیں کرنا۔اور اگر بَلْ سے پہلے کلام منفی ہو جیسے **ما جاءنی بکر بل خالد** تو اس صورت میں بل معطوف کے لیے حکم کی نفی کو ثابت کرے گا یا نہیں اس میں خارجی طور پر تھوڑا سا اختلاف ہے۔

امام مبرد :

فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بل معطوف کے لیے حکم کی نفی کو ثابت کرے گا اور معطوف علیہ مسکوت عنہ کے حکم میں ہو گا یعنی اس کو ایسا سمجھا جائے گا گویا کہ اس کا ذکر ہی نہیں ہوا چنانچہ ان کے نزدیک **بل خالد** کے معنی ہوں گے **بل ما جاء خالد** کہ خالد نہیں آیا بقیہ رہا عمرو کا معاملہ تو وہ مسکوت عنہ کے حکم میں ہے۔

جمھور کی رائے یہ ہے کہ بل معطوف کے لیے حکم کی نفی کو ثابت نہیں کرے گا بلکہ سابقہ جملے میں جس حکم کی معطوف علیہ سے نفی کی گئی بل اس کو معطوف کے لیے ثابت کرے گا اور معطوف علیہ سے حکم کی نفی یا تو بدستور باقی رہے گی یا وہ مسکوت عنہ کے حکم میں ہو گا چنانچہ جمہور کے نزدیک **بل خالد** کا معنی ہو گا **بَلْ جَاءَ خَالِدٌ** کہ خالد آیا اور عمرو یا تو نہیں آیا یا وہ سکوت عنہ ہے۔

لٰکن للاستدراک: لٰکن استدراک کے لیے آتا ہے یعنی کلام سابق سے پیدا شدہ وہم کو ختم کرنے کے لیے آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسکے لیے نفی ضروری ہوتی ہے مصنف کا قول "**لکن لازمة للنفی**" اسی شرط کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی یا تو اس سے پہلے نفی ہو جیسے ما جآءنی زیدٌ لکن وعمرٌو جآءَ میرے پاس زید نہیں آیا لیکن عمرو آیا۔ یا اس کے بعد نفی ہو جیسے قام بکر لکن خالد لم یقم کہ بکر کھڑا ہے لیکن خالد کھڑا نہیں ہے۔

[حروف التنبیه]:

(ألا)، و (أما)، و (ها).

ترجمہ: [حروفِ تنبیہ] :(ألا)، (أما)، اور (ها) ہیں۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ تنبیہ کا بیان شروع فرمارہے ہیں۔ "تنبیہ" کا معنی ہے آگاہ کرنا، متوجہ کرنا یا خبردار کرنا۔ یہ وہ حروف ہیں جو کلام کے شروع میں لائے جاتے ہیں تاکہ مخاطب (سننے والے) کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جاسکے جو اس کے بعد کہی جانے والی ہے، گویا کہ متکلم کہہ رہا ہو "خبردار!"، "سنو!"، "غور کرو!"۔ ان حروف کا کوئی اعرابی عمل نہیں ہوتا، یعنی یہ اپنے بعد آنے والے کلمات کے اعراب میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے؛ ان کا مقصد صرف معنوی اور بلاغی ہوتا ہے۔

مصنفؒ نے یہاں تین حروفِ تنبیہ شمار کیے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے

.1: (ألا) یہ حرفِ تنبیہ کلام کے شروع میں داخل ہو کر مخاطب کو آنے والے مضمون کی اہمیت پر آگاہ کرتا ہے۔ اسے حرفِ استفتاح (کلام شروع کرنے والا حرف) بھی کہتے ہیں۔

استعمال : یہ اکثر جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ، دونوں پر داخل ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ استعمال ان مقامات پر ہوتا ہے جہاں کلام میں تاکید، ترغیب، یا کسی اہم خبر کا اعلان مقصود ہو۔

خاص مواقع : یہ عموماً "إنَّ" اور "لیتَ" پر، یا امر (حکم) اور قسم سے پہلے کثرت سے آتا ہے تاکہ تنبیہ میں مزید تاکید پیدا ہو۔

مثالیں: قرآن مجید سے (إنّ پر داخل): ﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (سن لو! بے شک جو اللہ کے دوست ہیں، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے)۔ یہاں "ألا" نے آنے والی عظیم خوشخبری کی طرف ذہنوں کو پوری طرح متوجہ کر دیا ہے۔

شعر سے (لیت پر داخل): أَلَا لَيْتَ الشَّبَابَ يَعُودُ يَوْمًا (آہ! کاش جوانی ایک دن کے لیے لوٹ آتی)۔ یہاں "ألا" حسرت اور آرزو کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

.2 (أما) یہ حرف بھی "ألا" کی طرح تنبیہ اور کلام کے افتتاح کے لیے آتا ہے۔ یہ بھی مخاطب کو متوجہ کرتا ہے کہ جو بات آگے آ رہی ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔

استعمال : یہ بھی جملہ اسمیہ اور فعلیہ دونوں پر داخل ہوتا ہے۔

فرق : بعض نحویوں کے نزدیک "أما" میں "ألا" کی نسبت قسم اور تاکید کا معنی زیادہ پایا جاتا ہے۔

مثال: قسم پر داخل: أَمَا وَاللّٰهِ إِنَّ زَيْدًا لَقَائِمٌ (آگاہ رہو! اللہ کی قسم، بے شک زید ضرور کھڑا ہے)۔ یہاں "أما" نے قسم کو

مزید موکد کر دیا ہے۔

.3 (ھا) یہ حرفِ تنبیہ بھی مخاطب کو متوجہ کرنے کے لیے آتا ہے، لیکن اس کا استعمال پہلے دو حروف سے مختلف ہے۔ یہ اکثر دوسرے کلمات کے ساتھ مل کر استعمال ہوتا ہے۔

سب سے مشہور استعمال :اس کا سب سے زیادہ استعمال اسماءِ اشارہ سے پہلے ہوتا ہے۔ درحقیقت، اسماءِ اشارہ جیسے "**هذا، هذه، هؤلاء**" میں اصل اسمِ اشارہ "**ذا، ذِهِ، أولاء**" ہے اور شروع میں لگی ہوئی "ہا" تنبیہ کے لیے ہے۔ **هذا** (یہ مذکر) اصل میں ہا + ذا ہے۔ **هذه** (یہ مؤنث) اصل میں ہا + ذِہِ ہے۔ **هؤلاء** (یہ سب) اصل میں ہا + اُولَاءِ ہے۔

اس "ہا" کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اشارہ کیے جانے والی چیز کی طرف دیکھنے اور سمجھنے کے لیے پہلے سے تیار ہو جاتا ہے۔

دیگر استعمالات: یہ کبھی ضمیر سے پہلے بھی آتا ہے، جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (سنو! تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا)۔ یہاں "ہا" ضمیر "انتم" کو خبردار کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

[حروف النداء]:

(يا) أعمّها، و (أيا) و (هيا) للبعيد، و (أي) و (الهمزة) للقريب.

ترجمہ: [حروفِ ندا]: 'یَا' سب سے زیادہ عام ہے۔ 'أَيَا' اور 'هَيَا' دور والے کے لیے ہیں۔ اور 'أَي' اور 'هَمزَة' (یعنی اَ) قریب والے کے لیے ہیں۔

تشریح

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبارت میں حروفِ ندا کو ان کے استعمال کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ہر حرف کس قسم کے منادی (جسے پکارا جا رہا ہے) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

حروف ندا کی تعریف :حروف ندا ان حروف کو کہتے ہیں جن کے ذریعے سے کسی کو مدعو کیا جائے، پکارا جائے حروف ندا پانچ ہیں (۱)یا (۲)ایا (۳)ھیا (۴) ای (۵)**ھمزہ مفتوحہ**۔

.1 (يَا) أَعَمُّهَا (یعنی 'یَا' سب سے زیادہ عام ہے): مصنف یہاں یہ بیان فرماتے ہیں کہ حروفِ ندا میں 'یَا' سب سے زیادہ کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور اس کا استعمال منادی کے قریب یا دور ہونے کی قید سے آزاد ہے۔ یعنی یہ قریب، بعید، اور متوسط ہر طرح کے منادی کو پکارنے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ اسی عمومیت کی وجہ سے یہ تمام حروفِ ندا کا امام اور اصل سمجھا جاتا ہے۔ عام بول چال اور قرآن و حدیث میں بھی اس کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی کو منادی کی دوری یا قربت کا علم نہ ہو تو وہ بلا جھجک 'یَا' استعمال کر سکتا ہے، کیونکہ یہ کسی خاص حالت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

.2 (أَيَا) وَ (هَيَا) لِلْبَعِيدِ (یعنی 'اَیَا' اور 'ھَیَا' دور والے کے لیے ہیں): مصنف نے یہاں ان دو حروف کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ ان دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، یعنی دور کے منادی کو پکارنا۔ ان حروف کو خاص طور پر اس لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ دور

کے شخص کو آواز دینے میں آسانی ہو اور یہ پکار کی مسافت کو ظاہر کر سکیں۔ ان کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب مخاطب پکارنے والے سے کافی فاصلے پر ہو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اس آواز کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں جو کسی دور کے شخص تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

.3 (أَيْ) وَ (الْهَمْزَةُ) لِلْقَرِيبِ (یعنی 'اَیْ' اور 'ھَمزۃ' قریب والے کے لیے ہیں): مصنف یہاں یہ بیان فرماتے ہیں کہ جب منادی قریب ہو تو اسے پکارنے کے لیے 'اَیْ' اور ہمزہ مفتوحہ (یعنی اَ) کا استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں حروف کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قریب کے مخاطب کو مخاطب کرنے کے لیے ہیں، جس کے لیے زیادہ بلند آواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس قربت کا اظہار کرتے ہیں جہاں اشارہ یا ہلکی آواز بھی کافی ہو۔ اگر کوئی شخص 'اَیْ' یا 'اَ' استعمال کرے تو یہ خود بخود یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ قریب کھڑے شخص کو مخاطب کر رہا ہے۔

[حروف الإيجاب]:

(نعم)، و (بلى)، و (إي)، و (أجل)، و (جير)، و (إن). ف (نعم) مقرّرة لما سبقها. و (بلى) مختصّة بإيجاب النّفي. و (إي) إثبات بعد الاستفهام، ويلزمها القسم. و (أجل)، و (جير)، و (إن) تصديق للمخبر.

ترجمہ: "حروفِ ایجاب" (یعنی ہاں کہنے والے حروف): یہ چھ حروف ہیں: (نعم)، (بلى)، (إي)، (أجل)، (جير)، اور (إن)۔ نعم: یہ اپنے سے پہلے آنے والی بات کی تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ بلى: یہ صرف نفی کے جواب میں اثبات کے لیے آتا ہے۔ إي: یہ سوال کے بعد بات کی تصدیق کے لیے آتا ہے اور اس کے ساتھ قسم لگانا ضروری ہے۔ أجل، جير، اور إن: یہ تینوں خبر دینے والے کی بات کی تصدیق کے لیے آتے ہیں۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروف ایجاب کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ چھ حروف ہیں، اور ہر ایک کا الگ استعمال ہے۔

حروف ایجاب کی تعریف:

حروف ایجاب ان حروف کو کہا جاتا ہے جو ماقبل والے کلام کے لیے بطور جواب یا ثبوت کے وضع کیے گئے ہوں۔ حروف ایجاب چھ ہیں: نعم[1] وَبَلٰی[2] اجل[3] جَیرِ[4] اِنَّ[5] وَاِی[6] ۔

.1 نعم (نَعَم): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ نعم کا کام تقریر ہے، یعنی اپنے سے پہلے آنے والی بات کو قائم رکھنا اور اسے جوں کا توں تسلیم کرنا۔ خواہ وہ بات مثبت ہو یا منفی، استفہام پر مبنی ہو یا نہ ہو۔

مثال: جب کوئی پوچھے: "أَجَاءَ زَيْدٌ؟" (کیا زید آیا؟) اگر جواب میں کہیں: "نَعَمْ"، تو اس کا مطلب ہے: "جَاءَ" (ہاں، آیا)۔ یہاں نعم نے استفہام کو ختم کرکے بات کو مثبت جواب میں قائم رکھا۔

مثال: جب کوئی پوچھے: "أَلَيْسَ زَيْدٌ قَائِمًا؟" (کیا زید کھڑا نہیں ہے؟) اگر جواب میں کہیں: "نَعَمْ"، تو اس کا مطلب ہے: "لَيْسَ قَائِمًا" (ہاں، وہ کھڑا نہیں ہے)۔ یہاں نعم نے استفہام کو ختم کرکے نفی کو قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ شارحین نے

نعم کو مُقَرِّرٌ لِما سَبَقَهُ کہا ہے، یعنی یہ ما قبل کو قائم رکھتا ہے۔

.2 بلی (بلی): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ بلی صرف نفی کے ایجاب کے لیے آتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ یہ نفی کو ختم کرکے اس کا اثبات کرتا ہے۔ یہ صرف اسی وقت استعمال ہوتا ہے جب سوال یا کلام میں نفی ہو۔

مثال : "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) قرآن میں اہلِ ایمان کا جواب ہے : "بَلَى" (کیوں نہیں!)۔ یعنی "أَنْتَ رَبُّنَا" (آپ ہمارے رب ہیں)۔ یہاں بلی نے سوال میں موجود نفی "أَلَسْتُ" کو ختم کرکے رب ہونے کا اثبات کیا۔ یہ جواب نعم سے نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اگر "نَعَمْ" کہتے تو اس کا مطلب ہوتا "لَسْتَ بِرَبِّنَا" (ہاں، آپ ہمارے رب نہیں ہیں)، جو کفر ہے۔

.3 إِي (إِي): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ إِی اثبات کے لیے آتا ہے لیکن یہ صرف استفہام کے بعد استعمال ہوتا ہے اور اس کے ساتھ قسم کا آنا ضروری ہے۔

مثال : جب کوئی پوچھے : "هَلْ فَعَلْتَ كَذَا؟" (کیا تم نے ایسا کیا؟) اگر جواب میں کہیں : "إِي وَاللهِ" (ہاں، اللہ کی قسم)۔ یہاں إِی نے استفہام کا اثبات کیا اور اس کے ساتھ قسم بھی لگائی۔

.4 أجل، جیر، اور إن: مصنفؒ ان تینوں حروف کو ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ مُخْبِر (خبر دینے والے) کی بات کی تصدیق کے لیے آتے ہیں۔ یہ تینوں حروف اپنے سے پہلے آنے والی خبر کی تصدیق کرتے ہیں، خواہ وہ خبر استفہام کے بغیر ہو۔

مثال : جب کوئی کہے : "جَاءَ زَيْدٌ" (زید آیا)۔ اس کی بات کی تصدیق کے لیے کہہ سکتے ہیں : "أَجَلْ" یا "جَيْرِ" یا "إِنَّهْ"۔ ان سب کا مطلب ہے : "ہاں، زید آیا ہے۔"

[حروف الزيادة]:

(إن)، و(أن)، و(ما)، و(لا)، و(من)، والباء، واللام. ف(إن) مع (ما) النّافية، وقلّت مع (ما) المصدريّة و(لما). و(أن) مع (لمّا)، وبين (لو) والقسم، وقلّت مع الكاف. و(ما) مع (إذا) و(متى) و(أيّ) و(أين) و(إن) شرطاً، وبعض حروف الجرّ، وقلّت مع المضاف. و(لا) مع الواو بعد النّفي، وبعد (أن) المصدريّة، وقلّت قبل أقسم، وشذّت مع المضاف. و(من) و(الباء) و(اللاّم) تقدّم ذكرها.

ترجمہ: "حروفِ زائدہ" (وہ حروف جو کلام میں اضافہ کے طور پر آتے ہیں): یہ سات حروف ہیں : (إن)، (أن)، (ما)، (لا)، (من)، (الباء)، اور (اللام)۔ إن : یہ زائد ہوتا ہے نفی والے ما کے ساتھ، اور کم استعمال ہوتا ہے مصدریہ ما اور لما کے ساتھ۔ أن : یہ زائد ہوتا ہے لما کے ساتھ، لو اور قسم کے درمیان، اور کم استعمال ہوتا ہے کاف کے ساتھ۔ ما : یہ زائد ہوتا ہے إذا، متی، أیّ، أین، اور شرطیہ إن کے ساتھ، اور بعض حروفِ جر کے ساتھ، اور کم استعمال ہوتا ہے مضاف کے ساتھ۔ لا : یہ زائد ہوتا ہے نفی کے بعد واو کے ساتھ، اور مصدریہ أن کے بعد، اور کم استعمال ہوتا ہے أقسم سے پہلے، اور شاذ و نادر استعمال ہوتا ہے مضاف کے

ساتھ۔ من، الباء، اور اللام :ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ زائدہ کی بحث شروع کرتے ہیں،

حروف زائدہ کی تعریف :

حروف زائدہ ان حروف کو کہتے ہیں جن کو کلام سے اگر گرادیا جائے تو کلام کے معنی پر کوئی فرق نہ پڑے بلکہ یہ حروف صرف کلام کی خوبصورتی کے لیے آتے ہیں۔

فائدہ:... حروف زائدہ کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ہر وقت ہر جگہ زائد ہوتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں حروف زائدہ کی ضرورت ہو تو وہاں ان حرفو کو لایا جائے گا یہ حروف اس لیے زائدہ کہلاتے ہیں... حروف زائدہ سات ۷ ہیں :إنْ، أنْ، ما، لا، من، ب، لام۔

1إن (إن) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ إن زائد ہوتا ہے، خاص طور پر ما نافیہ کے ساتھ۔ اس کی سب سے مشہور مثال یہ ہے :"وَمَا إِنْ تَفْعَلُوا لَا يُقْبَلُ مِنْكُمْ" (اگر تم ایسا کروگے تو تم سے قبول نہیں کیا جائے گا)۔ یہاں إن زائد ہے اور اس کا کوئی نحوی عمل یا معنی نہیں ہے۔

مصنفؒ مزید فرماتے ہیں کہ یہ ما مصدریہ کے ساتھ اور لما کے ساتھ کم استعمال ہوتا ہے۔

مثال :"بِأَيِّ مَا إِنْ لَحِقْتَ بَعْدُ" (جس کے بعد تم حق میں ہو)۔ یہاں إن زائد ہے۔

.2أن (أن) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ أن تین مقامات پر زائد ہوتا ہے۔

لما کے بعد :جیسے :"فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ" (پس جب خوشخبری دینے والا آیا)۔ یہاں أن زائد ہے۔

لو اور قسم کے درمیان :جیسے :"لَوْ أَنْ لَا تُعَارِضُونِي" (اگر تم میری مخالفت نہ کرو)۔ یہاں أن زائد ہے۔

کاف کے ساتھ (بہت کم) :جیسے :"كَأَنْ أَنَّ الْقَمَرَ نَارٌ" (گویا کہ چاند آگ ہے)۔ یہاں أن زائد ہے۔

.3ما (ما) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ما کا زیادہ استعمال زائد کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کے کئی مقامات ہیں:

إذا کے بعد :جیسے :"إِذَا مَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ" (جب منافق تمہارے پاس آئیں)۔ یہاں ما زائد ہے۔

متی، ای، أین، اور إن شرطیہ کے بعد :جیسے :"أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ" (تم جہاں کہیں بھی ہوگے، موت تمہیں پالے گی)۔ یہاں ما زائد ہے۔

بعض حروف جر کے ساتھ :جیسے :"عَمَّا قَلِيلٍ" (تھوڑی دیر بعد)۔ یہاں ما زائد ہے اور اصل میں "عن" ہے۔

مضاف کے ساتھ (بہت کم) :جیسے :"غَيْرَ مَا رَأْسِهِ" (اس کے سر کے علاوہ)۔ یہاں ما زائد ہے۔

.4لا (لا) :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ لا بھی زائد کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اور اس کے بھی کئی مقامات ہیں:

واو کے ساتھ نفی کے بعد :جیسے :"وَإِذَا لَمْ يَهْتَدُوا لَا يُنْظَرُونَ" (اور جب وہ ہدایت نہیں پاتے تو انہیں دیکھا نہیں جاتا)۔

اَن مصدریہ کے بعد : جیسے :"لِئَلَّا یَکُونَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ" (تاکہ لوگوں پر کوئی حجت باقی نہ رہے)۔ یہاں لا زائد ہے۔
اُقسم سے پہلے (بہت کم) : جیسے :"لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ" (میں قیامت کے دن کی قسم نہیں کھاتا)۔ یہاں لا زائد ہے اور اس کا معنی نہیں لیا جاتا۔
مضاف کے ساتھ (شاذ) : جیسے :"غَيْرَ لَا عَيْنِهِ" (اس کی آنکھ کے علاوہ)۔ یہاں لا زائد ہے۔
.5من، 6الباء، اور 7اللام: مصنفؒ ان تینوں حروف کے بارے میں صرف اتنا فرماتے ہیں کہ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ یہ تینوں حروف بھی زائد ہوتے ہیں۔
من : جیسے :"مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ" (ہمارے پاس کوئی بشیر نہیں آیا)۔ یہاں من زائد ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔
الباء : جیسے :"أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ" (کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟)۔ یہاں باء زائد ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔
اللام : جیسے :"إِنْ كَانَ لَكَذَا" (اگر یہ ایسا تھا)۔ یہاں لام زائد ہے۔

[حرفا التفسیر]:

(أی)، و (أن)، ف (أن) مختصّة بما فی معنی القول.

ترجمہ؛"حرفِ تفسیر" (کسی بات کو واضح کرنے والے حروف): یہ دو حروف ہیں :(ای) اور (اَن)۔اَن : یہ صرف اس کلام کے ساتھ خاص ہے جو قول (کہنے) کے معنی میں ہو۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ تفسیر کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ دو حروف ہیں :(أی) اور (أن)۔

تعریف

حروفِ تفسیر وہ حروف ہوتے ہیں جو اپنے سے پہلے آنے والے کلام کو واضح، تشریح اور بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں تاکہ بات کو مزید کھول کر بیان کیا جاسکے اور سننے والے کے لیے سمجھنا آسان ہو جائے۔
.1أی (ای): مصنفؒ نے یہاں أی کا عام استعمال بیان نہیں کیا، کیونکہ اس کا استعمال بہت وسیع ہے۔
أی کا استعمال عام طور پر کسی مبہم (غیر واضح) لفظ کی وضاحت کے لیے ہوتا ہے۔
مثال : جیسے کوئی کہے :"رَأَيْتُ اللَّيْثَ، أَيِ الْأَسَدَ" (میں نے لیث کو دیکھا، یعنی شیر کو)۔ یہاں "اللیث" ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی کی وضاحت کی ضرورت ہے، اس لیے "ای" کا استعمال کر کے اس کے معنی "الأسد" (شیر) سے واضح کیے گئے ہیں۔
ای کا استعمال صرف الفاظ کی وضاحت تک محدود نہیں، بلکہ یہ جملوں کی وضاحت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔
مثال : جیسے کوئی کہے :"أَشَرْتُ إِلَيْهِ، أَيْ قُلْتُ لَهُ" (میں نے اسے اشارہ کیا، یعنی میں نے اس سے کہا)۔ یہاں جملے "أَشَرْتُ" کی وضاحت دوسرے جملے "قُلْتُ لَهُ" سے کی گئی ہے۔

.2أن (اَن): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اَن صرف مافی معنی القول (اس چیز کے ساتھ جو قول یعنی بات کہنے کے معنی میں ہو) کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اَن وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی ایسا لفظ ہو جو قول کے معنی پر دلالت کرے۔

مثال : جیسے کوئی کہے : "كَتَبْتُ إِلَيْهِ أَنْ قُمْ" (میں نے اسے لکھا کہ کھڑا ہو جاؤ)۔ یہاں "کتبت" (میں نے لکھا) کا لفظ قول کے معنی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ لکھنا بھی ایک قسم کا قول ہے۔ اس لیے یہاں "اَن" کا استعمال کیا گیا ہے۔

تفسیر میں دونوں حروف کا فرق: اَی کا استعمال عام ہے اور یہ الفاظ، جملوں، اور ہر طرح کے کلام کی وضاحت کے لیے آتا ہے۔ یہ صرف قول کے معنی تک محدود نہیں۔ اَن کا استعمال خاص ہے اور یہ صرف اس کلام کی وضاحت کرتا ہے جو قول کے معنی پر دلالت کرے۔

[حروف المصدر]:

(ما)، و(أن)، و(أنّ). فالأوّلان للفعليّة. و(أن) للاسميّة.

ترجمہ؛ "حروفِ مصدر" (وہ حروف جو اسمِ مصدر کا معنی دیتے ہیں): یہ تین حروف ہیں : (ما)، (اَن)، اور (اَنّ)۔ پہلے دو (یعنی ما اور اَن) فعلیہ جملوں کے لیے ہیں۔ جبکہ آخری (یعنی اَنّ) اسمیہ جملوں کے لیے ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ مصدر کی بحث شروع کرتے ہیں

حروف مصدریہ کی تعریف :

حروف مصدری ان حروف کو کہتے ہیں جو جملے کو مصدر کے معنی میں کر دیتے ہیں چاہے وہ جملہ فعلیہ ہو یا اسمیہ ہو۔

فرماتے ہیں کہ یہ تین حروف ہیں : (ما)، (أن)، اور (أنّ)۔ ان حروف کا کام یہ ہے کہ یہ اپنے بعد آنے والے جملے کو مصدر کے معنی میں کر دیتے ہیں، یعنی وہ جملہ ایک اسم کے طور پر استعمال ہونے لگتا ہے۔

.1 ما (ما): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ما مصدریہ فعل کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ صرف فعلیہ جملے کو مصدر کے معنی میں کرتا ہے۔

مثال : جیسے آیت میں ہے : "فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ" (پس نکاح کرو جو تمہارے لیے عورتوں میں سے پاکیزہ ہو)۔ یہاں "مَا طَابَ" کا معنی ہے "طِيبَهُنَّ" (ان کا پاکیزہ ہونا)۔ اس مثال میں، ما نے اپنے بعد آنے والے فعل "طَابَ" اور اس کے فاعل کو مصدر یعنی "طِیب" کے معنی میں کر دیا۔ یہ اس بات کی وضاحت ہے کہ ما فعلیہ جملے کے ساتھ آتا ہے۔

.2أن (اَن): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اَن بھی فعل کے ساتھ خاص ہے۔ یہ بھی فعلیہ جملے کو مصدر کا معنی دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ فعل کا آنا ضروری ہے۔

مثال : جیسے آیت میں ہے : "وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ" (اور تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے)۔ یہاں "أَنْ تَصُومُوا" کا مطلب ہے "صِيَامُكُمْ" (تمہارا روزہ رکھنا)۔ یہاں اَن نے فعل "تَصُومُوا" اور اس کے فاعل کو ملا کر ایک مصدر

یعنی "صِیامٌ" کا معنی دے دیا۔

اَن اور ما میں فرق: ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اَن اپنے بعد آنے والے فعل کو مستقبل یا حال کا معنی دیتا ہے، جبکہ ما زمانۂ ماضی کا معنی دیتا ہے۔

.3 أنَّ (اَنّ): مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اَنّ اسمیہ جملے کے ساتھ خاص ہے۔ یہ اپنے بعد آنے والے مبتدا اور خبر کو مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔

مثال: جیسے آیت میں ہے: "أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ" (کیا انہیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی؟)۔ یہاں "أَنَّا أَنْزَلْنَا" کا مطلب ہے "إِنْزَالُنَا" (ہمارا نازل کرنا)۔ اس مثال میں اَنّ نے اپنے بعد آنے والے اسم (کاف) اور خبر (انزلنا) کو ایک مصدر یعنی "اِنزال" کے معنی میں کر دیا

[حروف التّحضيض]:

(هلاّ)، و(ألاّ)، و(لولا)، و(لوما) لها صدر الكلام، ويلزم الفعل لفظاً أو تقديراً.

ترجمہ؛ "حروفِ تحضیض" (وہ حروف جو کسی کام کو کرنے کی ترغیب اور تحریک دیتے ہیں) یہ چار حروف ہیں: (هَلَّا)، (أَلَّا)، (لَوْلَا)، اور (لَوْمَا)۔ ان حروف کو کلام کے شروع میں ہونا چاہیے، اور ان کے بعد فعل کا آنا ضروری ہے، خواہ وہ لفظوں میں موجود ہو یا اس کا تقدیر اندازہ لگایا جائے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ تحضیض کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں

حروفِ تحضیض کی تعریف اور اقسام:

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ حروفِ تحضیض چار ہیں: **هلاّ، ألاّ، لولا، اور لوما۔**

"تحضیض" کا لغوی معنی کسی کام پر شد و مد سے ابھارنا اور ترغیب دلانا ہے۔ اصطلاح میں یہ حروف دو معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں: تحضیض (ترغیب و ابھارنا): جب یہ حروف فعلِ مضارع پر داخل ہوتے ہیں تو مخاطب کو کسی کام کے کرنے پر ابھارتے ہیں۔ مثلاً، ہَلَّا تَزُوْرُنَا (آپ ہماری زیارت کیوں نہیں کرتے؟/آپ کو ہماری زیارت کرنی چاہیے)۔ توبیخ و تندیم (ملامت و سرزنش): جب یہ حروف فعلِ ماضی پر داخل ہوتے ہیں تو مخاطب کو کسی کام کے نہ کرنے پر ملامت اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً، لَوْمَا جِئْتَ مَعَنَا (تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئے؟/کاش تم ہمارے ساتھ آئے ہوتے)۔

ہر حرف کا استعمال:

هَلَّا: یہ ماضی اور مستقبل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ماضی کی مثال: "هَلَّا جِئْتَنَا بِفَائِدَةٍ؟" (تم ہمارے پاس فائدہ لے کر کیوں نہیں آئے؟) یہاں نہ آنے پر ملامت ہے۔

مستقبل کی مثال: "هَلَّا تَأْتِينَا؟" (تم ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟) یہاں آنے کی ترغیب ہے۔

أَلَّا : یہ بھی تحضیض کے لیے آتا ہے۔
مثال :"أَلَّا تَجْلِسُ فِي مَجْلِسِ الْعِلْمِ؟" (تم علم کی مجلس میں کیوں نہیں بیٹھتے؟) یہاں بیٹھنے کی ترغیب ہے۔
لَوْلَا : یہ بھی تحضیض و شرط کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب "اگر ایسا نہ ہوتا تو" ہے۔ اس کا استعمال ایک ایسے عمل یا حالت کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جس کا نہ ہونا کسی دوسرے عمل یا حالت کا سبب بنتا ہے۔
مثالیں :* لولا المطر لجف الزرع۔ (اگر بارش نہ ہوتی تو فصلیں سوکھ جاتیں۔) *لولاك لهلكت۔ (اگر تم نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔) *لولا الشرطي لسرق اللص المنزل۔ (اگر پولیس والا نہ ہوتا تو چور گھر چوری کر لیتا۔) ان مثالوں میں، "لولا" کے بعد آنے والی حالت یا چیز (بارش، تم، پولیس والا) کا نہ ہونا اس کے بعد والے نتیجے (فصلوں کا سوکھنا، ہلاکت، گھر کی چوری) کا سبب بنتا ہے۔
(نوٹ) لولا علی رضی اللہ عنہ لهلك عمر رضی اللہ عنہ اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ یہ مثال اکثر نحو کی کتابوں میں موجود ہوتی ہے اس لیے فائدہ کے لیے اس کا حوالہ تحریر کرتا ہوں۔

قال احمد ابن زهیر حدثنا عبداللہ ابن عمر القواریری حدثنا مؤمل ابن اسماعیل حدثنا سفیان الثوری عن یحیی ابن سعید عن سعید ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ قال کان عمر رضی اللہ عنہ یتعوذ باللہ من معظمۃ لیس لها ابو الحسن وقال فی المجنونۃ التی امر برجمها وفی التی وضعت لستۃ اشهر فاراد عمر رضی اللہ تعالی عنہ رجمها فقال لہ علی رضی اللہ تعالی عنہ ان اللہ تعالی یقول :وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۔ وقال لہ ان اللہ رفع القلم عن المجنون الحدیث فکان عمر رضی اللہ تعالی عنہ یقول لولا علی (رضی اللہ تعالی عنہ) لهلك عمر رضی اللہ تعالی عنہ ۔(استیعاب ابن عبدالبر ج صفحہ :۱۱۰۳)

سیدنا عمر ہر اس مسئلہ کے بارے میں اللہ سے پناہ مانگتے تھے جہاں حضرت علی موجود نہ ہو اور ایک ایسی دیوانی عورت کے بارے میں کہ جس کے بارے ییں رجم کا فیصلہ فرمایا اور اس عورت کے بارے میں جس کا چھ مہینے کی مدت کے بعد بچہ پیدا ہوا تھا ۔اور سیدنا عمر اس کو سنگسار کرنا چاہتے تھے ۔ حضرت علی نے ان سے فرمایا خداوند عالم قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں اور عورت کے حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ۳۰ مہینے ہے اس کے بعد حضرت عمر سے کہا خدا نے دیوانی پر کوئی ذمہ داری نہیں رکھی اس کے بعد حضرت عمر کہتے تھے اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔
لَوْمَا : یہ بھی تحضیض کے لیے آتا ہے اور اس کا معنی لولا کی طرح ہی ہے۔ مثال :"لَوْمَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ؟" (تم نماز کے لیے کیوں نہیں کھڑے ہوئے؟) یہاں نماز نہ پڑھنے پر ملامت اور افسوس کا اظہار ہے۔
حروفِ تحضیض کے احکام: مصنفؒ ان حروف کے دو بنیادی قواعد و خصائص بیان فرماتے ہیں
لها صدر الکلام (یہ ہمیشہ جملے کے شروع میں آتے ہیں) :پہلا حکم یہ ہے کہ یہ حروف "صدارت طلب" ہوتے ہیں، یعنی یہ ہمیشہ جملے کے شروع میں ہی آسکتے ہیں۔ ان سے پہلے جملے کا کوئی اور جز (مثلاً فاعل یا مفعول) نہیں لایا جا سکتا۔ آپ زیداً هلاّ أکرمت نہیں کہہ سکتے، بلکہ هلاّ أکرمت زیداً کہنا لازم ہے۔ اس قاعدے میں یہ حروف، حروفِ استفہام اور حروفِ شرط کی

طرح ہیں۔

ویلزم الفعل لفظاً أو تقدیراً (ان کے بعد فعل کاآنالازم ہے): دوسرا حکم یہ ہے کہ ان حروف کے بعد فعل کاآنا ضروری ہے، کیونکہ ترغیب یاملامت کا تعلق کسی فعل (کام) سے ہی ہوتا ہے۔اس فعل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

لفظاً: فعل جملے میں صراحتاً مذکور ہو۔ یہ عام صورت ہے۔

مثال (فعلِ مضارع کے ساتھ): **أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ** (القرآن 9:13)۔ترجمہ: "تم ان لوگوں سے جنگ کیوں نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں؟" یہاں اَلَا تحضیض کے لیے ہے اور اس کے بعد فعل تُقَاتِلُونَ لفظوں میں موجود ہے۔

مثال (فعلِ ماضی کے ساتھ): **لَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً** (القرآن 46:28)۔ترجمہ: "تو اُن معبودوں نے اُن کی مدد کیوں نہ کی جنہیں انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر قربت کا ذریعہ بنایا تھا؟" یہاں لَوْلَا توبیخ کے لیے ہے اور اس کے بعد فعل نَصَرَہُم مذکور ہے۔

تقدیراً: فعل جملے میں محذوف (حذف شدہ) ہو لیکن نیت اور تقدیر میں موجود ہو۔ یہ صورت تب پیش آتی ہے جب سیاقِ کلام اس محذوف فعل پر دلالت کر رہا ہو۔

مثال: اگر کوئی شخص سفر کا ارادہ ظاہر کرے اور آپ اسے زادِ راہ (سفر خرچ) نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہوئے پائیں، تو آپ کہہ سکتے ہیں **هَلَّا التَّمْرَ وَالْمَاءَ**۔ اس کی تقدیر یا اصل عبارت یوں ہو گی: **هَلَّا أَحْضَرْتَ التَّمْرَ وَالْمَاءَ** (تم نے کھجور اور پانی کا انتظام کیوں نہیں کر لیا؟)۔ یہاں ہَلَّا کے بعد فعل اَحْضَرْتَ محذوف ہے لیکن قرینے سے سمجھا جا رہا ہے۔

[حرف التّوقّع]:

(قد)، وفی المضارع للتّقلیل.

ترجمہ: "حرفِ توقع" (یعنی وہ حرف جو کسی بات کی توقع یا امید کو ظاہر کرے): یہ حرف (قد) ہے۔اور جب یہ فعلِ مضارع سے پہلے آئے تو یہ کمی یا قلّت کا معنی دیتا ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حرفِ توقع کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں اور وہ ایک ہی حرف ہے حرف قد۔

حرف توقع کی تعریف:

حرف توقع وہ حرف ہے جس کے ذریعے ایسی بات کی خبر دی جائے جس کی اُمید ہو جیسے قد جاءَ زید زید آگیا ہے اور حرف توقع حرف قد ہے۔ حکم اس کا یہ ہے کہ یہ صرف فعل پر داخل ہوتا ہے اور دخول علی الفعل کی دو ۲ صورتیں ہیں: (۱) فعل ماضی۔ (۲) فعل مضارع۔

قد اگر فعل ماضی پر داخل ہو تو یہ دو ۲ معنی دے گا۔ (۱) ماضی کو حال کے قریب کر دے گا۔ (۲) تاکید کا معنی دے گا۔

(۱) پہلا معنی :یہ اگر ماضی پر داخل ہو تو ماضی کو حال کے معنی کے قریب کر دے گا اسی وجہ سے اس صورت میں اس کو حرف تقریب کہیں گے۔ جیسے قد رکب الامیر یعنی امیر سوار ہو گئے، یعنی تھوڑی دیر پہلے چونکہ اس صورت میں اس نے ماضی کو حال کے قریب کر دیا اس وجہ سے اس کو حرف تقریب کہتے ہیں۔

(۲) دوسرا معنی :دخول علی الماضی کی صورت میں دوسرا معنی تاکید۔ تو قد جب ماضی پر داخل ہو گا تو اس کا معنی تاکید کا ہو گا جیسے کوئی سائل سوال کرے اقام زید کیا زید کھڑا ہے تو کہا جائے گا جواب میں قد قام زید تحقیق زید کھڑا ہے۔

وفی المضارع للتقلیل: یہاں سے صاحب کتاب دخول علی الفعل کی دوسری صورت جب حرف قد فعل مضارع پر داخل ہو وہ بیان فرمارہے ہیں۔ فرماتے ہیں قد جب فعل مضارع پر داخل ہو تو یہ دو ۲ معنی دے گا۔

(۱) للتقلیل یعنی قلّت کم ہونے کا معنی دے گا جیسے اِنَّ الْكَذُوْبَ قَدْ يَصْدُقُ جھوٹا بھی کبھی کبھی سچ بول دیتا ہے اور وَاِنَّ الْجَوَّادَ قَدْ يَبْخَلُ اور سخی بھی کبھی کبھی بخل کر دیتا ہے۔

اور (۲) دوسرا معنی قد جب مضارع پر داخل ہو تو تحقیق کے معنی دے گا جیسے اللہ تعالیٰ فرمان عالیشان ہے: قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ تحقیق (بلا شبہ) اللہ تعالیٰ جانتا ہے روکنے والوں کو۔

[حرفا الاستفهام]:

الهمزة، و(هل). لهما صدر الكلام، تقول: (أزيد قائم؟)، و(أقام زيد؟)، وكذلك (هل)، والهمزة أعمّ تصرّفا، تقول: (أزيدا ضربت؟) و(أتضرب زيدا وهو أخوك؟)، و(أزيد عندك أم عمرو)، و{أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ}، و{أَفَمَنْ كَانَ}، و{أَوَمَنْ كَانَ}، دون (هل).

ترجمہ: "حروفِ استفہام" (یعنی سوال کرنے والے حروف) :یہ دو حروف ہیں :(الهمزة) اور (ہل)۔ یہ دونوں کلام کے شروع میں آتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں :"أَزَيْدٌ قَائِمٌ؟" (کیا زید کھڑا ہے؟) اور "أَقَامَ زَيْدٌ؟" (کیا زید کھڑا ہوا؟)، اسی طرح (ہل) کے ساتھ بھی۔ لیکن ہمزہ کا استعمال زیادہ وسیع ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں :"أَزَيْدًا ضَرَبْتَ؟" (کیا تم نے زید کو مارا؟)، "أَتَضْرِبُ زَيْدًا وَهُوَ أَخُوكَ؟" (کیا تم زید کو مارو گے حالانکہ وہ تمہارا بھائی ہے؟)، "أَزَيْدٌ عِنْدَكَ أَمْ عَمْرٌو؟" (کیا زید تمہارے پاس ہے یا عمرو؟)، اور قرآن کی آیات :"أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ" (پھر جب وہ واقع ہو)، "أَفَمَنْ كَانَ" (تو کیا وہ شخص جو…)، "أَوَمَنْ كَانَ" (کیا وہ شخص جو…)۔ ان سب صورتوں میں (ہل) کا استعمال نہیں ہو سکتا۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ استفہام کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ دو حروف ہیں :(ہمزہ) اور (ہل)۔ استفہام کا مقصد کسی بات کی معلومات حاصل کرنا یا سوال کرنا ہوتا ہے۔

ہمزہ اور ہل کی مماثلت: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ ہمزہ اور ہل دونوں میں ایک خاص بات مشترک ہے کہ یہ ہمیشہ کلام کے شروع میں آتے ہیں۔ ان کا معمول (یعنی جس پر یہ عمل کرتے ہیں) ان کے بعد آتا ہے اور یہ خود اس کے پہلے آتے ہیں۔

مثالیں: ھمزہ : "أَزَيْدٌ قَائِمٌ؟" (کیا زید کھڑا ہے؟) یہ اسمیہ جملہ ہے۔ ہمزہ : "أَقَامَ زَيْدٌ؟" (کیا زید کھڑا ہوا؟) یہ فعلیہ جملہ ہے۔

ھل :اسی طرح "هَلْ زَيْدٌ قَائِمٌ؟" اور "هَلْ قَامَ زَيْدٌ؟" بھی درست ہیں۔

والهمزة أعمّ تصرّفا، تقول :(أزيدا ضربت؟) و(أتضرب زيدا وهو أخوك؟)، و(أزيد عندك أم عمرو)، و{أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ}، و{أَفَمَنْ كَانَ}، و{أَوَمَنْ كَانَ}، دون (هل).

ہمزہ کی وسعت اور ہل کا محدود استعمال:

مصنفؒ یہاں ہمزہ کی وسعت اور ہل کی محدودیت کو بیان فرماتے ہیں۔ ہمزہ زیادہ وسیع ہے اور اس کا استعمال کئی ایسے مقامات پر ہوتا ہے جہاں ہل کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجوہات یہ ہیں:

مَعْمُولُهُ (عمل کرنے والا) مقدم ہوتا ہے: ہمزہ کے بعد معمول آسکتا ہے، جیسے کہ "أَزَيْدًا ضَرَبْتَ؟" (کیا تم نے زید کو مارا؟)۔ یہاں "زیدًا" فعل "ضَرَبْتَ" کا مفعول ہے جو ہمزہ کے فوراً بعد آیا ہے۔ ہل کے ساتھ یہ ممکن نہیں، آپ "هَلْ زَيْدًا ضَرَبْتَ؟" نہیں کہہ سکتے۔

· **کلام میں فصل (جدائی) ہو سکتی ہے:** ہمزہ اور اس کے بعد آنے والے معمول کے درمیان کوئی اور لفظ آسکتا ہے۔

مثال : "أَتَضْرِبُ زَيْدًا وَهُوَ أَخُوكَ؟" (کیا تم زید کو مارو گے حالانکہ وہ تمہارا بھائی ہے؟)۔ یہاں "أتضرب" اور "زیدًا" کے درمیان ایک جملہ آگیا ہے۔ ہل کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

· **حرفِ عطف کے بعد آنا:** ہمزہ حرفِ عطف (واو، فا، ثم) کے بعد آسکتا ہے۔

مثال : "أَفَمَنْ كَانَ" اور "أَوَمَنْ كَانَ"۔ یہ مثالیں قرآن سے ہیں، جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں۔ ہل کے ساتھ ایسا ممکن نہیں ہے۔

ہمزہ کا استعمال 'اَم' کے ساتھ: جب کلام میں "اَم" موجود ہو تو استفہام کے لیے ہمزہ کا ہی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ "اَم" کا استعمال اختیار (چناؤ) کے لیے ہوتا ہے، اور یہ ہمزہ کی خصوصیت ہے۔

مثال : "أَزَيْدٌ عِنْدَكَ أَمْ عَمْرٌو؟" (کیا زید تمہارے پاس ہے یا عمرو؟)۔ یہاں آپ کو دونوں میں سے ایک کو چننا ہے۔ ہل کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہل کا جواب صرف "نعم" یا "لا" میں ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمزہ اور ہل دونوں استفہام کے لیے ہیں، لیکن ہمزہ زیادہ وسیع ہے اور مختلف حالات میں استعمال ہو سکتا ہے، جبکہ ہل کا استعمال صرف ایک خاص صورت تک محدود ہے۔

فائدہ بعض ایسے مواقع بھی ہیں جہاں صرف ھل آتا ہے ہمزہ نہیں آتا۔ درایۃ النحو میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَهَلْ أَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ۝۸۰ اور فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۳۵۔

[حروف الشرط]:

(إن)، و(لو)، و(أمّا). لها صدر الكلام. ف(إن) للاستقبال وإن دخل على الماضي، و(لو) عكسه. ويلزمان الفعل لفظاً أو تقديراً، ومن ثمّ قيل: (لو أنّك) بالفتح؛ لأنّه فاعل، و(انطلقت) بالفعل موضع (منطلق) ليكون كالعوض. وإن كان جامداً جاز لتعذّره. وإذا تقدّم القسم أوّل الكلام على الشّرط لزمه الماضي لفظاً ومعنى، وكان الجواب للقسم لفظاً. مثل (والله إن أتيتني، وإن لم تأتني لأكرمتك). وإن توسّط بتقديم الشّرط أو غيره جاز أن يعتبر وأن يلغى، كقولك: (أنا والله إن تأتني آتك) و(إن أتيتني والله لآتينّك). وتقدير القسم كاللّفظ. نحو {لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ} و{وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ} و(أمّا) للتّفصيل، والتزم حذف فعلها، وعوّض بينها وبين فائها جزء ممّا في حيّزها مطلقاً، وقيل: هو معمول المحذوف مطلقاً مثل: (أمّا يوم الجمعة فزيد منطلق). وقيل: إن كان جائز التّقديم فمن الأوّل، وإلّا فمن الثّاني.

ترجمہ؛ "حروفِ شرط" (وہ حروف جو کسی شرط کو بیان کرتے ہیں) :یہ تین حروف ہیں :(إن)، (لو)، اور (أمّا)۔ان حروف کو کلام کے شروع میں ہونا چاہیے۔إن مستقبل کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگرچہ یہ ماضی پر داخل ہو۔اور لو اس کے برعکس (ماضی کے لیے) ہے۔یہ دونوں (إن اور لو) فعل کو لازم کرتے ہیں، خواہ وہ لفظوں میں موجود ہو یا اس کا اندازہ لگایا جائے۔اسی لیے کہا گیا ہے :"لَوْ أَنَّكَ" میں أنَّ کو فتحہ دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ فاعل ہے، اور فعل "انْطَلَقْتَ" (جس کا اندازہ لگایا گیا ہے) "مُنْطَلِقٌ" (اسم فاعل) کی جگہ پر ہے تاکہ یہ عوض (بدل) ہو جائے۔اور اگر فعل جامد ہو تو اس کا استعمال جائز ہے کیونکہ وہ متعذر (مشکل) ہے۔جب کلام کے شروع میں قسم شرط پر مقدم ہو، تو شرط کا فعل لفظاً اور معناً ماضی کے لیے ہوتا ہے۔اور جواب لفظاً قسم کے لیے ہوتا ہے۔جیسے آپ کہیں :"وَاللهِ إِنْ أَتَيْتَنِي، وَإِنْ لَمْ تَأْتِنِي لَأَكْرَمْتُكَ" (اللہ کی قسم اگر تم میرے پاس آئے اور اگر تم نہ آئے تو میں تمہارا ضرور اکرام کروں گا)۔اور اگر قسم درمیان میں ہو، یا شرط پہلے ہو، تو اس کا اعتبار کیا بھی جا سکتا ہے اور اس کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ آپ کا قول ہے :"أَنَا وَاللهِ إِنْ تَأْتِنِي آتِكَ" (میں، اللہ کی قسم، اگر تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہارے پاس آؤں گا) اور "إِنْ أَتَيْتَنِي وَاللهِ لَآتِيَنَّكَ" (اگر تم میرے پاس آئے، اللہ کی قسم، تو میں ضرور تمہارے پاس آؤں گا)۔اور قسم کا اندازہ لگانا لفظی قسم کی طرح ہی ہے۔ جیسے :{لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ} اور {وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ}۔اور أمّا تفصیل کے لیے ہے۔اور اس کا فعل حذف کرنا لازم ہے، اور اس کے اور اس کے فاء کے درمیان اس کے حیز میں سے کوئی جز عوض بنا کر لایا جاتا ہے مطلقاً۔اور کہا گیا ہے کہ وہ (جزء) مطلقاً محذوف کا معمول ہے۔ جیسے :"أَمَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَزَيْدٌ مُنْطَلِقٌ" (جمعہ کا دن، تو اس میں زید جانے والا ہے)۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ (جزء) تقدیم کا جائز ہو تو پہلی رائے درست ہے، ورنہ دوسری۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حروفِ شرط کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ تین حروف ہیں :(إن)، (لو)، اور (أمّا)۔

حروف شرط کی تعریف:

حروف شرط ان حروف غیر عاملہ کو کہتے ہیں جو دو ۲ جملوں پر داخل ہوتے ہیں پہلے جملے کو شرط اور دوسرے جملے کو جزاء کہتے ہیں

۔جیسے اِنۡ تَضۡرِبۡ اَضۡرِبۡ ان حرف شرط ہے تضرب جملہ شرط ہے اور اضرب جملہ اس کی جزاء ہے حروف شرط تین ہیں:
(۱) ان ہمزہ کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ۔ (۲) لَو اور (۳) اَمَّا ہمزہ کے فتحہ ساتھ اور میم کی تشدید کے ساتھ۔
لها صدر الکلام یہاں سے صاحب کتاب حروف شرط کے استعمال کو بیان فرماتے ہیں کہ یہ کلام کے شروع میں آتے ہیں۔
فان للاستقبال ...الخ یہاں سے صاحب کتاب اِنۡ حرف شرط کا معنی بیان فرمارہے ہیں۔فرماتے ہیں کہ ان حرف شرط جو ہے یہ استقبال کا معنی دیتا ہے اگرچہ ماضی پر داخل ہو جیسے ان زرتنی فا کرمتك تو اب اس مثال میں دیکھیں زُرۡتَ یہ فعل ماضی ہے اور اس کا معنی ہوگا اگر آپ میری زیارت کریں گے۔
،**و (لو) عکسه**... الخ یہاں سے صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ لو ماضی کا معنی دیتا ہے اگرچہ مضارع پر داخل ہو جیسے **لو تزورنی اکرمتُكَ** اگر آپ میری زیارت کرتے تو میں آپ کا اکرام کرتا...آپ دیکھیں اس مثال میں **تزود** مضارع ہے لو مضارع پر داخل ہے لیکن ماضی کا معنی دیا ہے۔
وتلزمان الفعل لفظاً أو تقدیراً،الخ یہاں سے صاحبِ کتاب اس بات کو بیان فرماتے ہیں کہ اِنۡ اور لو ان کا فعل پر داخل کرنا لازم ہے۔یعنی ان کا مدخول فعل ہوگا چاہے وہ فعل لفظی ہو یا فعل تقدیری ہو۔ فعل لفظی کی مثال تو گزر چکی اور فعل تقدیری سے مراد یہ ہے کہ لفظاً تو اسم ہو لیکن تقدیراً وہ فعل ہو جیسے اِنۡ اَنۡتَ زَائِرِیۡ فانا اکرمك یہ حقیقت میں ہے ان کنت زائری توکان فعل از افعال ناقصہ کو حذف کر دیا اور ضمیر متصل تھی اس کو منفصل کر دیا تو اِنۡ اَنۡتَ زَائِرِیۡ بن گیا تقدیراً عبارت ہے :اِنۡ کُنۡتَ زَائِرِیۡ فانا اکرمك ۔

ومن ثمّ قیل :(لو أنّك) بالفتح؛ لأنّه فاعل، و (انطلقت) بالفعل موضع (منطلق) لیکون کالعوض.

مصنفؒ اس تقدیر پر دو دلائل پیش کرتے ہیں:
پہلی دلیل :عربوں کا قول لَوۡ أَنَّكَ جِئۡتَنَا ۔ یہاں اَنَّ کو فتحہ دیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ اپنے اسم و خبر کے ساتھ مل کر مصدر کی تاویل میں ہے۔ یہ مصدر ایک محذوف فعل کا فاعل بن رہا ہے۔ تقدیر عبارت ہے :لَوۡ ثَبَتَ مَجِیۡئُكَ (اگر تمہارا آنا ثابت ہوتا)۔ اگر فعل کو مقدر ماننا ضروری نہ ہوتا تو اِنَّكَ (کسرہ کے ساتھ) بھی کہا جا سکتا تھا۔
دوسری دلیل :عرب اسم (مُنۡطَلِقٌ) کی جگہ فعل (انۡطَلَقۡتَ) استعمال کرتے ہیں، مثلاً لَوۡ انۡطَلَقۡتَ کہتے ہیں لَوۡ مُنۡطَلِقٌ نہیں کہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فعل کو صراحتاً لا کر لَو کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں، اور یہ فعل گویا اس اسم کے عوض میں ہے جو یہاں معنی کے اعتبار سے آسکتا تھا۔

وإن کان جامداً جاز لتعذّره.

قاعدے سے استثناء آخر میں مصنفؒ ایک استثناء بیان کرتے ہیں۔ یعنی اگر لَو کے بعد کوئی ایسا اسم آرہا ہو جو جامد ہے (کسی فعل سے مشتق نہیں، جیسے أَسَدٌ، حَجَرٌ) اور اس کے معنی کو ادا کرنے والا کوئی مناسب فعل لانا مشکل یا ناممکن (مُتَعَذَّر) ہو، تو وہاں فعل کے بغیر براہِ راست اسم لانا جائز ہے۔ مثال :لَوۡ غَیۡرُكَ قَالَ هٰذَا لَمَا قَبِلۡتُهٗ (اگر تمہارے علاوہ کسی اور نے یہ کہا ہوتا تو میں اسے

قبول نہ کرتا)۔ یہاں غَیْرُ اسم ہے، اور اس کے معنی کو فعل سے ادا کرنا متعذر ہے۔

وإذا تقدّم القسم أوّل الكلام على الشّرط لزمه الماضي لفظا ومعنى، وكان الجواب للقسم لفظا، مثل (والله إن أتيتني، وإن لم تأتني لأكرمتك).

قسم اور شرط کے اجتماع کا قاعدہ

یہاں سے مصنفؒ ایک نہایت اہم مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ جب شرط قسم کے ساتھ واقع ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ آیا وہ ماقبل کے لیے بعد والا جملہ جواب قسم ہو یا شرط کی جزاء... تو یاد رکھیے کہ شرط کے قسم کے ساتھ تعلق کی دو ۲ صورتیں ہیں:

پہلی صورت (قسم مقدم ہو) :جب کلام کے بالکل شروع میں قسم آئے اور اس کے بعد شرط، تو غلبہ قسم کا ہوگا۔ اس کے دو لازمی نتائج ہوں گے: جواب قسم کا ہوگا : جملے کا جواب قسم کا مانا جائے گا اور اس پر وہ علامات آئیں گی جو جوابِ قسم پر آتی ہیں (جیسے لام تاکید)۔ شرط کا جواب محذوف مانا جائے گا۔ شرط ماضی میں ہوگی :شرطیہ جملے کا فعل لفظاً اور معنًی ماضی میں ہونا ضروری ہے۔

مثال :وَاللهِ إِنْ أَتَيْتَنِي لَأَكْرَمْتُكَ۔ یہاں وَاللهِ (قسم) شروع میں ہے اور إِنْ أَتَيْتَنِي (شرط) بعد میں۔ جواب لَأَكْرَمْتُكَ قسم کا ہے (لام کی وجہ سے)۔ شرط کا جواب محذوف ہے۔

وإن توسّط بتقديم الشّرط أو غيره جاز أن يعتبر وأن يلغى، كقولك :(أنا والله إن تأتني آتك) و (إن أتيتني والله لآتينّك).

دوسری صورت (قسم درمیان میں ہو) :اگر قسم شروع میں نہ ہو، بلکہ اس سے پہلے شرط یا کوئی اور کلام آ جائے، تو دونوں صورتیں جائز ہیں:

قسم کو معتبر ماننا :اس صورت میں جواب قسم کا آئے گا۔

مثال :إِنْ أَتَيْتَنِي وَاللهِ لَآتِيَنَّكَ۔ یہاں لَآتِيَنَّكَ جوابِ قسم ہے۔

قسم کو لغو کرنا :اس صورت میں قسم کو جملہ معترضہ مان کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور جواب شرط کا آتا ہے (جس پر جزم آتی ہے)۔

مثال :أَنَا وَاللهِ إِنْ تَأْتِنِي آتِكَ۔ یہاں آتِكَ مجزوم ہے اور یہ إِنْ تَأْتِنِي کا جواب ہے۔

وتقدير القسم كاللّفظ، نحو {لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ} (1) و {وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ}

مقدر قسم کا حکم :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جو قسم مقدر ہو (یعنی لفظوں میں نہ ہو مگر کلام میں اس کا قرینہ موجود ہو) اس کا حکم بھی لفظی قسم جیسا ہی ہے۔

مثالِ قرآن ۱ :{لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ}۔ یہاں لَئِنْ میں لام قسم کے لیے ہے (لَ بمعنی وَاللهِ) اور إِنْ شرط ہے۔ چونکہ قسم مقدم ہے، اس لیے جواب لَا يَخْرُجُونَ قسم کا ہے (اس لیے مجزوم نہیں ہوا)۔

مثالِ قرآن ۲ :{وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ}۔ یہاں إِنْ شرط ہے اور جواب إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ہے۔ یہ جملہ اسمیہ إِنَّ اور لام کے ساتھ موکد ہے، جو جوابِ قسم کی علامت ہے، لہٰذا یہاں ایک مقدر قسم کا اعتبار کیا گیا ہے۔

و (أمّا) للتّفصيل، والتزم حذف فعلها، وعوّض بينها وبين فائها جزء ممّا في حيزها مطلقا، وقيل :هو معمول المحذوف مطلقا مثل :(أمّا يوم الجمعة فزيد منطلق)، وقيل :إن كان جائز التّقديم فمن الأوّل، وإلّا فمن الثّاني.

امّا کا معنی اور عمل:

و (أمّا) للتّفصيل، والتزم حذف فعلها، وعوّض بينها وبين فائها جزء ممّا في حيزها مطلقا...

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "امّا" تفصیل کے لیے آتا ہے۔ تفصیل کا مطلب ہے کسی پہلے بیان شدہ مجمل (خلاصہ) بات کی جزئیات کو الگ الگ بیان کرنا۔ مثال :جیسے آپ کہیں "جاء القومُ" (قوم آئی)۔ یہ ایک مجمل بات ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہو گی :"أمّا زيدٌ فقائمٌ وأمّا عمروٌ فقاعدٌ" (رہے زید، تو وہ کھڑے ہیں، اور رہے عمرو، تو وہ بیٹھے ہیں)۔ یہاں "امّا" نے قوم کے افراد کی حالت کو تفصیل سے بیان کیا۔

مصنفؒ آگے فرماتے ہیں کہ "امّا" کے بعد اس کا فعلِ شرط ہمیشہ وجوبی طور پر حذف ہوتا ہے (والتزم حذف فعلها)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "امّا" دراصل ایک شرطیہ جملے مهما يكن من شيء (کچھ بھی ہو) کے قائم مقام ہے۔ تو اصل فعلِ شرط یکن ہمیشہ محذوف ہوتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس محذوف فعل کے عوض کے طور پر، "امّا" اور اس کے جواب پر آنے والی "فاء" کے درمیان، جوابِ شرط کا کوئی حصہ (جزء ممّا في حيزها) لایا جاتا ہے۔ یعنی "فاء" کے بعد جو جملہ آرہا ہے، اس کا کوئی معمول (جیسے مبتدا، خبر، ظرف، یا مفعول بہ) "امّا" اور "فاء" کے درمیان رکھ دیا جاتا ہے۔ لفظ "مطلقا" سے مراد یہ ہے کہ یہ مصنفؒ کا مختار مذہب ہے، جس میں کوئی تفصیل نہیں اور یہ قاعدہ ہر حال میں لاگو ہوتا ہے۔

مقدم ہونے والے جزء کی نحوی حیثیت میں اختلاف

اب مصنفؒ اس جزء کے بارے میں تین مختلف آراء بیان کرتے ہیں جو "امّا" اور "فاء" کے درمیان لایا جاتا ہے۔

مثال :أمّا يومَ الجمعةِ فزيدٌ منطلقٌ (رہا جمعہ کا دن، تو اس دن زید جانے والا ہے)۔ اس مثال میں "یوم الجمعة" وہ جزء ہے جسے آگے لایا گیا ہے۔ اس کی نحوی ترکیب کیا ہے؟ اس میں تین اقوال ہیں:

پہلا قول (مصنف کا مختار)....وعوّض بينها وبين فائها جزء ممّا في حيزها مطلقا...

:یہ مصنف کا اپنا نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک یہ مقدم ہونے والا جزء (يوم الجمعة) دراصل جوابِ شرط (فزيدٌ منطلقٌ) کا ہی حصہ تھا جسے آگے لایا گیا ہے۔ اصل جملہ تھا :زيدٌ منطلقٌ يومَ الجمعةِ۔ اس میں سے ظرف "يومَ الجمعةِ" کو "فاء" سے پہلے "امّا" کے بعد رکھ دیا گیا۔ اس صورت میں "يومَ الجمعةِ" کا عامل (عمل کرنے والا) "فاء" کے بعد مذکور لفظ "منطلقٌ" ہی ہے۔

دوسرا قول...وقيل :هو معمول المحذوف مطلقا مثل :(أمّا يوم الجمعة فزيد منطلق)..

:دوسرا قول یہ ہے کہ "امّا" اور "فاء" کے درمیان مذکور جزء (يوم الجمعة) کا تعلق "فاء" کے بعد والے جملے سے نہیں، بلکہ یہ اس فعلِ شرط کا معمول ہے جو "امّا" کے بعد وجوبی طور پر محذوف ہے، یعنی یکن۔ اس قول کے مطابق اصل عبارت یوں تھی :

مهما يكن من شيء في يوم الجمعة فزيدٌ منطلقٌ۔ اس ترکیب میں "یوم الجمعۃ" محذوف فعل یکن کا ظرف ہے۔ اس قول میں بھی "مطلقا" کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ قاعدہ ہر صورت میں لاگو ہوگا، چاہے اس جزء کو مؤخر کرنا جائز ہو یا نہ ہو۔

تیسرا قول (تفصیل کا قول): ۔ وقيل :إن كان جائز التّقديم فمن الأوّل، وإلاّ فمن الثّاني...

: تیسرا قول ان دونوں نظریات کے درمیان ایک تفصیل قائم کرتا ہے۔ اس قول کے مطابق: اگر اس جزء کو "فاء" کے بعد والے جملے کا معمول بنا کر مقدم کرنا قواعد کے لحاظ سے جائز ہو (إن كان جائز التّقديم)، تو پھر اسے پہلے قول کے مطابق مانا جائے گا، یعنی یہ "فاء" کے بعد والے جملے کا ہی حصہ ہے جسے آگے لایا گیا ہے۔

مثال :أمّا زيداً فضربتُ. یہاں زیداً کو ضربتُ کا مفعول بہ مقدم مانا جائے گا کیونکہ فعل سے پہلے مفعول بہ لانا جائز ہے۔ تو یہ پہلے قول کے مطابق ہے۔ اور اگر اس جزء کو "فاء" کے بعد والے جملے کا معمول بنا کر مقدم کرنا جائز نہ ہو (وإلّا)، تو پھر اسے دوسرے قول کے مطابق مانا جائے گا، یعنی یہ "أمّا" کے بعد محذوف فعلِ شرط یکن کا معمول ہے۔

مثال :أمّا اليوم فزيدٌ منطلقٌ غداً (رہا آج کا دن، تو زید کل جائے گا)۔ یہاں الیوم کو منطلقٌ کا ظرف نہیں بنا سکتے کیونکہ "آج" اور "کل" میں تضاد ہے۔ للذا، یہاں الیوم کو محذوف فعل یکن کا معمول ماننا ہی درست ہوگا، اور تقدیرِ عبارت ہوگی : مهما يكن من شيء اليوم فزيد منطلق غداً۔

[حرف الردع]:

(كلاّ)، وقد جاء بمعنى (حقّا).

ترجمہ؛ "حرفِ ردع" (یعنی وہ حرف جو کسی کو ڈانٹنے یا روکنے کے لیے استعمال ہو) :یہ حرف (كَلَّا) ہے۔ اور کبھی یہ (حقًّا) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے حرفِ ردع کی بحث شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ ایک ہی حرف ہے، یعنی (كَلَّا)۔

"ردع" کا مطلب ہے کسی کو کسی غلط کام سے روکنا یا ڈانٹ کر منع کرنا۔ یہ لفظ کلام میں اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط ہے اور قابلِ قبول نہیں ہے۔

كَلَّا کا استعمال بطورِ ردع: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ كَلَّا کا اصل استعمال ردع یعنی ڈانٹنے اور منع کرنے کے لیے ہے۔ یہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی ایسی بات کہی جائے جو درست نہ ہو یا اس سے اختلاف کیا جائے۔

مثال : جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ كَلَّا تو یہاں پر یہ کلا ڈانٹنے کے لیے ہے متکلم کو منع کیا جارہا ہے کہ بھئی تو ایسی بات نہ کر بات ایسی نہیں ہے۔

دوسری مثال : کوئی کہے :"سَأَضْرِبُ زَيْدًا" (میں زید کو ماروں گا)، اور آپ اسے روکنے کے لیے کہیں :"كَلَّا"۔ اس کا

مطلب ہوگا :"رُدِعْتَ عَنِ الضَّرْبِ" (تمہیں مارنے سے منع کیا جاتا ہے)۔

کَلَّا کا استعمال بمعنی حقًّا: مصنفؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی کلا حقًّا کے معنی میں ہوتا ہے یعنی جملے کے مضمون کو پختہ کرنے کے لیے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :سورۃ التکاثر میں **كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝** یقیناً عنقریب تم جان جاؤگے۔

یہاں کَلَّا ردع کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ حقًّا کے معنی میں آیا ہے اور کلام میں تاکید پیدا کر رہا ہے۔

[تاء التأنيث الساكنة]:

تاء التّأنيث السّاكنة :تلحق الماضي لتأنيث المسند إليه. فإن كان ظاهرا غير حقيقيّ فمخيّر .وأما إلحاق علامة التّثنية والجمعين فضعيف.

ترجمہ: "تاء التانیث الساکنہ " (تانیث کی علامت کے طور پر ساکن تاء) :یہ فعلِ ماضی کے ساتھ لگتی ہے تاکہ مسند الیہ کو مونث کیا جائے۔اگر مسند الیہ ظاہر ہو اور اس کی تانیث حقیقی نہ ہو تو اس کا لگانا یا نہ لگانا اختیار میں ہے۔تثنیہ اور جمع کی علامتوں کا لگانا (یعنی تثنیہ یا جمع کے لیے تاء کو بدلنا) ضعیف (کمزور) ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے تاء تانیث ساکنہ کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس کے قواعد بیان فرماتے ہیں۔

تائے تانیث کی تعریف:

تاء تانیث اس تا کو کہتے ہیں جو ماضی کے آخر میں ہوتی ہے تاکہ اس چیز کے مؤنث ہونے پر دلالت کرے جس کی طرف فعل کی اسناد کی گئی ہو۔چاہے وہ فاعل ہو جیسے ضَرَبَتْ هِنْدٌ ہندہ نے مارا، یا نائب فاعل ہو جیسے ضُرِبَتْ هِنْدٌ ہندہ ماری گئی۔

فوائد وقیود : اس میں تائے تانیث ساکنہ کی قید سے تا متحرک نکل گئی تلحق الماضی کی قید سے ماضی کے علاوہ تمام زمانے نکل گئے۔

تلحق الماضي لتأنيث المسند إليه.

تاء کا لازمی استعمال: مصنفؒ کا فرمانا ہے کہ یہ تاء فعلِ ماضی کے ساتھ لگتی ہے تاکہ اس کے مسند الیہ (فاعل) کو مونث کیا جائے۔

اس کا استعمال دو صورتوں میں واجب ہوتا ہے

.1 :جب **فاعل اسم ظاہر اور حقیقی مونث ہو** :جیسے :"**جَاءَتْ هِنْدٌ**" (ہند آئی)۔ یہاں ہند اسم ظاہر بھی ہے اور حقیقی مونث بھی، اس لیے فعل کے ساتھ تاء کا لگانا واجب ہے۔

.2 جب **فاعل ضمیر ہو جو مونث حقیقی یا غیر حقیقی کی طرف لوٹ رہی ہو** :جیسے :"**هِنْدٌ قَامَتْ**" (ہند کھڑی ہوئی)۔ یہاں "ت" میں فاعل ہند کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہے، اس لیے تاء کا لگانا واجب ہے۔

تاء کا اختیاری استعمال: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسند الیہ ظاہر ہو، لیکن اس کی تانیث غیر حقیقی ہو تو تاء کا لگانا یا نہ لگانا دونوں جائز ہیں۔ تانیثِ غیر حقیقی اس تانیث کو کہتے ہیں جس میں مونث کا معنی ہو، لیکن وہ مذکر و مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے،

جیسے :شمس (سورج)، نار (آگ)، وغیرہ۔

مثال : جیسے :"طَلَعَتِ الشَّمْسُ" یا "طَلَعَ الشَّمْسُ" (سورج نکلا)۔ یہاں شمس غیر حقیقی مونث ہے، اس لیے دونوں طرح استعمال جائز ہے۔

تثنیہ اور جمع کی علامتوں کا ضعف: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ تاء تانیث کو تثنیہ یا جمع کی علامات دینا (جیسے ت کو تا یا تو بنانا) ضعیف ہے۔

مثال : جیسے کوئی کہے :"اَلنِّسَاءُ قَامَتَا" (عورتیں دونوں کھڑی ہوئیں)، یا "اَلنِّسَاءُ قَامَتْنَ" (عورتیں کھڑی ہوئیں)۔
یہ استعمال ضعیف ہے۔ صحیح استعمال یہ ہے کہ فعل ہمیشہ صیغۂ واحد مونث ہی رہے، چاہے فاعل تثنیہ ہو یا جمع۔

صحیح مثال : "اَلْهِنْدَانِ قَامَتْ" (دو ہند کھڑی ہوئیں)، "اَلْهِنْدَاتُ قَامَتْ" (ہندیں کھڑی ہوئیں)۔ ان مثالوں میں تثنیہ اور جمع کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا۔

[التنوين]:

التّنوين :نون ساكنة تتبع حركة الآخر لا لتأكيد الفعل.وهو للتّمكّن،والتّنكير،والعوض،والمقابلة، والتّرنّم .ويحذف من العلم موصوفا ب(ابن) مضافا إلى علم آخر.

ترجمہ؛"التنوین":تنوین ایک ساکن نون ہے جو کسی لفظ کے آخری حرف کی حرکت کے بعد آتی ہے اور اس کا مقصد فعل کی تاکید نہیں ہوتا۔ تنوین کی پانچ اقسام ہیں: تمکن کے لیے تنکیر کے لیے عوض کے لیے مقابلہ کے لیے ترنم کے لیے تنوین اس وقت حذف کر دیا جاتا ہے جب کوئی علم (خاص نام) "ابن" کے ساتھ موصوف ہو اور "ابن" کسی دوسرے علم کی طرف مضاف ہو۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے التنوین کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس کی تعریف اور اقسام بیان فرماتے ہیں۔

تنوین کی تعریف :

تنوین وہ نون ساکن ہے نون ساکنۃ تتبع حرکۃ اٰخر الکلمۃ لا لتاکید الفعل تنوین وہ نون ساکن ہے جو کلمے کے آخری حرف کی حرکت کے تابع ہو تاکہ فعل کی تاکید کے لیے ہو۔

فوائد وقیود :

جب فرمایا نون تو یہ بمنزلہ جنس کے ہے اس میں تمام نون داخل ہو گئے ساکنۃ پہلی فصل ہے اس سے نون متحرک نکل گیا تتبع حرکۃ اٰخر الکلمۃ دوسری فصل ہے اس کے ذریعے سے لدن اور عن اور من اور لَمْ یَکُنْ اس کے نون نکل گئے کیونکہ یہ آخری حرف کی حرکت کے تابع نہیں ہوتے بلکہ خود ساکن ہوتے ہیں لا لتاکید الفعل یہ تیسری فصل ہے اس سے نون خفیفہ نکل گیا کیونکہ وہ فعل کی تاکید کے لیے ہوتا ہے۔

تنوین کی (۵) پانچ ۵ قسمیں

وھو للتّمکّن، والتّنکیر، والعوض، والمقابلۃ، والترّنم۔

یہاں سے صاحبِ کتاب فرماتے ہیں کہ تنوین کی (۵) پانچ ۵ قسمیں ہیں :(۱) تنوین تمکن۔ (۲) تنوین تنکیر (۳) تنوین عوض۔ (۴) تنوین مقابلہ۔ (۵) تنوین ترنم۔

تنوین التمکن (تمکن کی تنوین): یہ تنوین ان اسماء کے آخر میں آتی ہے جو معرب (اعراب قبول کرنے والے) اور منصرف (تنوین قبول کرنے والے) ہوتے ہیں۔ یہ تنوین اس اسم کی تمکن یعنی اصلیت اور عربی ہونے کی علامت ہوتی ہے۔

مثال :"جَاءَ رَجُلٌ" (ایک آدمی آیا)۔ یہاں "رَجُلٌ" میں جو تنوین ہے وہ تنوین تمکن ہے، جو اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ یہ اسم کامل طور پر معرب ہے۔

. تنوین التنکیر (تنکیر کی تنوین): تنوین تنکیر کی تعریف تنوین تنکیر اس تنوین کو کہتے ہیں جو اسم پر داخل ہوتی ہے جیسے صَهٍ اس کی تقدیری عبارت ہے ای اسکت سکوتا مافی وقت ما اور صَهْ کی تقدیری عبارت ہے اسکت السکوت الاٰن جو سکون کے ساتھ ہے یہ معرفہ پر داخل ہے اور جو تنوین کے ساتھ ہے وہ نکرہ پر داخل ہے نکرہ ہے۔

تنوین العوض (عوض کی تنوین): یہ تنوین اس وقت آتی ہے جب کوئی لفظ یا جملہ حذف ہو جائے۔ اس کی تین صورتیں ہیں

.1: حرف کا عوض :جیسے "جَوَارٍ" اور "غَوَاشٍ"۔ ان کی اصل "جَوَارِي" اور "غَوَاشِي" تھی، جہاں یائے کو حذف کر کے تنوین لائی گئی۔

.2 اسم کا عوض :جیسے "كُلٌّ" اور "بَعْضٌ"۔ ان میں جب تنوین ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے بعد کوئی مضاف الیہ حذف ہے، جیسے :"كُلٌّ يَعْمَلُ علی شَاكِلَتِهِ" (ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کرتا ہے)۔ یہاں "كُلٌّ" کے بعد "إنسان" یا "شخص" محذوف ہے۔

.3 جملہ کا عوض :جیسے "حِينَئِذٍ" اور "يَوْمَئِذٍ"۔ ان میں تنوین ایک مکمل جملے کی جگہ پر آئی ہے۔ جیسے :"يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا" (اس دن لوگ مختلف گروہوں میں نکلیں گے)۔ یہاں تنوین کا مطلب ہے :"يَوْمَ إِذْ بَعَثَ اللّٰهُ النَّاسَ" (اس دن جب اللہ لوگوں کو اٹھائے گا)۔

تنوین المقابلہ (مقابلہ کی تنوین): یہ تنوین جمع مؤنث سالم کے آخر میں آتی ہے تاکہ یہ جمع مذکر سالم میں آنے والی نون کا مقابلہ کر سکے۔

مثال :"مُسْلِمَاتٌ" (مسلمان عورتیں)۔ یہاں تنوین کا مقابلہ "مُسْلِمُونَ" میں موجود نون سے ہے۔

فائدہ ان چاروں کا حکم یہ ہے کہ یہ چاروں قسمیں خاص ہیں اسم کے ساتھ اور پانچویں قسم جو تنوین کی ہے تنوین ترنم وہ اسم فعل حرف ہر چیز پر داخل ہو سکتی ہے۔

تنوین الترنم (ترنم کی تنوین): تنوین کی پانچویں قسم تنوین ترنم ہے جو اشعار اور مصرعوں کے اٰخر میں آواز کو خوبصورت کرنے کے لیے لائی جاتی ہے۔ پہلی مثال صاحب کتاب نے دی ہے ابیات کی یعنی جو اشعار کے آخر میں آتی ہے:

اقلی اللوم عاذل والعتابن   وقولی ان اصبت لقد اصابن

اے ملامت کرنے والی عورت ملامت اور عتاب کو کم کر اور تو کہہ جب میں کوئی اچھا کام کروں کہ تو نے اچھا کام کیا ہے محل استشہاد اس شعر کے پہلے مصرعے میں عتابَن ہے اور دوسرے مصرعہ میں اصابن ہے۔:

اسمِ عَلَم سے تنوین کو حذف کرنا

ویحذف من العلم موصوفا ب(ابن) مضافا إلی علم آخر

مصنف، علامہ ابن حاجبؒ، یہاں سے اس قاعدے کو بیان فرما رہے ہیں جس کے تحت کسی اسمِ عَلَم سے تنوین کو حذف (ختم) کر دیا جاتا ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اسمِ عَلَم سے تنوین کو اس وقت حذف کیا جاتا ہے جب وہ تین شرائط پوری کر رہا ہو

:پہلی شرط :من العلم وہ اسم جس سے تنوین حذف کی جا رہی ہے، وہ اسم عَلَم ہو، یعنی کسی شخص کا خاص نام ہو۔

دوسری شرط :موصوفا ب(ابن) اس اسمِ عَلَم کی صفت لفظِ "ابن" کے ساتھ لائی گئی ہو، یعنی وہ عَلَم موصوف بن رہا ہو اور "ابن" اس کی صفت ہو۔

تیسری شرط :مضافا إلی علم آخر لفظِ "ابن" آگے کسی دوسرے اسمِ عَلَم کی طرف مضاف ہو رہا ہو (یعنی بیٹے کے نام کے بعد باپ کا نام بھی اسمِ عَلَم ہو)۔

مثال سے وضاحت

جیسے آپ کہتے ہیں :"جاء زیدُ بنُ عمروٍ" (عمرو کا بیٹا زید آیا)۔ اس مثال میں "زید" ایک اسمِ عَلَم ہے جس سے تنوین کو حذف کر دیا گیا ہے، ورنہ اصل میں یہ "زیدٌ" تھا۔ تنوین کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مذکورہ تینوں شرائط پائی جا رہی ہیں: "زید" ایک اسمِ عَلَم ہے۔ اس کی صفت لفظِ "ابن" کے ساتھ لائی گئی ہے (زیدُ موصوف اور ابنُ صفت)۔ لفظِ "ابن" آگے ایک دوسرے اسمِ عَلَم "عمروٍ" کی طرف مضاف ہے۔

قاعدے کی حکمت اور نحوی پہلو

مصنفؒ کے بیان کردہ اس قاعدے کی وجہ یہ ہے کہ جب دو عَلَموں کے درمیان "ابن" کا لفظ آجاتا ہے، تو یہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے تخفیف (آسانی) کا تقاضا کرتا ہے۔ عربوں نے ان تینوں (بیٹے کا نام، لفظِ ابن، اور باپ کا نام) کو ایک ہی کلمے کی طرح شمار کیا، اور جب یہ ایک کلمے کی طرح ہو گئے تو پہلے اسم (بیٹے کے نام) سے تنوین کو حذف کر دیا، کیونکہ تنوین دو اسموں کے درمیان جدائی کی علامت ہوتی ہے، جبکہ یہاں مقصود دونوں کو جوڑ کر ایک شناخت بنانا ہے۔

شرائط کا فائدہ:

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو تنوین کو حذف نہیں کیا جائے گا۔ اگر پہلا اسم عَلَم نہ ہو، جیسے :"جاء رجلٌ ابنُ عمروٍ" (عمرو کا بیٹا ایک آدمی آیا)، تو یہاں "رجلٌ" سے تنوین حذف نہیں ہوگی کیونکہ وہ اسم نکرہ ہے۔ اگر صفت "ابن" کے علاوہ کوئی اور لفظ ہو، جیسے :"زیدٌ صدیقُ عمروٍ" (زید عمرو کا دوست ہے)، تو یہاں بھی تنوین باقی رہے گی۔ اگر "ابن" کے بعد

والا اسم عَلَم نہ ہو، جیسے: "جاء زیدٌ ابنُ أخینا" (ہمارے بھائی کا بیٹا زید آیا)، تو یہاں بھی "زیدٌ" پر تنوین باقی رہے گی کیونکہ "أخینا" اسمِ عَلَم نہیں ہے۔

فائدہ:...ابن اور ابنۃ ایسے دو علموں کے درمیان واقع ہوں جن میں تناسل اور نسبیت کا تعلق ہو تو وہاں ابن اور ابنۃ ما قبل کے لیے صفت اور مابعد کے لیے مضاف ہوتے ہیں۔

[نون التأکید]:

نون التّأکید: خفیفة ساکنة، ومشدّدة مفتوحة مع غیر الألف. تختصّ بالفعل المستقبل في الأمر، والنّهي، والاستفهام، والتّمنّي، والعرض، والقسم. وقلّت في النّفي، ولزمت في مثبت القسم. و کثرت في مثل (إمّا تفعلنّ). وما قبلها مع ضمیر المذکّرین مضموم، ومع المخاطبة مکسور، وفیما عدا ذلك مفتوح. وتقول في التّثنیة وجمع المؤنّث: (اضربانّ) و (اضربنانّ)، ولا تدخلهما الخفیفة، خلافا لیونس. وهما في غیرهما مع الضّمیر البارز کالمنفصل، فإن لم یکن فکالمتّصل. ومن ثمّ قیل: (هل ترینّ) و (ترونّ) و (ترینّ)، و (اغزونّ) و (اغزنّ) و (اغزنّ). والمخفّفة تحذف للسّاکن، وفي الوقف، فیردّ ما حذف، والمفتوح ما قبلها تقلب ألفا.

والله أعلم.

ترجمہ: "نونِ تاکید": نونِ تاکید دو قسم کی ہے: ایک ساکن خفیفہ (ہلکی) اور دوسری مفتوح مشدّدہ (شد والی، زبر کے ساتھ)، جو الف کے علاوہ ہوتی ہے۔ یہ فعلِ مستقبل کے ساتھ خاص ہے جو کہ امر، نہی، استفہام، تمنی، عرض، اور قسم کے معانی میں ہو۔ نفی میں اس کا استعمال کم ہے، اور مثبت قسم میں یہ لازم ہے۔إمّا کے ساتھ اس کا استعمال زیادہ ہے (إمّا تفعلنّ)۔ اس سے پہلے والا حرف مذکر کی ضمیر کے ساتھ مضموم (پیش والا) ہوتا ہے، مخاطبہ (مؤنث واحد مخاطب) کے ساتھ مکسور (زیر والا)، اور ان دونوں کے علاوہ میں مفتوح (زبر والا) ہوتا ہے۔ تثنیہ اور جمع مؤنث میں آپ کہیں گے: "اِضْرِبَانِّ" اور "اِضْرِبْنَانِّ"۔ ان دونوں میں (تثنیہ اور جمع مؤنث) میں نونِ خفیفہ داخل نہیں ہوتی، یونس نحوی کے خلاف۔ اور ان کے علاوہ میں، ظاہر ضمیر کے ساتھ یہ منفصل (جدا) ضمیر کی طرح ہے۔ اگر ضمیر ظاہر نہ ہو تو یہ متصل (ملی ہوئی) کی طرح ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: "هَلْ تَرَیِنَّ"، "وَلَا تَرَوُنَّ"، "وَلَا تَرَیِنَّ"، "اغْزُوَنَّ"، "اغْزِیِنَّ"، اور "اغْزُنَّ"۔ نونِ خفیفہ کو ساکن کی وجہ سے حذف کر دیا جاتا ہے، اور وقف کی صورت میں، جو کچھ حذف ہوا تھا وہ واپس آجاتا ہے، اور اس سے پہلے جو مفتوح (زبر والا) ہو وہ الف میں بدل جاتا ہے۔

تشریح

مصنفؒ یہاں سے نونِ تاکید کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس کی اقسام، استعمالات اور اس کے ساتھ پیش آنے والی نحوی تبدیلیوں کو بیان فرماتے ہیں۔

نون تاکید کی تعریف

نون تاکید وہ غیر عامل مشدد اور ساکن ہے جو امر اور فعل مضارع کی تاکید کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ جس میں طلب کا معنی ہو اور وہ نون تاکید اس قد کے معنی میں ہو جو ماضی کی تاکید کے لیے آتا ہے یعنی جس طرح قد ماضی کی تاکید کے لیے آتا ہے اسی طرح مضارع کی تاکید کے نون تاکید آتا ہے: صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ نون تاکید کی دو قسمیں ہیں: (۱) نون خفیفہ۔ (۲) نون

ثقلیہ۔

نون تاکید خفیفہ :

اس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ ساکن ہو جیسے اضربَن، اضربُن، اضربِن ضرور بضرور مار تو ایک مرد۔ ضرور بضرور مارو تم سب مرد۔ ضرور بضرور مار تو ایک عورت۔

نون تاکید ثقلیہ :

اس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ مشدد ہو اور نون ثقلیہ ہمیشہ مفتوح ہوگا مگر شرط یہ ہے کہ اس سے پہلے الف نہ ہو جیسے اضربَنّ ضرور بضرور مار تو ایک مرد۔ اضربُنّ ضرور بضرور مار تو سب مرد۔ اضربِنّ ضرور بضرور مار تو ایک عورت۔

ومشدّدة مفتوحة مع غير الألف.

اور اگر نون سے پہلے الف ہو تو نون ہمیشہ مکسور ہوگا جیسے اضربَانّ ضرور بضرور مارو تم دو ۲ مرد یا دو ۲ عورتیں۔ اضربنان ضرور بضرور مارو تم سب عورتیں۔

نونِ تاکید کا محل استعمال؛

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ نونِ تاکید کا استعمال ان سات مقامات میں ہوتا ہے:

فعلِ امر :اِضْرِبَنَّ (تم ضرور مارو)۔

نہی :لَا تَضْرِبَنَّ (تم ہرگز نہ مارو)۔

استفہام (سوال) :هَلْ تَذْهَبَنَّ؟ (کیا تم ضرور جاؤ گے؟)۔

تمنّی (خواہش) :لَيْتَنِي أَعْمَلَنَّ خَيْرًا (کاش میں ضرور اچھا کام کرتا)۔

عرض (پیشکش) :أَلَا تَأْكُلَنَّ؟ (کیا تم ضرور نہیں کھاؤ گے؟)۔

قسم :وَاللهِ لَأَضْرِبَنَّ زَيْدًا (اللہ کی قسم، میں ضرور زید کو ماروں گا)۔ یہ واجب ہے۔

وقلّت في النّفي، ولزمت في مثبت القسم، و كثرت في مثل (إمّا تفعلنّ).

* **نفی میں قلّت؛** نفی کے ساتھ اس کا استعمال بہت کم اور شاذ ہے، جیسے وَاللهِ لَا يَفْعَلَنَّ۔

قسم میں نون تاکید کا وجوب؛ یہاں سے صاحبِ کتاب ایک قاعدہ بیان فرماتے ہیں کہ کبھی جواب قسم پر نون تاکید کو داخل کرنا واجب ہوتا ہے شرط یہ ہے کہ جواب قسم مثبت ہو اور نون تاکید کے داخل ہونے کی جو شرط ہے طلب فعل وہ اس میں پائی جائے کیونکہ نون تاکید کی جو شرط ہے طلب فعل وہ اس میں پائی جاتی ہے یعنی جواب قسم میں پائی جاتی ہے کیونکہ متکلم جب قسم کا تکلم کرتا ہے تو اس کی قسم میں فعل کی طلب ہے جو اصل میں جواب قسم ہے غالباً اسی وجہ سے علمائے نحو کے نزدیک جواب جب مثبت ہو تو اس پر نون تاکید داخل کرنا واجب ہوگا تاکہ وہ قسم کے مطابق ہو جائے کیونکہ قسم میں بھی تاکید ہوتی ہے اور اس میں بھی تاکید آجائے گی جیسے واللہ لا افعلن کذا اللہ کی قسم میں ضرور بضرور ایسا کروں گا۔

* **شرط میں کثرت :** جب إنْ شرطیہ مَا زائدہ کے ساتھ مل جائے تو فعل پر نونِ تاکید کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، جیسے إِمَّا

تَفْعَلَنَّ (اگر تم ضرور کروگے)

وما قبلها مع ضمير المذكّرين مضموم، ومع الخاطبة مكسور، وفيما عدا ذلك مفتوح.

نونِ تاکید کی حرکات:

مصنفؒ ان حروف کے ساتھ آنے والی حرکات کے قواعد بھی بیان کرتے ہیں۔

مذکر کی ضمیر کے ساتھ :نون سے پہلے والا حرف مضموم (پیش والا) ہوتا ہے۔ جیسے :تَضْرِبُونَّ (تَضْرِبُنَّ)۔ یہاں واؤ حذف ہو گیا اور ضمہ باقی رہا۔

مخاطبہ (واحد مؤنث) :نون سے پہلے والا حرف مکسور (زیر والا) ہوتا ہے۔ جیسے :تَضْرِبِينَ (تَضْرِبِنَّ)۔ یہاں یائے حذف ہو گئ اور کسرہ باقی رہا۔

باقی تمام صورتوں میں :نون سے پہلے والا حرف مفتوح (زبر والا) ہوتا ہے۔ جیسے :يَضْرِبَنَّ، تَضْرِبُنَّ، نَضْرِبَنَّ۔

.وتقول في التّثنية وجمع المؤنّث :(اضربانّ) و (اضربنانّ)، ولا تدخلهما الخفيفة، خلافا ليونس

نونِ تاکید اور تثنیہ و جمع مؤنث :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ تثنیہ اور جمع مؤنث میں نونِ خفیفہ (ساکن) استعمال نہیں ہوتی۔ صرف نونِ ثقیلہ آتی ہے۔

۱۔ تثنیہ :اضْرِبَانِّ۔ اس کی اصل اضْرِبَا + نِّ تھی۔ الف اور نونِ مشددہ کے پہلے ساکن حرف کے درمیان التقائے ساکنین ہے، لیکن چونکہ الف ما قبل مفتوح کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے الف کو حذف نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نون کو مکسور پڑھا گیا جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

۲۔ جمع مؤنث :اضْرِبْنَانِّ۔ اس کی اصل اضْرِبْنَ + نِّ تھی۔ یہاں نونِ جمع مؤنث (جو کہ ساکن ہے) اور نونِ تاکید کے پہلے ساکن حرف کے درمیان التقاء ساکنین کو روکنے کے لیے ایک الف فاصل لایا گیا۔ پس یہ اضْرِبْنَانِّ بن گیا۔

*مسئلہ اختلافیہ :

ولا تدخلهما الخفيفة، خلافا ليونس... الخ یہاں صاحبِ کتاب جمہور نحویوں کے نزدیک نون خفیفہ کا ایک خاص حکم بیان فرماتے ہیں کہ نون خفیفہ یہ تثنیہ اور جمع پر کبھی بھی داخل نہیں ہو سکتا... کیونکہ اگر خفیفہ کو تثنیہ یا جمع مؤنث پر داخل کیا جائے گا تو دو ۲ خرابیوں میں سے ایک لازم آئے گی۔

پہلی خرابی:...اگر نون خفیفہ کو حرکت دیتے ہیں تو پھر وہ نون خفیفہ نہیں رہتی۔

دوسری خرابی:...آپ اگر اسے ساکن چھوڑ دیتے ہیں تو اس صورت نون تاکید خفیفہ تو ہے لیکن اس صورت میں التقائے ساکنین علیٰ غیر حدہ لازم آئے گا اور یہ بہتر نہیں ہے۔

(۱) التقائے ساکنین کی دو قسمیں ہیں:

التقائے ساکنین علی حدہ :

جائز ہے اس میں تین شرطیں ہونی چاہییں (۱) پہلا والا حرف ساکن مدہ ہو۔ (۲) دوسرا والا حرف ساکن مدغم ہو۔ (۳) دونوں

ایک کلمے میں ہوں۔ یہ التقائے ساکنین کی پہلی قسم ہے اور یہ جائز ہے التقائے ساکنین علی حدہ جیسے دابّۃ اصل میں تھا دَابِبَۃ۔
اور دوسری قسم:

التقائے ساکنین علی غیر حدہ

اس کو کہتے ہیں جس میں یہ شرائط نہ پائی جائیں یعنی پہلے والا حرف ساکن مدہ نہ ہو یا مدہ ہو دوسرا مدغم نہ ہو یا دونوں ہوں حرُف مدہ بھی ہو پہلا دوسرا مدغم بھی ہو لیکن ایک کلمے میں نہ ہوں جیسے اضربان۔
نونِ خفیفہ (جو خود ساکن ہے) ان دو صیغوں میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ الفِ تثنیہ اور نونِ جمع مؤنث کے بعد اس کی آمد سے التقائے ساکنین لازم آئے گا جو جائز نہیں۔ لیکن امام یونس نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ جمہور کا قول ہی راجح ہے۔

وهما في غيرهما مع الضّمير البارز كالمنفصل، فإن لم يكن فكالمتّصل. ومن ثمّ قيل: (هل ترينّ) و (ترونّ) و (ترينّ)، و (اغزونّ) و (اغزنّ) و (اغزنّ).

مصنف (ابن حاجب) یہاں سے نونِ تاکید کے متعلق ایک اور اہم قاعدہ بیان فرمارہے ہیں کہ جب نونِ تاکید کا استعمال تثنیہ (دو افراد) اور جمع مؤنث کے علاوہ دیگر صیغوں (شکلوں) میں ہو تو اس کے دو اصول ہیں:
ضمیرِ بارز (ظاہری ضمیر) کے ساتھ: اگر فعل میں ضمیر واضح طور پر نظر آ رہی ہو (جیسے تضربون میں واو اور تضربین میں یا)، تو اس کی حالت ضمیرِ منفصل کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نونِ تاکید آتی ہے تو ضمیر اور نون کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔
جب ضمیرِ بارز نہ ہو: اگر فعل میں ضمیر واضح نہ ہو (جیسے یضرب میں ضمیر ھو چھپی ہوئی ہے)، تو اس کی حالت ضمیرِ متصل (ملی ہوئی) کی طرح ہوتی ہے، یعنی اس کے بعد نونِ تاکید بغیر کسی رکاوٹ کے آجاتی ہے۔
مصنف کے اس فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب نونِ تاکید فعلِ مضارع کے ساتھ ملتی ہے تو اس کی شکل میں تبدیلی آتی ہے۔ اسی قاعدے کی روشنی میں یہ مثالیں دی گئی ہیں:
مثالیں: "هل تَرَوُنَّ": یہ دراصل "تَرَوْنَ" (تم سب دیکھتے ہو) تھا۔ جب اس کے ساتھ نونِ تاکید ثقیلہ ملی تو واو (جو کہ جمع کی علامت ہے) اور نونِ تاکید کے درمیان دو ساکن حرف اکٹھے ہو گئے۔ عربی گرامر کے اصول کے مطابق، ان میں سے پہلے ساکن حرف کو حذف کر دیا گیا، جس کے نتیجے میں "تَرَوُنَّ" بنا۔
"هل تَرَيِنَّ": یہ اصل میں "تَرَيْنَ" تھا۔ اس میں یا اور نونِ تاکید ثقیلہ کے درمیان دو ساکن جمع ہو گئے۔ یا کو حذف کر دیا گیا، اور نتیجے میں "تَرَيِنَّ" بنا۔ اسی طرح، فعلِ امر اغزَا سے بھی تین مثالیں دی گئی ہیں:
"أُغْزُوَنَّ": یہ اصل میں اغزُ تھا (تو جہاد کر)۔ یہ ایک واحد مذکر کا صیغہ ہے۔ اس کے ساتھ نونِ تاکید کے ملنے سے "أُغْزُوَنَّ" بنا۔
"أُغْزُنَّ": یہ اصل میں اغْزُوا (تم سب جہاد کرو) تھا، یعنی جمع کا صیغہ۔ جب نونِ تاکید سے ملا تو دو ساکن حرف واو اور نون اکٹھے ہو گئے، جس کی وجہ سے واو کو حذف کر دیا گیا، اور نتیجے میں "أُغْزُنَّ" بنا۔
"أُغزِنَّ": یہ اصل میں اغزِی تھا، یعنی واحد مؤنث کا صیغہ۔ جب نونِ تاکید سے ملا تو دو ساکن حرف یا اور نون اکٹھے ہو گئے، جس کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا گیا، اور نتیجے میں "أُغزِنَّ" بنا۔

وَالْمُخَفَّفَةُ تُحْذَفُ لِلسَّاكِنِ، وَفِي الْوَقْفِ، فَيُرَدُّ مَا حُذِفَ، وَالْمَفْتُوحُ مَا قَبْلَهَا تُقْلَبُ أَلِفًا.

اس عبارت میں مصنفؒ نے نونِ خفیفہ (نْ) کے تین بنیادی احکام اور ان سے متعلقہ تفصیلات کو بیان فرمایا ہے۔

پہلا حکم: التقائے ساکنین کی وجہ سے نون کا حذف ہونا

"وَالْمُخَفَّفَةُ تُحْذَفُ لِلسَّاكِنِ" مصنفؒ یہاں سے یہ بیان فرمارہے ہیں کہ نونِ تاکید خفیفہ (جو خود ساکن ہوتا ہے) کو اس وقت حذف کر دیا جاتا ہے جب اس کے بعد کوئی حرفِ ساکن آرہا ہو کیونکہ کہ دو ساکن حروف (التقائے ساکنین) کا ایک ساتھ آنا درست نہیں سمجھا جاتا، خصوصاً جب پہلا ساکن حرفِ مدہ نہ ہو۔ چونکہ نونِ خفیفہ (نْ) خود ساکن ہے، اگر اس کے بعد والا لفظ بھی کسی ساکن حرف سے شروع ہو (جیسے لامِ تعریف کا ال)، تو اس صورت میں نونِ خفیفہ کو تلفظ میں باقی رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ للذا، اس نون کو گرادیا جاتا ہے تاکہ کلام میں روانی برقرار رہے۔

مثال: اگر آپ کہنا چاہیں "لَتَضْرِبَنْ الرَّجُلَ" (تو ضرور اس مرد کو مار)، تو یہاں لَتَضْرِبَنْ کا نونِ خفیفہ ساکن ہے اور الرَّجُلَ کا لام بھی (جو شمسی ہونے کی وجہ سے مدغم ہے لیکن اصلاً ساکن ہے)۔ یہاں دو ساکن جمع ہو گئے۔ اس التقائے ساکنین سے بچنے کے لیے نونِ خفیفہ کو حذف کر دیا جائے گا اور اسے یوں پڑھا جائے گا: "لَتَضْرِبَ الرَّجُلَ"۔

دوسرا حکم: وقف کی حالت میں نون کا حذف ہونا

"وَفِي الْوَقْفِ" مصنفؒ فرماتے ہیں کہ نونِ خفیفہ کو وقف کی حالت میں بھی حذف کر دیا جاتا ہے (یعنی جب اس کلمے پر بات ختم کی جارہی ہو)۔ جب کسی ایسے فعل پر وقف کیا جاتا ہے جس کے آخر میں نونِ خفیفہ ہو تو اس نون کو پڑھا نہیں جاتا۔ یہ اس کے تلفظ میں تخفیف اور آسانی پیدا کرنے کے لیے ہے۔

مثال: فعل لَتَضْرِبَنْ پر اگر وقف کیا جائے تو اسے لَتَضْرِبْ پڑھا جائے گا، یعنی نونِ خفیفہ کو حذف کر دیا جائے گا۔

تیسرا حکم: حذف شدہ حرف کا واپس لوٹنا

"فَيُرَدُّ مَا حُذِفَ" یہ گزشتہ حکم (وقف میں حذف) کا ایک اہم تتمہ (تکملہ) ہے۔ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ جب وقف کی وجہ سے نونِ خفیفہ کو حذف کیا جاتا ہے تو وہ حرف واپس آجاتا ہے جسے فعل کی اصلی حالت (مثلاً امر یا نہی کی وجہ سے) میں حذف کیا گیا تھا۔

یہ قاعدہ ان افعالِ ناقصہ (وہ افعال جن کے آخر میں حرفِ علت ہو) سے تعلق رکھتا ہے جن میں جزم یا بناء کی وجہ سے آخری حرفِ علت کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً أُدْعُ (اصل میں أُدْعُو تھا)، اِرْمِ (اصل میں اِرْمِي تھا)۔ جب ان افعال پر نونِ خفیفہ داخل ہوتا ہے تو یہ أُدْعُن اور اِرْمِيَنْ بن جاتے ہیں۔ اب جب ان پر وقف کیا جائے گا تو پچھلے قاعدے کے مطابق نونِ خفیفہ حذف ہو جائے گا۔ جب نون حذف ہوگا تو وہ اصلی حرفِ علت، جسے امر ہونے کی وجہ سے حذف کیا گیا تھا، اپنی جگہ واپس لوٹ آئے گا۔

مثال: فعل امر ہے أُدْعُ (آپ دعا کریں)۔ اس پر نونِ خفیفہ لگانے سے یہ أُدْعُنَّ ہو گیا۔ اب اگر أُدْعُنَّ پر وقف کریں گے تو نونِ

خفیفہ (ن) گر جائے گا اور جو واو (و) امر کی وجہ سے گرا تھا، وہ واپس آ جائے گا، اور اسے اُدْعُوْ پڑھا جائے گا۔

اسی طرح لَا تَنْسَ (تو مت بھول) پر نونِ خفیفہ لگانے سے لَا تَنْسَيَنْ بنے گا۔ وقف کی حالت میں نون گرے گا اور آخر میں الف (ی کی صورت میں) واپس آ جائے گا اور اسے لَا تَنْسَى پڑھا جائے گا۔

چوتھا حکم: وقف میں نون کا الف سے بدلنا

"وَالْمَفْتُوحُ مَا قَبْلَهَا تُقْلَبُ أَلِفًا" یہاں مصنفؒ وقف کے قاعدے میں ایک استثناء اور تخصیص بیان فرما رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر نونِ خفیفہ سے پہلے والے حرف پر فتحہ (زبر) ہو تو وقف کی حالت میں نونِ خفیفہ کو حذف کرنے کے بجائے الف سے بدل دیا جاتا ہے۔ یہ قاعدہ پچھلے قاعدے (وقف میں حذف) پر مقدم ہے۔ یعنی اگر نونِ خفیفہ سے ما قبل حرف مفتوح ہے، تو ہم اسے صرف حذف نہیں کریں گے، بلکہ اسے الف میں تبدیل کر دیں گے۔ یہ قرآن کریم میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور فصاحت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

مثال: قرآن مجید کی آیت لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ میں لفظ لَنَسْفَعًا اصل میں لَنَسْفَعَنْ تھا۔ چونکہ نونِ خفیفہ سے پہلے والے حرف (ع) پر فتحہ ہے، اس لیے وقف کی حالت میں اس نون کو الف سے بدل دیا گیا اور اسے لَنَسْفَعَا پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح سورہ یوسف میں لَيَكُونًا مِنَ الصَّاغِرِينَ میں لَيَكُونًا اصل میں لَيَكُونَنْ تھا۔

واللہ اعلم

فبعون الله وتوفيقه، هذا اليوم المبارك ختام شرح كتاب "الكافية" للإمام ابن الحاجب رحمه الله. فما كان في هذا الشرح من صواب وتوفيق فمن الله وحده، وما كان فيه من خطأ أو زلل أو نسيان فمني ومن الشيطان، والله ورسوله منه براء. نسأل الله العظيم أن يتقبل منا هذا الجهد المتواضع، وأن يجعله خالصا لوجهه الكريم، وأن ينفعنا بما حررنا وقرأنا ودرسنا، وأن يجعله حجة لنا لا علينا يوم نلقاه. وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين. وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

ابو صهيب المفتی

2025_1447